جنوری — دسمبر ۱۹۷۱

(جنوری فروری یکجا)

جنوری فروری
پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل

مصنفہ :- الطاف علی صاحب نگراں تربیت جسمانی ، جامعہ

ہمارے ملک میں بچّے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک
بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں
دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچّے جسمانی لحاظ سے کم زور ہوتے ہیں اور اُن کی
چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو ان بچّوں میں ملتی ہے جنھیں کثرت سے
کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچّوں کو [illegible] سے لے کر [illegible] گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے
کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کرسکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں
تربیت پائے گا وہ ملک وملّت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و
فراز میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا مصنّف نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً
[illegible]
ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔

قیمت ۔ ۸؍

مکتبہ جامعہ
دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

پیامی بھائیوں کو ہو مبارک سالِ نو یارب
لگے علم و ہنر کی شمع سے ان سب کی لو یارب
دُعا نیّر کی ہے پھولیں پھلیں یہ باغِ عالم میں
رہیں راہِ ترقی پر ہمیشہ تیز رو یارب
شفیع الدین نیر
FIROZE 70

سالنامہ

پیامِ تعلیم دہلی

جلد ۲۴ نمبر ۱ و ۲

پیام تعلیم یو پی، سی پی، برار، میسور، حیدر آباد اور پنجاب کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔

جنوری و فروری ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

F. ROZE

ایڈیٹر: محمد حسین حسان

قیمت سالانہ عہ
سالنامہ مہ

اپنی بات

پیامی عزیزوں کو بڑی عید اور نیا سال مبارک۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ان کے لئے نئی نئی کامیابیوں اور مسرتوں کا پیام لائے۔ آمین

اس خوشی کے موقع پر سالنامے کا یہ تحفہ ہمیں یقین ہے کہ ان کی مسرتوں کو اور بڑھادے گا۔ ہم نے اسے دلچسپ اور مفید بنانے کے لئے بہت محنت کی ہے۔ اگر ہمارے عزیز پیامیوں نے بھی اسے پسند کیا تو گویا ہماری محنت ٹھکانے لگی

پیام تعلیم کا سال گرہ نمبر اب تک اکتوبر میں شائع ہوتا تھا۔ مگر اس مرتبہ کچھ ایسی رکاوٹیں آ کر پڑیں کہ ہم پچھلے اکتوبر میں سالنامہ شائع نہ کر سکے۔ سب سے بڑی رکاوٹ آج کل کے حالات تھے۔ اس وقت لڑائی کی وجہ سے ہر چیز مہنگی ہے۔ کاغذ۔ چھپائی۔ اور بلاکوں کی بنوائی وغیرہ۔ تاہم اس سے ہمارے پیامیوں کو جو رنج اور ناامیدی ہوئی اس کا ہمیں احساس تھا۔ اسی احساس نے ہمیں جنوری میں سالنامہ نکالنے پر مجبور کیا۔

ہمیں پچھلے سالوں کے سالناموں کے مقابلے میں اس کی تیاری کے لئے وقت بہت کم ملا۔ کل ایک مہینہ۔ پھر مضمون نگاروں سے مضمون لکھوانا۔ ان کی کتابت کرانا۔ آرٹسٹ سے تصویریں بنوانا۔ تصویروں کے بلاک بنوانا۔ پھر ان سب کو چھپوا کر وقت پر تمہارے پاس بھیجنا غرض اتنی کم مدت میں یہ سب کچھ کرانا تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور رات دن ایک کر دیا۔

ہم نے سال گرہ نمبر کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم اسے اپنی خواہش اور ارادوں کے مطابق تیار نہ کر سکے۔ وقت کی کمی ہی اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اس پرچے کی ترتیب میں ہمیں مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر سے خاص مدد ملی۔ انھوں نے ہمارے لئے

ایک دلچسپ کہانی لکھی۔ دو اچھی اچھی نظمیں لکھیں اور
بچوں کی بہت سی نظموں کی اصلاح کی۔ ان کے
علاوہ سید عروج الحسن صاحب معمّن کے سلسلے میں
سال بھر تک ہماری مدد کرتے رہے۔ سید نور الحسن
صاحب ہاشمی (ایڈیٹر جامعہ) نے خود بھی مضمون
لکھے اور دوسروں سے لکھوائے۔ جناب عبد الغفور
صاحب لکچرار ٹریننگ کالج نے اپنے شاگردوں سے
بہت قیمتی مضمون لکھوائے۔ حسن سبحانی صاحب
بی۔ اے جامعہ نے محترمہ آپا جان کے ایک انگریزی
مضمون کا ترجمہ کیا۔ اور اسے ایک دلچسپ مضمون
بنا دیا۔ اور وقتاً فوقتاً ہمارا ہاتھ بٹاتے رہے۔
جناب سعید انصاری صاحب (پرنسپل استادوں کا مدرسہ
جامعہ) آخر تک مضمون لکھنے کا وعدہ کرتے رہے
اور آخر میں انھیں وعدہ پورا نہ کرسکنے کا افسوس
رہا۔ ان سب بزرگوں اور بھائیوں کا ہم دلی
شکریہ ادا کرتے ہیں ان کی امداد اور مشوروں
کے بغیر پیام تعلیم کو شاید اتنی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔

لڈو کا ٹکڑا والی نظم ہم نے نیّر صاحب سے
خاص طور سے لکھوائی ہے۔ پچھلے سال گرہ نمبر
دسمبر ۳۹ء کی نظم "پھل جیسی کو کس نے مارا" بچوں نے
بہت پسند کی تھی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بھی اسی طرح مقبول
ہوگی

پچھلے پرچے میں ہم نے چند عنوانات پر بچوں
کو مضمون لکھنے کی دعوت دی تھی۔ بہت کم
بچوں نے اس طرف توجہ کی۔ شاید اس لئے
اور بھی کہ وقت کم تھا۔ ان مضامین میں صدیقہ
رضیہ سلطانہ نانا وور، اور محمد الدین مؤجد کے مضمون
سب سے اچھے ہیں۔ انعام انھی کو دیا جائے گا
امیر اللہ خاں بھوپالی کا مضمون بھی بہت اچھا ہے
لیکن وقت پر نہیں پہنچا۔ یہ مضمون اگلے پرچے
میں چھپے گا۔

یہ پرچہ جنوری اور فروری کا مشترکہ نمبر
ہے۔ اس لئے فروری میں پیام تعلیم کا انتظار
نہ کرنا۔ اب یہ مارچ میں تمھارے پاس پہنچے گا

لفافے کی قیمت اب ۱؍ ہو گئی ہے مگر بعض بچے
اب تک ایک ہی آنے میں خط بھیجتے ہیں۔ ان کا خط
بیرنگ ہوجاتا ہے۔ اور دفتر کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا
ہے۔ امید ہے کہ بچے آئندہ خیال رکھیں گے۔

کسی شہر میں ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ مزدور تھا دن بھر کام کرتا۔ شام کو گھر آتا۔ مزدوری کے جو پیسے ملتے ان سے آٹا، دال، گھی، لکڑی، نمک، مرچ خریدتا، بیوی اناج پیستی، چولھا جلاتی کھانا پکاتی، کھانا پک چکتا تو سب کھانے کو بیٹھ جاتے۔ اَور کھا پی کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

یہ میاں بیوی بہت غریب تھے میاں جو کچھ لاتا اس میں انھی کا خرچ مشکل سے چلتا۔ اس پر ان کے تین بچّے بھی تھے۔ پھر بھی جیسے بن پڑتا۔ یہ کام چلاتے۔ میاں بیوی اَور بچّے خوش رہتے۔ جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا ہنسی خوشی کھا پی لیتے۔

ان کے تین بچّوں میں سب سے چھوٹا بچّہ عجیب طرح کا تھا آٹھ دس برس کا ہوگیا۔ مگر اس کا قد ایک فٹ سے زیادہ نہ بڑھا۔ نام تو نہ جانے کیا تھا۔ مگر سب لوگ اسے ٹلّو میاں کہہ کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بہت تیز۔ باہمّت اَور سمجھ دار تھا۔ اس عمر میں ایسی ایسی باتیں کرتا کہ سب سن سن کر حیران ہوتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اس مزدور کو کئی دن تک کچھ کام نہ ملا۔
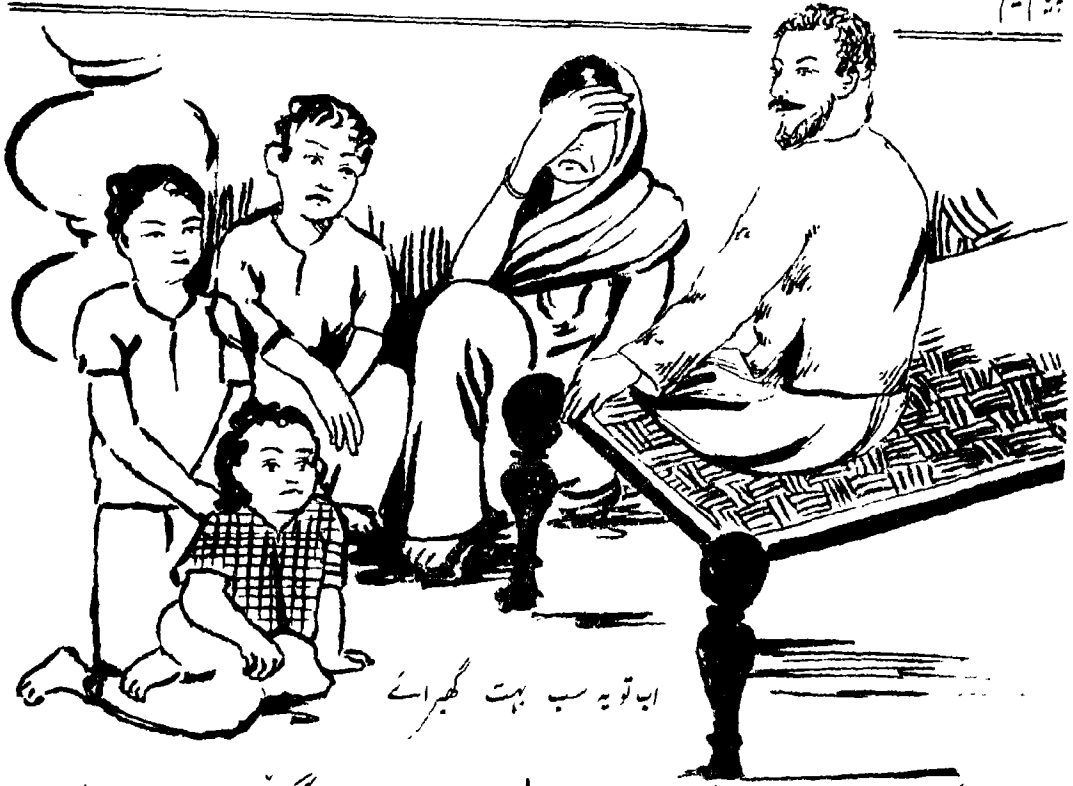
اب تو یہ سب بہت گھبرائے

اب تو گھر کا کام چلنا بند ہو گیا۔ ایک دو دن آدھے پیٹ کھا کر گذارہ کیا مگر جب اتنا بھی نہ ملا تو یہ سب بہت گھبرائے۔ ایک دن تنگ آ کر باپ نے کہا۔ "چلو جنگل چلیں۔ جنگلی جھاڑیوں میں بیر ویر مل جائیں تو وہی کھا پی کر پیٹ بھر لیں۔" تینوں بچے بولے "اچھا" اور اچھلتے کودتے چل دئے۔ چلتے چلتے وہ گھر سے بہت دور نکل گئے۔ اور ایک بہت ہی گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ وہاں بہت سی جھاڑیوں میں بیر اور کچھ اور بھی پھل ملے۔ یہ بھوکے تو تھے ہی، بس ٹوٹ پڑے۔ باپ نے سوچا یہ بچے یہاں کھالیں میں ذرا آگے بڑھ جاؤں۔ اور نئی جھاڑیاں تلاش کر کے ان کے پھل کھاؤں۔ اس نے ایسا ہی کیا مگر کھاتے کھاتے ذرا زیادہ دور نکل گیا۔ اتنے میں شام ہو گئی اور بچوں کے پاس واپس

آنے کے لئے چلا مگر غریب راستہ بھول گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ بچے مل جائیں مگر نہ ملے۔ آخر تھکا ہارا اُداس گھر پہنچا۔ اپنی بیوی سے سب حال کہا۔ دونوں بہت روئے پیٹے مگر فقط رونے پیٹنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان دونوں نے مل کر ان کو تلاش کرنا شروع کیا۔

اب بچوں کا حال سنئے۔ وہ مزے سے کھیلتے اَور کھاتے رہے کھانے۔ اَور کھیلنے سے ان کا پیٹ خوب بھر گیا تو شام کا اندھیرا دیکھ کر ان کو بھی ہوش آیا۔ سب خوب زوَر زوَر سے "ابا! ابا!" کہہ کہہ کر چلائے۔ مگر کوئی جواب نہ ملا تو کہنے لگے اب کیا کریں! ایک نے کہا "جس رستے آئے ہو اسی رستے گھر لوٹ چلو۔" سب نے کہا "بات تو ٹھیک ہے۔" اب چلے تو یہ بھی راستہ بھول گئے۔ رات بھی ہو رہی تھی۔ جنگل کے جانوروں کی آوازیں سنائی دیں تو یہ بہت ڈرے۔ بڑے بھائی نے کہا "خدا خیر کرے آج بچے نظر نہیں آتے" ٹلو میاں بولے "تم کیوں ہارتے ہو۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ مگر یوں جنگل میں مارا مارا پھرنا ٹھیک نہیں چلو کسی ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں شاید کہیں روشنی نظر آئے۔ بس اسی طرف چل پڑیں گے۔ آبادی میں رات گزار دیں گے صبح اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

وہ اَور کرتے بھی کیا۔ سب نے کہا اچھا چلو۔ آگے آگے ٹلو میاں پیچھے پیچھے دونوں بھائی چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے کبھی کوئی لومڑی گزر جاتی اَور کبھی گیدڑ۔ ان کا کلیجہ کانپ جاتا۔ یہ اچھا ہوا کہ بھیڑیا، بھالو یا شیر نہ ملا ورنہ ان کا نوالا بنا لیتا۔ چلتے چلتے یہ ایک ٹیلے کے پاس پہنچے۔ ٹیلا کیا تھا اچھی خاصی پہاڑی تھی۔ یہ جھٹ پٹ اس پر

چڑھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دوسری طرف جنگل ونگل کچھ نہیں ایک بہت لمبا چوڑا میدان ہے۔ اس میدان میں بہت دُور ایک طرف انھیں کچھ روشنی بھی دکھائی دی۔

یہ بولے "بس وہیں چلو" یہ تینوں چلے۔ وہی آگے آگے ٹلّو میاں اور پیچھے پیچھے بھائی۔

یہ روشنی اصل میں ایک محل کے پھاٹک کی تھی۔ اس محل کا مالک ایک بہت ظالم دیو تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو پھاٹک کھلا پایا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک پری ان کو نظر آئی۔ یہ پری بہت ہی اچھے کپڑے پہنے محل کے باغ کی ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے جو انھیں دیکھا تو نرمی سے پوچھا "تم کون ہو؟"

ٹلّو میاں جھٹ آگے بڑھے اور انھوں نے پری کو اپنا حال کہہ سنایا۔

یہ پری بہت نیک تھی۔ اس کو ان پر رحم آگیا۔ بولی "بچّو! تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو یہاں سے ابھی چلے جاؤ۔ اس محل کا مالک دیو آگیا تو تمھیں کچّا کھا جائے گا۔"

ٹلّو میاں نے کہا "جائیں کہاں؟ ہم اپنے گھر کا راستہ بھُول گئے ہیں۔ اب تو یہیں رہیں گے۔ باہر گئے تو درندے شیر یا بھالو ہمیں کھا جائیں گے۔"

پری کیا کرتی۔ وہ بے چاری آپ دیو کی قید میں تھی۔ اس نے یہ بات بچّوں کو بتا بھی دی مگر کچھ سوچ کر پھر اس نے کہا "اچّھا تم کسی بہت ہی گھنے پیڑ پر چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ رات کسی طرح گزار دو۔ وہ دیو صبح ہوتے ہی چلا جاتا ہے۔ وہ چلا جائے تو تم اپنے گھر چلے جانا۔"

بچّوں نے کہا "اچّھا" یہ کہہ کر وہ ایک بہت ہی گھنے پیڑ پر چڑھ گئے اور اس کے پتّوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ اس پیڑ کے ٹہنے ایسے بڑے اور

پری نے پوچھا تم کون ہو

چوڑے تھے کہ ان پر اچھی طرح وہ لیٹ گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، دونوں بھائی تو پیڑ کے ٹہنے پر لیٹتے ہی سو گئے مگر ٹلّو میاں جاگتے رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی دیو نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے سوچا آج دیو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا۔

اتنے میں ہوا کی سرسراہٹ سی ہوئی۔ ایک بہت لمبا تڑنگا دیو ایک تخت پر بیٹھا ہوا آیا۔ اس تخت کو چار اَور دیو اڑائے لا رہے تھے۔ انھوں نے یہ تخت باغ کے ایک ہرے بھرے میدان میں اُتارا۔ وہ دیو اتنا بڑا تھا کہ اگر ان بچّوں کو کھانے پر آتا تو سب کا ایک نوالا بنا کر کھا جاتا۔

ٹلّو میاں نے اس کی صوٗرت دیکھی تو ڈر کے مارے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر بھی انھوں نے ہمّت سے کام لیا اَور چپ چاپ دم سادھے بیٹھے رہے۔ پری وہیں کھڑی ہوئی تھی دیو اس سے باتیں کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ٹلّو میاں نے سوچا، چلو دیو کو پاس سے ذرا اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ ان کا سارا ڈر جاتا رہا۔

آپ چُپکے چُپکے جاکر دیو کے کمرے کی ایسی سمت میں کھڑے ہو گئے جہاں اُنھیں کوئی دیکھ نہ سکے۔

ٹلّو میاں کا بیان ہے کہ کمرے کے بیچ میں ایک بہت بڑی میز بچھی ہوئی تھی۔ اس پر کھانا چُنا ہوا تھا۔ ایک بیل کا قورمہ تھا۔ اَور پانچ بکروں کے گوشت کی بریانی۔ چار من دوٗدھ کی کھیر تھی اَور دس بارہ من آٹے کی خمیری روٹیاں۔ چٹنی اچار کا وزن بھی سات آٹھ سیر سے کم نہ ہوگا۔ پری نے تو بہت تھوڑا سا کھانا کھایا مگر دیو یہ سب کھانا چٹ کر گیا۔ پانی

پینے پر آیا تو دس بارہ مٹکے پانی غٹ غٹ چڑھا گیا۔ کھا پی چکا تو ایسی ڈکار لی گویا توپ کا گولا چھٹا۔ ٹلّو میاں اِک دم اچھل پڑے۔ اس آواز کو سن کر ان کا دِل دھڑکنے لگا۔

دیو کھانا کھا چکا تو بولا "آدمی کے دو چار بچوں کا گوشت اَور مل جاتا تو جی ذرا خوش ہوتا۔ خیر کل کوئی فکر کی جائے گی۔" یہ بات سن کر ٹلّو میاں کے بدن کا خون خشک ہوگیا۔

دیو کھا پی کر فارغ ہو چکا تو اس نے پری سے پوچھا "تم نے کیا سوچا؟ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو بولو۔ جواب دو؟!"

پری سے کچھ جواب نہ بن پڑا اس پر وہ دیو اَور بھی غصے میں بھر گیا آنکھیں نکال کر کہنے لگا "تم کو تین دن کی مہلت اَور دی جاتی ہے، اگر اس عرصے میں تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوئیں اَور ہنسی خوشی یہاں رہنا پسند نہ کیا تو چوتھے دن تمھاری خیر نہیں"

پری اب بھی چپ رہی اَور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دیو اٹھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ بھی اپنے سونے کے کمرے میں گیا اَور پلنگ پر لیٹتے ہی بے خبر سو گیا۔

ٹلّو میاں بھی اس کے کمرے میں چلے گئے اَور کمرے کی ہر چیز غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں اچانک دیو کے بولنے کی آواز سن کر وہ ڈر گئے اَور جھٹ اس کے پلنگ کے نیچے جا چھپے۔

دیو کہہ رہا تھا "آج میرے باغ میں ضرور کوئی نیا آدمی آیا ہے۔ کل اس کو کچا چبا ڈالوں گا۔ .... پری میرا کہا نہیں مانتی مجھ سے شادی نہیں کرتی۔ اس کو بھی سزا ملنی چاہئے۔ وہاں ماروں گا

جہاں پانی نہ ملے .... کہتی تھی میں تجھ کو مار ڈالوں گی .... مجھ کو مار ڈالے گی! ہاہاہا!!......... مجھ کو مار ڈالے گی!!! مجھ کو کوئی نہیں مار سکتا......... میری جان ایک انڈے میں بند ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ وہ انڈا کہاں رکھا ہے۔ میں کبھی کسی کو نہ بتاؤں گا......... اس کا پتا کوئی نہ پا سکے گا......... میں نے اس کو اپنے اسی کمرے کے تہہ خانے میں رکھا ہے...

.... میرا باغ اور میرا محل کیسا اچھا ہے مگر یہ پری کسی بات کو خاطر ہی میں نہیں لاتی......... میری جان لینا چاہتی ہے......... تہہ خانے کا دروازہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں .... وہ میرے پلنگ کے نیچے ہے......... کوئی اس انڈے کو جو سونے کے ایک ڈبے میں بند ہے لے لے تو میں اس کے بس میں ہو جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ کہے وہی کرنے لگتا ہوں۔ اگر کوئی زمین پر پٹک کر پھوڑ دے تو میں اسی وقت مر جاؤں۔ یہ انڈا اس پری کے فرشتوں کو بھی نہیں مل سکتا......... اب تین روز کے بعد اس کی ضد کا اسے مزا چکھاؤں گا۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کرتا رہا۔ ٹلّو میاں سمجھ گئے کہ دیو یہ سب کچھ سونے کی حالت میں بک رہا ہے۔ اس لئے ان کا ڈر جاتا رہا۔ پلنگ کے نیچے چھپے ہوئے تو تھے ہی، ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا تو سچ مچ ایک دروازہ پایا۔ یہ دیکھ کر تو بہت خوش ہوئے دل میں کہنے لگے۔ اچھا بچہ! اب بچ کر کہاں جائے گا۔ تیرے غرور، ظلم، اور طاقت کو نہ توڑا ہو تو ٹلّو میاں نام نہیں۔

(باقی آئندہ)

بچہ تھا میں اِک نادان — مجھ کو نہ تھی کچھ بھی پہچان
تم نے بڑھایا میرا مان — مجھ پہ رہیں صدقے قربان

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

وقت پہ کھانا تم نے دیا — وقت پہ کپڑا تم نے دیا
میرے لئے سب کام کیا — پھر بھی بدلہ کچھ نہ لیا

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

میرے لئے جھولا ڈالا — میرے لئے طوطا پالا
گورا تھا میں یا کالا — میرا بول رکھا بالا

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

دکھ میں مجھ کو اگر پایا بھول گئیں تم سکھ اپنا
مجھ کو پلائی تم نے دوا خوش دیکھا تو چین ملا

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

کہنے کو تو عورت ہو میرے لئے اک نعمت ہو
میرے حق میں جنت ہو تم پہ خدا کی رحمت ہو

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

محمود، خالد، راشد، حفیظ، سلامت اور نہ جانے کتنے اور سب ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے تصوّر کے یہاں جمع ہوئے تھے۔ دعوت بڑوں کی تھی، یہ سب خالی دُم چھلّے تھے۔ انھیں اچھّے اچھّے کپڑے پہنائے گئے، اور میزبان کے گھر لاکر چھوڑ دیا گیا کہ جو چاہو کرو مگر شرارت نہ کرو۔ تھوڑی دیر تک یہ کودتے پھاندتے رہے پھر چائے پلائی گئی۔ چائے کے بعد یہ پھر کھیلے کودے، مگر سردی کا زمانہ تھا، اندھیرا جلدی ہو گیا اور یہ سب اندر بلا لئے گئے یہاں بڑوں کا ساتھ تھا، بچّے جو کچھ کرتے وہ شرارت، جو کچھ کہتے وہ شور۔ آخر میں محمود سے نہ رہا گیا۔ اُس نے خالد سے کہا: ”آؤ بھی خالد، ایک ڈراما کریں“
خالد کو معلوم نہیں تھا کہ ڈراما کسے کہتے ہیں مگر خالی بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اُکتا گئی تھی۔ کرنے کا نام سُنتے ہی وہ جاگ اُٹھا۔

اُس نے کہا: ”آؤ، کریں“

محمود نے کہا: ”اچھا دیکھو، تم ہو بسکٹ والے۔ تم ایک ٹوکری سر پر لے کر بانگ لگاتے ہوئے آؤ“ کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ!“ میں اور راشد یہاں کھڑے ہوں گے۔ تم سامنے آؤ گے تو میں کہوں گا، ”اسے بھئی کس حساب سے دیتے ہو؟“ تم ٹوکری اُٹھا کر زمین پر رکھ دینا، بسکٹوں

پر سے کپڑا ہٹا لینا، اور مجھے بتانا :۔" یہ جی پیسے پیسے ہیں، یہ بڑے بڑے دو پیسے کے ہیں" اس کے بعد میں بسکٹوں کو دیکھ کر کہوں گا:" یہ پیسے پیسے والے چار دے دو" تم چار بسکٹ مجھے دینا اور پیسوں کے لیے ہاتھ بڑھانا۔ میں بسکٹ لے لوں گا اور تم کو ٹھینگا دکھا کر بھاگوں گا۔ تم میرے پیچھے دوڑنا۔ جب تم ذرا دور نکل جاؤ گے تو راشد تمھاری ٹوکری سے بسکٹ نکال کر گود میں بھر لیں گے اور چمپت ہو جائیں گے۔ تم تھوڑی دیر بعد آؤ گے تو دیکھو گے کہ آدھی ٹوکری غائب ہے۔ اور بڑی کھسیانی صورت بناؤ گے۔ اور ٹوکری سر پر رکھ کے پھر چل دو گے۔ آؤ کرو، بڑا مزا آئے گا۔"

خالد نے کچھ سوچ کر کہا:" واہ میں کھسیانی صورت کیوں بناؤں۔ تم آپ بناؤ۔"

خالد کے ابّا ماجد صاحب محمود کی باتیں کان لگائے سن رہے تھے۔ خالد نے بسکٹ والا بننے سے انکار کیا تو انھوں نے کہا:۔" نہیں خالد، اس میں بگڑنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈراما میں بے وقوف کا پارٹ کرنے سے کوئی بے وقوف نہیں بن جاتا۔ اگر تم نے بسکٹ اسی طرح بیچے جیسے بسکٹ والا بیچتا ہے، اور دھوکا کھانے کے بعد ایسی صورت بنائی جس سے معلوم ہو کہ تم نے سچ مچ دھوکا کھایا ہے اور بہت پچتا رہے ہو تو لوگ کہیں گے کہ تم بڑے ہوشیار ہو۔ بسکٹ والے کا پارٹ خوب کرتے ہو۔ تم کو تو اس پر خوش ہونا چاہیے۔ لیکن خالد کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ وہ چپ رہا۔ پھر محمود نے کہا:" اچھا تم اور راشد لڑکے بنو۔ میں بسکٹ والا بنوں گا۔ چچا آپ مجھے ایک ٹوکری دلوا دیجیے"

ماجد صاحب اٹھ کر تصوّر کے والد

خورشید صاحب کے پاس گئے جو کچھ دور بیٹھے تھے اور اُن کے کان میں کچھ کہا۔ خورشید صاحب مسکرا کر اُٹھے اور اندر چلے گئے۔

ماجد صاحب نے واپس آکر محمود سے کہا "اچھا، آؤ بھئی محمود، تم کو بسکٹ والے کی صورت بھی تو بنانا ہے۔"

محمود نے کہا "جی ہاں"۔ ماجد صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر بازو کے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ شاید خورشید صاحب کے سونے کا کمرہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد خورشید صاحب ایک میلی سی لنگی اور اتنا ہی میلا کرتا اور ٹوپی لے کر آئے۔ محمود نے اپنے اچھے اچھے کپڑے اُتار کر لنگی باندھی، کرتا پہنا اور ٹوپی سر پر رکھی۔ اتنے میں ایک نوکر چھوٹی سی ٹوکری لے کر آیا جس میں بسکٹ بھی رکھے تھے۔ ماجد صاحب نے کہا: "لو بھئی بسکٹ والے، اپنی ٹوکری سنبھالو۔ اچھا مگر یہ تو بتاؤ، اسے لے کر کیسے چلوگے؟" محمود نے ٹوکری اُٹھالی، ایک ٹانگ چھوٹی کرلی۔ بدن ایک طرف کو جھکایا گردن دوسری طرف کو اور سر پر ٹوکری رکھ کر بانگ لگائی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ!" ماجد صاحب ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا: "بھئی واہ، تم تو بڑے اُستاد نکلے۔ اچھا تم ذرا دیر ٹھہرو۔ میں ذرا جاکر اسٹیج ٹھیک کرآؤں۔"

ماجد صاحب نے جاکر مہمانوں سے کہا "حضرات، دو تین بچے آپ کو ایک چھوٹا سا ڈراما دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ذرا تکلیف کرکے ایک طرف کو بیٹھ جائیں جس میں اسٹیج کے لئے جگہ نکل آئے۔" مہمان خوشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ماجد صاحب نے اسٹیج کے لئے اس طرح جگہ نکالی:

مہمان سب ٹھیک سے بیٹھ گئے تو ماجد صاحب خالد اور راشد کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں محمود انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے تینوں کو سامنے کھڑا کرکے کہا: "دیکھو بھئی ہیں نے تمھارے ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار کردیا ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں۔ بائیں طرف جو دروازہ ہے۔ اس میں سے پہلے خالد اور راشد باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔ وہ دو چار قدم چلے ہوں گے جب پیچھے سے بسکٹ والے کی بانگ سُنائی دے گی۔ خالد تم راشد کو وہیں کھڑا کردینا اور خود ذرا آگے جاکر ٹھہر جانا۔ جب بسکٹ والا اندر آجائے اور خالد کے قریب پہنچے تب وہ پوچھیں گے کہ بھئی کس حساب سے دیتے ہو۔ تم راشد اس وقت ذرا بسکٹ والے کی طرف بڑھ آنا، مگر اس طرح کہ اس کے اور تماشائیوں کے درمیان نہ آجاؤ۔ اس کا ضرور خیال رکھنا۔ آگے تو تمھیں معلوم ہے نا؟"

تینوں نے کہا: "جی ہاں"۔

تماشائی سب بیٹھے انتظار کررہے تھے اتنے میں اسٹیج کی بائیں طرف سے اسکول کے دو لڑکے باتیں کرتے ہوئے آئے، اور اُن کے داخل ہوتے ہی ایک بانگ سُنائی دی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ"! ایک لڑکے نے دوسرے کی طرف آنکھ ماری اور کہا: "ارے یہی ہے وہ بسکٹ والا" یہ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھی کو وہیں روک دیا اور خود ذرا آگے بڑھ کر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں بسکٹ والا داخل ہوا اور اس نے ایک اور بانگ لگائی۔ پہلے لڑکے نے، جو اسٹیج کے بیچ میں کھڑا تھا، کہا: "ارے بسکٹ والے ذرا دکھاؤ تو کیسے بسکٹ ہیں"۔ بسکٹ والے

نے سر پر سے ٹوکری اُتارتے ہوئے کہا: "لو جی ایسے بسکٹ ہیں کہ شہر میں کہیں نہ ملیں گے خالص گھی کے ہیں۔ ایسے خستہ کہ کھاتے ہی مُنہ میں گھُل جائیں۔ یہ پیسے پیسے کے ہیں۔ یہ پیسے کے دو۔ یہ بڑے دو دو پیسے کے" بسکٹ والا لنگڑا کر چلتا تھا، کمر ٹیڑھی تھی، گردن ٹیڑھی، ٹوپی ٹیڑھی۔ اب بسکٹ کے دام بتاتے ہوئے اس نے تماشائیوں کی طرف مُنہ پھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ کانا بھی ہے اور بات کہنے کے بعد ایک طرف کو زبان بھی نکال دیتا ہے۔ تماشائیوں کو یہ سب دیکھ کر خوب مزا آیا۔ اور سب کے جی میں یہ بات آئی کہ اگر لڑکے اس کے ساتھ کوئی شرارت کریں تو بڑا اچھا ہو۔

پہلے لڑکے نے جس نے دام پوچھے تھے، اب کہا: "اچھا یہ پیسے پیسے والے چار دے دو۔ اس نے اپنی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا، جیسے کوئی پیسے نکالنے کے لئے ڈالتا ہے۔ بسکٹ والے نے اُس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ دے دئے۔ اور پیسے دینے کے لئے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ لڑکے نے اُس کے ہاتھ میں انگوٹھا چھلایا اور اسٹیج کے دوسرے دروازے سے بھاگ کر نکل گیا۔ بسکٹ والا اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑا۔ جب وہ دروازے سے نکل گیا تو دوسرے لڑکے نے جو چپ چاپ کھڑا تھا لپک کر ٹوکری سے بہت سے بسکٹ نکالے، کچھ جیبوں میں بھرے کچھ گود میں، اور پہلے دروازے سے نکل کر غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد بسکٹ والا دوسرے دروازے سے ہانپتا کانپتا پھر داخل ہوا۔ اُس کی صورت شکل اور چال پر ویسے بھی ہنسی آتی تھی، ٹوکری خالی دیکھ کر اس نے جو کھسیانی صورت بنائی وہ تو بس غضب کی تھی۔ سارے تماشائی ہنسی سے لوٹ گئے۔ وہ تھوڑی دیر

آنکھیں بلکہ اپنی ایک آنکھ میچا تا رہا، پھر ٹوکری اُٹھائی، اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پھر ایک بانگ لگائی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ!" یہ بانگ بھی بڑی سبق آموز تھی کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بسکٹ والے کی عقل حیران اور ٹوکری خالی ہے۔

ماجد صاحب، محمود، خالد اور راشد کو لے کر اسٹیج پر آئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ماجد صاحب نے کہا: "حضرات! آپ یہ ذرا سا تماشا دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارے بچّوں میں ڈراما کرنے کی کتنی قدرتی استعداد ہے۔ محمود بسکٹ والے کے شوق کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا ہے کہ ان بچّوں کو ڈرامے کا ٖن سکھاؤں۔ آپ سے اُمید ہے کہ آپ اُن کی ہمّت بڑھاتے رہیں گے اور جب کبھی یہ کوئی ڈراما تیار کریں تو اُسے دیکھیں گے۔ محمود میں تمھیں سب کی طرف سے مُبارک باد دیتا ہوں۔ اب اگر تُم خود نہ اُکتا گئے تو تمھیں ڈراما کرنے کے بہت سے موقعے ملیں گے اور لوگ تُمھاری نقلوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آئیں گے۔

محمود پھر لنگڑا اور ٹیڑھا اور کانا ہو گیا اُس نے ٹوکری سر پر رکھی اور بانگ لگائی۔ اس کے بعد وہ دروازے سے نکل کر بھاگ گیا اور لوگوں نے پھر خوب تالیاں بجائیں۔

ہمارا باغ

محمد احمد عمر ۱۲ سال

باغ میں آم کے، جامن کے، نارنگی کے، سنترے کے پیڑ تھے۔ جامن کے پیڑ چاروں طرف باغ کے کونوں پر لگے ہوئے تھے۔ آم کے تختے الگ، نارنگی کے تختے الگ، سنترے کے تختے الگ، ایک طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ گلاب کے پھول کی کیاری۔ گلابی پتّیوں کا گلاب، زرد پتّیوں کا گلاب۔ چنبیلی کی بیلیں درختوں پر لپٹی ہوئی تھیں۔ پھول تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ باغ میں ایسی بہار تھی کہ جی چاہتا تھا پھرتے ہی رہیں۔ ہم اور الیاس دونوں پھر رہے تھے۔ الیاس نے کہا "کیسا اچھا باغ ہے۔" ہم نے کہا "ہاں! بڑا اچھا باغ ہے۔" اتنے میں بادل آ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی پپیہا بولا۔ کوئل بولی۔ مور بولا۔ بگلے اُڑنے لگے۔ بادلوں کے کالے کالے دھوئیں میں سفید سفید بگلے۔ واہ!

چھم چھم مینہہ برسنے لگا۔ الیاس نے کہا "بھاگو" ہم نے کہا "بھاگو" ہمارا گھر دُور تھا۔ الیاس کا گھر پاس تھا۔ دونوں بھاگے۔ الیاس اپنے گھر میں گھُس گئے ہم بھی الیاس کے ساتھ۔

دونوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے دونوں نے کپڑے اُتارے۔ نیکر پہن لئے الیاس کی اُمّی نے گرم گرم کچوریاں کھلائیں

مزا آگیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے اور تعلیمی تاش کھیلنے لگے۔ کھیل میں اتنی دیر ہوگئی کہ ہم دونوں کے کپڑے سوکھ گئے۔

ہم نے کہا" بھائی الیاس شام کو تم ہمارے گھر آنا۔ ہم تمھیں گرم گرم کباب کھلائیں گے۔ چٹ پٹے اور سلونے۔

آج ہماری چھٹی کا دن تھا۔

FIROZE
نئے سال کی خوشی
اُچھلو پھاندو دوڑ لگاؤ
کھیلو کودو مزے اڑاؤ
میٹھے میٹھے گیت سنا کر
سارے جہاں کو مست بنا کر
سال گرہ کی خوشی مناؤ
باغ جہاں کی رنگت بدلی
سال نے دیکھو کروٹ بدلی
موسم نے بھی صورت بدلی
نقشہ تم بھی نیا جماؤ
سال گرہ کی خوشی مناؤ
عزم کو اپنے دگنا کردو
دنیا کو پھر جوش سے بھردو
ناممکن کو بھی ممکن کردو
آگے اپنا قدم بڑھاؤ
سال گرہ کی خوشی مناؤ
محمد حسین محسن حمایت نگر
منہ کی کھائی
حافظ جی نے روٹی کھائی
راہ میں پڑتی تھی اک کھائی
کھائی دی ان کو نہ دکھائی
پیٹ دکھا کر بولے حضرت
خوب ہی کھائی کہتے کہتے
بچے اس پر ہنس کر بولے
نور دعا اب مانگو تم یہ
سیر کی پھر کچھ دل میں سمائی
حافظ جی کی شامت آئی
بولا اک "حافظ جی کھائی"
ہاں ہاں آج تو خوب ہی کھائی
کھائی میں اک ٹھنی کھائی
حافظ جی نے منہ کی کھائی
حق رکھے سب کی بینائی
نورالدین احمد نور بدایونی

سید ابو طاہر صاحب بی، اس، سی، ایل، ٹی

رات کو جب سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے تو بھائی عرشی نے ایک کہانی کہنی شروع کی جسے میں انھی کی زبانی بیان کرتا ہوں۔

آنکھوں دیکھی کہتے ہیں۔ کانوں سنی نہیں کہتے، ثواب سننے والے کی گردن پر اور عذاب نہ سننے والے کے سر پر۔ کہتے ہیں ہمیشہ سے ایک بادشاہ چلا آتا ہے۔ جیسے ہمارا تمھارا خدا بادشاہ کہ نام اس کا دماغ، کام اس کا حکومت اور ملک اس کا جسم تھا۔ یہ بادشاہ بیدار مغزی اور ہوشیاری میں اپنا جواب نہ رکھتا، آج کے کاموں کے سوا اس کو کوی دوسرا شوق نہ تھا۔ جب سے حکومت کی باگ سنبھالی کبھی رات کو پلک سے پلک نہ لگائی۔

دنیا کے بڑے بڑے رشی، منی اور صوفیوں نے اسے تسخیر کرنے کی دھن میں عمریں تیاگ دیں، لیکن وہ ان کے قبضہ سے ایسے نکل جاتا۔ جیسے مٹھی میں سے پانی۔

اس راجہ کی پانچ سندر راج کماریاں تھیں۔ جو اپنے پتا کے اشاروں پر چلنا ہی اپنا دھرم اور ایمان سمجھتیں۔ راجہ بھی انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا اور ان کے مشورے بغیر ایک قدم آگے نہ بڑھاتا۔ تمام راج کماریاں الگ الگ صوبوں پر راج شاستر کے مطابق حکومت کرتیں اور خود راجہ ایک ہوائی قلعہ میں بیٹھا حکم اور احکام جاری کرتا۔

اس اتفاق اور محبت کی وجہ سے راج کا سارا کام اس خوبی سے چلتا کہ دوست خوشحال اور دشمن پائمال تھے۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔ راجہ بھی پرجا کے سکھ میں سکھی تھے مگر نہ جانے کیا راز تھا

کہ وہ اپنے قلعہ سے باہر قدم رکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ سب اس کی صورت دیکھنے کو ترستے لیکن وہ موجود ہو کر بھی نظر نہ آتا۔ راج کماریاں اس بھید کو اچھی طرح جانتی تھیں کہ جس دن راجہ نے قلعہ کی دہلیز پھلانگی اسی دن سارے راج پر تباہی کے بادل چھا جائیں گے۔ اس لئے وہ راج کے سوا کسی دوسری چیز کی طرف بھولے سے بھی خیال نہ لے جاتیں۔

ایک روز خدا کا کرنا یوں ہوا کہ سب سے بڑی لڑکی کان کماری کے دربار میں ایک بوڑھا گویا پھرتا پھراتا آنکلا۔ وہ کچھ اس طرح گاتا کہ کوئی اس کو ایک بار سن پاتا تو دل سے صبر و قرار ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے۔ چنانچہ راجہ کی بیٹی کی یہ حالت ہوگئی کہ دن رات گویا گاتا رہتا اور وہ اسے سننے میں محو رہتی۔ ادھر اس کی آواز تھوڑی دیر کے لئے بھی رکتی اور اُدھر وہ بے تاب ہو جاتی جب کئی روز اسی طرح بیت گئے تو گویئے نے راج کماری سے رخصت طلب کی۔ اتنا سُننا تھا کہ وہ فی الفور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھے گویئے نے جب یہ حال دیکھا کہ راج کماری راگ پر اپنا تن من نچھاور کر چکی ہے تو اس نے راج کماری کے کان میں جھک کر کہا "سن اے راج کماری! راج کماردرن تیرے حسن و جمال کا شہرا سُن کر بوڑھے گویئے کا روپ دھار کر آیا تھا۔ اس نے جیسا سنا تھا ویسا ہی تجھ کو پایا۔ محبت کے راگ رنگ لائے۔"
......لے۔ اب میں جاتا ہوں مگر تو اپنے پتا جی سے اپنے من کا بھید ظاہر کر کے سوئمبر کی سواگت کرنا۔ پھر میرے راگ تیرے دل کی دھڑکن سے سنسار کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے اس دنیا کو جنت بنا دیں گے"
راج کماری نے یہ سب باتیں بڑے غور سے سنیں۔ لیکن جب اس نے آنکھ کھولی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کیونکہ راج کماردرن اپنے اصلی روپ میں واپس آکر غائب ہو چکا تھا۔
اب راج کماری کو کسی کروٹ چین نہ تھا بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی۔ اور آہ وزاری کرتی تھی۔ دن رات درن کا نام تھا اور وہ تھی۔ لاکھ سب نے سمجھایا۔ دوائیں اور دعائیں کیں لیکن یہ جادو اس کے سر سے نہ اترنا تھا نہ اترا۔ یہاں تک حالت پہنچ گئی کہ راج کے کاروبار میں ابتری پھیل گئی اور ایک صوبہ کی خرابی تمام ملک کے انتظام پر اثر ڈالنے لگی۔ چنانچہ مخبروں نے راجہ کو سارا کچا چٹھا جا سنایا۔ سنتے ہی اس کے ہوش

حواس جاتے رہے۔ غصّے میں آگ بھبوکا ہو گیا
ہر پر پانی کے تڑاڑے ڈالے گئے تو اس کا
دماغ ٹھکانے آیا۔ تھوڑی دیر تک سر نیچا کئے
بیٹھا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وزیر عقل کو طلب
کیا۔ اس کی عقل بھی ماری گئی۔ مجبور ہو کر اپنے
استاد حکیم تقدیر سے عالم خیال میں جا کر ملاقات
کی اور سارا ماجرا رو رو کر بیان کیا۔ حکیم تقدیر
نے بموجب سننے اس کے ایک آہ کھینچی اور
پھر اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر یوں گویا ہوا
کہ "اے دنیا کے سب سے زبردست راجہ!
مصیبت کے وقت ہوش و حواس برقرار رکھنا
ہی سب سے بڑی جواں مردی ہے۔ بیشک
تیرا ستارہ اقبال اس وقت نحوست کے طالع
میں سے گزر رہا ہے۔ تیری حکومت کا تختہ
الٹ رہا ہے کیونکہ جھاڑ میں سے کوئی تِنکا
نکل جائے تو بندھن ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اب
مجھے تو اپنے دل کا حال بتا کہ آیا تو بے تاب
رہنا چاہتا ہے یا راجہ۔"

یہ سن کر راجہ نے جواب دیا کہ "اے پیروں
کے پیر اور اے مُرشِدوں کے مُرشِد!
اس وقت تو دونوں چیزیں میرے ہاتھوں
سے جا رہی ہیں۔ آج کان کماری کا سنجوگ
ورن سے کر دیا۔ تو کل کو چاروں راج کماریاں
بھی بر مانگنے لگیں گی اور یہ راج اندھا گونگا
بہرا اور اپاہج ہو کر رہ جائے گا۔ اور اگر
میں ان سب کو قید کئے دیتا ہوں تو بھی یہی
مشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے اے حکیم مطلق!
تو ان کے دلوں سے محبت نکال کر پھینک دے
اور فرض کو اس کی جگہ داخل کر دے۔ بس
یہ ہے میری مصیبت کا علاج اور اے استاد اس
وقت کچھ ایسی آن پڑی ہے کہ اگر تو میری بات
پوری نہیں کرتا تو میں بھی محبت کے دریا میں ڈوب
کر جان دے دوں گا۔" یہ بات راجہ نے کچھ اس
طرح گڑگڑا کر کہی کہ حکیم کا دل پسیج گیا۔ اور اس
کے منہ سے بن سوچے نکل گیا "جا راجہ ایسا ہی
ہوگا۔" پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگا "ہائے یہ میں
کیا کہہ گیا۔ خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ مگر اے راجہ ٹھیر!
راج کماریوں کی محبت تو چھین ہی لی اب اپنی
محبت کہاں لے چلا وہ بھی دے جا۔ میں اس
میں اپنی طرف سے کچھ اور ملا کر اسے راج
رانی دل کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اب تو جانے
اور تیری بیوی۔" اتنا کہا اور آگے بڑھ کر غائب
ہی ہونا چاہتا تھا کہ راجہ نے لپک کر اس کا
دامن پکڑ لیا اور دکھی ہو کر کہنے لگا "راجہ کو
بھکاری بنا کر مفت کی سزا تو دے دی۔ اور
راج کمار ورن کو میرا تماشا دیکھنے کے لئے

یونہی چھوڑ دیا۔ ابھی یہ الفاظ پُورے بھی نہ ہوئے تھے کہ آنکھ جھپکتے میں چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیارا چھا گیا۔ زمین اَور آسمان میں زلزلہ آگیا اَور ہر طرف سے "ہیہات" "ہیہات" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ راجہ کی جو حالت ہوئی، اس کے لئے الفاظ نہیں کہ بیان کی جا سکے۔ بارے اس شور و غوغا کے تھم جانے کے بعد ایک مہیب سی آواز سنائی دی جس نے راجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لے راجہ تیری آخری درخواست بھی پوری کی گئی محبت کی سزا بھی دے دی۔ دونوں کو ایک دُوسرے کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا۔ ورن کو سوز اَور بے تابی دے کر کان کماری کے منہ پر تالے لگا دئے گئے ہیں تاکہ قیامت تک ایک فریاد کرتا رہے اَور دُوسرا اُسے خاموشی سے سنتا رہے۔ جا۔ اب تو تیرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی"۔

کہتے ہیں جب سے راج کمار ورن کے تلوؤں کے نیچے آگ سلگ رہی ہے۔ اسی لئے وہ ایک جگہ نہیں ٹھیر سکتا۔ اب اس کی چال قیامت ہو گئی ہے جدھر سے نکل جاتا درخت انگڑائیاں لینے لگتے۔ کلیاں چٹکنے لگتیں، چشموں کی چل پریاں اٹھکیلیاں کرتیں ذرّے ذرّے پر راگ کی مستی چھا جاتی ہنستا تو بہار آتی، روتا تو جل تھل بھر جاتے غصہ ہوتا تو آگ برستی، آہ کرتا تو شعلے بلند ہوتے۔ اَور سو جاتا تو سب کا دم نکلنے لگتا۔ وہ دن رات کان کماری کے قلعہ کے چکر لگاتا رہتا۔ اَور پردہ کے پاس آکر محبت کے راگ گایا کرتا ہے۔ اَور کان کماری سیپ کے حوض میں پانی کے بلبلوں کی پیٹھ پر ستار ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوئی ہے۔ باہر سے راجکمار گاتا ہے۔ اَور اندر سے ستار کے تار خود بخود بجنے لگتے ہیں۔

جناب شجاعت سندیلوی

ایک تھا بنیا دولت والا ۔۔۔ کنجوسی میں سب سے نرالا
آگے پیچھے کوئی نہیں تھا ۔۔۔ یہ بنیا تنہا رہتا تھا
جھوٹ، فریب اور مکاری سے ۔۔۔ دھنی ہوا تھا عیاری سے
ساری خلقت دکھیا اس سے ۔۔۔ دیتا سب کو سودی قرضے
دھن ہی میں دم اٹکا رہتا ۔۔۔ دھن کا ہر دم کھٹکا رہتا

(۲)

اِک دن دل میں وہم سمایا ۔۔۔ سمجھا گھر میں چور ہے آیا
کانپا، لرزا، اور چلایا ۔۔۔ چو چو چو چو چور ہے آیا
ہاتھ میں لے کر اپنے ڈنڈے ۔۔۔ آئے محلے والے دوڑے
پوچھا اس سے چور کہاں ہے؟ ۔۔۔ چوری کا کیوں تم کو گماں ہے
بولا وہ تھا دھڑکا مجھ کو ۔۔۔ چوری کا تھا کھٹکا مجھ کو
جی میں ناخوش ہوگئے سارے ۔۔۔ لوٹ گئے وہ سب بے چارے

(۳)

اک دن پھر وہ یوں چلاّیا — دوڑو لوگو! چور ہے آیا
اس دن پھر کچھ آدمی آئے — چور نہ پاکر سب گرمائے
بڈّھے سے کہا سب نے مل کر — تم کو ہنسی یہ سوجھی کیوں کر
نیند میں حیراں کرتے ہو تم — سب کو پریشاں کرتے ہو تم
چور سے ہو جب اتنا ڈرتے — نوکر کیوں نہیں تم رکھ لیتے
ہو گئے واپس یہ کہہ کہہ کر — چل دئے سب اپنے اپنے گھر

(۴)

اک دن سچ مچ چور جو آیا — بڈّھے نے پھر شور مچایا
اس دن لیکن کوئی نہ آیا — سمجھے یونہی ہے چلّایا
چور نے اس کو مارا پہلے — چمپت ہو گیا پھر دھن لے کے

جھوٹ کا یہ انجام ہے بھائی
دولت کھوئی، جان گنوائی

اہرام سقارہ کی سیر

از جناب مولوی محمد سعد الدین صاحب انصاری ۔ فاضل جامعہ ازہر (مصر)

کل ۸ مارچ کو طلبہ ازہر کی ایک جماعت اہرام سقارہ کی سیر کو جانے والی تھی ۔ اپنے ازہری دمصری دوست محمود الدیب کے کہنے سے میں بھی اس جماعت کے ساتھ ہولیا یوں بھی عرصے سے مجھے اس سیر کا شوق تھا ۔ لیکن اچھے ساتھیوں اور مناسب موقع کی تلاش تھی۔

یہ جماعت ۷ ½ بجے صبح کو وزارت تعلیم کی دو نہایت عمدہ موٹر لاریوں پر روانہ ہوئی ۔ طلبا کی تعداد ساٹھ تھی ۔ سقارہ قاہرہ سے کوئی ۲۰ میل کے قریب ہوگا ۔ شہر سے نکلنے کے بعد سقارہ تک راستہ نہایت پُر فضا تھا ۔ نیل کی ایک نہر کے کنارے کنارے نہایت اچھی سڑک پر موٹر چل رہی تھی ۔ چاروں طرف جہاں تک نظر جاتی تھی ہرے بھرے ربیع کے کھیت دلوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے ۔ منظر کی خوبی سے تمام طلبا پر خوشی کی ایک کیفیت طاری تھی ۔ ایک طالب علم نے نہایت شیریں آواز میں عربی کی غزلیں گانی شروع کیں ۔ اکثر طالب علم اسے بہت شوق سے سُن رہے تھے ۔ بیچ بیچ میں بعض ہنس مکھ طالب علم اپنے ظریفانہ فقروں سے اس نغمے کو موقوف کر دیتے اور اس کی جگہ ہنسی اور قہقہے شروع ہو جاتے ۔ اسی طرح مختلف دلچسپیوں کے ساتھ دونوں موٹریں کوئی ایک گھنٹے کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گئیں۔

موٹروں سے اُتر کر ہم سب ایک عمارت کی طرف آئے جس کے اندر فراعنہ مصر کے ایک مشہور بادشاہ کا مجسمہ رکھا تھا ۔ یہ مجسمہ ایک خاص نرم پتھر (جیری) سے (جو مصر میں بکثرت ہے) نہایت خوب صورتی سے بنا ہوا ہے ۔ جسم نہایت سڈول اور ورزشی ہے ۔ پٹھے رگیں اور ایک ایک عضو فطرت کے موافق بنا ہوا ہے ۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی ایسے ماہرین فن موجود تھے ۔ اس جماعت کے ساتھ دو تین اُستاد بھی تھے تاریخ کے ایک لائق اُستاد عبد الفتاح سرنجادی اس جماعت کے رئیس تھے ۔ موصوف نے اس مجسمے کی تاریخی طور پر نہایت عمدہ تشریح کی ۔ بتایا کہ یہ وہ بادشاہ ہے جس نے پرانے زمانے میں اس جگہ ایک نہایت عمدہ شہر منف کے نام سے بسایا تھا ۔ مورخوں کے نزدیک یہ شہر اپنے زمانے میں بہت آباد اور بارونق

تھا۔ لیکن اِس عظیم الشان شہر کے آثار تقریباً ناپید ہیں یہ شہر دریائے نیل اور صحرائے نوبیا کے بیچ میں ذرا اونچائی میں تھا اِس لئے اونچائی میں آباد کیا گیا تھا کہ دریائے نیل سے پوری طرح سیراب ہوسکے۔ افسوس ہے کہ جس نیل نے اِس شہر کو سرسبز اور شاداب بنایا اسی نے اپنی ایک ظالمانہ ادا سے راستہ بدل کر اس شہر کو برباد بھی کر دیا۔ اس کے بعد نیل کے سالانہ سیلابوں نے اپنی بے اندازہ ریت سے اس شہر کو ایسا نیست و نابود کیا کہ اب مطلق کوئی نشان اُس کا باقی نہیں ہے۔

اس شہر کے ایک طرف تو نیل ہے اور دوسری طرف ریگستان کا کنارہ ہے۔ یہ کنارہ شہر کی نسبت بلند ہے اور جا بجا ریت کے تودے پھیلے ہوئے ہیں۔ مینا کا مجسمہ اور بعض دوسرے معمولی آثار مجسموں کی شکل میں دیکھنے کے بعد ہم سب لوگ موٹر پر سوار ہوئے اور کوئی میل دو میل کی مسافت طے کرکے اس ریگستان کے کنارے پہنچے۔ یہاں قدیم مصریوں نے ایک شہر "مدینۃ الاموات" کے نام سے بنایا تھا۔ مصری اپنے اعتقاد کے موافق اپنے مُردوں کو ممی بنا کر بڑے اہتمام اور بڑی حفاظت سے دفن کرتے تھے۔ چنانچہ آبادی کے قریب ہی یہ مدینۃ الاموات" یا قبرستان بنایا۔ یہ قبرستان بھی ناپید تھا لیکن یورپ کے لوگوں نے اپنی اَن تھک کوششوں سے بجائے کیا کیا معلوم کرلیا ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی "مریت" نے (جو مصری حکومت سے پاشا کا خطاب پاکر مریت پاشا کے نام سے مشہور رہے) خدیو اسمٰعیل کے زمانے میں اپنی مسلسل کوششوں سے اس شہر کو معلوم کیا۔ اس شہر میں رفتہ رفتہ بہت سے مقبرے ملے ہیں۔ یہ مقبرے جن کو مصری اپنی اصطلاح میں اہرام کہتے ہیں عجیب و غریب چیز ہیں۔ اور زمین کے اندر بہت نیچے بڑے بڑے تہخانوں کی شکل میں بنے ہوئے ہیں۔

یہاں پہنچ کر پہلے ہم سب ایک اہرام کے اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑی سُرنگ کے ذریعے جو بتدریج نشیب کے ساتھ زمین کے اندر گئی ہے۔ ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک بہت بڑا تہہ خانہ نظر آیا۔ سُرنگ اور اِس تمام تہہ خانے میں مصری حکومت نے سیاحوں کے لئے جا بجا بجلی کا انتظام کر دیا ہے۔ اِس کی وجہ سے اس کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ یہ تہہ خانہ بہت وسیع ہے........ اس میں بڑے بڑے کمروں کی کئی قطاریں ہیں۔ جن کے درمیان غلام گردش کی طرح راستے گذرتے ہیں۔ انھی کمروں کے اندر مصری تابوت پتھر کے بنے ہوئے رکھے ہیں۔ مصری لوگ ان میں اپنے ممی کئے ہوئے مُردوں کو بڑی حفاظت سے رکھ دیتے تھے۔ ممیاں تو سب نکل کر مشہور مشہور عجائب خانوں میں پہنچ گئی ہیں۔ یہاں بس پتھر کے بڑے بڑے تابوت باقی رہ گئے ہیں۔ یہ تابوت مصر کے مشہور پتھر گرانائٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ اِن تابوتوں کا طول اندازاً ۵، ۶ گز اور عرض ۲، ۳ گز اور بلندی ۳، ۴ گز

ہو گی ۔ تمام تابوت ایک طول و عرض کے نہیں ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی طرح کے ہیں۔ تابوت کے گرد کمرے کی دیواروں پر جو اکثر چیری پتھر کی ہیں۔ قدیم مصری زندگی کی تصویریں نہایت خوب صورتی سے اُبھرے ہوئے نقوش کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ تصویریں بہت عجیب و غریب ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مصر کی پرانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو تصویروں کے ذریعے نہ دکھایا گیا ہو۔ کھیتی باڑی، صنعت و حرفت، گھریلو زندگی۔ سیر و شکار۔ کشتی بانی۔ ناچ رنگ۔ کھانا پینا۔ پڑھنا لکھنا، فوج پولیس، لڑائی۔ حکومت کے انتظام اور مذہبی رسمیں غرض ہر چیز نہایت خوبی سے تصویروں کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ یہ تابوت اکثر بادشاہوں اور بڑے بڑے امیروں کے ہیں۔ جس کمرے میں جس کو دفن کرتے تھے اُس کی دیواروں پر اُسی کی زندگی کے حالات تصویروں کے ذریعے پیش کرتے تھے۔ یہ تصویریں درحقیقت مصری قوم کی کتابیں ہیں، بلکہ میرے خیال میں کتابوں سے بڑھ کر۔ اس لئے کہ ایک نظر میں ہر عالم و جاہل ان تصویروں کے ذریعے ہزاروں برس کے واقعات بڑی آسانی سے جان لیتا ہے۔ تصویریں اس کمال و باریکی کے ساتھ بنی ہیں۔ کہ عقل دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ شکل و صورت کی خوبی کے ساتھ خوشی، رنج اور مذہبی خشوع و خضوع کے فطری جذبات تک کی ترجمانی کی گئی ہے جو تصویریں رنگین ہیں اُن کے رنگ بھی فطرت سے قریب ہیں۔ یہ کمال اب تک فنِ مصوری کو پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ تصویریں سو دو سو یا ہزار دو ہزار برس پہلے کی نہیں بلکہ مؤرخوں اور کھوج لگانے والوں کے نزدیک ان کا سلسلہ ۸، ۱۰ ہزار برس پہلے تک پہنچتا ہے۔

اسی قسم کے کوئی ۶، ۷ اہراموں کی ہم سب نے سیر کی۔ ایک دو کے سوا باقی میں بجلی کا انتظام نہیں ہے ہمارے ساتھ موم کی شمعیں تھیں۔ ان کی مدد سے اندر کی چیزیں دیکھیں۔ بعض تہہ خانے ایسے تنگ و تاریک تھے کہ اُن کے اندر دم گھٹتا تھا۔ مصریوں کا یہ مشہور اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد ہر شخص کی روح قیامت کے دن اُسی کے جسم کو ڈھونڈے گی۔ اگر جسم اُسے نہ ملا تو وہ روح بہت پریشان ہوگی۔ اس لئے مصری اپنے مُردوں کی حفاظت میں ایسا محفوظ اور مضبوط انتظام کرتے تھے کہ کسی انسان کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے اور نہ ہزاروں برس گذرنے پر بھی ان پر بوسیدگی کا کوئی اثر ہو۔ لیکن انسان بھی کیا بلا ہے۔ ایک طرف اس نے نہ معلوم کن کن طریقوں سے اپنے مجسموں کو محفوظ کیا اور دوسری طرف اسی کی آنے والی نسلوں نے ان چھپے ہوئے خزانوں کو کس کس طریقے سے ڈھونڈھ نکالا۔

سیر کا سلسلہ صبح ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک رہا۔ بیچ میں کوئی دو بجے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے ہم سب ایک خاص عمارت میں جمع ہوئے۔ یہ مرحوم پاشا کی یادگار

سحر مصر کا ایک مشہور فرعون

مرمر کی طرح کے پتھر کے ایک بادشاہ کے
سر مختلف رخوں سے

مویشی اور پالتو جانوروں کا ایک منظر

بکری کی شکل کا ایک آرائشی سامان

چند پیامی

عظیم قادری حیدرآبادی

وسیم جہاں بیگم قزلباش آگرہ

محمد اسد پٹنہ

محمد احمد کلکتہ

میں مصری حکومت نے سیاحوں کے آرام و راحت اور کھانے پینے کے لئے بنائی ہے۔ اس عمارت میں ایک بڑا ہال ہے اور چند چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ہال میں کھانے کے لئے بڑی بڑی میزیں بچھی ہوئی ہیں۔ ان کے چاروں طرف بیٹھنے کے لئے بنچیں ہیں۔ کھانے کا انتظام ہر ایک نے اپنا الگ الگ کیا تھا۔ لیکن یہاں سب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں اپنے ہم مذاق تقسیم ہوگئے، اور ہر ٹولی نے اپنا کھانا مزے سے کھایا پیا۔

طالب علم اس سیر سے اتنے خوش تھے کہ کھانے کے بعد اپنے اُستاذ کا شکریہ اور اس تاریخی سیر کے دیکھنے سے ان پر جو اثر ہوا تھا اُس کا پرجوش تقریروں اور قصیدوں کے ذریعے اظہار شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کی یہ بیانی خصوصیت اب تک باقی ہے۔ نوجوان اکثر اس برجستگی سے تقریریں کرتے یا نظمیں پڑھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اپنے ہاں تو بہم صرا پر بھی مشکل سے کوئی نوجوان جلسوں کے موقع پر بولنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تقریروں میں زیادہ تر مصر کی تاریخی عظمت اور وطنی جذبات کا اظہار رہا۔ بعض طلبا نے وطنیت کی تنگ ذہنیت سے اختلاف بھی کیا۔ لیکن یہ اکثر غیر مصری تھے۔ استاد نے فرمایا کہ ہمارے لئے ان آثار میں مذہبی زندگی کے بھی موثر سبق ہیں۔ قدیم مصریوں میں کوئی باقاعدہ آسمانی شریعت نہ تھی پھر بھی دین داری اور آخرت کا اعتقاد انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔

میں تقریر تو کیا کرتا لیکن حضرت استاذ اور بعض طلبا سے دورانِ گفتگو میں بتایا کہ مصر کی طرح ہندوستان کے قدیم آثار بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ مصر کے برابر وہ پرانے تو غالباً نہیں ہیں لیکن نقاشی اور فن مصوری کے کمال میں وہ مصری آثار سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے اُن سے ایلورا اور اجنٹا کے غاروں کا کچھ حال بیان کیا جن کو میں دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ بعضوں نے یہ سُن کر ہندوستان کی سیاحت کا شوق بھی ظاہر کیا۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس دُنیا میں جتنی ترقیاں ہوئی ہیں وہ کسی ایک قوم کا حصہ نہیں، بلکہ ہر قوم نے اپنی بساط کے موافق دُنیا کی ترقی میں حصہ لیا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو آگے پیچھے ایک دوسری قوم سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ باقی اس کا حقیقی طور پر پتہ چلانا کہ کس قوم کو معنی کی فضیلت سب سے پہلے حاصل ہوئی ہے، اوّلاً اب تک قیاس اور گمان سے آگے نہیں بڑھا۔ دوسرے اس قسم کے خیالات کا اظہار درحقیقت انسانوں میں تنگ وطنیت کے جذبات کو پیدا کرتا ہے جو دنیا کو ترقی دینے کے بجائے اس کو تباہی کی طرف زیادہ بلاتے ہیں۔

۵ بجے یہ پُرلطف سیر ختم ہوگئی اور ہم سب پھر موٹروں میں بیٹھ کر راستے کے پرفضا منظروں سے لطف اُٹھاتے ہوئے واپس آگئے۔ خدا کرے ایسی سیر پھر نصیب ہو۔

کارتوس کے خول جمع کرنا

محمد اختر یوسف زئی۔ آگرہ

تم میں سے زیادہ تر ایسے ہوں گے جنھیں کچھ اور نہیں تو کم ازکم ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تو ضرور ہوگا۔ اسی طرح بہنوں کا مشغلہ سکّے اور پتیاں وغیرہ جمع کرنا ہوگا۔ مشغلے کی وبا اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اپنے روزمرّہ کے ضروری کام کے علاوہ اگر کوئی بھی اور شغل اختیار کرلیا جائے تو وہی مشغلہ یعنی ہوبی کہلانے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ امریکہ کے ایک بڈھے سپاہی کو رنگ برنگ کے بٹن جمع کرنے کی دھن تھی۔ ابھی حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ نیوجرسی کے ایک قصبہ "پلین فیلڈ" میں ایک صاحب ہیں جن کا نام ہے "سی اسٹینلی جیکب" (تم آسانی کے لئے انھیں یعقوب کہہ سکتے ہو۔) تو ان مسٹر یعقوب کو بندوق کی گولیوں اور چھرّوں کے خانے (کارتوس نہیں) اور قدیم عہد کی بارود دانیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔

آج سے کوئی ۳۰ سال پہلے انھیں اپنی مرحومہ دادی کی طرف سے وراثت میں بارود رکھنے کی ایک نلی (گائے کے سینگ جیسی) ملی تھی۔ یہ نلی اس جنگ میں کام میں لائی گئی تھی جب کہ امریکہ کے باشندوں نے لڑجھگڑ کر اپنے کو برطانیہ عظمیٰ سے علیحدہ کرلیا تھا اور خود کو آزاد کہنے لگے تھے۔ اس جنگ کو امریکہ کی "انقلابی جنگ" کہتے ہیں۔ ہاں تو یہی نلی مسٹر یعقوب کے اس عجیب وغریب مشغلے کی ابتدا تھی۔

اس تیس سال کے عرصے میں انھوں نے ادھر ادھر سے مانگ کر یا خرید کر طرح طرح کی بارود رکھنے کی نلیاں اور بوتلیں۔ صراحی دار شیشیاں۔ پیپے۔ کنستر اکٹھا کرلئے ہیں۔ ان کا یہ عجائب خانہ ان کے مکان کی دوسری منزل پر واقع ہے اور اس وقت اس میں بارہ سو طرح طرح کی مختلف چیزیں موجود ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اپنے طرز کا یہ واحد اور بے مثل مجموعہ ہے۔ اور ماہرین فن کے نزدیک اس کی قیمت ۱۰۰۰۰ ڈالر سے کسی حالت میں بھی کم نہیں۔ زیادہ چاہے جتنی ہو۔

ان میں بہت سی چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور آج تک اپنے پچھلے زمانے کی یاد دلا رہی ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے میں نامور جہاز "میگلین" کے نائب کپتان

جوین سباسٹین کی صُراحی دار بارُود رکھنے کی شیشی ہے اوُر مشہوُر سمندری ڈاکو سر ہنری مارگن کی سینگ نما نلی بھی ہے اور افریقہ کے وحشیوں، امریکہ کے ریڈ انڈین اوُر شاہانِ فارس کی بارُود دانیاں بھی۔ بہت سی شیشیاں اوُر نلیاں ایسی بھی ہیں جو ہرن کے سینگ، دوسرے بہت سے جانوروں کی بڑی بڑی ہڈیوں، کچھوے کی سخت کھال سے بنائی گئی ہیں۔ ایران اوُر ترکی کی

بارُود اوُر چھرّے اپنا کام بھی کرتے جاتے ہیں۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ان یعقوب صاحب نے اپنے اس مشغلے کی خاطر تھوڑا بہت بلکہ بہت کچھ روپیہ صرف کیا ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کو بہت سی مشکلات اوُر دشواریوں سے سابقہ پڑا۔ اس کا اُنھوں نے ہمت اوُر استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک بڈھے کے پاس بارُود رکھنے کی ایک نلی تھی میں نے

ہاتھی دانت اور پیتل کی بنی ہوئی چیزیں وہاں کی صنعت اوُر کاری گری کا بیش بہا نمونہ ہیں۔

اس مجموعے میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں جو صرف بارُود رکھنے کے لئے مخصوص تھیں۔ مگر کچھ ایسے نمونے بھی ہیں جن میں بارُود اوُر چھرّے رکھنے کے لئے الگ الگ خانے بنے ہوئے ہیں۔ اوُر بعض بعض تو بالکل ایسے ہیں جیسے موجوُدہ زمانے کے پستول۔ یعنی گھوڑا دبانے سے

بہت چاہا کہ کسی طرح وہ اسے میرے ہاتھ فروخت کردے مگر وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ میں نے ہرچند کوشش کی۔ بہلایا پھسلایا طرح طرح کا لالچ دیا۔ ضرورت سے زیادہ قیمت لگادی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خدا معلوم کمبخت کو کیا ضد تھی۔ آخر میں صبر کرکے بیٹھ رہا۔ مگر ہمیشہ موقع کا منتظر رہتا تھا۔ خُدا خُدا کرکے کہیں دس سال کے بعد وہ بڈھا مرا اوُر تب وہی نلی نیلام ہوئی اوُر مجھے صرف ایک ڈالر میں مل گئی۔

مرتضیٰ قادری ہادی۔ کرنول

میں جو اِک دن باغ گیا تھا
رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے
ہریالی ہی ہریالی تھی
طرح طرح کے لوگ وہاں تھے
بعضے چپّل دھوتی والے
ان ہی میں کچھ وہ بھائی تھے
کتّے کی ڈوری کو پکڑے
ان کے پیچھے ان کے کتّے
ساتھ میں آقاؤں کے پھرتے
دو بابو جب آ گئے اِک جا
ان کے ساتھی یعنے کتّے
جب ہم جنس کو دیکھا اپنے
اس نے اس کتّے کو جھنجوڑا
کتوں پر کیا رکھیں تہمت
آقا کے تو پاؤں چاٹیں
رونا تو ہے انسانوں کا
ہمدردی غیروں سے رکھیں
کیا ہی اچھا ہو اے ہادیؔ

کہہ دوں بچّو! کیا دیکھا تھا
پوڈوے اِک ہی صف میں کھڑے تھے
جو سب کے جی کو بھاتی تھی
بچّے بوڑھے اور جواں تھے
تھوڑے اچکن ٹوپی والے
جو مغرب کے شیدائی تھے
ٹہل رہے تھے اکڑے اکڑے
دمیں ہلاتے سر کو جھکائے
یعنے وفا کا دم بھرتے تھے
"ہلو" کہہ کر ہاتھ ملایا
جن کی وفا کے گھر گھر چرچے
لگے اسی دم بھوں بھوں کرنے
اس نے اس کتّے کو بھنبوڑا
ان کی تو یہ ہے ہی خصلت
اور اپنوں کی گردن کاٹیں
اور بھارت کے نادانوں کا
بیدردی اپنوں سے برتیں
بھائی کو ہم سمجھیں بھائی

جانوروں میں تمدّن

ریاض الاسلام صاحب بی اے علیگ

اُوپر کا عنوان کچھ عجیب سا ہے۔ تم اپنے جی میں کہتے ہوگے، بھئی واہ کیا کہی ہے، جانور اور تمدن! تم پہلے ہماری بات سن لو۔ یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ ہم سب انسانوں کو مِل جُل کر رہنے کی عادت ہے اور یہ کوئی آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ تم نے کبھی اپنے ماسٹر صاحب یا کسی اَور بڑے سے شاید جماعتی زندگی کا لفظ سُنا ہوگا۔ لیکن اس کا مطلب معلوم نہ ہوگا تو اس کا مطلب آج سمجھ لو۔ جماعتی زندگی کہتے ہیں آپس میں مل جل کر رہنے کو تمدن بھی گویا اس کا دوسرا نام ہے۔ تو یہ جماعتی زندگی ہم تم ہی میں نہیں جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جس طرح انسان مِل جُل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی رہتے ہیں۔ جس طرح انسان آپس میں کام تقسیم کر لیتے ہیں، کوئی کاشتکاری کرتا ہے، کوئی کپڑے تیار کرتا ہے۔ کوئی مکان بناتا ہے۔ اسی طرح جانور بھی آپس میں کام بانٹ لیتے ہیں۔ تم نے بھی کبھی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کے طور طریق کو غور سے دیکھا ہوگا۔ تو تمھیں اس کا تھوڑا بہت ضرور اندازہ ہوگا۔ اگر یہ جانور اس طرح مِل جُل کر کام نہ کریں تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ ذرا سوچو ایک بے چاری ذرا سی چیونٹی کس طرح تمام مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور کس طرح وہ تمام کام انجام دے سکتی ہے جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ صرف جماعتی زندگی ہے جو اس کی مدد اَور حفاظت کرتی ہے۔

غالباً سب سے زیادہ مہذب جانور چیونٹی ہے۔ اسی لئے وہ تمام جانوروں سے زیادہ ذہین ہے۔ یہ دنیا کے ہر حصّہ میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس کثرت سے برازیل (جنوبی امریکہ) میں ہے۔ اتنی کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ اسی لئے اسے کبھی کبھی "چیونٹیوں کا ملک" کہا جاتا ہے۔ یہہ چیونٹیاں

انسانوں کی طرح رہتی ہیں۔ ان کے نہایت عمدہ چھوٹے چھوٹے مکان ہیں پٹی ہوئی گیلریاں ہیں اور مکانوں کے درمیان پکی سڑکیں ہیں غلّہ جمع کرنے کے لئے مضبوط کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ انڈے سینے کے لئے عمدہ عمارت ہوتی ہے۔ ان چیونٹیوں کے بہت سے گروہ ہوتے ہیں۔ ان گروہوں میں اکثر دشمنی ہو جاتی ہے۔ جیسے انسانوں کی جماعتوں میں۔ جب مخالف گروہوں کی دو دو چیونٹیاں ملتی ہیں۔ تو وہ ایک دوسرے سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر ایک ہی گروہ کی ہوتی ہیں تو آپس میں ملاقات کرکے اپنے اپنے کام کو چلی جاتی ہیں۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھوکی ہے۔ اور دوسری کی تھیلی بھری ہے تو بھوکی کھانا مانگتی ہے۔ دوسری اپنی تھیلی میں سے ایک قطرہ ٹپکا دیتی ہے جو بھوکی چیونٹی چاٹ جاتی ہے۔ اگر کوئی چیونٹی (باوجود اپنی تھیلی بھری ہونے کے) دوسری کو غذا نہ دے تو سارا گروہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اکثر اس کو مار ڈالا جاتا ہے۔

چیونٹی کی بساط ہی کیا۔ لیکن اس یک جہتی کی وجہ سے وہ بڑے سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر لیتی ہے اور بڑے بڑے کیڑے بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ چڑے، مکڑے اور چھوٹے چھوٹے کیڑے اس سے بھاگتے ہیں کبھی کبھی چیونٹیاں بھڑوں کے چھتے پر حملہ کر دیتی ہیں، بہت سی لڑائی میں ماری جاتی ہیں۔ لیکن آخر کو جیت انھی ہی کی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے ایک جزیرہ کا نہایت دل چسپ اور خوف ناک واقعہ ہے۔ اب سے ڈیڑھ سَو برس پہلے یہ جزیرہ بہت آباد تھا۔ گنّے کی فصل تیار کھڑی تھی کہ یکایک چیونٹیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جزیرے والوں نے دیکھا کہ ایک دم ان کے کھیت سیاہی سے ڈھک گئے۔ اوّل اوّل ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا قصہ ہے۔ جب وہ آگے بڑھے تو دیکھا کہ چوہوں، خرگوشوں اور دوسرے جانوروں کے غول کے غول بے تحاشا بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کے پیچھے ایک بڑھتا ہوا سیاہ سمندر ہے یہ چیونٹوں کی فوج تھی آدمیوں کے ہوش و حواس باختہ ہو گئے اور وہ بھی جان بچا کر بھاگے اور سمندر کے پانی میں جا کر پناہ لی۔ بہت سے ڈوب گئے۔ باقی

تیر کر دوسرے جزیرے میں پہنچ گئے۔ چیونٹے سارے جزیرے پر پھیل گئے۔ تمام جزیرہ سیاہی سے ڈھک گیا۔ اگر کوئی پرندہ زمین پر اترآتا تو وہ ایک دم کالی فوج کی صفوں میں چھپ جاتا اور تھوڑی دیر بعد صرف اس کی ہڈیاں نظر آتیں۔ بہت سے بھاگتے ہوئے جانوروں کو آگے پیچھے سے گھیر کر شکار کر لیا گیا۔ دریا بھی ان کے راستہ میں حائل نہ ہو سکا۔ کروڑوں چیونٹے پانی میں گھس گئے۔ یہاں تک کہ دریا پٹ گیا اور باقی کروڑوں پار ہو گئے۔ اسی طرح جب ان کے روکنے کے لئے آگ جلائی گئی تو انھوں نے اس کو بھی پاٹ کر بجھا دیا۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو کوئی جزیرے کو چیونٹوں سے نجات دلائے اسے تین لاکھ کا انعام دیا جائے گا۔ لیکن اس عذاب کا کون مقابلہ کرتا اور کیسے کرتا۔ غرض کئی سال اس جزیرہ پر چیونٹوں کی حکومت رہی آخر کار قدرت نے خود ہی اس کا انتظام کیا کچھ سال بعد ایک نہایت زبردست طوفان آیا جس نے تمام چیونٹوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن اس کے بعد وہاں کی زمین بھی تباہ ہو گئی۔ اور کھیتی کے لائق نہ رہی۔ بہت عرصے تک وہاں کوئی آبادی نہ ہو سکی۔

شہد کی مکھیاں بھی اسی طرح آپس میں مِل جُل کر رہتی ہیں۔ ان میں کام بانٹنے کی صلاحیت خاص طور سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب کبھی ان کا غول کسی نئے چھتے کی تلاش میں ہوتا ہے تو وہ پہلے کچھ مکھیاں معائنہ کے لئے بھیجتا ہے۔ جب ان کو کوئی موزوں جگہ مل جاتی ہے۔ تو وہ اس کی صفائی کرتی ہیں اور جب تک پورا غول نہ آ جائے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ شہد کی حفاظت کے لئے ایک سنتری گارد رہتا ہے۔ اگر کوئی مکھی اس میں سے شہد چرانے کی کوشش کرتی ہے۔ تو سنتری اسے مار ڈالتے ہیں۔ البتہ اگر کسی دوسرے چھتے کی مکھی راستہ بھول کر آ جائے تو اسے کچھ نہیں کہتے۔

شکاری جانور اکثر مل کر شکار کرتے ہیں۔ علم حیوانات کے ایک ماہر نے اس سلسلہ میں اپنا ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے ایک بار انھوں نے دیکھا کہ ایک عقاب آسمان میں چکر لگا رہا تھا۔ یکایک اس نے نہایت زور سے چیخ ماری جیسے وہ کسی کو بلا رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے بہت سے عقاب جمع ہو کر ایک جگہ اترے۔ وہاں ایک گھوڑے کی لاش

پڑی تھی۔ پہلے بڑی عمر والے عقابوں نے پیٹ بھرا، جب وہ کھا چکے تو چھوٹوں نے کھانا شروع کیا اور بڑے نگہبانی کرتے رہے۔

بگلے کی بعض قسمیں مچھلیوں کا شکار اس طرح کرتی ہیں کہ وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ دونوں گروہ مل کر پانی میں ایک دائرہ بنا لیتے ہیں۔ پھر ایک گروہ دوسرے گروہ کی طرف بڑھتا ہے۔ دائرہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ جو مچھلیاں اس طرح پھنس جاتی ہیں ان کا آسانی سے شکار کر لیا جاتا ہے۔

ابابیلوں میں اکثر ایک ہی ابابیل شکار کرتی ہے۔ اور سب ساتھی مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ اگر کوئی شکرا ان پر حملہ کرتا ہے۔ تو سب مل کر اس کو بھگا دیتی ہیں چیل حالانکہ عقاب سے کم زور ہوتی ہے لیکن اکثر کئی چیلیں مل کر عقاب سے شکار چھین لیتی ہیں۔ سارس بہت عقل مند ہوتے ہیں اور خوب مل جل کر بھائی چارے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ان کا غول شکار کرتا ہے یا آرام میں ہوتا ہے۔ تو ان میں سے چند کا کام یہ ہوتا ہے کہ دیکھ بھال کرتے رہیں اور خطرے سے آگاہ کردیں اگر کسی جگہ انھیں خطرے کا شبہ ہو جائے تو وہاں جانے سے پہلے معائنہ کے لئے اسکاوٹ بھیجتے ہیں۔ جب وہ واپس آکر اطلاع دیتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں تو ایک اور گروہ اطمینان کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ جب بالکل یقین ہوجاتا ہے کہ کوئی خطرہ نہیں۔ تب پورا غول وہاں اڑ کر آ جاتا ہے۔ سارس دن کا بہت تھوڑا حصہ شکار میں صرف کرتا ہے۔ باقی تمام دن خوش فعلیوں اور کھیل میں صرف ہوتا ہے۔ جس میں سب شریک ہوتے ہیں۔

پرندوں میں غالباً طوطا سب سے ذہین ہوتا ہے۔ جب طوطوں کے جھنڈ کو کسی کھیت پر حملہ کرنا ہوتا ہے۔ تو پہلے اسکاوٹ بھیجے جاتے ہیں، جو کھیت کے چاروں طرف درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب وہ خوب دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی آدمی قریب نہیں تو وہ آواز دیتے ہیں "سب ٹھیک ہے" پھر پورا جھنڈ کھیت پر لوٹ پڑتا ہے۔ اگر ذرا کھٹکا ہو تو سب ایک دم اڑ جاتے ہیں طوطے آپس میں بہت محبت کرتے ہیں۔ اور اس لئے دوسرے جانور ان پر حملہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

بہار کے زمانے میں بہت سے پرند

شمالی ملکوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور بڑے بڑے غولوں میں جنگلوں میں اور دریا کے کنارے اترتے ہیں۔ ان میں اکثر چھوٹے چھوٹے پرندے ہوتے ہیں۔ لیکن شکاری پرندوں کو ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر کبھی کوئی ان پر حملہ کرتا ہے تو سب مل کر یا تو اسے بھگا دیتے ہیں یا پانی کی چھینٹیں اس طرح اڑاتے ہیں کہ حملہ کرنے والا جانور گھبرا کر اڑ جاتا ہے۔

جانوروں کی باہمی امداد کی بہت اچھی مثالیں اس زمانے میں نظر آتی ہیں جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتے ہیں۔ یہ سفر عام طور سے موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ جاڑوں میں بہت سے جانور جنوب کی طرف آجاتے ہیں کیونکہ یہاں سردی کم ہوتی ہے۔ گرمی میں گرمی سے بچنے کے لئے شمال کی طرف چلے جاتے ہیں۔ جب کوئی سفر درپیش ہوتا ہے تو سب پرند ایک جگہ جمع ہونے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دن تک رہتا ہے تاکہ کوئی پرندہ رہ نہ جائے۔ پھر ان کی فوج کی فوج وادیوں اور سمندروں کو طے کرتی چلی جاتی ہے۔

بندر غول میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اور تنہائی سے بہت گھبراتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی پر کوئی مصیبت آجائے تو اس کی آواز سن کر سب دوڑ آتے ہیں اور دشمن پر سب مل کر حملہ کرتے ہیں۔ اگر لڑائی میں کوئی بندر زخمی ہو جائے تو اسے اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ وہ مر گیا۔ بعض نسل کے بندر حفاظت کے لئے سنتری مقرر کر دیتے ہیں۔ جب بندر کہیں ڈاکا ڈالتے ہیں تو مال غنیمت دوسری جگہ بہت جلد پہنچانے کے لئے کچھ کچھ فاصلے سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مال ہاتھوں ہاتھ کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ ٹی ٹی (چھوٹی نسل کے بندر جو بہت خوب صورت ہوتے ہیں) بارش میں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اور اپنی دم ایک دوسرے کے گلے میں حفاظت کے لئے لپیٹ لیتے ہیں۔

پرندوں اور جانوروں میں ایک دوسرے کی مدد صرف حفاظت اور شکار ہی کے وقت نہیں کی جاتی۔ تفریح اور کھیل کے میدان میں بھی یہ چیز اسی حد تک پائی جاتی ہے۔ سارس کا اس سلسلے میں پہلے ذکر آچکا ہے، کتوں بلوں اور بلی کے بچوں کو بھی تم نے کھیلتے دیکھا ہوگا۔ چڑیاں اکثر مل کر گاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا

گیا ہے کہ چڑیوں کے کئی جھنڈ ہوتے ہیں، پہلے ایک پورا جھنڈ مل کر گاتا ہے۔ جب یہ خاموش ہوجاتا ہے۔ تو پھر دوسرا گاتا ہے۔ اسی طرح باری باری سب گاتے ہیں۔

ایک اور ماہر حیوانات نے جو قطب جنوبی کے قریب پرندوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے گئے تھے اپنا ایک مشاہدہ اس طرح بیان کیا ہے "میں تمام تمام دن پنگین (ایک سمندری چڑیا) کے غولوں کو نہاتے دیکھا کرتا تھا۔ یہ چڑیاں ایک ایک کرکے برف کے کنارے بیٹھنا شروع کرتیں یہاں تک کہ ان کی ایک پوری پارٹی جمع ہوجاتی پھر وہ اپنی شرارتیں اور کھیل شروع کرتیں اور ایک دوسرے کے پیچھے اڑی اڑی پھرتیں۔ ہر پنگین کی کوشش یہ ہوتی کہ کسی طرح کوئی دوسری پنگین پانی میں پہلے داخل ہو۔ ان کی ایک قطار پیچھے سے اڑتی اور دوڑتی ہوئی آتی تاکہ اگلی قطار کو پانی میں دھکیل دے اور جب دوسری قطار بالکل کنارے پر پہنچ جاتی اور پانی میں گرنے کو ہوتی تو فوراً اڑ کر وہ پچھلی والی قطار کے پیچھے پہنچ جاتی اور پورا زور لگاتی کہ اسے پانی میں پہنچادے۔ یہ کش مکش کچھ دیر جاری رہتی آخر کو ہوتا یہ کہ کوئی ایک پنگین سرپٹ دوڑتی ہوئی جاتی اور سر کے بل پانی میں غوطہ مارتی اور کچھ دور جاکر پانی میں سے نکلتی پھر باقی سب بھی یہی کرتیں اور سب اکٹھی ایک جگہ جاکر نکلتیں۔ جب وہ پانی میں سے کودتی اچھلتی نکلتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہت سے بچے مل کر شور مچا رہے ہیں۔ جب کبھی کوئی برف کی سل بہتی ہوئی آجاتی تو کچھ چڑیاں اس پر سوار ہوجاتیں اور جب یہ سل کنارے کے قریب ہو کر گذرتی تو وہ کنارے پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر خوب شور مچاتیں اور پھر جواب میں یہ ان سے بھی زیادہ چلاتیں اکثر ان سلوں پر چڑیاں اتنی تعداد میں بیٹھ جاتی تھیں کہ سل بالکل ان سے ڈھک جاتی تھی۔ ان چڑیوں کی یہ سب حرکتیں دیکھ کر یہ خیال مشکل سے آتا تھا کہ یہ انسان نہیں بلکہ چڑیاں ہیں۔

جانوروں میں انصاف کا خیال بھی پایا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی ابابیل دوسری ابابیل کے گھونسلے پر قبضہ کرے یا اس میں سے کچھ چرالے تو گروہ کے دوسرے ممبر فوراً مداخلت کرتے ہیں اور جس کا حق ہوتا ہے اسے واپس دلوا دیتے ہیں۔
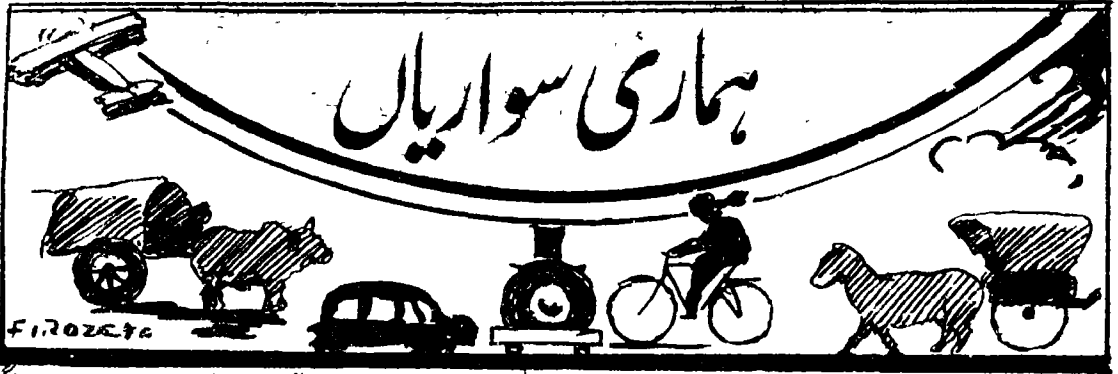
سید محمد حسین صاحب صدر مدرس حمایت نگر

بیل گاڑی

گڑ گڑ گڑ گڑ گاڑی میری
دھیمی دھیمی چلتی ہے کیسی
اچھے اچھے بیل جُتتے ہیں
گدّی تکئے اس میں رکھے ہیں
اس میں کیا آرام ہے دیکھو
چاہو بیٹھو چاہو لیٹو
جنگل ہو یا ندّی نالا
پہنچے ہر جا گاڑی والا

تانگا

صاف اور ستھرا تانگا ہے کیسا
اس میں جتا ہے چنچل گھوڑا
ساز سے گھوڑا دولھا بنا ہے
تانگے کا رنگ چمک رہا ہے
دوڑا دوڑا جاتا ہے گھوڑا
وقت سفر میں لگتا ہے تھوڑا
ریل سے آنے والے مسافر
بیٹھ کے اس میں جاتے ہیں گھر گھر

سائیکل

سائیکل ہے یہ کیسی پیاری
دنیا بھر میں سُبک سواری
پاؤں رکھا اور زور لگایا
چلی گئی بس یہ جا وہ جا
دانہ چارہ کچھ نہیں کھاتی
پھرتی ہے دن بھر دوڑ دکھاتی

نازک نازک پہیوں والی　　چال ہے اس کی سب سے نرالی
چڑھ کر اس پر زور لگاؤ　　ساری دنیا گھوم کر آؤ

موٹر

پم پم پم پم موٹر آئی　　کالی پیلی رنگت والی
سواریوں میں ہے یہ رانی　　چلتی ہے پی کر تیل اور پانی
گرد اڑا کر چلنے والی　　میلوں کوسوں پھرنے والی
ریل اور سائیکل۔ گھوڑا۔ گاڑی　　اس کے برابر دوڑے نہ کوئی

ریل

ریل وہ آئی شور مچاتی　　چھک چھک کرتی دھواں اڑاتی
ڈبے ہیں اس کے تیرہ چودہ　　ہر ایک ڈبہ گھر ہے گویا
کھا کر کوئلے کا ایندھن　　بن گیا کالا پہاڑ سا انجن
اولا پالا یا ہو آندھی　　وقت پر اپنے آن ہی پہنچی

ہوائی جہاز

آتی ہے زوں زوں زوں آواز　　دیکھو وہ آیا ہوائی جہاز
گھر کے جتنا بڑا سا ٹڈا　　ہوا میں اڑتا پھرتا ہے گویا
راہ میں دلدل ہو یا صحرا　　پہاڑ سے بھی یہ نہیں ہے ڈرتا
ابھی زمیں پر ابھی ہوا میں　　پلک جھپکتے گم ہے فضا میں
اڑ کر جاؤ جس جا چاہو　　سیر و سفر کا لطف اٹھاؤ

قطب شمالی

محترمہ آپا جان حسن سجانی
بی اے (جامعہ)

ہمارے جغرافیہ کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے ہیں۔ جغرافیے کی باتیں ایسی دلچسپی سے بتاتے ہیں کہ ہم سب لڑکے خوب محو ہو کر سنتے ہیں۔ یورپ میں آئے دن جغرافیے کے بارے میں نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کا ذکر اخباروں میں آتا رہتا ہے۔ ماسٹر صاحب، ہمیں یہ خبریں ضرور سناتے ہیں۔ انھی سب باتوں کی وجہ سے ہم جس محنت اور شوق سے ماسٹر صاحب کا کام کرتے ہیں اور کسی ماسٹر کا نہیں کرتے۔

ایک دن ماسٹر صاحب درجے میں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک انگریزی کا اخبار تھا۔ ہم سب سمجھ گئے کہ ماسٹر صاحب آج ضرور کوئی نئی بات سنائیں گے۔ درجے میں بالکل خاموشی چھا گئی اور ماسٹر صاحب نے فرمایا "لو بھئی ایک نئی خبر سنو۔ امریکہ میں کوئی صاحب ہیں۔ جے۔ ایچ۔ ولکنس۔ یہ غوطہ خور کشتی کے ذریعے قطب شمالی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا "ماسٹر صاحب! قطب شمالی تو دریافت ہو چکا ہے۔" ماسٹر صاحب نے کہا "ہاں بھئی، مگر کپتان پیری جس نے قطب شمالی کو دریافت کیا ہے۔ وہ جہاز پر بیٹھ کر گیا تھا اور پھر برف کے میدانوں اور برف کی سلوں پر سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

کپتان پیری کا نام تو ہم سب نے سنا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ قطب شمالی اسی نے دریافت کیا تھا۔ مگر اس کا حال نہیں معلوم تھا، نہ یہ کہ اس نے قطب شمالی کو کیسے دریافت کیا۔" بال کرشن بولا "ماسٹر صاحب! یہ پیری کون صاحب تھے۔ اور قطب شمالی تک کیسے پہنچ گئے۔" ماسٹر صاحب مسکرا کر بولے "یہ سوال آپ نے دلچسپ کیا۔ بھئی کپتان پیری کو نہیں جانتے ہو۔ یہ بہت مشہور شخص ہے۔ اس نے انجینیری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ امریکہ کے بحری محکمے

میں نوکر تھا۔ جب وہ ۲۹ برس کا تھا تو اس نے گرین لینڈ کی دریافت پر ایک کتاب پڑھی۔ اسے پڑھ کر اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔ دوسرے سال اس نے گرین لینڈ کا تنہا سفر کیا اور جبھی سے قطب شمالی کی دریافت کا خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا۔ وہ پورے بیس برس تک اس مہم کو سر کرنے میں لگا رہا۔ میں نے حیرت سے پوچھا "ماسٹر صاحب! پورے بیس برس! بڑی ہمّت والا آدمی تھا ماسٹر صاحب!" ماسٹر صاحب نے کہا "ایسے ہی مستقل مزاج لوگ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور دنیا کے لئے مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ ہاں، تو اس مہم کو شروع کرنے سے پہلے۔ اس نے قطبی علاقے کے بہت سے چکر کئے۔ سمندر اور خشکی کے علاقوں کی جانچ کی۔ اس علاقے کے باشندوں یعنی اسکیمو لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ اس نے قطب شمالی تک پہنچنے کی بار بار کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بعض مہموں میں اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی" بال کرشن بولا "ماسٹر صاحب! اس کی بیوی بھی؟ ہمارے ہاں کی عورتیں ایسی خطرناک جگہوں پر جانے کے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوں۔" ماسٹر صاحب "ہاں میاں وہاں کی عورتیں بھی ایسی ہی باہمت نڈر اور بہادر ہوتی ہیں اگر ہماری ماؤں بہنوں میں یہ اچھی باتیں آجائیں

تو ہمارا ملک کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ خیر تو ان بار بار کی ناکامیوں سے پیری کی ہمّت کبھی نہ ٹوٹی بلکہ ہر ناکامی سے اس نے ایک نیا سبق اور مفید تجربہ حاصل کیا۔ آخر بیس اکیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس نے ایک آخری کوشش کی۔ وہ ۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو ایک بہت مضبوط جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ ۲۶ کو وہ اس خطے میں پہنچا۔ جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ پہلی اگست کو کیپ یارک پہنچا۔ یہاں وہ اپنے اسکیمو دوستوں سے ملا اور اپنی مدد کے لئے ان میں سے کوئی ۴۹ آدمی چھانٹے۔ ان کے علاوہ ۲۴۶ کتے ساتھ لئے

اب آگے کا راستہ بہت مشکل تھا۔ چاروں طرف برف کے بڑے بڑے تودے تیر رہے تھے ایک آدھ جگہ جہاز برف کے تودے سے ٹکرایا بھی مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اتنا مضبوط جہاز تھا پھر بھی جہاز کے تمام لوگ ہر وقت سامان کے بنڈل ہاتھوں میں لئے تیار رہتے تھے کہ جہاز ٹوٹ جائے تو سامان سمیت کود پڑیں۔ ایک جگہ جہاز چودہ روز تک برف کے تودوں میں گھرا رہا۔ آخر ڈائنا میٹ کے ذریعے راستہ صاف کیا گیا۔ ۵ ستمبر کو جہاز شیریڈن پہنچا۔ یہاں سفر کی ایک منزل ختم ہوئی۔ اب جاڑے کا موسم شروع

ہو گیا تھا۔ آگے بڑھنا نا ممکن تھا۔ اس لئے طے ہوا کہ جاڑا کیمپ شیریڈن میں گزارا جائے۔

۲۲ر فروری کو جاڑے کا موسم ختم ہوا۔ تو کپتان پیری ۲۴ر آدمیوں، ۱۶ گاڑیوں، ۱۴۴ کتوں کو ساتھ لے کر قطب شمالی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ برفانی راستہ چار سو میل لمبا تھا اور جہاز والے راستے سے کہیں زیادہ دشوار اور خطرناک۔ ایک جگہ کوئی چوتھائی میل تک لمبا نالہ ملا اور دن بھر رکنا پڑا۔ نالا برف سے بھر گیا تو آگے بڑھے۔ ایک جگہ نالا اس سے بھی زیادہ چوڑا تھا۔ وہاں پانچ دن تک رکنا پڑا۔ ان کے علاوہ چھوٹے بڑے بہت سے نالے ملے۔ پھر اکثر برف کے تیرتے ہوئے تودوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ذرا بھی پیر پھسلا اور پانی میں۔ ایک گاڑی کے چند کتے پھسل بھی گئے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں باہر نکالا گیا۔

چلتے چلتے قطب ۱۲۲ میل رہ گیا۔ پیری کے ساتھ اب صرف چار اسکیمو اور اس کا ایک حبشی خدمت گار تھا۔ باقی لوگوں کو واپس کردیا گیا تھا۔ ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ ہاتھ منہ پھٹ رہے تھے۔ تکلیف کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ لیکن کوئی ان باتوں کو خیال میں نہ لاتا تھا۔ برابر بڑھے چلے جا رہے تھے کامیابی کی امید نے دگنی قوت پیدا کردی تھی۔

آخر ۱۶۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو چھ آدمیوں کا یہ مختصر گروہ قطب شمالی تک پہنچ گیا۔ کپتان پیری نے یہاں امریکہ کا قومی جھنڈا نصب کردیا۔

کوئی تین گھنٹے تک انھوں نے قطب تک چکر لگایا پھر اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر خوش خوش وہاں سے لوٹ پڑے۔

سعید:۔ ماسٹر صاحب۔ سچ مچ کپتان پیری نے بڑا کام کیا۔

ماسٹر صاحب:۔ ہاں بھئی آزاد ملکوں کے لوگ ایسے ہی ہمت اور دلیری کا کام کرتے ہیں

کیلاش:۔ اور ماسٹر صاحب جے اچ ولکنس کا کیا قصہ ہے؟

ماسٹر صاحب:۔ ہاں آج میں یہی تو تمھیں سنانا چاہتا تھا۔

رشید:۔ تو ماسٹر صاحب جلدی سے بتائیے نا کہیں گھنٹہ ختم نہ ہو جائے۔

ماسٹر صاحب:۔ نہیں۔ (گھڑی دیکھ کر) ابھی بیس منٹ باقی ہیں۔ تو ابھی یہ تو تمھیں معلوم ہو گیا کہ پیری کہیں بیس سال تک کوشش کرنے کے بعد قطب شمالی پہنچ پایا۔ تمھیں یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس طرح کے سفر میں کتنے خطرے ہیں شدید سردی اور پھر برف کے تودے۔ اتنی شدید

سردی میں ہوائی جہاز کا بھی وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ پھر برف پر کہاں اتارا جائے اور کہاں اڑایا جائے۔ ول کنس کا خیال ہے کہ آب دوز کشتی کے سفر میں اس قسم کے خطرے نہیں ہیں اور اس کے ذریعے قطب شمالی تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ ول کنس کا ارادہ ہے کہ پانی ہی پانی میں قطب شمالی کے بڑے بڑے سفر کرے۔

قطبی علاقہ پانی ہی پانی ہے۔ اس کے اوپر برف کی دو سے لے کر چار میٹر تک موٹی تہ جمی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں یہ صرف ½ میٹر بھی ہے چنانچہ ایسی جگہوں میں والرس سانس لینے کے لئے برف کی تہ کو اپنے سر سے توڑ دیتا ہے۔ یہ سمندر (بحر منجمد شمالی) اوسطاً چار ہزار میٹر گہرا ہے۔ کہیں کہیں پانچ ہزار میٹر بھی۔ یورپ کا اونچے سے اونچا پہاڑ بھی اس کی گہرائی میں ڈوب جائے گا۔

بحر منجمد شمالی کی برف کو زپلن جہاز کے ذریعے دیکھا گیا ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ برف میں ایسے حصے یا سوراخ جگہ جگہ موجود ہیں جن میں بہتا ہوا پانی موجود ہے۔ قطب شمالی کے سارے سمندر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کھلے ہوئے حصے ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر ہوں۔ ان کھلے ہوئے حصوں میں آب دوز کشتی آسانی سے سطح کے اوپر آ سکتی ہے۔ اسی لئے تو ول کنس اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ برف کے نیچے کا راستہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

اس کے علاوہ آب دوز کشتی کی شیشے والی کھڑکیوں سے پانی کے اندر کی ایسی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جو کبھی خواب میں نظر نہ آئی ہوں گی۔ مثلاً سمندری سطح پر تیرنے والے آبی جانور جو گھونگھے کی شکل کے ہوتے ہیں سمندر کی لہریں انھیں ادھر سے ادھر لئے پھرتی ہیں۔ یہ سمندر کی چھوٹی مخلوق کی غذا بنتی ہیں۔ اور یہ چھوٹی مخلوق بھی مچھلیوں۔ سیل اور وھیل کا شکار بن جاتی ہے۔ پھر آب دوز کشتی کے آلے کے ذریعے برف کے پہاڑوں کی بنیادیں نظر آ سکتی ہیں۔ برف کے ان پہاڑوں کا صرف ساتواں حصہ پانی کی سطح کے اوپر ہوتا ہے

لیکن ان کشتیوں کے لئے کچھ مشکلیں بھی ہیں اور اسی لئے بہت احتیاط سے سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ کھلا ہوا حصہ جہاں برف پہاڑ کی صورت اختیار کر لیتا ہے

۱

۲

۳

۴

۵

۷

۶

۸

۹
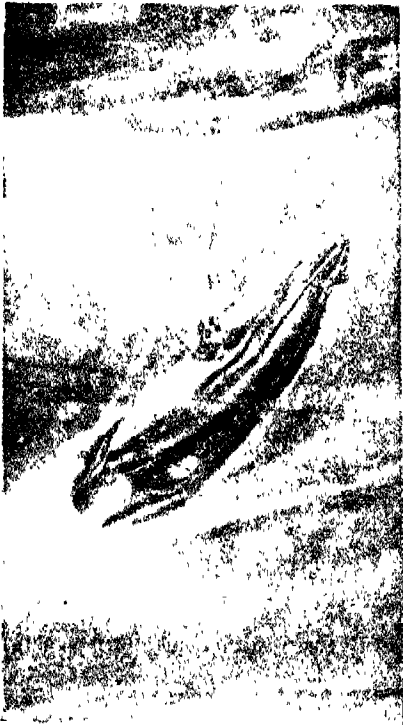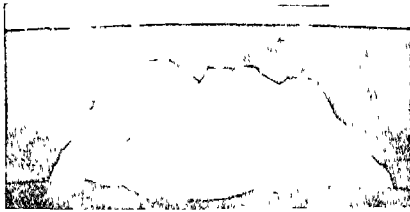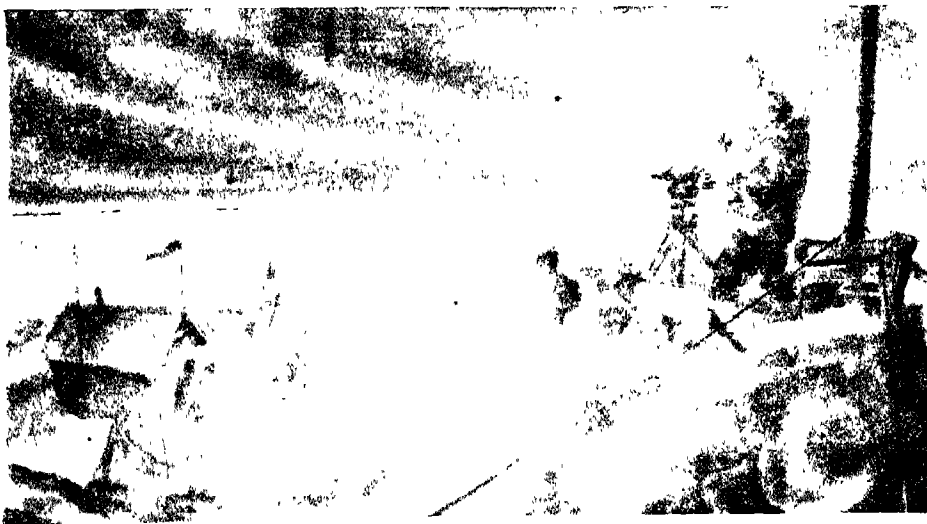
اور برف کا تودا جو پانی میں بہت نیچے تک چلا جاتا ہے۔ آب دوز کشتیوں کے لئے خطرے کا سبب بن جاتا ہے۔ قطب شمالی کے سمندر میں عام طور سے زیادہ پہاڑ نہیں ملتے۔ لیکن قطب شمالی کی طرف جانے والی کشتیوں کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئیے

ارشد:۔ ماسٹر صاحب! یہ مہم کامیاب ہو گئی تو بڑا عجیب کارنامہ ہوگا۔ اپنے مزے سے پانی کے اندر ہی اندر قطب شمالی پہنچ گئے۔

ماسٹر صاحب:۔ اور کیا۔ مگر ابھی صرف چھان بین کا کام ہو رہا ہے۔ اور ہاں دیکھو، اس اخبار میں کچھ تصویریں بھی آئی ہیں۔ ان تصویروں کی مدد سے بہت کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ دیکھو (۱) یہ تو ہیں کپتان پیری اور (۲) یہ ہیں جے اچ ولکنس (۳) یہ تیسری تصویر زپلن جہاز کے ذریعے لی گئی ہے۔ اس میں برف کی سفید اور صاف سطح پر کچھ نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ یہی وہ کھلے ہوئے حصے ہیں جن میں بہتا ہوا پانی موجود ہے یہ (۴) آبدوز کشتی کی تصویر ہے۔ یہ بڑی احتیاط کے ساتھ برف کے نیچے نیچے قطب شمالی تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہی ہے اس (۵) تصویر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آبدوز کشتی برف کے پہاڑوں کو اپنے آلے (دوربین اسکوپ) کے ذریعے دیکھ سکتی ہے۔ اچھا یہ اور (۶) دیکھو دالرس ہے۔ اس تصویر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دالرس سانس لینے کے لئے برف کی تہ کو توڑ دیتا ہے۔ اور (۷) یہ گویا برف کا پہاڑ ہے۔ اس کا صرف ساتواں حصہ پانی پر ہے پھر بھی دیکھو سچ مچ پہاڑ کا پہاڑ نظر آتا ہے۔ قطب شمالی کا سمندر حقیقتاً دنیا کا وسطی حصہ ہے۔ یہ بہت اہم براعظموں سے گھرا ہوا ہے اور جب ہوا بازی کا فن اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ تو یہ سمندر دنیا کی آمد و رفت کا مرکز بن جائے گا۔ اور یہ تصویر (۸) غوطہ خور کی ہے۔ اس مہم میں غوطہ خور کو بہت اہمیت حاصل ہے یہ پتوار اور پیچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ برف تک تیر کر پہنچ سکتا ہے برف توڑنے کے لئے اپنی کشتی کو نقصان پہنچائے بغیر سرنگیں بچھا سکتا ہے۔ اسے تازہ ہوا کے لئے پانی کی سطح تک ایک

نکلی بھی لے جانی پڑتی ہے۔

اور یہ دیکھو آخری (۹) تصویر ہے قطبِ شمالی کا اسٹیشن گویا سمندر کے علم کے ماہروں اور سمندر کا کھوج لگانے کا خواب اور پرانی آرزو۔ دیکھو برف کی سلیں برابر حرکت کرتی رہتی ہیں یہ یا تو ٹوٹ جاتی ہیں۔ یا دب جاتی ہیں۔ کچھ ایسے مضبوط تختے بھی ہوتے ہیں، جنھیں کافی عرصے تک کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ان مضبوط تختوں پر انسان آباد ہو سکتا ہے اور ان پر تیراکوں کے لئے لکڑی کے گھر بنائے جا سکتے ہیں۔ اچھا تو فرض کرو دو برس میں چھان بین کا کام ختم ہو گیا تو آب دوز کشتیاں قطبی اسٹیشن کی تلاش میں نکلیں گی۔ یہ اسٹیشن برف کی مسلسل حرکت کی وجہ سے کہیں اور ہٹ گیا ہوگا۔ آب دوز کشتی دائرلیس کے ذریعے معلومات حاصل کرکے ؛ دو سے لے کر تین ہزار میٹر کے فاصلہ تک ، اسٹیشن میں پہنچے گی اور پھر روشنی کے سگنل اور دھواں پھیلانے والے بم کے ذریعے معلوم ہو گا۔ کہ کشتی نئے ملک کا کھوج لگانے والوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اب گھنٹے میں دو تین منٹ رہ گئے ہیں۔ میٹر اور کیلو میٹر کا حساب اپنے حساب کے ماسٹر صاحب سے پوچھ لینا۔

سب لڑکے:۔ ماسٹر صاحب! آج کا سبق تو اتنا مزے دار تھا کہ گھنٹہ کا پتہ ہی نہ چلا

ماسٹر صاحب:۔ جو کچھ میں نے بتایا ہے سب یاد ہے؟

سب لڑکے:۔ ماسٹر صاحب ایک ایک حرف۔

ماسٹر صاحب:۔ تو سب لڑکے اسے کل تک مضمون کی شکل میں لکھ لائیں جس کا مضمون سب سے اچھا ہوگا، پیامِ تعلیم میں بھیج دیا جائے گا۔ جنوری میں اس کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ (کتابیں وغیرہ سمیٹتے ہوئے) دیکھو بھولنا مت۔ اور ہاں بہت خوش خط لکھ کر لانا خوب کھلا کھلا۔ کوئی بدخط مضمون کتنا ہی اچھا ہو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

اسکاٹ لینڈ کے پوُربی ساحل پر ایک جگہ بہت خطرناک چٹان ہے۔ یہ پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا نام انچ کیپ ہے۔ اندھیرے کہر اوَر طوُفانی موسم میں ملّاحوں کو خبردار کرنے کے لئے یہاں ایک بہت لمبا اوَر مضبوُط روشنی کا مینار بنا دیا گیا ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں اس جگہ کوئی مینار وینار نہیں بنا تھا۔ جب تند و تیز پوُربی ہوائیں چلتیں تو مچھیروں کی کشتیاں ہی نہیں، بڑے بڑے جہاز بھی اس چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔

یہیں پاس ہی سمندر کے کنارے ایک خانقاہ تھی اس میں پادری رہتے تھے اس خانقاہ کے ساتھ ایک گرجا بھی تھا۔ پادریوں کا سردار ایبٹ بہت ہی خدا ترس اوَر نیک آدمی تھا وہ اس بات سے ہمیشہ اُداس رہتا کہ بہت سے غریب مچھیروں کی کشتیاں طوُفان میں ادھر چلی آتیں اوَر چٹان سے ٹکرا جاتیں۔

ایک دن ایبٹ نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ کشتیاں اوَر جہاز اس چٹان سے نہ ٹکرائیں۔ آخر تھوڑی دیر بحث کے بعد یہ طے پایا کہ گرجے کی بڑی گھنٹی چٹان پر لٹکا دی جائے۔ ہوائیں یا طوُفان آئے گا تو موجوں کی وجہ سے گھنٹی بجے گی۔ اوَر لوگ ادھر نہ آئیں گے۔ گھنٹی چٹان پر لٹکا دی گئی۔ اب طوُفان آتا اوَر موجیں اُٹھتیں تو گھنٹی بجنے لگتی۔ اس طرح سینکڑوں آدمیوں کی جانیں بچ گئیں۔ ملّاح گھنٹی کی آواز سن کر ایبٹ کو دعائیں دیتے اوَر کشتی کو چٹان سے بچا کر لے جاتے۔ انھی دنوں اس طرف رالف نامی ایک سمندری ڈاکوُ کا بہت زور تھا۔ یہ سوداگروں کے جہاز لوُٹ لیتا تھا، کبھی کبھی خشکی پر بھی لوُٹ مار مچاتا وہ ایبٹ اوَر اس کے ساتھیوں سے بہت جلتا تھا ساری جلن اس بات کی تھی کہ ایبٹ مچھیروں کی

حفاظت کرتا تھا۔

ایک دن رالف کا جہاز انچ کیپ کے کنارے آ لگا۔ آسمان صاف تھا۔ اور سمندر خاموش۔ رالف نے اپنے جہاز سے چٹان پر گھنٹی لٹکی ہوئی دیکھی اور اپنے ساتھیوں سے بولا "کتنا اچھا موقع ہے۔ چلو اس گھنٹی کو وہاں سے کاٹ دیں۔ ہا ہا ہا! ایبٹ کتنا خفا ہوگا۔" اس کے ساتھی خوشی سے چلانے لگے۔ "واہ واہ کتنا اچھا ارادہ ہے۔" اور کشتیوں کے ذریعے وہاں پہنچ گھنٹی کی زنجیریں کاٹ، اسے سمندر کے حوالے کر دیا بہت خوش تھے کہ اب جو ملاح اِدھر آ پھنسیں گے وہ ایبٹ کو دعا نہیں دیں گے۔ اس کی تعریف سنتے سنتے کان پک گئے

رالف برابر جگہ جگہ ڈاکے ڈالتا اور لوٹ مار مچاتا رہا۔ یہاں تک کہ خوب مال دار ہو گیا۔ اب اس نے سوچا کہ میرے پاس اتنا روپیہ پیسہ جمع ہو گیا ہے۔ اور اس پیشے سے جی بھی اُکتا گیا ہے۔ اس لئے باقی زندگی اسکاٹ لینڈ میں آرام اور اطمینان سے گذارنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر اس نے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاری کی اور جہاز پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

ایک رات سارا سمندر کہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ خوب تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں ہواؤں کے طوفان نے رالف کے جہاز کو مشرقی ساحل کے کنارے پہنچا دیا۔ رالف پریشانی میں بڑبڑا رہا تھا۔ "کاش آج چاند نکلا ہوتا معلوم نہیں ہم لوگ کہاں ہیں........ (ساتھیوں سے) تم موجوں کا شور و غل نہیں سن رہے ہو؟ .... ہم انچ کیپ کے بالکل قریب ہیں .... کاش میں گھنٹی کی آواز سن سکتا.... ...... اسی وقت ایک زور کا دھکا ہوا۔ جہاز چٹان سے ٹکرا چکا تھا۔ رالف کے ساتھی چلائے "ہم ڈوب رہے ہیں۔ ہم ڈوب رہے ہیں" جہاز پاش پاش ہو گیا اور تھوڑی دیر میں سوائے چند تختوں کے جو سمندر کی سطح پر تیر رہے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

(ترجمہ بتصرف)

گل رخ

محترمہ شمسی عباد الرحمن صاحبہ

کسی ملک کی شہزادی کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا، اس نے دُور دُور کے ملکوں سے قسم قسم کے چرند، پرند اور آبی جانور منگاکر جمع کئے تھے۔ ان سب کے رہنے کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے بہت بڑا سا باغ اپنے خاص محل کے پیچھے بنوایا تھا۔ اس باغ میں شہزادی اپنے تمام جانور بالکل اس طرح رکھتی تھی۔ جیسے وہ جنگلوں میں رہا کرتے تھے مثلاً ننھی منی چڑیاں باریک جالی کے بنے ہوئے پنجروں میں رہتی تھیں۔ یہ پنجرے اتنے بڑے تھے کہ ان کے اندر چھوٹے چھوٹے خوب صورت باغ لگے ہوئے تھے۔ بھولی چڑیاں دن بھر پھلوں سے لدے ہوئے درختوں پر چہچہاتیں، پھولوں کے گرد اڑتی پھرتیں، جھاڑیوں میں گھونسلے بنا بنا کر بچے نکالتیں اور رات کو گھنے پیڑوں کی شاخوں پر بسیرا لیتی تھیں۔ انھیں گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ پنجروں میں بند ہیں۔ اسی طرح طوطے اور دُوسرے پرند بھی پلے تھے۔ بڑے جانور، جیسے اونٹ، ہاتھی، شیر، بھالو، یہ سب مصنوعی غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے۔ ان کے گھومنے پھرنے کو بڑے بڑے کھلے میدان تھے۔ ان میدانوں کے چاروں طرف گہری گہری نہریں کھدواکر پانی سے بھروا دی تھیں۔ تاکہ یہ خونخوار جانور نکل نہ بھاگیں اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

عقل مند شہزادی نے پانی کے جانوروں کے رہنے کا اور بھی اچھا انتظام کیا تھا۔ راج ہنسوں کے تیرنے کو خوب صورت کنول سے بھرے ہوئے پانی کے حوض بنوائے تھے۔ راج ہنس شہزادی کو بہت پیارے تھے۔ انھیں دیکھنے وہ روزانہ باغ میں آتی اور اپنے ہاتھ سے دانہ کھلاتی۔ جانور پالنے کا یہ طریقہ آج کل کوئی عجیب چیز نہیں ہے۔ قریب قریب ہر بڑے شہر میں چڑیا گھر موجود ہیں جہاں بالکل اسی

طرح بلکہ اس سے بھی عجیب و غریب طریقہ پر جانور پالے جاتے ہیں مگر تم جانو، پرانے زمانے میں تو یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔لوگ دوٗر دوٗر سے شہزادی کا چڑیا گھر دیکھنے آتے دیکھ کر حیران رہ جاتے اور شہزادی کی عقل کی داد دیتے تھے۔

یہ حال تو شہزادی کے چڑیا گھر کا رہا۔ اب کچھ جانور ایسے بھی تھے جو شہزادی کے خاص محل میں پل رہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ فوقیت بی گل رُخ کو حاصل تھی۔تم دل میں کہہ رہے ہوگے کہ یہ گل رُخ کون! الوسو گل رخ ایک ننھی سی زرد رنگ کی سیامی بلیّ کا نام تھا۔ یہ گلُ رُخ شہزادی کی بڑی لاڈلی تھیں اوٗر اس بات پر انھیں غروٗر بھی بہت تھا۔کیوں نہ ہوتا! ان کے دوٗسرے ساتھی جانوز گو اسی محل میں رہتے تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ کوٗد کر شہزادی کی گود میں بیٹھ جائے، یا دسترخوان پر کھانا کھائے۔ چاندی سونے کے تخت پر بیٹھے یا مخملی گدّوں کے بستر پر سوئے۔ یہ فخر تو صرف بی گل رخ ہی کو حاصل تھا۔ بات یہ تھی کہ گل رخ تھی بھی بہت خوب صورت۔ اس کی سیاہ گول مٹول شرارت سے بھری آنکھیں، ریشم ایسے ملائم بڑے بڑے بال، پھولی پھولی دُم اوٗر ننھے ننھے پاؤں شہزادی کو بہت بھاتے تھے۔ کبھی یہ اپنی ملکہ شہزادی سے ناراض بھی ہو جاتی اوٗر اس کے ہاتھ پر پنجہ مار دیتی مگر وہ کبھی اسے سزا نہ دیتی بلکہ اوٗر پیار کرتی تھی۔

غرض اس طرح بہت دن گذر گئے گُل رُخ بڑی ہوئی، عقل و شعور آیا۔ اب نہ پہلی سی شرارتیں رہیں اوٗر نہ کھیل کوٗد رہا۔شاہی محلوں میں پلی بڑھی تھی۔ اس پر شہزادی کی تربیت پائی تھی۔ خوب تمیز دار، برد بار اور عقلمند جوان بلیّ بن گئی۔رنگ روٗپ بھی نکھر آیا۔

کچھ روز اوٗر گزرے! ایک دن بیٹھے بیٹھے گل رخ کے دل میں خیال آیا۔ کہنے لگی میں نے آنکھ کھول کر سوائے شاہی محل کے اوٗر کوئی جگہ نہیں دیکھی! کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔اس میں بہت سے مقام دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک دیہات ہی کو لے لو۔ہماری شہزادی کو دیہات کی زندگی کتنی پسند ہے۔وہ اکثر کہا کرتی ہیں کاش انھیں کچھ دن کے لئے دیہات میں رہنے کی اجازت مل جایا کرتی وہ دیہاتی لوگوں کی کیسی تعریفیں کرتی ہیں کہ وہ کتنے سیدھے سادے اوٗر محنتی ہوتے ہیں لاؤ آج میں محل کے باہر جاؤں اوٗر سب

سے پہلے دیہات کی سیر کروں مگر........
ہاں شہزادی مجھے نہیں جانے دیں گی۔ میں ذرا باغ میں جاتی ہوں تو وہ دو تین باندیاں میری تلاش میں بھیج دیتی ہیں۔ اچھا! ایک تدبیر ہے وہ یہ کہ آج رات کو جب شہزادی سو جائیں تو میں چپکے سے نکل جاؤں! دیہات کچھ دور بھی تو نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہوتے واپس آجاؤں گی۔ یہ سوچ کر گل رخ رات کا انتظار کرنے لگی۔ رات کے کھانے کے بعد جب شہزادی اپنی خواب گاہ کو جانے لگی تو معمول کے مطابق گل رخ کو پکارا گل رخ دوڑتی ہوئی شہزادی کے ساتھ ہو لی۔ خواب گاہ میں پہنچ کر شہزادی کے بستر پر لیٹ گئی اور غُرغُر کرنے لگی۔ جب شہزادی بے خبر سو گئی تو چپکے سے اٹھی، باغ کے دروازے سے باہر نکلی اور دیہات کا راستہ لیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ جنگلی کتوں نے گھیرا مگر بی گل رخ کو اپنے بچاؤ کے داؤں پیچ خوب یاد تھے۔ کتوں کو دھوکا دے کر صاف نکل گئی! اور چلتے چلتے ایک گاؤں کے قریب پہنچ ہی گئی! چاندنی رات تھی۔ ہرے ہرے کھیت لہلہا رہے تھے جنگلی پھولوں کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ اس لئے گاؤں پر سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بس ایک زمیندار کی

چوپال میں دھندلی سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یہ سماں گل رخ کو ایسا بھایا کہ کھیت کی مینڈ پر بیٹھ کر دیہاتی منظر کا لطف اٹھانے لگی۔ اتنے میں پاس کی جھاڑی میں کچھ آہٹ ہوئی اور ایک دبلی پتلی، میلی سی جنگلی بلی سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور گل رخ کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ پھر فوراً گئی، گاؤں میں جاکر تمام دیہاتی بلیوں کو خبر دے دی کہ آج ایک نئی بلی کہیں سے آئی ہے بڑی خوب صورت ہے۔ کھیت پر بیٹھی ہے۔ اب کیا تھا وہی مثل ہوگئی" باولے گاؤں اونٹ آیا" ذرا سی دیر میں سارے گاؤں کی بلیاں گل رخ کے پاس جمع ہوگئیں اور لگیں بھدے پن سے میاؤں میاؤں کرنے۔ ایک نے پوچھا "اے بہن! تم کہاں سے آئی ہو؟" دوسری بولی "تمہارا گھر کہاں ہے؟" تیسری نے کہا "کہاں کی رہنے والی ہو؟" چوتھی بول اٹھی "بوا! اتنی رات کو ہمارے گاؤں میں کیوں آئی ہو؟" الغرض گل رخ پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔ بے چاری کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسے کسے جواب دے۔ اتنے میں ایک بوڑھی بلی آگے بڑھی اور سب بلیوں کو مخاطب کر کے کہا "ان سے کیا پوچھتی ہو؟ دیکھتی نہیں، صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شہر کی رہنے والی ہیں۔ گاؤں کی سیر کو جی چاہا ہوگا، چلی آئیں۔"

اب گل رخ نے موقع غنیمت جان کر تمیز کے
ساتھ کہا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں شہر میں شہزادی
کے پاس رہتی ہوں۔ میں نے کبھی دیہات نہیں
دیکھا تھا۔ آج شہزادی سے چھپ کر گاؤں کی
سیر کو چلی آئی ہوں" پھر اور بلیوں سے
مناسب بات چیت کرکے رخصت چاہی۔ پاس
ہی ایک نوجوان جنگلی بلا بیٹھا ہوا یہ سب باتیں
سن رہا تھا۔ گل رخ کی تمیز اور تہذیب اسے
بہت پسند آئی۔ گل رخ اور جنگلی بلیوں میں
زمین آسمان کا فرق معلوم ہوا۔ فوراً گل رخ
کے پاس آکر اپنا تعارف کرایا اور شادی کا
پیغام دیدیا۔ پہلے تو گل رخ کو بلے کی جرأت پر
بڑا غصہ آیا۔ پھر اس کے بھولے پن اور سادہ
لوحی پر ہنسی بھی آئی۔ اس نے تنک کر جواب
دیا "واہ! میں تمہارے ساتھ شادی کیسے کرلوں
میرا بیاہ تو شہزادی اپنی سہیلی کے بلے کے
ساتھ ٹھیرا چکی ہیں؟" مگر پھر گل رخ نے سوچا
کہ جنگلی بلا۔ نیک، تندرست اور خوبصورت ہے
آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ بے چارے کو
کھیتوں اور جنگلوں میں رہ کر کچھ سیکھنے کا موقع
نہیں ملا ہے۔ اگر اسے لے جاکر شہر میں رکھا
جائے اور سکھایا پڑھایا جائے تو بڑا قابل بن
جائے گا۔ شہزادی کی سہیلی کا بلا جس کے ساتھ
میری منگنی ہوئی ہے امیروں کی صحبت میں
رہ کر مزاج کا خراب، آرام طلب اور کاہل
ہوگیا ہے۔ یہ سوچ کر گل رخ نے نرمی کے
لہجہ میں مگر شرارت سے کہا "شادی کرنے
میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں تمہارے
ساتھ شادی کرسکتی ہوں مگر تم تو نرے گنوار
ہو۔ تمہاری بھونڈی حرکتیں دیکھ کر میری شہزادی
ایک دن بھی تمہیں اپنے پاس نہ رہنے دیں گی"
جواب معقول تھا۔ بلے کو کچھ کہتے بن نہ پڑا
بلکہ ندامت سے گردن جھکالی۔ کچھ دیر کے بعد
اتنا پوچھا "تو پھر ہماری شادی نہیں ہوسکتی؟"
گل رخ نے جواب دیا "ایک شرط پر ہوسکتی
ہے۔ اگر تم تمیز و تہذیب سیکھ لو" بلے نے
مایوسی سے کہا "کیسے سیکھوں، یہ باتیں سکھانے
والا یہاں کون ہے؟" گل رخ بولی اگر تم وعدہ
کرو کہ جو میں کہوں اس پر عمل کروگے اور
اچھی اچھی باتیں دل لگاکر سیکھوگے۔ تو میں
تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ ہماری شہزادی
جانوروں پر بہت مہربان ہیں۔ تم سے ناراض
نہ ہوں گی تھوڑے دنوں کے بعد جب تم
ایک اچھے اور تمیز دار بلے بن جاؤگے تو
میں شہزادی سے کہہ کر تمہارے ساتھ
شادی کرلوں گی" یہ رائے بلے کو پسند

آئی اور وہ گل رخ کے ساتھ چلا گیا۔

تم جانو! محنت سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے اور کوشش سے ہر کام پورا ہوتا ہے تو بس، چند دنوں کی محنت اور کوشش سے وہ جنگلی بلا بڑا تمیز دار، مہذب اور اچھا بن گیا۔ گل رخ نے اس کے ساتھ شادی کری اور دونوں ہنسی خوشی شہزادی کے پاس رہنے لگے۔
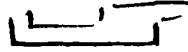
خورشید اور صندل

خورشید	آ آ صندل دودھ پلاؤں	بسکٹ میٹھا تجھ کو کھلاؤں
	جھوٗ جھوٗ جھولا تجھ کو جھلاؤں	تھپک تھپک کر تجھ کو سلاؤں
صندل	خورشید بیگم آتا ہوں میں	آپ کا ہی گن گاتا ہوں میں
	ماؤں ماؤں	ماؤں ماؤں
خورشید	آ آ تیرا بیاہ رچاؤں	ننھی سی ایک دلہن لاؤں
	چاٹ اور مکھن اس کو چٹاؤں	تجھ کو تازہ دودھ پلاؤں
صندل	پیاری بیگم آتا ہوں میں	گیت تمہارا گاتا ہوں میں
	پاؤں میں لوٹوں دم کو ہلاؤں	گیت پیارے پیارے سناؤں
	ماؤں ماؤں	ماؤں ماؤں
خورشید	آ آ صندل دھوم مچائیں	کھیلیں کودیں مل کر گائیں
	تتلی پکڑیں پھول سنگھائیں	پھولوں کی ایک گیند بنائیں
صندل	پیاری بیگم آتا ہوں میں	گیند اٹھا کر لاتا ہوں میں
	حکم کے ملتے گیند اٹھاؤں	نغمۂ الفت اپنا گاؤں
	ماؤں ماؤں	ماؤں ماؤں

مولوی علیم الدین صاحب تیز رنگ فہمی

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی اصلاح کے بعد

طوطا ہم نے ایک خریدا — اس کو اک پنجرہ میں ڈالا
رنگت اس کی پیاری پیاری — ہو جیسے پھولوں کی کیاری
گلے میں اس کے نازک کنٹھی — کتنی اچھی ہے وہ لگتی
سبز پری کہتے ہیں اس کو — نام ہے اس کا کتنا پیارا
آنکھیں ہے وہ کیسی پھراتا — مجھ کو ہے وہ دل سے بھاتا
ٹیں ٹیں کرکے ہے چلاتا — دن بھر ہے وہ شور مچاتا
دیتی ہوں جب پھل کا ٹکڑا — پنجے سے ہے اپنے اٹھاتا

صبح سویرے اٹھتا ہے وہ
حمد خدا کی کرتا ہے وہ

(فہیم جہاں بیگم قزلباش) عمر ۷ سال (آگرہ)

ننھے! کس کو تکتے ہو — پر کچھ کہہ نہیں سکتے ہو
آؤ بتلاؤں ہے کیا؟ — گول سے یہ چہرے والا
چندا ماموں نام ان کا — روشنی دینا کام ان کا
جگ کو روشن کرتے ہیں — نور سے دنیا بھرتے ہیں
ننھے! بتلاؤ تو بھلا — میں نے تمھیں کیا سمجھایا

تم تو انگوٹھا چوستے ہو
میری بات کو کیا سمجھو

محمد اکرام۔ لاہور
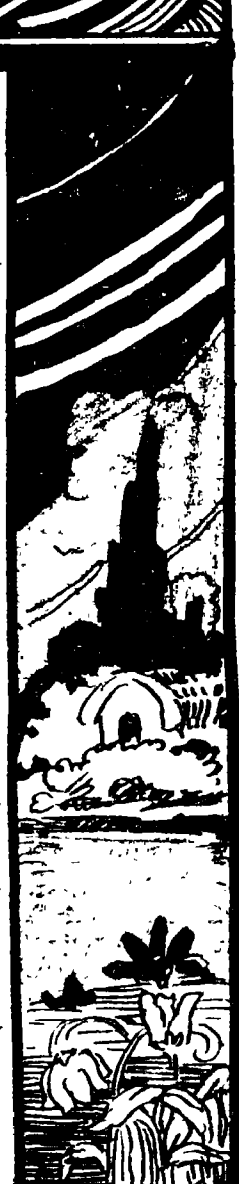
تجھ سے وابستہ ہے ہر کام پیام تعلیم
ہے بہت خوب ترا نام پیام تعلیم

تو جب آتا ہے تو ہم عید سمجھتے ہیں وہ وقت
رات ہو صبح ہو یا شام پیام تعلیم

تیرے مضمون انوکھے تیرے قصے دلچسپ
کیوں نہ دنیا ہو تری رام پیام تعلیم

تو ہے تعلیم کی ترغیب دلانے والا
دل کا ہم سب کے ہے آرام پیام تعلیم

اتنی دلچسپیاں اور قیمتِ سالانہ کم
مجھ سے پوچھو تو ہے بے دام پیام تعلیم

سال نو خیر سے آغاز ہوا ہے تیرا
خیر کے ساتھ ہوا انجام پیام تعلیم

ہے حبیبہ کی دعا حق سے کہ دنیا بھر میں
خوب روشن ہو ترا نام پیام تعلیم

حبیبہ خاتون۔ بدایوں

یہ کس شوکت سے نکلا سالنامہ بھائیو اب کی
کہ دیکھو جس طرف بھی اس طرف ہی دھوم ہے اسکی

وہ نظمیں اور قصے ہیں جنھیں تم پڑھ کے خوش ہوگے
جو آئیں گے عزیز اور دوست ان سب کو دکھاؤ گے

پیامی بھائیو! تم سب خوشی سے ناچنے لگنا
شفیع صاحب کی نظمیں آئیں گی اس میں اہاہاہا

لطیفے بھی سنا کر آپا جی کو تم ہنساؤ گے
کبھی وہ مسکرائیں گے کبھی تم کھل کھلاؤ گے

یہی اس قادر مطلق سے ہے عالم دعا اپنی
ترقی اس کی ہو دائم ہمیشہ خوش رہیں پیامی

عالم دانشی کانپور

ایک لڑکا تھا بھولا بھالا
ننھا منا پیارا پیارا

گھر بھر میں تھا سب کو دلارا
ماں اور باپ کی آنکھ کا تارا

مدرسے اپنے شوق سے جاتا
پڑھ کے گھر میں خوش خوش آتا

اچھی طرح ہر چیز کو رکھتا
استادوں کی بات وہ سنتا

اپنے بڑوں کا ادب وہ کرتا
چھوٹوں سے بھی محبت رکھتا

جھوٹی باتیں کبھی نہ کرتا
سچ وہ ہمیشہ بولا کرتا

سب ہی سے ہمدردی رکھتا
کام سبھی کا شوق سے کرتا

سب کہتے وہ جہاں بھی جاتا
ہے یہ بچہ کیسا پیارا

آسودہ بیگم حیدرآباد دکن

چلو آؤ سب مل کے یہ گیت گائیں
نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں
زمیں پر چلی ہیں معطر ہوائیں
فلک پر اٹھی ہیں خوشی کی گھٹائیں
نہ ہوں رنجشیں دل میں پیدا کسی کے
محبت کی گنگا میں چل کر نہائیں
ہنود اور مسلم ہیں سب بھائی بھائی
ہیں جھگڑے جو آپس کے ان کو مٹائیں
وطن کی محبت کا نغمہ سنائیں
نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں

یہ چاند اور تارے سنہری ضیائیں
گلوں کی وہ بستی میں رنگیں فضائیں
چلو ایسی فطرت کی رنگین فضائیں
محبت کی چھوٹی سی دنیا بنائیں
یہاں ایک محبت کا من ربنائیں
محبت کے گانے سبھی کو سنائیں
وطن کی محبت کا نغمہ سنائیں
نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں

اسد حسین پٹنہ

جاگو اور جگاؤ

سارا عالم جاگ رہا ہے
سوئے ترقی بھاگ رہا ہے
تم بھی دوڑے جاؤ
جاگو اور جگاؤ
قوم کا بیڑا غرق نہ کرنا
رسوا نام شرق نہ کرنا
سوئے بہت اٹھ جاؤ
جاگو اور جگاؤ
ملک کی خاطر کام کرو کچھ
پیدا جہاں میں نام کرو کچھ
قوم کو اپنی بچاؤ
جاگو اور جگاؤ
اٹھنے میں اب دیر کرو گے
تو گویا اندھیر کرو گے
وقت ہے کم آ جاؤ
جاگو اور جگاؤ
مغنی کا پیغام یہی ہے
جینے یہی آرام یہی ہے
ملک کے کام بناؤ
جاگو اور جگاؤ

سید محمد عبدالمغنی۔ اجمیر

لڈو کا ٹکڑا

محمد شفیع الدین صاحب نیر

یہ خیال ایک انگریزی نظم سے لیا گیا ہے۔ چیزوں کے بیان میں ہندوستانی حالات سے مطابقت دے دی گئی ہے۔ نیر

(۱)

یہ وہ لڈّو کا ٹکڑا ہے
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اس کے گھر میں رکھی تھی
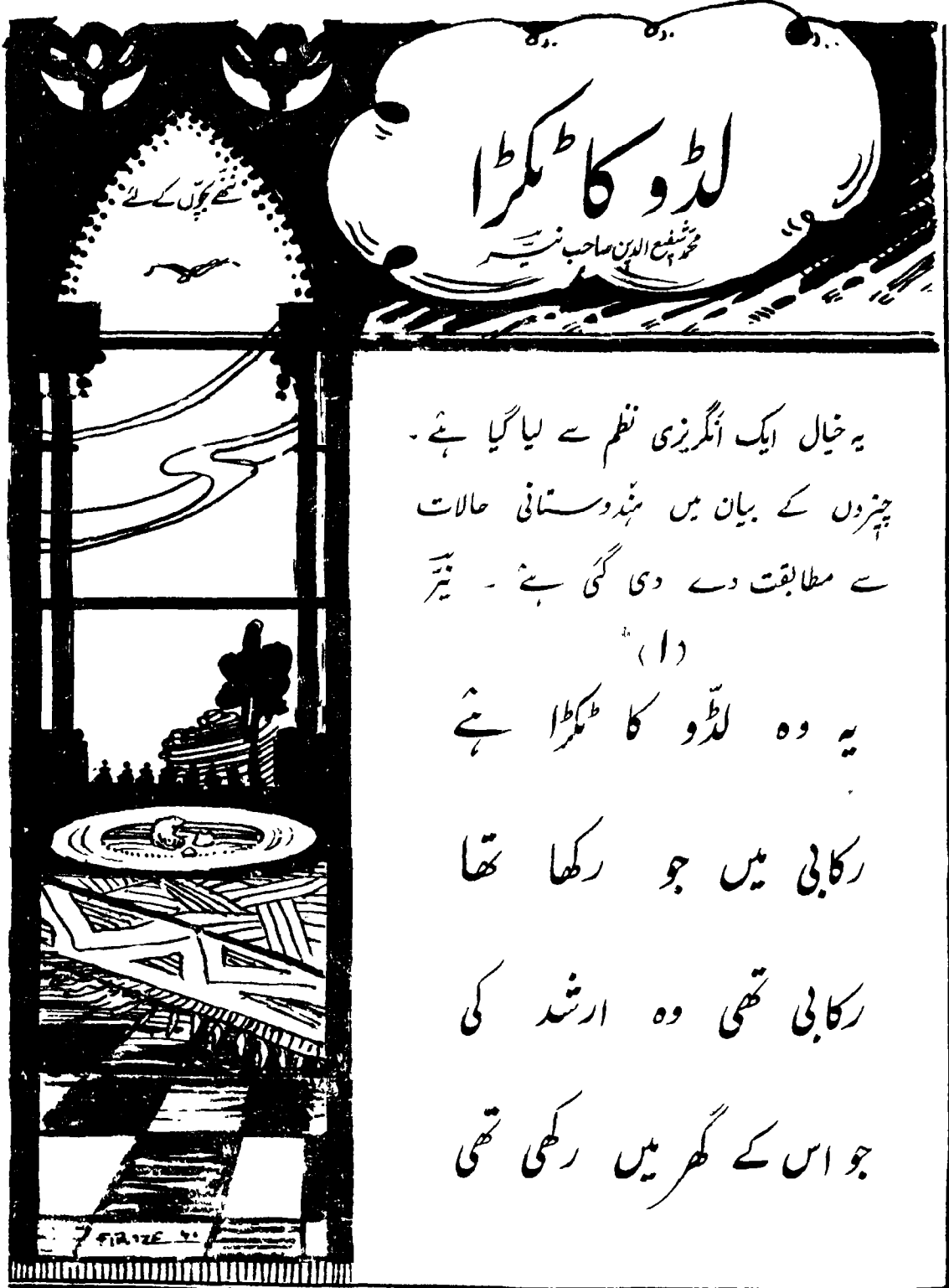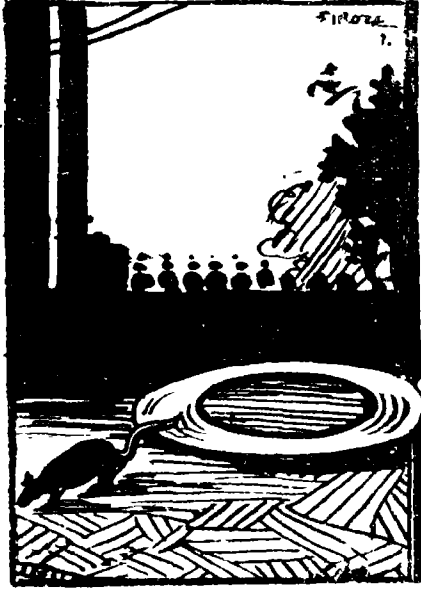
(۲)

یہ چوہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اسی نے کھا لیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

(۳)

یہی بلّی ہے وہ خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھّا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھّی تھی

(۴)

یہ دیکھو ہے وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا
وہی بلّی جو ہے خالہ
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ذرا دِل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھّا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اس کے گھر میں رکھی تھی
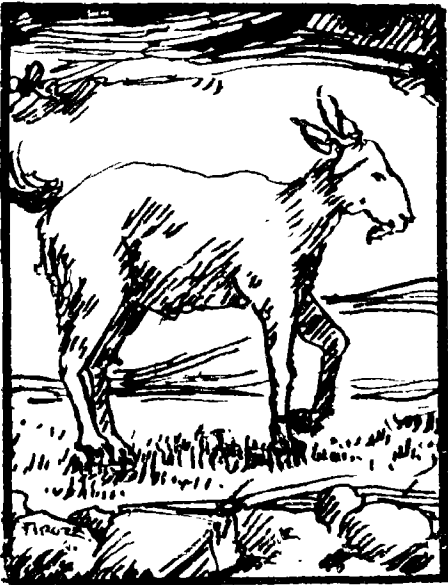
(۵)

یہ ہے کس شخص کا بکرا ؟
کہ جس نے کُتّے کو مارا
وہی کُتّا وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا

وہی بلّی جو ہے خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اس کے گھر میں رکھی تھی

(۶)

گڈریے کا یہ ہے لڑکا
یہ لڑکا ہے بہت اچھّا
اِسی کا تو وہ بکرا تھا
کہ جس نے کُتّے کو مارا
وہی کُتّا وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا

وہی بلّی جو ہے خالا

کہ جس نے چوہے کو مارا

وہ چوہا جو یہاں آیا

ڈرا دل میں نہ شرمایا

اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا

رکابی میں جو رکھّا تھا

رکابی تھی وہ ارشد کی

جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

(۷)

یہی تو گھر ہے لڑکے کا
جو لڑکا ہے گڈریے کا
اسی لڑکے کا تھا بکرا
کہ جس نے کتّے کو ڈانٹا
وہی کتّا وہی کتّا
کہ جِس نے بلّی کو گھیرا
وہی بلّی جو ہے خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ذرا دِل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھّا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

پرندوں کا سفر

ورزش اور چہل قدمی کے فائدوں سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ عادتیں بڑھتے بڑھتے مرض کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ ہمارے دوست ہاشمی صاحب بھی کچھ اسی طرح کے مریض ہیں۔ دفتر کے کام کے علاوہ ان کے بس دو ہی مشغلے ہیں۔ پرندوں پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا اور ٹہلنے کے لئے دور دور نکل جانا۔ اکثر مجھ پر بھی کرم فرماتے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹہلنے میں ایک بات ضرور ہے، چاہے کتنے دور چلے جایئے تھکن نہیں معلوم ہوتی۔ باتیں ایسی دلچسپ اور اچھے داد کرتے ہیں کہ آدمی کا دھیان بٹا رہتا ہے۔

ایک دن ہم ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے دور نکل گئے۔ ہاشمی صاحب نے کہا "چلو سامنے کی پہاڑی پر بیٹھ کر ذرا دم لے لیں پھر واپس چلیں"۔ جب ذرا دھندلکا سا ہوا تو ہم واپس چلنے کے لئے تیار ہوئے اتفاق سے اس وقت میری نظر اوپر اٹھ گئی۔ پرندوں کے غول کے غول ایک طرف کو اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے کہا "دیکھئے اس وقت شفق پھول رہی ہے سامنے دُھندلی دُھندلی دلّی کی جامع مسجد نظر آرہی ہے ایسے میں ان چڑیوں کا اُڑنا کیسا اچھا لگ رہا ہے۔"

ہم دونوں بڑی دیر تک نظر جمائے انھیں دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ وہ نظروں سے غائب ہونے لگیں اور آخر میں بس ایک دُھندلا سا نشان باقی رہ گیا۔ میں نے کہا "ہاشمی صاحب چلئے اب واپس چلیں، دیکھئے پرندے بھی بسیرا لینے کے لئے اپنے ٹھکانوں پر جارہے ہیں۔" ہاشمی صاحب اس وقت کچھ کھوئے ہوئے تھے میری بات سن کر چونکے اور چلنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے پہاڑی سے نیچے آکر کہنے لگے "یہ پرند اس وقت بسیرا لینے نہیں جارہے ہیں بلکہ سفر میں ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں برسات ختم ہوگئی ہے۔ جاڑے کا موسم شروع ہونے والا ہے اس وقت بہت سے پرند ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ یہ آمد و رفت موسموں کے لحاظ سے برابر جاری رہتی ہے۔" میں نے کہا "اتنا تو میں نے بھی سنا ہے کہ بعض موسموں میں چڑیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ مگر بس اتنا ہی جانتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں"

کہنے لگے "جی ہاں دن بھر بیٹھے گپ ہانکنے سے وقت تو بے شک اچھا گذر جاتا ہے مگر اس میں تھوڑا سا نقصان ہے اور وہ یہ کہ آدمی ذرا جاہل رہ جاتا ہے۔ ارے بھئی موسم بدلتے وقت پرند تو پرند اکثر چوپائے اور مچھلیاں تک ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی ہیں مثلاً سیل مچھلی سردیوں کے موسم میں پری بی لوف (PRIBILOF) جزیروں سے بیرنگ سی (BERING SEA) میں جنوبی کیلی فورنیا تک چلی جاتی ہے۔ قطبی ہرن یا رینڈ یر اسی موسم میں چارے اور گل مہندی اور صنوبر کے سایے کی تلاش میں جنوب کی طرف برٹش امریکہ کے اندرونی حصے تک پہنچ جاتے ہیں۔ شاڈ (SHAD) اور سالومن (SALMON) مچھلیاں محض انڈے دینے کے لئے سمندری دریاؤں تک سینکڑوں میل کا سفر کرتی ہیں۔ اسی طرح ٹڈے اور بعض قسم کی تتلیاں دور دور کا چکر لگاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی یہاں تک کہ انسان بھی سیاحت اور سفر میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔ "ہاشمی صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ انسانوں نے دنیا کے چکر لگائے ہیں ساری دنیا کے بھلا ان کا اور پرندوں کا کیا مقابلہ"

ہاشمی صاحب بولے "جی ہاں یہ صحیح ہے لیکن ذرا اس پر بھی تو غور کیجئے کہ انسان یہ سفر دوسروں کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتا۔ وہ زمین یا میدان پر جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ مگر جتنا فاصلہ وہ دنوں میں طے کرے گا چڑیاں اتنی دور ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گی۔ پھر سمندر کے سفر کے لئے انسان کو کشتی یا جہاز کی ضرورت ہوگی۔ راستہ معلوم کرنے کے لئے قطب نما اور نقشے ساتھ لینا ہوں گے۔ مسافروں اور جہاز رانوں کے لئے کھانے پینے کا ذخیرہ رکھنا ہوگا۔"

لیکن سفر کرنے والے پرندے اس قسم کی مدد سے بے نیاز ہیں۔ اُن کے پاس ریل ہے نہ موٹر، نہ جہاز، وہ اپنے ساتھ نہ نقشے رکھتے ہیں نہ قطب نما۔ باوجود اس کے وہ دنیا کے بعض ایسے حصوں میں آسانی سے پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان کو پہنچتے پہنچتے برسوں لگ جائیں۔ بلکہ وہ تو ایسی جگہوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں جو انسان کے لئے ابھی تک نامعلوم ہیں۔

آپ نے قطب شمالی کی مہموں کا حال تو پڑھا ہوگا۔ کن مشکلوں سے انسان برف کے بہتے ہوئے تودوں کے درمیان راستہ بناتا ہے۔ کبھی کبھی تو آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر برف کے پہاڑوں سے ٹکرانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے اور جس وقت یہ انسان اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آگے کی طرف راستہ نکالنے میں لگا ہوتا ہے، مرغابیاں آسمان میں اس کے سر پر بڑے اطمینان سے بغیر پر ہلائے سفر کرتی یا ہوا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

پینگن (ایک بحری پرندہ) قطب جنوبی کے سمندر میں بڑے مزے سے تیرتا ہے اور جہاں اُسے برف کی وجہ سے سطح پر راستہ نہیں ملتا وہ پانی کے اندر غوطہ لگاتا ہے

پانی کی سطح کے مقابلے میں پانی کے اندر وہ زیادہ تیزی اور زیادہ آرام کے ساتھ سفر طے کرتا ہے، بالکل جیسے پروں والی آب دوز کشتی۔

پہاڑوں کی بہت سی چوٹیاں اتنی اونچی اور اس قدر ڈھلواں ہیں کہ اب تک انسان کے قدم وہاں تک نہیں پہنچ سکے ہیں لیکن پرندے ان پر بیٹھ کر گویا اپنے سفر کی تھکن دور کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے بھی اوپر۔ کہیں بلندی پر اڑتے ہیں۔ کہئے اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ چڑیاں دنیا میں سب سے زیادہ ہوا باز بلکہ سب سے زیادہ سفر کرنے والی ہیں انسان بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے عرض کیا" لیکن قبلہ ایک بات تو بتائیے انسان کا معاملہ تو یہ ہے کہ یا تو وہ خود سفر کرتا ہے۔ اس سے اسے نئے نئے تجربے نئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نئے نئے منظر دیکھنے میں آتے ہیں نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے یا پھر وہ سیاحوں کے سفر نامے پڑھتا ہے۔ مگر چڑیاں اپنے سفر کے متعلق ڈائری لکھ سکتی ہیں نہ کتابیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان ان کے سفر کا حال معلوم کرنے کے لئے ہوائی جہاز ہی پر بیٹھ کر سہی، ان کے پیچھے پیچھے پھرے پھر آخر یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوتی ہیں"۔ ہاشمی صاحب ہنس کر کہنے لگے" واہ بھائی اب تو آپ عقل کی باتیں کرنے لگے۔ بھائی صاحب خدا کے بہت سے بندوں نے پرندوں کے مختلف حالات معلوم کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ان میں سے کچھ تو پرندوں کی غذا کی تحقیق کرتے رہتے ہیں کچھ ان کی گھونسلا بنانے کی عادت کی اور کچھ ان کے سیر و سفر کی

یورپ میں بہت سے لوگ برسوں سے اس طرح کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے محض اسی لئے جنوب کا سفر کیا ہے جو بہت سے پرندوں کا یوں سمجھئے کہ گرمی کا وطن ہے۔ وہ شمال کی طرف گئے ہیں جو ان کا موسم سرما کا وطن ہے اُنھوں نے ان پرندوں کو ادھر اُدھر سفر کرتے دیکھا ہے اور دم لینے کے لئے جہازوں پر بیٹھتے دیکھا ہے۔ اُنھوں نے سمندر کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر اُنھیں غذا کی تلاش میں رکتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر اُنھیں رات میں سفر کرتے دیکھا ہے اور جناب والا یہ تجربے ان تحقیق کرنے والوں نے کتابوں میں لکھے ہیں اور یہ کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔۔۔۔۔۔"

ہم دونوں اس گفتگو میں محو بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔ اتنے میں ہاشمی صاحب کا گھر آگیا مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لئے آگے بڑھ گیا۔ ہاشمی صاحب کو اور کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میں ذرا دور نکل گیا تو ہاشمی صاحب چلا کر بولے" کل اسی موضوع پر ہماری آپ کی پھر گفتگو ہوگی اور میں آپ کو پرندوں کے سفر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتاؤں گا۔ مثلاً پرندے کس طرح سفر کی تیاری کرتے ہیں کہاں جاتے ہیں اور کب جاتے ہیں۔ کس طرح اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں اور اپنی منزل پر پہنچ کر وہاں کس طرح رہتے سہتے ہیں۔ میں نے وہیں سے جواب دیا" ضرور ضرور۔ مجھے بھی اب دلچسپی پیدا ہو گئی ہے" اس پوری گفتگو کو آپ سالگرہ نمبر میں دیکھیں گے میری طرح پیامیوں کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تو ہماری آپ کی تمام بات چیت پیام تعلیم میں چھاپ دی جائے گی۔ اچھا آداب عرض۔"

منظر

دریا کا کنارہ ہے۔ ایک طرف ایک مُربع میں خیمے لگے ہوئے ہیں۔ کیمپ کے بیچوں بیچ صحن میں ببُول کا ایک پیڑ ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر آگ روشن ہے۔ آگ کے گرد کچھ اسکاوٹ اپنے ایک استاد کے ساتھ تفریح کی باتوں سے دن بھر کی تکان اُتار رہے ہیں۔ آسمان تاروں سے جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔

غوث :(تاروں کی طرف کھوئے ہوئے سے عالم میں دیکھتے ہوئے) ماٹ صاحب! اگر مجھے کوئی جادو کا کھوڑا مل جائے تو ایک ایک کر کے ان سارے ستاروں کی سیر کر ڈالوں۔

سکندر:(ناک سے آواز نکالتے ہوئے) لو بھئی لو، انھیں تو بڑی دوُر کی سوجھی۔ اتنی جلدی دُنیا سے گھبرا گئے۔ (سب قہقہہ لگاتے ہیں)۔ ارے تُم سب ہنستے کس بات پر ہو۔ ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔

غوث :۔ دیکھو سکندر ہر وقت کا مذاق ٹھیک نہیں تم نہیں جانتے میری عادت بہت بُری ہے

سکندر :۔ یہ تو خوب جانتا ہوں کہ تمھاری عادت کتنی بُری ہے۔ تُمھاری عادت کو ہم ہی نے بگاڑا ہے ۔ رہیں زمین پر خواب دیکھیں تاروں کے۔ ماٹ صاحب! ...... آپ انھیں سیر پری والا جادو کا کھٹولا ابھی منگوا دیجیے۔

اُستاد :۔ بھائی مشکل تو یہی ہے کہ آخر غوث میاں کو کون سی سواری دی جائے کہ وہاں تک پہنچ جائیں۔

مشکوُر :۔ (جلدی جلدی آنکھیں مچکاتے ہوئے۔) صاحب ان کے لئے ایروپلنگ کا انتظام کر........

(سب کے سب ہنس پڑتے ہیں۔ ایک آواز۔ بھائی یہ "ایروپلنگ" خوب ہے اسے ضرور حاصل کرو۔ (مشکور جھینپ گئے۔ وہ ایروپلین (ہوائی جہاز) کہنا چاہتے تھے)

اخلاق :۔ (استاد کی طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے۔)
ماٹ صاحب تو آپ کی بات تو رہی جا رہی ہے!
(سب خاموش ہو جاتے ہیں)۔ ہاں ماٹ صاحب۔

اُستاد :۔ بھئی مشکور۔ تمھارے ہوائی جہاز سے کام نہیں چلے گا۔

پیچھے سے ایک آواز :۔ ایر وینگ کی اُردو ہوائی جہاز۔ نوٹ فرمالیں لوگ (قہقہہ۔)

اخلاق :۔ (پھر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے) ارے برادر ذرا چپ بھی رہوگے نہیں ..... احمد شاہ! بھائی تمھیں بہت مخول سوجھ رہا ہے۔

استاد :۔ ہوائی جہاز کی رفتار قریب قریب ۵۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔

جمیل : اُف او۔ ماٹ صاحب، تو پھر کیا مشکل ہے تاروں تک پہنچنا۔

استاد :۔ بات یہ ہے جمیل میاں کہ ستارے ہم سے اس قدر دور ہیں کہ اگر تم پیدا ہوتے ہی تیز سے تیز رفتار جہاز میں سوار ہو کر ستاروں کی طرف اُڑنے لگے۔ تو تمھارا بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور موت کی ساری منزلیں راستے ہی میں ختم ہو جائیں اور پھر بھی تم سب سے قریب کے ستارے تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

احمد : غوث، نوٹ فرمایا؟

غوث :۔ ارے بھئی جہاز نہ سہی تو اور کوئی سہی ماٹ صاحب ابھی بتائیں گے۔

اُستاد :۔ کائنات میں سب سے زیادہ تیزی سے سفر کرنے والی چیز روشنی ہے۔

صمد :۔ ارے باس صاب کیا رفتار ہوگی اس کی؟

استاد :۔ اس کی رفتار ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ۔

مشکور :۔ اوں ہوں۔ ایک لاکھ۔ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ۔

ایک نامعلوم آواز :۔ پھر بولے!

جمیل :۔ تو روشنی کے ذریعے اگر کوئی انتظام کیا جائے تو تو ہم تاروں کی دنیا تک چند منٹوں میں پہنچ جائیں گے۔

غوث :۔ اور کیا۔

استاد :۔ ویسے ہی کہہ دیا اور کیا۔ ستارے ہم سے کس قدر دور ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ہم سے سب سے قریب کا جو ستارہ ہے اس کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں ۴ سال ۴ مہینے لگتے ہیں۔

صمد :۔ اس ستارے کا نام کیا ہے، ماس صاب؟

استاد :۔ بھئی اس کا نام ہے (ALPHA CENTAURI)

احمد :۔ اس کا اُردو میں کیا نام ہے، صاب؟

استاد :۔ بھئی ہمیں تو یہی انگریزی کا نام معلوم ہے

ہاں عربی میں اسے رجل القنطورس کہتے ہیں۔

مشکور :۔ (آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے) یہ کون سا ستارہ ہے۔ ماٹ صاحب؟

اُستاد :۔ یہ ستارہ زمین کے شمالی نصف میں نظر نہیں آتا۔ اس سے بعد کا جو قریبی ستارہ ہے اس کی روشنی کو ہم تک آنے میں دس سال لگتے ہیں اس کا نام سِری اس SIRIUS یا DOG STAR ہے۔ عربی میں اسے شعرائے یانی کہتے ہیں۔

اخلاق :۔ اور سورج کی روشنی ماٹ صاحب؟

اُستاد :۔ سورج کی روشنی تو ہم تک صرف ۸½ منٹ میں آجاتی ہے۔

اعجاز :۔ DOG STAR سے دور تو اور بہت سے ستارے ہوں گے۔

اُستاد :۔ ہاں ستارے تعداد میں تو اتنے ہیں کہ ابھی تک اُن کا شمار نہیں ہو سکا ہے۔ ۴۷۰۰ ستارے تو بغیر دوربین کی مدد کے دیکھے جا سکتے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ دوربین کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ستارے گن لئے جائیں۔

غوث :۔ دوربین سے گننا کون سی مشکل ہے سب دکھائی دیتے ہوں گے اس میں تو۔

اُستاد :۔ دوربین کی جیسے جیسے طاقت بڑھتی جا رہی ہے، اتنے ہی زیادہ ستاروں کے متعلق معلومات بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔

صمد :۔ تو ماٹ صاحب اب تک کتنی طاقت کی دوربین بن چکی ہے۔

اُستاد :۔ امریکہ میں رصدگاہ وسن کی دوربین دنیا کی سب سے بڑی دوربین ہے۔ اس کے شیشے کا قطر ۱۰۰ انچ کا ہے۔ اس دوربین سے ایک ارب پچاس لاکھ ستاروں کی تصویریں لی جا چکی ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اب ایک ایسی دوربین بنائی جائے جس کے شیشے کا قطر ۲۰۰ انچ ہو۔

مشکور :۔ یہ ستارے بھی چاند کی طرح کیا سورج کی روشنی سے چمکتے ہیں؟

اُستاد :۔ نہیں، بلکہ ہر ستارہ اپنی جگہ ایک سورج ہے۔ سِری اس (شعرائے یانی) کی روشنی تمہارے سورج سے ۳۰ گنا زاید ہے۔

غوث :۔ اوہ! معلوم یہ ہوا ماسٹر صاحب کہ ہماری زمین، ہمارا چاند اور ہمارا سورج تو کائنات میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔

اُستاد :۔ اِس میں کیا شک ہے، ہماری دنیا تو ریگستان میں ریت کے ذرّے کی طرح ہے۔ کائنات کی حدیں کہاں ختم ہوتی ہیں، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ ریڈیو پر آواز انگلستان سے آسٹریلیا صرف ⅕ سکنڈ میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اکثر ستاروں سے

بھیجا ہوا ریڈیو کا پیغام ہم تک ہزاروں برس میں بھی تو نہیں پہنچے گا۔

جمیل:۔ ماسٹر صاحب وہ ستارہ ان میں سے کون سا ہے جس سے سمتیں معلوم کرتے ہیں۔

احمد:۔ لو دیکھو، بھائی کو ابھی تک قطب تارہ بھی معلوم نہیں۔

حسن:۔ (طنز کے ساتھ) اچھا تو تم ہی بتا دو نا شاہ صاحب!

احمد شاہ نے جھینپتے ہوئے انداز میں آسمان پر نظر دوڑائی۔ ان کے ساتھی مذاق میں اِدھر اُدھر یوں ہی اُنگلی اُٹھا دیتے اور چلاتے "وہ رہا قطب تارہ!" پھر کوئی دوسرا کہتا "نہیں وہ نہیں یارو۔ وہ ہے۔ وہ دیکھو وہ!"

استاد:۔ بھئی سُنیے! وقت تھوڑا ہے، رخصت کی سیٹی بج گئی تو یہ بات رہ جائے گی۔

حسن:۔ احمد شاہ بھائی تمھیں جو سوجھتی ہے، ایسی ہی سوجھتی ہے۔ کیا کچھ اب بھی چڑھی ہوئی ہے۔

(اس آخری فقرے پر سب ہنس دیتے ہیں۔ کیوں کہ احمد شاہ نے پچھلی کیمپ فائر (تفریح کے وقت) میں چرس پینے والے جوگی کا پارٹ کیا تھا۔)

استاد:۔ ذرا چپ بھی ہو جاؤ۔ دیکھو آسمان پر سر کے اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر ڈالو تمھیں چار ستارے اس شکل میں نظر آئیں گے (دیکھو اس طرح زمین پر انگلی سے نقشہ بناتے ہوئے)
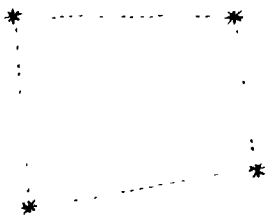
ایک آواز:۔ ارے یہ تو دِکھ گیا ماسٹر صاحب، وہ رہا ایک کھٹولا سا!

اخلاق:۔ (پھر ایک طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے۔) اب کھٹولے اور پلنگ تو رہنے دو جو ماسٹر صاحب کہہ رہے ہیں اُسے سن لو۔

استاد:۔ اچھا اس کھٹولے کے ایک پائے کی طرف تین تارے اور ہیں۔ دیکھو

دب اکبر

کئی آوازیں ایک ساتھ:۔ ارے ماسٹر صاحب وہ تو یہ رہے۔ یہ ہیں۔ ہاں بھئی یہ ہیں۔

استاد:۔ اب اس کے دوسرے پائے کی سیدھ میں نظر ڈالو۔ اے یہ دیکھو، یہ

یہ ہے قطب تارہ

دُب اکبر

قطب تارا

ایک آواز :۔ جمیل میاں دکھائی دیا۔

جمیل :۔ بھائی شاہ صاحب سے پوچھو۔

صمد :۔ اس کا ڈھونڈنا تو بڑا آسان ہے۔

استاد :۔ ہاں یہ تارہ ہمیشہ قطب شمالی کی طرف ہوتا ہے۔ اور اسی سے شمال کی سمت معلوم کی جاتی ہے۔ اور کھٹولے کے چار ستارے اور تین ستارے زنجیر بناتے ہوئے اس کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ لیکن قطب تارہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ باقی سات تاروں کو "دُب اکبر" کہتے ہیں۔ اور قطب تارے کے ساتھ کبھی ان کی شکل یہ ہوتی ہے (زمین پر انگلی سے شکل بناتے ہوئے۔

قطب تارا

دُب اکبر

کبھی یہ

دُب اکبر
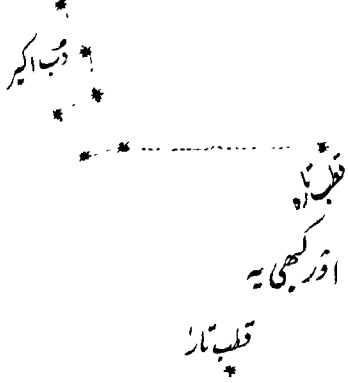
قطب تارہ

اور کبھی یہ

قطب تارا

دُب اکبر

قطب تارے کو ڈھونڈنے کی ایک اور آسان ترکیب یہ ہے کہ دُب اکبر سے مخالف طرف قطب تارے سے اتنے ہی فاصلے پر جتنے فاصلے پر اُس سے دُب اکبر ہے ایک ستاروں کا بُرج اس شکل کا ہوتا ہے

ذات الکرسی ملکہ

ایک آواز :۔ یہ تو ماسٹر صاحب (M یا W) کی شکل ہے۔

اُستاد :۔ ہاں بالکل یہی۔ اس کا نام ذات الکرسی ملکہ (CASSIOPEIA) ہے۔ اب دُب اکبر قطب تارہ اور ملکہ ذات الکرسی کا باہمی تعلق ان شکلوں سے اور

صاف ہو جائے گا۔

استاد :- اچھا بھائی۔

دُبِ اکبر
قطب تارا
ملکہ ذات الکرسی

قطب تارہ
دُبِ اکبر

ملکہ ذات الکرسی
قطب تارہ
دُبِ اکبر

قطب تارہ

اعجاز :- یہ شکلیں تو بڑے کام کی ہیں۔ انھیں تو کاپی پر بنا لیں گے۔

(ایک طرف سے سیٹی کی آواز آتی ہے۔)

احمد :- ارے ابھی سے ۹ بج گئے۔ گھڑی تو دیکھو کوئی۔

حسن :- ہاں بھئی ٹھیک نو بجے ہیں۔
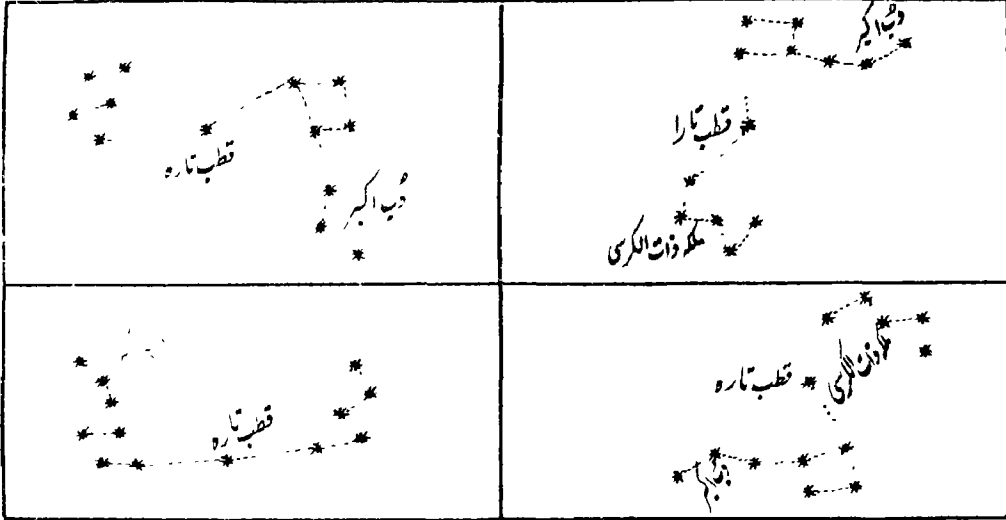
اخلاق :- ماسٹر صاحب، ذرا ایک دفعہ وہ تو ہو جائے...... وہ

اعجاز :- کیا کہا ...... ؟

سب ایک ساتھ بولتے ہیں۔ ہاں، ہاں ماسٹر صاحب، ضرور ہو گی .... سب مل کر گاتے ہیں: کیا کہا ٹماٹر نے جب گیا......

اچھے شہری

جناب لطیف فاروقی صاحب ایڈیٹر سعادت

تارے چھپے نہ ہوں جب
اٹھ کر کریں دعائیں
بن جائیں اچھے شہری

دل میں نہ یہ کبھی ہو
اور لیں نہ بد دعائیں
بن جائیں اچھے شہری

اخلاق رکھیں اپنے
خوش خوش وہ پیش آئیں
بن جائیں اچھے شہری

ہم سے جسے بھی دکھ ہو
خلق اپنا یہ دکھائیں
بن جائیں اچھے شہری

باتیں کہیں نہ جھوٹی
جھوٹی نہ قسمیں کھائیں
بن جائیں اچھے شہری

اپنوں سے ہو محبت
یوں سب سے لو لگائیں
بن جائیں اچھے شہری

دل میں نہ ہو بڑائی
اکڑیں نہ سر جھکائیں
بن جائیں اچھے شہری

اٹھیں سویرے ہم سب
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

تکلیف دیں کسی کو
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

خوش ہوں پرائے اپنے
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

کہہ دیں معاف کر دو
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

باتیں سہیں نہ جھوٹی
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

غیروں سے ہو محبت
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

عاجز نہ دیں دکھائی
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

ایک چرواہا چشمے کے پاس اُداس بیٹھا اپنا دُکھڑا رو رہا تھا، اپنی مصیبت اور ناقابلِ تلافی نقصان کی داستان سُنا رہا تھا۔ سبب یہ تھا کہ کچھ دن پہلے اس کا ایک پیارا بکری کا بچہ دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ چرواہے کی داستان سن کر چشمہ غصے سے سرسرانے لگا۔ اس نے کہا: "اے لالچی دریا۔ کیا ہوتا اگر کہیں تیری تہ ویسی صاف اور سب کی نظروں کے سامنے کھلی رکھی ہوتی جیسی کہ میری اور ہر شخص تیری گندلی تہ میں ان تمام چیزوں کو دیکھ سکتا جنھیں تو اپنی ہوس میں نگل گیا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں تو شرم کے مارے زمین کے اندر گھس جاتا اور تاریک گہرائیوں میں اپنا منہ چھپا کر بیٹھ رہتا۔ مجھے پانی اسی افراط سے نصیب ہوا ہوتا جیسے کہ تجھ کو تو میں تو قدرت کا ایک زیور بن کر دنیا کو سجا دیتا۔ اور چھوٹی سی چھوٹی چیز کو کو نقصان نہ پہنچاتا۔ میرا پانی سنبھل سنبھل کر بہتا اور ہر جھونپڑی اور جھاڑ کو بچا کر نکل جاتا وہ کنارے جنھیں چھوٹے چھوٹے دریا کاٹتے رہتے ہیں میرے گن گاتے۔ میں وادیوں اور چراگاہوں کو سرسبز کرتا اور ان کی ایک سوکھی پتی کو بھی بہا نہ لے جاتا۔ مختصر یہ کہ میں بھلائی کرنے والوں کی راہ پر چلتا، کسی کو دُکھ پہنچاتا نہ نقصان، اور میرا پانی سمندر میں گرتا تو ایسا چمکیلا ہوتا جیسے چاندی۔"

چشمے نے زبان سے یہ سب کہا: اور اس کے دل میں بھی یہی بات تھی۔ پھر ہوا کیا؟ اس بات کو کچھ ہفتے بھی گذرے تھے جب ایک طوفانی بادل قریب کے کسی پہاڑ پر برس پڑا چشمے میں پانی کی ویسی ہی افراط ہوگئی جیسی کہ دریا میں۔ مگر ہائے اب چشمے کی وہ نیکی ساری غائب ہوگئی۔ اس کا گندلا پانی تھپیڑے مارتا ہوا کناروں سے بہہ نکلا، ابلا، گرجا اس کے گرد ابل میلا میلا جھین اچھلنے لگا۔ اس نے سینکڑوں برس پرانے درختوں کو لٹا دیا۔ اس کا پتہ دھماکوں کی آواز دور سے دینے لگی ... اور تو اور وہی چرواہا جس کی خاطر چشمے نے دریا کو ایسے دل نشین الفاظ میں لعنت ملامت کی تھی، خود اس میں ڈوب گیا، اس کا گلہ سارا بہہ گیا اور اس کی جھونپڑی کا نام و نشان تک مٹ گیا

ایسے بہت سے چشمے ہیں جو مسکین معلوم ہوتے ہیں۔ ؎

؎ آہستہ آہستہ بہتے ہیں اور اپنی قُل قُل سے دل کو خوش کرتے ہیں صرف اس لئے کہ ان میں پانی کم ہوتا ہے ؛

ہوائی جہاز کی کہانی

نورالحسن صاحب ہاشمی
ایم۔اے علیگ

ہوا میں اڑنا کون نہیں پسند کرتا۔ پرانے زمانے سے لوگ اب تک برابر سوچتے آئے ہیں کہ ہوا میں کیوں کر اڑا جائے۔ کوئی سوپ باندھ کر اڑنے کی کوشش کرتا کوئی بڑے بڑے پر بنا کر لٹکا لیتا ایک قصہ مشہور ہے کہ جزیرہ کریٹ میں ایک شخص داداٗس نام کا تھا۔ اس نے ایک بھول بھلیاں بنائی تھی تاکہ مجرموں اور ملک کے دشمنوں کو اس میں بند کیا جائے۔ اتفاق سے کریٹ کا بادشاہ خود داداٗس سے ناراض ہوگیا۔ اس کو اور اس کے لڑکے ایکارس کو اس بھول بھلیاں میں بند کر دیا اور یہاں داداٗس بھی اس سے نکلنے کا راستہ بھول گیا۔ دونوں نے کئی دن تک اس میں چکر کاٹے۔ آخرکار انھوں نے ایک ترکیب سوچی اور پروں کو موم سے جوڑ جوڑ کر چار بڑے بڑے پر تیار کئے۔ دو اپنے لئے دو اپنے لڑکے کے لئے اور ان پروں کو اپنے بازوؤں پر لگا کر اس بھول بھلیاں سے اڑ کر بھاگے۔ کہتے ہیں کہ داداٗس بغیر کسی حادثے کے جزیرے میں پہنچ گیا۔ لیکن اس کا لڑکا ایکارس بہت اونچا اڑ گیا۔ اونچا اڑنے سے سورج کی گرم گرم کرنیں اس کے پروں پر پڑیں۔ موم پگھل گیا اور وہ سمندر میں گر کر ڈوب گیا۔

اس طرح کی اور بھی کئی کہانیاں مشہور ہیں لیکن یہ سب کہانیاں ہی ہیں۔ دراصل سب سے پہلی سمجھ داری کی کوشش ۱۷۸۳ء میں شروع ہوئی۔ فرانس میں وارسائی کے قریب ایک گاؤں انونے ہے وہاں کے کچھ لوگوں نے جون کے مہینے میں کتان کے کپڑے کا ایک بہت بڑا غبارہ بنایا اور ایک کھیت میں اس

کو رکھ کر اُس کے نیچے آگ جلا دی تاکہ اس میں خوب دُھواں بھر جائے۔ تم نے آتش بازی والے غبارے دیکھے ہوں گے۔ جس طرح اِس کے نیچے آگ جلا دیتے ہیں اور وہ اُڑتا چلا جاتا ہے اسی طرح ان غبارے میں بھی یہی کیا گیا۔ کیوں کہ دُھواں ہوا سے ہلکا ہوتا ہے اور ہمیشہ اوپر کو اڑتا ہے۔ اس لئے خیال تھا کہ یہ غبارے کو بھی اوپر اُٹھا دے گا۔ چنانچہ سچ مچ وہ غبارہ ربڑ کے پھکنے کی طرح پھول گیا۔ اور اوپر اُٹھا لوگوں نے اس کی رسیاں کاٹ دیں جن سے وہ زمین سے بندھا ہوا تھا۔ غبارہ ہوا میں اونچا اٹھا اور ہوا کے رُخ پر کوئی دس منٹ تک برابر اُڑتا رہا اور قریب ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جا کر گر گیا۔ ہوا میں سچ مچ اُڑنے کی یہ پہلی کوشش تھی اور اس کے بنانے والے جو دو فرانسیسی بھائی مانٹگلفیر نامی تھے واقعی بڑی تعریف کے مستحق ہیں۔

جب ان لوگوں کو چسکا لگ گیا تو اُنھوں نے ستمبر ۱۷۸۳ء میں پھر ایک بڑا غبارہ وارسائی سے اُڑایا۔ اور اس میں دو تین جانور بطخ، مُرغی اور بھیڑ بھی رکھ دئے۔ یہ تین جانور گویا پہلے جاندار تھے جو ہوا میں اُڑے۔ غبارہ آٹھ منٹ تک ہوا میں اُڑتا رہا۔ اور پھر دو میل پر جا کر گر گیا۔

جب اس میں کامیابی ہوئی تو پھر اسی سال نومبر میں ایک فرانسیسی شخص اوزئیر نامی نے طے کیا کہ اب وہ خود غبارے میں بیٹھ کر جائے گا۔ چنانچہ جان پر کھیل کر یہ شخص غبارے میں بیٹھ گیا۔ غبارہ حسبِ معمول اُڑا اور کوئی ۲۵ منٹ اُڑتا رہا۔ اس کے بعد ۵ میل کے فاصلے پر جا کر گر گیا۔ ذرا سوچو اس پہلے شخص کو کتنا لُطف آیا ہوگا جب وہ یہ محسوس کر رہا ہوگا کہ میں پہلا شخص ہوں جو اُڑ رہا ہوں۔

اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ غبارے میں پھوس

لکڑی وغیرہ کی آگ جلا کر دُھواں بھر دیتے تھے لیکن کچھ دنوں بعد مانٹگلفیر بھائیوں نے محسوس کیا کہ دراصل دُھوئیں کی وجہ سے غبارہ نہیں اُڑتا بلکہ گرم ہوا کی وجہ سے اُڑتا ہے۔ کیوں کہ گرم ہوا ہلکی ہوتی ہے اور ہلکی ہونے کے سبب سے اوپر اُٹھتی ہے۔ جب یہ بات اُن کو معلوم ہوئی تو اُنھوں نے ایسا انتظام کیا کہ آگ برابر

غبارے کے نیچے جلتی رہے (جیسا کہ تم آتش بازی کے غباروں میں دیکھتے ہوگے۔) اس ترکیب سے واقعی غبارہ اوپر دور جانے لگا۔ لیکن اس میں یہ دقت پھر بھی باقی رہی کہ زیادہ کوئلہ، زیادہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

چنانچہ اب لوگوں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ کوئی اور ایسی چیز بھی ہے جو معمولی ٹھنڈی ہوا سے ہلکی ہو؟ لوگوں نے خوب خوب سوچا اور بہت سے تجربے کئے ہوا میں جتنی مختلف گیسیں ہوتی ہیں سب کو جانچا اور آخر کار پتہ لگا ہی لیا کہ ہائیڈروجن گیس ہوا سے چودہ گنا کم ہلکی ہوتی ہے۔ بس پھر کیا تھا یہ بھید معلوم ہوتے ہی گرم ہوا کی بجائے غباروں میں ہائیڈروجن گیس بھری جانے لگی اور خوب خوب غبارے اُڑنے لگے۔ لیکن ابھی پھر بھی اس میں ایک کمی تھی وہ یہ کہ غبارہ اسی طرف اُڑتا جدھر کی ہوا ہوتی تھی۔ یعنی غبارہ بالکل ہوا کی مرضی پر تھا۔ جدھر وہ چاہے اُڑائے جائے۔

پھر لوگوں نے ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ جس میں سے ایک بڑی دلچسپ ہے۔ ایک صاحب نے یہ ترکیب کی کہ کپڑے کے چپو بنائے اور جس طرح کشتی کو پانی میں کھینچتے ہیں اسی طرح غبارے کو ہوا میں کھینچا جایا تمام لوگ دیکھتے اور ہنستے تھے۔ لیکن خیر رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کی ترکیبیں سوچ لیں اور اب غبارے سگار کی شکل کے بنائے جانے لگے۔ جن میں انجن اور پنکھے لگائے جاتے ہیں۔ تاکہ ہوا کے خلاف اُڑ سکیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں سنتاس ڈومن نامی ایک شخص نے ایک بہت بڑے سگار کی شکل کے غبارے کو پیرس کے مشہور ایفل مینار کے چاروں طرف ۱۱ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑایا۔ اس وقت سے یہ سمجھا جانے لگا کہ بس اب تمام مراحل طے ہوگئے اور اب ہوا بازی خوب خوب ترقی کرے گی۔

جرمنی نے جو یہ دیکھا کہ واقعی ہوا بازی سے بہت فائدے ہوں گے تو اُس نے بھی فرانس کی دیکھا دیکھی اس میں ترقی کرنا شروع کی۔ اس خیال سے اور بھی کہ جب کبھی لڑائی ہوگی تو اس میں اس سے کام لیا جائے گا جرمنی تو یوں ہی لڑاکا ہے ہی۔

جرمنی میں ایک شخص کاونٹ زیپلین (ZEPLEN) نے تو ہوائی جہاز بنانے کو اپنی زندگی کا مقصد ہی ٹھہرا لیا اور اس نے اس میں خوب نئی نئی باتیں نکالیں۔ یہاں تک کہ جرمنی فن ہوا بازی میں بہت جلد فرانس سے بڑھ گیا۔

زیپلین نے اس میں بڑی ترقیاں کیں۔ اس نے دیکھا کہ گیس کے تھیلوں میں اوپر جا کر پھٹنے کو بڑے نکل آتے ہیں اس لئے اس نے اپنے جہاز کا ڈھانچہ المونیم سے تیار کیا۔ اور اس کے اندر چھوٹے چھوٹے سے خلئے بنا کر ہائیڈروجن گیس بھر دی اور

اندر ریشم کی استر کاری بھی کر دی - یہ گویا پہلا ہوائی جہاز تھا - اِس کی رفتار بھی زیادہ کر دی اور جدھر چاہتے اس کو بآسانی موڑا جا سکتا تھا - اس جہاز کا نام اسی کے نام پر زیپلن رکھا گیا۔

جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو جرمنی کے پاس بہت سے زیپلن قسم کے ہوائی جہاز تھے اور جرمنی کو خیال تھا کہ وہ ان پر سے بم گرا کر فرانس اور انگلستان کو بڑا نقصان

کا اتنا اندیشہ نہ ہو - دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک دوسری گیس ہیلیم نامی ہے جو ہلکی بھی ہے اور جس میں آگ بھی نہیں لگتی - چنانچہ ۱۹۱۶ء سے اس گیس کا استعمال ہونے لگا اس وقت سے زیپلین ہوائی جہاز آرام دہ اور محفوظ ہو گئے - ہیلیم گیس پہلے بہت کم مقدار میں ملتی تھی لیکن اس کو بنایا بھی جانے لگا جس سے اور بھی آسانی ہو گئی۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں
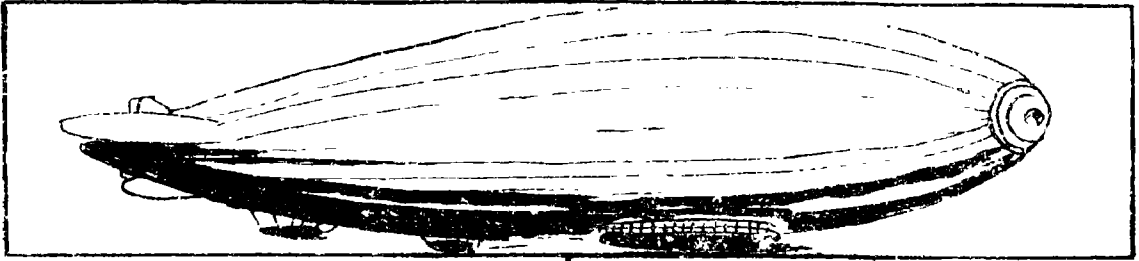
پہنچائے گا اور تھوڑا بہت اس نے نقصان پہنچایا بھی مگر جیسا سب کو معلوم ہے کہ جرمنی کی اُمیدیں پوری نہ ہوئیں۔

لیکن ابھی اس میں ایک کمی پھر بھی باقی رہی - بات یہ ہے کہ ہائیڈروجن گیس ایسی گیس ہے جس میں آگ بڑی آسانی سے لگ جاتی ہے انجن کی گرمی سے اکثر و بیشتر جہاز میں آگ لگ جایا کرتی تھی - اس کے چلانے والے ہوا بازوں کو ہر وقت خوف لگا رہتا کہ کہیں آگ نہ لگ جائے - چنانچہ اب پھر اس کی تلاش ہوئی کہ اس زیپلین میں کوئی اور چیز بھر دی جائے جس میں آگ لگنے

ایک بڑا جہاز (R - 101) آر ۱۰۱ نامی زیپلین کے طرز کا بنایا گیا اور اس کو انگلستان سے امریکہ تک اُڑایا گیا - یہ پہلا جہاز تھا جس نے بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) کو پار کیا - اڈنبرا سے نیویارک کا سفر اس نے ۱۰۸ گھنٹوں میں طے کیا اور پھر واپسی میں اسی سفر کو ۷۵ گھنٹوں میں ختم کیا - گویا اسی زمانے کے تیز سے تیز پانی کے جہازوں کے مقابلے میں پورے دو دن کم لگائے۔

(باقی)

ہماری کیمپنگ

حسن احمد قنوجی متعلم جامعہ

جب سے ہم جامعہ نگر اوکھلا آئے ہیں نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہماری زندگی بالکل بدل گئی ہے۔ کھلا میدان صاف ہوا۔ ورزش کھیل کود، تیراکی غرض کیا کیا بتاؤں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں جان پیدا ہوگئی ہے۔ پچھلے دنوں استادوں کے مدرسے کے ساتھ ہم کیمپنگ کے لئے گئے تھے۔ بہت دلچسپی رہی۔ میں یہاں اس کا مختصر سا حال لکھتا ہوں شاید پیامیوں کو بھی کیمپنگ کی زندگی کا لطف آجائے۔

ہمیں کچھ دنوں پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ کیمپنگ کے لئے فرید آباد جانا ہے۔ یہ اوکھلے سے کوئی دس، بارہ میل ہوگا۔ جتنے جانے والے لڑکے تھے سب خوش تھے۔ اور بے چین تھے کہ کب وہ دن آتا ہے۔ جانے سے ایک دن پہلے سب نے اپنا اپنا سامان درست کیا اور صبح تڑکے چلنے کی تیاری ہوئی۔ سب انصاری روڈ پر جمع ہوئے اور دایاں بایاں کرتے ہوئے پیدل روانہ ہوگئے۔ سنگ ساتھ میں سفر بہت دلچسپی سے کٹ رہا تھا۔ جمنا کی نہر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے کوئی آٹھ بج گئے تو ناشتے کی فکر ہوئی۔ ایک جگہ کنوئیں کے پاس درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ایک صاحب نے کمال کیا چپکے سے ایک پراٹھا لے سیدھے درخت پر۔ بہتیرا دوڑ دھوپ ہوئی مگر وہ حضرت وہیں اطمینان سے ناشتہ کرنے کے بعد نیچے اترے۔ ہم لوگ کھا پی کر فارغ ہو، پھر چل کھڑے ہوئے۔

اب فرید آباد بس ایک میل رہ گیا تھا یہ ایک میل پچھلے دس میلوں سے زیادہ سخت تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور منزل پر پہنچ کر دم لیا۔ یہ نہر کے پاس ہی ایک باغ تھا۔ بہت لمبا۔ اس میں آدھے میں آم اور آدھے میں امرود، لیموں، بڑھل اور شریفے وغیرہ کے درخت تھے۔ بندر بھی بہت تھے۔

ہماری پوری جماعت کے پانچ پٹرول، گروپ ٹولیاں کردی گئیں۔ دو پٹرول مدرسہ ثانوی کے لڑکوں کے دو استادوں کے مدرسے کے اور ایک استادوں کا۔ ہمارے یعنی ثانوی کے دونوں پٹرولوں میں چھ چھ لڑکے تھے۔ استادوں کے مدرسے والے پٹرولوں میں آٹھ آٹھ اور استادوں کے

ہمارا اسکاؤٹ کلاس

نہر میں تیرنا ہمارا روزانہ کا مشغلہ تھا

بکاے کی مشق

چند نامی

پیام برادری کے چند رکن چاء پر

مرزا نور عالم قزلباش آگرہ

فضل الرحمان دہلی

کالی گھٹا

پٹرول میں پانچ۔ ان میں ایک اسکاؤٹ ماسٹر تھے۔ ایک صبح کی ورزش کے انچارج۔ ایک کھیلوں کے۔ ان ایک بچے نگہبان۔ ایک اکڑ۔

ہر پٹرول میں سے ایک پٹرول لیڈر چنا گیا۔ اور پورے کیمپ میں سے ایک لڑکے کو ڈے آفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدے روزانہ تبدیل ہوتے رہتے۔ پٹرول لیڈر کا کام یہ تھا کہ اپنے کیمپ یعنی پٹرول کا پورا ذمہ دار رہے اور اس کی صفائی اور انتظام کی پوری نگرانی کرے۔ ڈے آفیسر پر دن بھر کے تمام کاموں کی ذمہ داری تھی۔ تمام کیمپ کی خبر رکھنا اور کھانے کے وقت لوگوں کی مدد کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

شام کے وقت ہم اپنے اپنے بستر درختوں کے نیچے لگا چکے تھے کہ خیموں کی گاڑی آگئی۔ مگر کچھ تھکن اور کچھ سستی سی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ہمارے نگہبان صاحب نے کہا، "یہاں تھکنے کا نام نہ لینا۔ اس جگہ ہم فوجی زندگی گذارنے آئے ہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔" پھر کیا تھا ذرا کے ذرا میں خیمے لگ گئے۔ رات میں بڑی اچھی نیند آئی۔ ہمارے ایک ساتھی چوروں سے بہت ڈر رہے تھے۔ بار بار جگاتے تھے۔ مگر انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا گیا۔

صبح اٹھے تو سیٹی سنائی دی۔ یہ ورزش کی تیاری کی اطلاع یا الارم تھا۔ ہم لوگ ضرورت سے فارغ ہونے کے لئے (جسے کیمپ کی اصطلاح میں سو قدم اور تین سو قدم کہتے ہیں) کیمپ سے باہر نکلے۔ سردی کا عالم نہ پوچھئے۔ ہوا اور پھر جنگل کی۔ واپس آ ہی رہے تھے کہ ایک سیٹی اور بجی جس کا مطلب تھا کہ ورزش میں صرف پانچ منٹ اور ہیں۔ جلدی سے لباس یا اسکاؤٹ یونیفارم پہنا اور میدان میں جا پہنچے۔ ایک صاحب ذرا پیچھے رہ گئے تھے وہ بھاگتے ہوئے آئے۔ انچارج صاحب نے انھیں یہ سزا دی کہ میدان کے چار چکر لگائیں۔ کچھ دیر تک الٹے سیدھے کی مشق رہی۔ اس کے بعد میدان صاف کیا۔ میدان کے ایک طرف اسکاؤٹ جھنڈے کے لئے آدھا دائرہ بنایا۔ جھنڈا گاڑا اور ایک ترانے کے بعد جھنڈے کی سلامی کی رسم ادا کی گئی اس کے بعد تین مرتبہ زوردار نعرہ لگایا گیا جو یہ تھا "ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ جامعہ اسکاؤٹنگ۔ جامعہ اسکاؤٹنگ۔ جامعہ اسکاؤٹنگ۔ ہندوستان زندہ باد ہندوستان زندہ باد۔ ہندوستان زندہ باد" اس کے بعد ہم نے ڈرل شروع کی اور پھر مختلف قسم کے دلچسپ کھیل کھیلے ۶ بجے سے ۸ بجے تک یہ پروگرام رہا۔

۹ بجے کھڑے کھڑے ناشتہ کیا۔ اپنے اپنے خیموں میں واپس آئے اور معائنے کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ خیمے کے چاروں طرف خوب صفائی کی۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ خیمے کے اندر تمام چیزیں سلیقے سے رکھیں۔ غرض جس طرح بن پڑا خیمے کے اندر اور اس کے چاروں طرف خوشنما بنانے میں پوری کوشش کی۔ سیٹی کی آواز آئی۔ معائنہ شروع ہوگیا۔ ہم وردی میں باہر آکر کھڑے ہوگئے۔ تین حضرات تشریف لائے

تمام چیزیں دیکھیں اور چلے گئے۔ اسی طرح اُنھوں نے تمام خیموں کا معائنہ کیا۔ پھر بلانے کی سیٹی ہوئی۔ سب کے سب جمع ہوگئے۔ آج کے معائنے کا نتیجہ سنایا گیا۔ ہم خوشی سے اچھل پڑے۔ آج ہم نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اور انعامی جھنڈے کے مستحق تھے۔ پٹرول لیڈر نے جھنڈا اپنے خیمے پر نصب کردیا۔

پھر جماعت کی سیٹی ہوئی ہم فوراً پہنچے۔ اسکاوٹ ماسٹر صاحب نے بہت کچھ بتایا۔ اسکاوٹنگ کی تاریخ اور اس کے فرائض وغیرہ پر تقریر کی۔ مثلاً

۱۔ اسکاوٹ مصیبت کے وقت مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہے۔

۲۔ اسکاوٹ جانوروں کا دوست ہوتا ہے۔

خدا خدا کرکے ۱۰ بجے ہم پھر خیموں میں آئے اور تیرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس زندگی میں یہ سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔ خوب تیرے۔ ۱۲ بجے واپس آئے اور کھانا کھایا۔ اس کے بعد آرام کے لئے لیٹ گئے۔ ۲½ بجے دوبارہ درجے کی سیٹی ہوئی اور ہم جلدی سے پہنچے۔ اس وقت مختلف قسم کی گانٹھیں بتائی گئیں اور پھر گانا شروع ہوا۔ تقریباً چار بجے ہم جلسے سے فارغ ہوگئے اور میدان پہنچے۔ وہاں والی بال، بیڈمنٹن، گیند بلا اور دوسرے کھیلوں میں مشغول ہوگئے۔ مغرب کے وقت واپس آئے اور کیمپ فائر کا پروگرام سوچنے لگے۔ اتنے میں کھانے کی سیٹی ہوئی اور ہم کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانے کے بعد ہی کیمپ فائر شروع ہوا۔

ہم کھلی فضا میں دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ درمیان میں آگ روشن ہوئی۔ اور سب نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ تمام پٹرول والوں کی طرف سے کوئی ڈراما گانا، مکالمہ یا نقل وغیرہ ہوئی۔ کوئی ۸½ بجے تک یہ دلچسپ مجلس رہی۔ اب نتیجہ سنایا گیا۔ ہمارے نمبر تمام پٹرول والوں سے زیادہ تھے اور یہ ہماری دوسری شاندار کامیابی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ کل ہم کیمپ فائر کی صدارت کریں گے۔

۸½ بجے یہ مشغلہ ختم ہوا۔ ڈے آفیسر نے نگہبان سے مل کر واچ ورڈ مقرر کیا اور تمام خیموں میں آکر پٹرول لیڈر کو بتلادیا۔ آج کا واچ ورڈ آزادی تھا۔ اس کے بعد ہم سوگئے۔

یہ تھا ہماری کیمپ زندگی کا ایک دن۔ آئندہ ہر روز تقریباً یہی پروگرام رہا۔ واچ ورڈ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ کیمپ میں روزانہ ایک پٹرول پہرا دیتا تھا اور باقی کیمپ والے ۹½ بجے کے بعد سو رہتے تھے۔ مقرر وقت کے بعد اگر کسی شخص کو باہر جانے کی حاجت ہو تو اُسے واچ ورڈ یاد ہونا ضروری ہے۔ اگر پہرے دار نے اس سے واچ ورڈ پوچھا اور اُس نے نہ بتایا تو پہرے دار کو اختیار ہے کہ رات بھر اُسے باہر ہی رہنے دے یا صرف نام اور پتہ لکھ کر چھوڑ دے۔ اور صبح کو اس شخص کو کیمپ کے قانون کے مطابق سزا

دی جائے۔ دوسری عجیب بات کیمپ میں یہ تھی کہ اگر چوری کرو اور پکڑے نہ جاؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ خواہ بعد میں پتہ چل جائے اور جو پکڑے گئے تو سزا ملی! ایک واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔ ایک رات ہماری پہرہ دینے کی باری تھی۔ اتفاق سے ہم میں سے ایک صاحب غافل ہوگئے۔ انچارج صاحب کہیں پیشاب کے لئے اُٹھے تھے۔ پہرے دار کو غافل دیکھ کر کیمپ میں سے دو کوٹ لے اُڑے۔ صبح کے وقت ہم کو یہ سزا سنائی گئی کہ ہم اپنی تفریح کے وقت میں ایک گھنٹے تک دھوپ میں پریڈ کریں۔ لطف یہ کہ جن صاحب کی وجہ سے سب کو سزا ملی تھی وہ ڈھول بجا رہے تھے اور ہم اس کی آواز پر پریڈ میں مشغول تھے۔

ہم نے کیمپ فائر میں بہت حصہ لیا اور ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انعامی جھنڈا بھی پانچ مرتبہ ہمارے پاس رہا۔ اور رفتہ رفتہ چند ہی دن میں ہم اس زندگی کے پوری طرح عادی ہوگئے۔ لیکن افسوس نویں دن ہمیں اپنا کیمپ اُکھاڑ کر ادھر آنا پڑا اور اب پھر وہی زندگی ہماری ہے۔

اپنے خریداروں سے چند ضروری باتیں

شروع سال ۱۹۳۲ء سے رسالہ پیام تعلیم کی روانگی وغیرہ کے انتظام میں چند اہم تبدیلیاں کی جارہی ہیں۔ براہِ کرم ان کو اچھی طرح سے نوٹ فرمالیجئے۔

۱۔ جنوری کا پیام تعلیم ۲۸ دسمبر سے روانہ کیا جائے گا۔ جو تمام خریداروں کے پاس ۱۰ جنوری ۱۹۳۲ء تک ضرور پہنچ جائے گا جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ ۱۵ جنوری تک خط لکھ کر رسالہ دوبارہ دفتر سے منگا سکتے ہیں۔ ۱۵ جنوری کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

۲۔ تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری سب کے رسائل پر لکھے ہوئے ہیں خریدار ان نمبروں کو نوٹ فرمالیں

۳۔ خریدار خطوط اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو خطوط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے اُن کی ہرگز تعمیل نہ کی جائے گی۔

۴۔ آیندہ ماہ تمام خریداروں کے پتے مع نمبر خریداری کے چھپ جائیں گے۔ جو صاحب پتوں میں تبدیلی کرانا چاہیں ان کے خطوط بھی ۱۰ جنوری ۱۹۳۲ء تک آجانے چاہئیں خطوط میں نئے نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا جائے ورنہ پتے تبدیل نہ ہوسکیں گے۔

مینجر "پیام تعلیم"

دریائے ایمے زن کی کہانی

محمد عظیم اللہ صاحب
بی۔اے

آج کوئی چار سو (۱۵۴۲ء) برس پہلے کی بات ہے اسپین کا ایک باشندہ فرانسسکو پیزارو سونے کے ملک کی تلاش میں جنوبی امریکہ کی طرف روانہ ہوا اور کوئیٹو شہر تک پہنچا۔ کوئیٹو جنوبی امریکہ میں خط استوا کے قریب ایک شہر ہے کوئیٹو سے اس نے اپنے ساتھیوں کو دو طرف روانہ کیا کچھ لوگ جنوبی امریکہ کے مغربی کنارے ہوتے ہوئے چلے پہنچے۔ ایک جماعت فرانسسکو پیزارو کے بھائی گونزالو پیزارو کے ہمراہ (سنہ ۱۵۳۹ء) پورب کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ لوگ جنگلوں اور جھاڑیوں میں اپنا راستہ بناتے اور بڑی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے نیپو نام دریا کے کنارے پہنچے۔ یہاں ان کا ارادہ ہوا کہ دریا کے ذریعے سفر کیا جائے۔ کشتی بنانے کے لئے جنگل میں لکڑی تو کافی تھی لیکن اور کوئی سامان نہ تھا انھوں نے کیلیں مرے ہوئے گھوڑوں کے نعلوں کی بنائیں۔ درختوں کے گوند سے تارکول کا کام لیا اور کپڑے پھاڑ پھاڑ کر تختوں کے سوراخ بند کئے اور کچھ لوگ کشتی میں اور کچھ پیدل آگے بڑھے۔ بہت سے آدمی راستے کی تکلیف اور بھوک سے مر گئے۔ آخر انھیں معلوم ہوا کہ کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے جہاں کھانے پینے کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ اس لئے طے ہوا کہ کچھ لوگ کشتی میں بیٹھ کر جلد سے جلد کھانے کا سامان لے آئیں۔ فرانسسکو ڈی اوریلنا کو اس کشتی کا افسر بنایا گیا۔ اوریلنا کئی دن تک دریا میں سفر کرتا رہا لیکن گاؤں نظر نہ آیا۔ چلتے چلتے وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں یہ دریا ایک اور دریا میں مل گیا تھا۔ یہ دریا بہت بڑا تھا اور بہت تیز بہتا تھا۔ لوگ کشتی کو بہاؤ کے خلاف نہیں چلا سکتے تھے۔ اوریلنا یہ سوچ کر کہ اب گونزالو کے پاس پہنچنا مشکل ہے۔ آگے کی طرف بڑھتا رہا ادھر گونزالو اوریلنا کا انتظار کرتے کرتے ناامید ہو گیا تو کوئیٹو واپس چلا گیا راستے میں اس نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور اس کے بہت سے ساتھی مر گئے۔

اب اوریلنا کا قصہ سنو۔ یہ برابر آگے ہی بڑھتا گیا راستے میں اسے بہت سے جنگل اور دلدلی زمینیں ملیں آخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جہاں اسے اس جنگل کے پرانے باشندے نظر آئے۔ ان میں سے کچھ مردوں کا حلیہ ایسا تھا کہ بظاہر وہ عورت معلوم ہوتے تھے بعد کو معلوم ہوا کہ یہ مرد تھے۔ اوریلنا پہلے انھیں عورت

سمجھا تھا اس لئے اس نے ان کا نام ایمے زن رکھ دیا۔ ایمے زن یونانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں زنانہ سپاہی۔ اوریلنا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "یہ زنانہ سپاہی لمبے اور خوب صورت تھے۔ اُن کے ہاتھ میں تیر کمان تھے اور یہ بہت بہادر اور لڑاکا سپاہی تھے۔"

اوریلنا راستے کی دقتوں کو سہتا، مصیبتیں اُٹھاتا اس دریا کے دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں اُسے معلوم ہوا کہ وہ بحر اٹلانٹک میں ہے۔ اُس کا سفر جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی ٹھیک سیدھ میں مشرقی ساحل پر ختم ہوا۔ یہاں سے وہ اسپین واپس آگیا۔ اپنے ملک میں پہنچ کر اس نے لوگوں کو اپنے سفر کے واقعات سنائے اور اُن لوگوں کا حال بتایا جن کا نام اس نے ایمے زن رکھا تھا۔ بعد میں اس دریا کا نام ایمے زن پڑ گیا۔

ایمے زن دنیا کے بہت بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ اس کی لمبائی کوئی چار ہزار میل ہے یہ کوہ انڈیز سے نکل کر خطِ استوا کے پاس سے بہتا ہوا بحر اٹلانٹک میں گرتا ہے۔ اس علاقے میں بارش بہت ہوتی ہے۔ آب و ہوا گرم اور مرطوب اور تندرستی کے لئے مضر ہے۔

اوریلنا کے سفرنامے کو پڑھ کر اور دریائے ایمے زن کے کنارے کا حال سن کر بہت سے لوگوں کو اس دریا کی سیر کا شوق ہوا۔ ہنری والٹر بیٹس اور الفرڈ رسل ولیس کے سفر کی کہانی بہت دلچسپ مگر لمبی ہے اس سیاحت کا حال تم کسی اگلے نمبر میں پڑھنا۔

ہاتھ سے کاغذ بنانا

از سید سوفح الحسن صاحب۔ استاد تعلیمی مرکز جامعہ

ہاتھ سے کاغذ بنانے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ شاید تم نے کسی اخبار یا رسالے میں پڑھی بھی ہو۔ تمھارے پیام تعلیم (سال گرہ نمبر ۳۸ء) ہی میں کاغذ بنانے پر ایک مضمون چھپ چکا ہے۔

یہاں ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ہاتھ سے کاغذ بنانا کس قدر آسان ہے ہمارا خیال تھا کہ بنانے کی ترکیب پر ایک لمبا سا مضمون لکھ دیا جائے، لیکن خالی مضمون پڑھنے سے تمھیں اتنی دلچسپی نہ ہوتی اس لئے ہر بات تصویروں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تصویریں جامعہ تعلیمی مرکز نمبر ا کے درجہ ششم کے بچوں کی ہیں۔ یہ بچے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ باغبانی، گتّے اور ابری کا کام سیکھتے ہیں۔ اس سال انھیں ہاتھ سے کاغذ بنانے کا کام بھی سکھایا جارہا ہے۔

یوں تو کاغذ ہر ریشے دار چیز سے بن سکتا ہے۔ لیکن جس قدر آسانی سے ردّی کاغذ سے بنتا ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں بنتا۔ ہم نے بھی ردّی کاغذ سے کاغذ بنانا شروع کیا ہے

کام شروع کرنے کے لئے بہت تھوڑے سامان کی ضرورت ہے۔ پہلی تصویر میں وہ سب چیزیں دکھائی گئی ہیں جنھیں ہم استعمال کرتے ہیں

دوسری تصویر میں دو بچے ردّی کاغذوں میں سے رنگین، مٹیلا اور اخبار کا کاغذ اور دوسری چیزیں الگ کررہے ہیں۔ تاکہ کاغذ بنانے کے لئے اچھا کاغذ باقی رہ جائے۔ اس صاف کی ہوئی ردّی کو ایک دو دن تک پانی میں بھگوئے رکھتے ہیں۔ بھیگی ہوئی ردّی کو جلد گلانے کے لئے ردّی کے وزن کا کوئی دو فیصدی کاسٹک سوڈا ملا دیتے ہیں۔

ردّی خوب گل جاتی ہے تو اسے پیروں سے اس قدر کچلتے ہیں کہ لگدی سی بن جاتی ہے۔ اور کاغذ کا ذرا سا ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ تیسری تصویر میں دو لڑکے یہی کام

۳

۱

۴

۲

۵

۶

۷

۸

کررہے ہیں۔

اب اس لگدی میں ردّی کے وزن کا تین یا چار فی صدی صابن ملاکر خوب دھوتے ہیں۔ چوتھی تصویر میں یہی کام ہورہا ہے دھونے کے بعد لگدی کو حوض میں ڈال دیتے ہیں۔ پانی لگدی کی مناسبت سے ملانا چاہئے۔ زیادہ پانی ہوگا تو پتلا کاغذ بنے گا ورنہ موٹا۔ پانچویں تصویر میں اس حوض پر چار لڑکے بیٹھے ہیں۔ ایک لڑکا جالی کے فریم پر کوئی آدھے انچ چوڑی لکڑی کا ایک اَور فریم رکھ کر کاغذ اٹھا رہا ہے۔ جالی کو لگدی ملے ہوئے پانی میں ڈال کر آہستگی سے اٹھا لیتے ہیں۔ پانی نیچے گر جاتا ہے۔ لگدی پانی پر رہ جاتی ہے۔ اب دو لڑکے کانپوری لٹھے کا ایک رومال چاروں کونے پکڑ کر اس جالی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اس جالی کو الٹ کر ایک تختے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اب جالی کو آہستہ سے اٹھا لیتے ہیں لیجئے کاغذ بن گیا۔ اسی طرح ایک کے اوپر دوسرا کاغذ رکھتے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے تختے سے انھیں دباتے بھی رہتے ہیں۔ تاکہ پانی نکل جائے۔

اب ان رومالوں کو جن پر کاغذ لگا ہوا ہے دیوار پر برش کے ذریعے چپکا دیتے ہیں۔ کاغذ دیوار کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے لئے سیمنٹ کی دیواریں ہونی چاہئیں۔ چھٹی تصویر میں کاغذ دیوار پر لگانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

کاغذ سوکھ جاتا ہے تو اسے کپڑے سے الگ کرلیتے ہیں۔ اور تمام تیار کاغذ کے وزن سے چار گنے پانی میں چار فیصدی پھٹکری اور ایک فی صدی سریش ملاکر خوب پکالیتے ہیں اور کاغذ کو اس میں سے گذارتے ہیں۔ (دیکھو ساتویں تصویر)

اس کے بعد کاغذ کو سکھانے کے لئے ماروں یا تاگوں پر پھیلا دیتے ہیں۔ جب یہ کاغذ سوکھ جاتے ہیں۔ تو انھیں لکڑی کے چکنے تختے پر رکھ کر بڑی کوڑی چکنے پتھر، یا شیشے کے پیپر ویٹ سے خوب رگڑتے ہیں۔ اس سے کاغذ چکنا اور ہموار ہوجاتا ہے آٹھویں تصویر میں دو بچے کاغذ رگڑ رہے ہیں۔

ہاں ایک بات اور سمجھ لو کاغذ کو جب دیوار سے اُتارتے ہیں تو وہ جاذب بن جاتا ہے لکھنے کے کام کا یہ جبھی بنتا ہے جب اس پر بعد کے عمل کئے جاتے ہیں۔ دیکھو کتنا آسان نسخہ ہے۔ اور کس قدر دلچسپ ہمارے ہاں کے بچے تو اب بہت آسانی سے کاغذ بنالیتے ہیں۔ تم بھی ذرا کوشش کرکے دیکھو۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔

الطاف علی صاحب نگراں ورزش جسمانی جامعہ نگر

۱- چھوجانے پر دوڑ جاؤ

تعداد:- آٹھ سے چالیس تک۔

جگہ:- صحن یا میدان
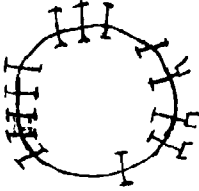
طریقہ:- ایک دائرے میں کم از کم تین تین فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو جاؤ۔ ایک لڑکا دائرے کے گرد دوڑنا شروع کرے۔ دوڑتے دوڑتے پیچھے سے کسی ایک کھلاڑی کو چھو دے اور خود دائرے کے گرد بھاگنا جاری رکھے۔ اب یہ دوسرا کھلاڑی تیسرے کو چھوئے اور اپنی دوڑ جاری رکھے۔ تیسرا اس کے پیچھے دوڑے اور پہلے کی طرح چوتھے کو چھوڑ کر کھیل جاری رکھے۔ ہر دوڑنے والا جس کو چھوئے اس کی جگہ پر ایک دفعہ دائرے کے گرد دوڑ کر کھڑا ہو جائے اس طرح کھیل جاری رہے۔

احتیاط:- (۱) چھوتے وقت ہاتھ زور سے نہیں مارنا چاہیے۔

(۲) دوڑنے والا جلد ہی دوسرے کو چھولے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں سات آٹھ کھلاڑی دائرے کے گرد دوڑتے ہوتے ہیں۔ اِس سے کھیل میں بہت دلچسپی رہتی ہے۔

۲- تم کہاں ہو؟

تعداد:- آٹھ سے چالیس۔

جگہ:- کمرہ، صحن یا کھیل کا میدان
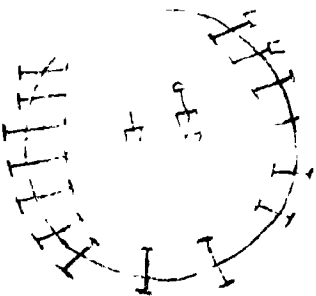
طریقہ:- کھلاڑی دائرے میں کھڑے ہو جائیں۔ دو کھلاڑیوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کو

دیکھ نہ سکیں۔ پھر دونوں دائرے کے اندر ایک دوسرے سے ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔ ایک کھلاڑی دوسرے سے پوچھے "تم کہاں ہو" دوسرا کھلاڑی جواب میں تالی بجائے۔ پہلا کھلاڑی تالی کی آواز پر چلے، اور اسے پکڑنے کی کوشش کرے۔ تالی بجانے والا تالی بجائے تو اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ اس طرح کھیل جاری رہے۔

احتیاط:۔ (۱) پٹّی کس کر نہ باندھی جائے۔

(۲) پٹّی اس طرح باندھی جائے کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔

۳۔ اُٹھاؤ اور پیالے میں ڈالو

تعداد:۔ دس تا پچاس۔

جگہ:۔ آنگن یا کھیل کا میدان یا کلاس روم۔

طریقہ:۔ کھلاڑی دو قطاروں میں ایک دوسرے کے مقابل دو دو گز کے فاصلے پر بیٹھ جائیں۔ ہر قطار میں برابر کے کھلاڑی ہوں۔ ہر قطار میں ایک چھوڑ بیچ کا کھلاڑی اپنے ہاتھوں کو ملا کر پیالے کی طرح بنائے اور تھوڑا سا آگے بڑھا دے۔ لیکن قطار کے پہلے اور آخری کھلاڑی کو اپنے ہاتھوں کا پیالا نہیں بنانا چاہیے جب یہ ہو چکے تو ہر قطار کے ایک سرے پر چند معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ دی جائیں۔ یہ چیزیں تعداد اور قسم میں یکساں ہوں۔
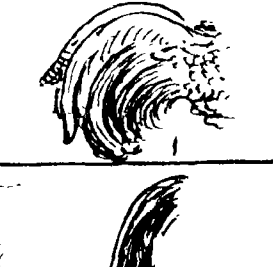
پھر ریفری کے حکم سے ہر قطار کا پہلا کھلاڑی ایک ایک چیز اُٹھائے اور اپنے ساتھ والے کھلاڑی کے پیالے میں رکھ دے۔ پھر پیالے والے کھلاڑی سے اگلا کھلاڑی اُس چیز کو اس کے پیالے میں سے اُٹھا کر اگلے کھلاڑی کے پیالے میں ڈال دے اس طرح کھیل جاری رہے۔ یہاں تک کہ ہر قطار کی سب چیزیں ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جائیں۔ جس قطار کی چیزیں پہلے پہنچیں گی وہ جیت جائے گی۔
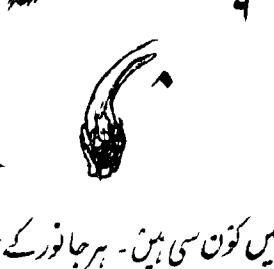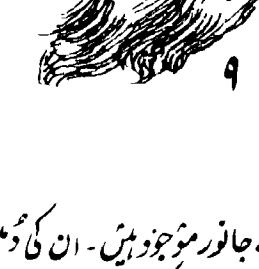
احتیاط:۔ (۱) کھیل بہت تیزی سے کھیلنا چاہیے۔

(۲) تمام چیزیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک کرکے پہنچانی چاہئیں۔

(۳) جو چیزیں استعمال کی جائیں۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہئیں اور نہ بہت چھوٹی ہوں۔

~۰~

تصویر میں جتنے جانور موجود ہیں - ان کی دُمیں کون سی ہیں - ہر جانور کے حرف کے پاس اس کی ٹھیک دُم کا عدد لکھ دو -

(ح - م - اسلم)

۱۔ ایک دن جبکہ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ان بچوں نے آپس میں بازار چلنے کا مشورہ کیا اور ایک بڑی سی چھتری لگا کر خوشی خوشی بازار روانہ ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ چھتری بھیگنے سی بچا لے گی
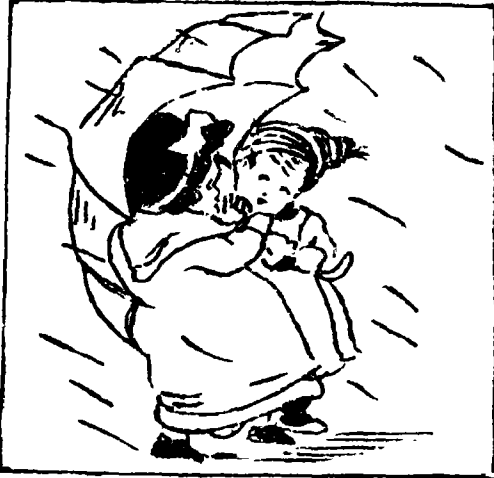
۲۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انھیں خیال آیا کہ چھتری بڑی ہے کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اس لئے دونوں نے چھتری کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے ؛

۳۔ بارش زیادہ ہونے لگی۔ اور ہوا بھی تیز چلنے لگی۔ دل میں سوچ رہے ہیں بُرے پھنسے ؛

۴۔ آندھی خوب زوروں پر ہے۔ لو بھئی ان کی چھتری ہی اُلٹ گئی۔ ارے چھتری میں تو ہوا بھر گئی جو انھیں آگے کو کھینچ رہی ہے۔ کبھی تمھیں بھی ایسا تجربہ ہوا ہے ؛

محمود حسن بجنوری
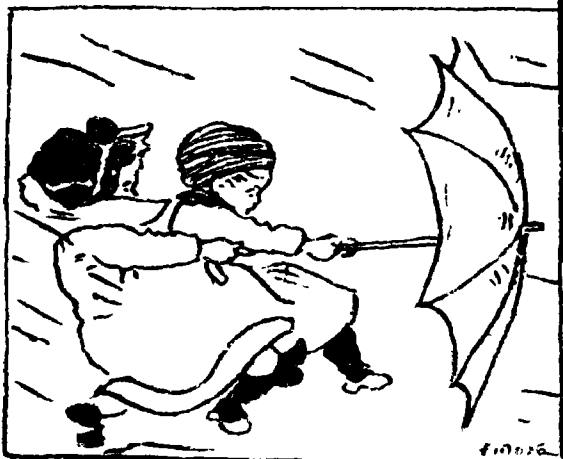
پیاری بچیو اور بچو۔ خوش رہو اور تندرست۔ ان صفحوں تک پہنچتے پہنچتے تم نے اپنے سالنامے کے بہت سے مضمون پڑھ ڈالے ہوں گے کہو، کچھ پسند بھی آئے ؟ ہم نے تو اپنی سی بہت کوشش کی کہ یہ تحفہ تمھارے لئے سچ مچ اتنا اچھا ہو کہ تم دیکھتے ہی پھڑک اٹھو۔ آج کل تمھیں معلوم ہے کہ حالات کیسے نازک ہیں اور دوسرے رسالے اور اخبار کتنی کفایت شعاری سے کام لے رہے ہیں۔ پھر بھی ہم نے خرچ کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اور پورے سو صفحے کا رسالہ نکال دیا۔ لیتھو اور بلاک کی اتنی بہت سی تصویریں شائع کیں باتصویر مضمون شائع کئے یہ بات بچوں کے کسی رسالے میں تمھیں شاید ہی ملے۔ اچھا بھئی اگر تمھیں اپنا سالنامہ پسند آگیا تو ہم تم سے ایک درخواست کریں گے۔ اور وہ یہ کہ یہ سالنامہ تم اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو دکھاؤ اور انھیں جیسے بھی بن پڑے پیام تعلیم کی خریداری پر آمادہ کرو۔ ہمارے پیامیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ اگر سب نے کوشش کر ڈالی تو بات کہتے میں کئی ہزار خریدار پیدا ہو جائیں گے اور اتنے خریدار پیدا ہو گئے تو پیام تعلیم کے عام نمبر بھی ایسے شاندار نکلیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ اور سالنامے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ جو پیامی سب سے زیادہ خریدار بنائیں گے۔ انھیں ہم بہت اچھا سا انعام بھی دیں گے۔ ۲۵ فروری تک ہم اس کی مدت مقرر کرتے ہیں۔

معمہ نمبر ۱۲ کے صحیح حل ان بچوں نے بھیجے ہیں

صحیح حل		اوّل انعام		فی کس ۶
۱۔ منظور علی	راجپوتانہ	۴۔ عبد اللہ خاں	گوالیار	
۲۔ محمد محمود خاں	کلکتہ	۵۔ مرزا اسکندر بیگ	گورکھپور	
۳۔ فہیم جہاں بیگم	آگرہ	ہر ایک کے حساب میں کل ۶	پڑتے ہیں۔ ان سب کو انعام بھیج دیا گیا ہے	

ان بچوں کے حل میں ایک غلطی ہے

۱۔ مقبول احمد ساگر ۲۔ وارث رشید قدوائی دہلی ۳۔ احمد حسن لکھنؤ ۴۔ عبدالکریم بسمت نگر ۵۔ منہاج حسین میرٹھ
۶۔ محمد حسن لکھنؤ ۷۔ جمیل اختر امرتسر ۸۔ کنور محمد عزاد آر حسین دیوگاؤں اسٹیٹ ۹۔ حامد شاہ خاں رامپور ۱۰۔ مس اسمٰعیل کالی کٹ
۱۱۔ رحیم الدین دہلی ۱۲۔ سید منصور حسین دہلی ۱۳۔ سلطان احمد اللہ والا دہلی ۱۴۔ ابرار احمد فاروقی تھولینڈی ۱۵۔ عبدالوحید دہلی
۱۶۔ محمد مجیب الرحمٰن خاں شروانی حبیب گنج ۱۷۔ محمد ظفر الہدیٰ بہاری دہلی ۱۸۔ عبدالجلیل عزیزی ۱۹۔ شمیم حفیظ احمد حیدرآباد دکن
۲۰۔ احمد نور اوجین ۲۱۔ طاہرہ صدیقہ الوت محل ۲۲۔ محمد عزیز گھریانواں ۲۳۔ محمد خالد دہلی ۲۴۔ سید محفوظ الرحمٰن اتھانول
۲۵۔ افضال احمد ساگر ۲۶۔ اعجاز احمد نئی دہلی۔

ہر ایک کے حساب میں کوئی پونے تین آنے پڑتے ہیں۔ اتنے کم داموں کا انعام کیا بھیجیں۔ یہ بچے سالنامے کے معمے کے چار حل مفت بھیج سکتے ہیں۔ مگر اس بات کا حوالہ ضرور دیں کہ پچھلے حل میں ہماری ایک غلطی آئی تھی اور ہاں اپنا نمبر بھی لکھیں۔ نمبر وہی جو اس وقت ہر ایک نام کے ساتھ ہے

نئے سال کی خوشی میں ہم نے معمے کا انعام بڑھا دیا ہے۔ یعنی صحیح حل بھیجنے والوں کے لئے بجائے چھ کے دس روپئے کردیئے ہیں۔ اور ایک غلطی والوں کے لئے بجائے چار کے چھ روپئے۔ معمّا بنانے اور جانچنے والے صاحب نے ایک اعلان کی ہمیں اور اجازت دی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ لفافے کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کئی بچے ایک ہی لفافے میں اپنے حل بھیج سکتے ہیں۔ اور ہاں اس مرتبہ انھوں نے مدت بھی بڑھا دی ہے۔ یعنی بجائے پندرہ کے پچیس کردی ہے

بعض بچوں نے ہمیں شکایت لکھی ہے۔ کہ اکثر انھیں اپنے سرپرستوں یا استادوں کے تصدیقی دستخط حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ جن بچوں کو یہ مجبوری ہو وہ بغیر دستخط کے اپنے حل بھیج سکتے ہیں۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ کرنول (مدراس) کے پیامیوں نے اپنے یہاں برادری قائم کرلی ہے۔ برادری کے دو جلسے بھی ہو چکے ہیں۔ پہلا جلسہ عہدے داروں کے انتخاب کا تھا۔ چائے وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا عالی جناب حضرت سید ظہور اللہ حسینی صاحب۔ وائس پرنسپل اسلامیہ عربیہ کالج سرپرست منتخب ہوئے۔ جناب سید مرتضیٰ قادری صاحب ہادی لکچرر اسلامیہ عربیہ کالج صدر۔ سید عبدالستار ثریا ناظم اور شیخ محمود صدیقی نائب ناظم۔ دوسرے جلسے میں مشیر الدین احمد صدیقی نے کلام پاک کی تلاوت سے جلسے کی ابتدا کی۔ سید شریف نے نعت پڑھی۔ ناظم نے پچھلے جلسے کی روداد سنائی رشید بیگ اور محمد حسین نے کوشش پر مضمون پڑھے۔ شیخ محمود صدیقی اور سید ابراہیم خلیل نے اپنی تقریروں میں بتایا کہ ہم پیام برادری کو کس طرح کامیاب بناسکتے

ہیں۔ جنابِ صدر نے اپنی اختتامی تقریر میں پیامیوں کو بہت سی مفید باتیں بتائیں۔

ہم کرنول کے پیامیوں کو اس بات پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ امید ہے کہ برادری ان عزیزوں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں بہت کچھ مدد کرے گی۔

کچھ عرصے سے پیام برادری کی سرگرمیاں ذرا ہلکی پڑ گئی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ برادری کی ممبری کی شرط سولہ سال تک کی عمر ہے۔ بہت سے پیامی اس حد سے نکل گئے ہیں۔ اور کچھ تو ایسے ہیں جو اسکول چھوڑ کر کالجوں میں پہنچ گئے ہیں۔ تاہم پیام تعلیم اور پیام برادری سے ان کی دلچسپی اور تعلق اسی طرح ہے۔ ایسے پیامیوں کے لئے ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس عمر کو پہنچنے کے بعد وہ برادری کو اپنے چھوٹے بھائیوں کے ہاتھ میں دے دیں۔ اور خود اپنے لئے پیام کلب کے نام سے ایک انجمن بنالیں۔ اس طرح ان کی دلچسپیوں میں زیادہ وسعت کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ چھوٹی برادری کی نگرانی اور ہدایت بھی انھی کے ذمے ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ پیامی اس مسئلے پر غور کرکے اپنے مشورے سے مجھے مطلع کریں گے۔

ہمارے محترم بھائی جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی تجویز ہے۔ کہ بچوں کی نظموں کی طرح چھوٹے بچوں کے مضمون بھی پیام تعلیم میں چھپنے چاہئیں۔ میرے خیال میں یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ پیام تعلیم کے چار صفحے اس کے لئے خاص کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مضمون زیادہ سے زیادہ ایک صفحے کے ہوں۔ بہت صاف اور خوش خط۔ ہر سطر کے بعد ایک سطر اصلاح کے لئے چھوٹی ہوئی۔

اچھا بھئی! آج میں نے تم سے بہت باتیں کر ڈالیں تم بھی اکتا گئے ہوگے۔ اب انشاء اللہ پہلی مارچ کو ہماری تمھاری ملاقات ہوگی۔ اس لئے کہ فروری میں تو تمھارا پیام تعلیم چھپے گا نہیں۔ ہاں چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دوں۔ سالنامے کے بارے میں تم اپنی رائے مجھے ضرور لکھنا بھولنا مت!

تمھارا

محمد حسین حسان

یہ پرچہ جنوری و فروری کا مشترکہ نمبر ہے اگلا پرچہ مارچ میں نکلے گا۔ منیجر

معمّا نمبر ۱۵

پہلا انعام عہ۵ ر

دوسرا انعام ۲ ر

مشقی کوپن

۱ م	ب	۲ ا	۳ ر	ک	■	۴	۵ ا
	■	۶	و	■	۷ ر	■	ن
■	۸	■	۹ س		ت	■	
۱۰	ک	■		■	۱۱	۱۲ ی	ا
۱۳ ن	ر	۱۴	■	۱۵	■	۱۶	م
	■	۱۷ و		د	■	و	■
و	■	ب	■	۱۸ ن	۱۹	■	۲۰
۲۱ ر		■	۲۲	ہ	و		ر

اشارات

دائیں سے بائیں

۱۔ ہماری طرف سے تمام پیامیوں کو نیا سال ...... ہو۔

۴۔ .. دا ــ آبا کے آبا۔

۶۔ بلانے کا اشارہ ۔

۹۔ اگر استاد .... ہے تو اکثر طلبا اس سے ناخوش رہتے ہیں۔

۱۰۔ ایک

۱۱۔ ہر ... سال ایک انقلاب لے کر آتا ہے۔

۱۳۔ بے میل

۱۶۔ ماں

۱۷۔ ... جس دل میں ہو اس دل کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں — افسر

۱۸۔ .. نقد نہ تیرہ اُدھار۔

۲۱۔ شطرنج کا ایک مُہرہ

۲۲۔ آج کل ..... وہی ہے جو تن من دھن سے اپنے ملک کی خاطر قربان ہو جائے۔ (بے ترتیب)

اُوپر سے نیچے

۱۔ چالیس سیر کہہ لو یا ایک ..

۲۔

۳۔ .... انقلاب مزدوروں نے کیا تھا۔

۵۔ معما حل کرتے ہی اس کی فکر ہو جاتی ہے۔

۷۔ اکبر کے نو ... مشہور ہیں۔

۸۔ مصیبت میں گنہگار بھی خدا کا ... کرنے لگتا ہے۔

۱۰۔ چمن کا موتیا .....

۱۲۔ سچی ... وہی ہے جو دل سے کی جائے ۔

۱۴۔ بے ... بے نصیب با ... با نصیب

۱۵۔ آزادی کی قربان گاہ پر سینکڑوں بھینٹ چڑھ رہے ہیں

۱۹۔ معما صحیح حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر اشارہ .... تین بار ضرور پڑھا جائے۔ (الٹا)

۲۰۔ اگر کسی پرند کا ... کاٹ دیا جائے تو وہ اُڑ ہی کیا سکتا ہے۔

۱۔ معما بجائے پندرہ کے پچیس ۲۵ جنوری تک بھیج سکتے ہو۔
۲۔ ایک ہی لفافے میں کئی بچے حل بھیج سکتے ہیں۔
۳۔ لفافے کی قیمت اب پانچ پیسے ہو گئی ہے۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ استاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں، عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔
(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ ۴ حلوں کی ۲ر ہے۔
(۴) دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے قرعہ اندازی نہ ہوگی۔
(۵) تمام حل ۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں
(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
(۷) پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔
(۸) کوپن کے چاروں طرف جو نقطے والی لائن ہے۔ وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔
(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا
(۱۰) ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمے آنے چاہئیں۔
(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہیے
(۱۲) معما حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو
(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔
(۱۴) ڈال اور واؤ کا فرق نمایاں ہو۔ (ڈ - وٗ)
(۱۵) چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (یٗ - ےٗ)
(۱۶) جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے
(۱۷) املا کی غلطی بھی غلطی شمار کی جائے گی۔
(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں
(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔
(۲۰) پتہ :۔ سب ایڈیٹر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ نئی دہلی

معما نمبر ۱۴ کا صحیح حل

۵ ج	۴ ب	■	۳ د	ا	۲ ز	۱ ا
ن	۷ م	■	ع	■	ن	۶ ج
ج	■	۹ ب	ا	۸ ش	■	■
ا	م	۱۱ ہ	■	ا	ف	۱۰ خ
■	■	ر	۱۳ ت	۱۲ س	■	س
۱۷ ب	۱۶ ل	■	ن	■	۱۵ [illegible]	۱۴ ر
و	و	ر	۱۹ ا	■	ا	۱۸ و

نئی کہانیاں

شریر موتی ایک کُتّے کے پلّے کو یہ گُمان ہوگیا تھا کہ مَیں بھی کچھ ہوں، ہر ایک سے اُلجھتا اور مُنہ کی کھاتا، آخر میں اُن کی اماں جان مدد کو پہنچ گئیں نہیں تو جانے بچارے کا کیا حال ہوتا۔ بہت دلچسپ۔ اس کے ساتھ ایک کُتّے کی مزیدار کہانی ہی۔ ۲ر

قرقر ایک بطخ کا بچّہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف سیر کرنے نکلا۔ راستے میں جو کوئی نصیحت کرتا، اُسے کھری کھری سناتا۔ آخر مل گئیں بلّی خالا۔ اب بھاگے اور تالاب میں جا کر دم لیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

مُرغ اور بلّی کی ایک اور مزیدار کہانی ہی۔ مُرغ نے بلّی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور نیچا دکھایا۔ قیمت ۲ر

چنّو منّو یہ دو دوست تھے۔ چنّو تھا ٹٹّو کا بچّہ اور منّو گدھے کا۔ منّو نے چنّو سے ایک دن کہا بھیّا تم بڑے بدصورت ہو۔ اُنھیں بہت رنج تھا۔ دونوں نے سوچا کہ اس کا علاج پوچھنا چاہیے۔ جگہ جگہ گئے اور بہت عجیب غریب اور دلچسپ مشورے ملے۔ آخر ایک بھولی بھالی لڑکی نے منّو کو خوب صورت بتا کر اس کا رنج دور کر دیا۔ سُندر بلّی کا ایک اور مزے دار قصّہ ہے۔ قیمت ۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

Regd. L. No. 1961

ایک پہیلی میں کہوں تو سن لے میرے پوت

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

جلد ۲۴ فہرست مضامین مارچ ۱۹۴۱ء نمبر ۳

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

پیامی بچیوں اور بچوں نے سالنامے کو بہت پسند کیا۔ اکثر بڑے لوگوں نے اس کے بارے میں اچھی رائیں ظاہر کی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ کوشش عزیز پیامیوں میں مقبول ہوئی۔ اگر لڑائی کی وجہ سے چیزیں مہنگی نہ ہوتیں تو ہم اس سے بھی کہیں شان دار سالنامہ شائع کرتے۔

افسوس ہے کہ اِس مرتبہ تصویروں کا اچھا کاغذ بازار میں نہ مل سکا۔ اس لئے تصویریں نہ چھپ سکیں۔ اگر ممکن ہوا تو اگلے پرچوں میں یہ کمی پوری کردی جائے گی۔

اس پرچے میں اکثر مضمون وہی ہیں جو سال گرہ نمبر میں چھپنے سے رہ گئے تھے۔ ٹلّو میاں اور دریائے ایمیزن اگلے نمبر میں ختم ہوں گے۔ ہوائی جہاز کی کہانی کا دوسرا حصہ بھی آئندہ شائع ہوسکے گا

اگلے نمبر میں بہت اچھے اچھے مضمون اور کہانیاں شائع ہوں گی۔ برکت صاحب کا مضمون "آنکھ کا دھوکا" خاص طور پر دلچسپ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ نے اس سال تصویریں جمع کرنے والے شوقینوں کے لئے ایک خوب صورت سا البم تیار کیا ہے۔ جو بچے تصویریں جمع کرتے ہیں انھیں بجائے سادہ کاپی استعمال کرنے کے یہی البم منگانا چاہیئے۔ بہت سہولت رہے گی۔

لکھنؤ کی پیام برادری نے اپنے ماہوار (قلمی) رسالے جگاؤ کا سالنامہ شائع کردیا ہے اور مکتبہ جامعہ کی شاخ لکھنؤ (امین آباد) سے مل سکتا ہے۔

اس مرتبہ ٹائٹل پر عزیزی احمد دین ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی تصویر شائع کی جارہی ہے۔ بچے اس قسم کی اور اچھے اچھے منظروں کی تصویریں ہمیں بھیجیں۔ ان کا سائز ٹائٹل کی تصویر سے کچھ بڑا ہونا چاہیئے۔

لوری

مری جاں تڑپ رہی ہے ⁂ مرے دِل کو بے کلی ہے
تری نیند کیوں اُڑی ہے ⁂ کہاں مرا جی میں جی ہے
مرے پیارے لال سوجا

مرے دردو غم کا چارا ⁂ ترا مُکھڑا پیارا پیارا
مری ماں لے خُدا را ⁂ مرے دِل کا تو سہارا
مرے پیارے لال سوجا

نہیں تجھ سے بڑھ کے پیارے ⁂ یہ ہیں جتنے چاند، تارے
مری ماں لے دُلارے ⁂ مری جان کے سہارے
مرے پیارے لال سوجا

ترے واسطے ہوں مُضطر[۱] ⁂ نہیں چین ہے مُیسّر
یہ سُنائے لوری جوہر ⁂ تجھے نیند آئے دم بھر
مرے پیارے لال سوجا

۱۔ بے قرار

میل کی خوبی

از گنیش چندر سکسینہ، فتح گڑھ

ایک بڈھے کے تھے کئی لڑکے
وقت مرنے کا جب قریب آیا
سوت کی دے کے اٹنیاں[۱] اُن کو
زور سارا لگایا پھر بھی مگر
تب تو بڈھے نے ایک اٹنی لے
تار ایک ایک پھر دیا سب کو
توڑنے کا کیا ارادہ جو
مسکرا کر وہ بولا لڑکوں سے
دھاگے جب سب کے سب اکٹھے تھے
جب کہ اٹنی کو ہم نے کھول دیا

کاٹتے تھے جو وقت لڑ لڑ کے
پاس لڑکوں کو اُس نے بلوایا
لگا کہنے کہ "اُن کو توڑ دو تو"
توڑ اُن کو سکا نہ کوئی پسر[۲]
چند دھاگے نکالے اس میں سے
اور کہا "اب تو توڑ کر دیکھو"
ایک دھاگے کے ہوگئے دو۔دو
"یہ نتیجہ نکالو تم اس سے"
توڑ پایا نہ کوئی تم میں سے
چٹ سے دھاگوں کو سب نے توڑ دیا

مثل اٹنی کے سب رہو مل کر
اپنے دشمن سے بے خطر ہو کر

۱ کچے سوت کی لچھی۔
۲ لڑکا۔

محمد شفیع الدین صاحب نیّر

یہ سوچ کر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ اور اس پیڑ پر آئے جہاں اُن کے بھائی سو رہے تھے۔ آپ بھی مزے سے وہیں سو رہے۔

دُوسرے دن سویرے ہی دیو کو کسی ضروری کام سے جلد باہر جانا تھا۔ اُس نے پہلے تو ناشتہ کیا پھر نوکر دیووں سے کہا "شام کو اچھے اچھے کھانے تیّار کیے جائیں۔ کچھ تازہ تازہ پھل بھی ہوں اور ہاں جہاں ملیں آدمی کے دو چار بچّوں کو پکڑ کر اُن کے کباب بھی بنا رکھنا۔" اتنے میں پری بھی کپڑے بدل کر آگئی۔ آج یہ دیو پری سے بہت ناراض معلوم ہوتا تھا۔ اُس سے بات تک نہ کی۔ دیو تخت لائے وہ اُس پر سوار ہوا دم کے دم میں وہ تخت ہوا ہو کر نظروں سے غائب ہوگیا۔ پری نے نوکر دیووں کو تو کام میں لگا دیا اور آپ اُن بچّوں کے پاس آئی اُس نے سوچا کہ ان کو کچھ کھلا پلا کر جلد رُخصت کردوں۔ اگر کسی دیو نے دیکھ پایا تو بچاروں کا قیمہ بن جائے گا۔

وہ آئی تو بچّوں نے اُٹھ کر اُسے سلام کیا اور اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے کہا "بچّو شکریے کی کوئی بات نہیں ایک کو دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہیے۔"

پھر بولی "بہتر یہ ہے کہ تم کچھ کھا پی لو اور اپنے گھر جاؤ۔ میں یہاں خود قید ہوں۔ میری کہانی یہ ہے کہ میں آپ ایک دیو کی بیٹی ہوں میرا باپ بھی بہت طاقت ور ہے۔ مگر ظالم نہیں ہے۔ ایک دن میں اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اس دیو کا اِدھر سے گذر ہوا اُس نے مجھے دیکھا۔ شرارت جو سوجھی تو اپنے دیووں سے پکڑوا کر زبردستی اپنے تخت پر بٹھا لیا اور اُڑا کر یہاں لے آیا۔ میرے ماں باپ کو کچھ خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ میری جدائی میں نہ جانے اُن کا کیا حال ہوگا۔ دیو کہتا ہے کہ میں اُس سے شادی کر لوں یہ کبھی نہ ہوگا۔ اور اب وہ ایک ہی دن میں یہ مجھے مار ڈالے گا۔" یہ سُن کر ٹلو میاں بولے "بوبی گھبراؤ نہیں۔ تم نے اتنی مہربانی کرکے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ احسان ایسا ہے کہ ہم اس کا بدلا نہیں اُتار سکتے۔ مگر اپنی جان بچانے کے لئے تمھیں اس دُکھ میں چھوڑ جائیں یہ بات ہمیں گوارا نہیں۔ اب یا تو تم کو اس دُکھ سے چھٹکارا دلائیں گے یا اس دُکھ میں ہم بھی مر جائیں گے"

بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی یہ بات سُنی تو اُنھوں نے بھی کہا "ہاں ہاں ٹھیک ہے اب تو جبھی جائیں گے جب اُنھیں چھٹکارا مل جائے گا"

یہ سن کر تو پری اور بھی گھبرائی۔ سوچنے لگی یہ بچے ضد کرکے اپنی جان بھی مُفت گنوائیں گے۔

ٹلو میاں بولے "تم ذرا بھی مت گھبراؤ۔ پہلے ہم کچھ ناشتہ کرلیں، پھر سوچیں کہ کیا کرنا چاہئے۔" اُنھوں نے جلد جلد مُنہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کیا۔ ٹلو میاں نے پوچھا "کوئی دیو تو اِس وقت یہاں نہیں ہے"۔

پری بولی "دیووں کی یہاں کیا کمی ہے۔ مگر میں نے سب کو کام میں لگا دیا ہے"

ٹلو میاں نے پوچھا "تم نے دیو کے سونے کا کمرہ دیکھا ہے"

پری بولی "دیکھا تو ہے مگر صرف ایک دفعہ اور وہ بھی کھڑے کھڑے۔ اِس کمرے کے اندر جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔"

ٹلّو میاں بولے "بس اب کام بن گیا۔ جو کچھ میں کہوں وہ کرو۔ اس میں ہماری بھی بھلائی ہے اور تمھاری بھی۔ اب وقت کھونے کا موقع نہیں۔ چلو۔"

پری اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے تھی اُس نے سوچا چلو اسی کے کہنے پر چلوں کیا ہوگا۔ تین دن کے ہوتے آج ہی زندگی ختم ہوجائے گی۔ تینوں بچّے اور پری۔ دیوؤں کی نظروں سے بچتے بچاتے چھپتے چھپاتے۔ چُپکے چُپکے دیو کے سونے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اور اندر داخل ہوکر دروازے کی چٹخنی لگادی۔

ٹلّو میاں نے کہا۔ "پلنگ کے نیچے کا فرش ہٹاؤ۔" سب نے بڑی محنت سے وہ فرش ہٹایا تو ایک دروازہ نظر آیا۔ دروازے میں ایک بہت بھاری قفل لگا ہوا تھا۔ اُس کی کُنجی وہیں پاس ہی رکھی ہوئی مل گئی۔ سب نے پُورا زور لگایا تو خُدا خُدا کرکے وہ قفل کھُلا دروازے کے کواڑ کھولے تو ایک زینہ نظر آیا۔ مگر ایسا اندھیرا گھُپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر سب گھبرائے۔ ٹلّو میاں جلدی جلدی اِس زینے میں اُترے وہ چلتے جاتے تھے اور اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ آخر بہت نیچے اُترنے کے بعد کچھ روشنی نظر آئی۔ زینہ جہاں ختم ہوا وہاں ایک دروازہ تھا اس کو کھول کر دیکھا تو کیا کہنا تھا ایسا خوش نما اور دل کش باغ نظر آیا کہ جنّت بھی ہوگی تو بس ایسی ہی ہوگی۔ باغ میں ایک تالاب تھا تالاب کے بیچ میں سنگ مرمر کی ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ تالاب کے کنارے ایک کشتی بھی پڑی ہوئی تھی ٹلّو میاں

جھٹ اُس میں بیٹھ گئے اور بہت جلد بارہ دری میں پہنچ گئے ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہزاروں ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہیں ۔ اور

طرف ایسی انوکھی تصویریں لگی ہوئی ہیں کہ انسان ایک ایک تصویر کو گھنٹوں دیکھتا رہے تب بھی جی نہ بھرے ۔

کھانے پینے کی بھی طرح طرح کی چیزیں ہیں۔ مٹھائیاں ، پھل ، تازہ تازہ کھانے قرینے سے چُنے ہوئے ہیں ۔ دیواروں پر چاروں

ٹلو میاں کا جی للچایا کہ کچھ کھا پی لیں اور تھوڑے سے ہیرے جواہرات بھی ساتھ لیتے چلیں مگر اُنھوں نے اپنے جی کو مارا۔

بارہ دری کے بیچ میں پہنچے جہاں چاندی کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے وہ صندوق کھولا تو اس میں سونے کا ایک ڈبّا نظر آیا۔ یہ چاہتے ہی تھے کہ اس کو کھول کر انڈا نکال لیں کہ ایک دم سخت شور سُنائی دیا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک گویا سب کچھ اس شور میں جمع تھا۔ اتنے میں کسی کی ڈانٹنے کی آواز آئی " دیکھ کیا کرتا ہے۔ یاد رکھ اس انڈے کو ہاتھ بھی لگایا تو اپنی جان اپنے ہاتھ سے کھوئے گا۔ دیکھ مان جا۔ مان جا۔ اپنی سلامتی چاہتا ہے تو ڈبّا ابھی ہاتھ سے رکھ دے ورنہ دیکھ ......"

ٹلّو میاں نے مڑکر دیکھا تو اس دیو کو اپنی طرف بڑی تیزی سے دوڑتے ہوئے پایا۔ ان کے ہوش اُڑ گئے قریب تھا کہ ڈبّا گر پڑے یا وہ ڈر کر آپ رکھ دیں۔ مگر اُنھوں نے ہمّت سے کام لیا اور دیو کی پروا کئے بغیر بڑی پھرتی کر انڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انڈے کا ان کے ہاتھ میں آنا تھا کہ دیو کے ایک ٹھوکر لگی اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑا (باقی)
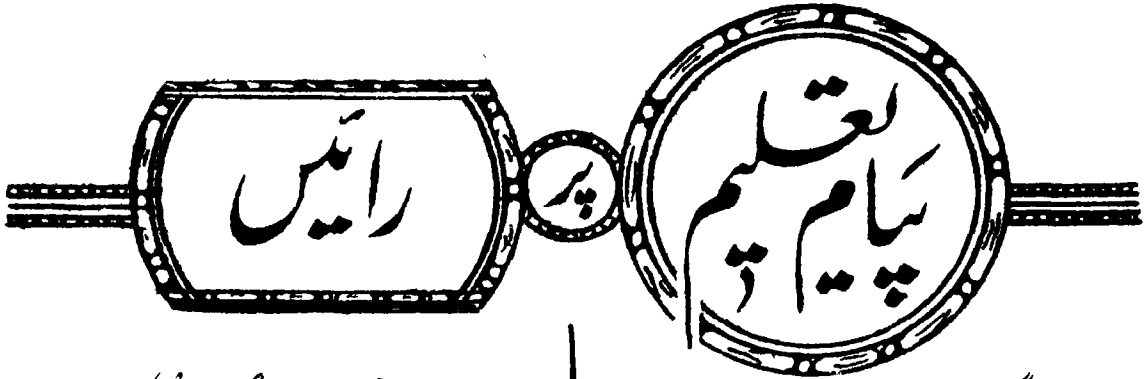
سال گرہ نمبر جس کا مہینوں سے انتظار تھا ملا۔ پڑھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوا۔ عید اور نئے سال کی خوشی دوبالا ہو گئی۔

سال گرہ نمبر کی ترتیب و تالیف میں یقیناً آپ نے بہت محنت سے کام لیا ہوگا۔ میں نے تو ایک ہی نشست میں اس کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اس کی سبھی چیزیں ایسی ہیں کہ بار بار پڑھنے سے بھی جی سیر نہیں ہوتا ہے۔ جنگ کے اس ہمت شکن زمانے میں جب ہر چیز پر مہنگائی کے خوفناک بادل منڈلا رہے ہیں، سال گرہ نمبر کو اپنی سابقہ شان کے مطابق شائع کرنا صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ ورنہ مجھے تو اس کی امید بھی نہیں تھی کہ اس سال ایسا اچھا سال گرہ نمبر دیکھنے کو ملے گا۔ میں آپ کو اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ جنگ اسی سال ختم ہو جائے اور اگلے سال ہمیں پیام تعلیم کا ایک بہت ہی شاندار جوبلی نمبر دیکھنا نصیب ہو۔ آمین

(محمد نور کھٹکٹے، بمبئی)

رسالہ پیام تعلیم کا سال گرہ نمبر مجھ کو عین بقرعید کے دن ملا، میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ گویا میری دوہری عید تھی۔ پیام تعلیم کا سرورق بہت اچھا تھا، مضمونوں میں مجھ کو یہ مضمون زیادہ پسند آئے :۔ ٹلو میاں، آؤ ڈراما کریں، کان کماری، جانوروں میں تمدن، قطب شمالی، گل رخ، ہوائی جہاز کی کہانی دریائے ایمیزن۔ یہ نظمیں اس میں قابل تعریف ہیں۔ جھوٹ کا انجام، دویا بو اور ان کے کتے، ہماری سواریاں لڈو کا ٹکڑا۔ میرے خیال میں یہ سال گرہ نمبر پچھلے نمبروں سے کئی گنا بہتر ہے۔ مضمون اس قدر دلچسپ تھے کہ میں بقرعید کے روز رات گئے تک اُن کا مطالعہ کرتا رہا تھا اس میں دلچسپی کے علاوہ بہت سی باتیں نصیحت آمیز بھی ہیں۔ مجھ کو خود بھی حیرت ہے کہ باوجود کاغذ کی گرانی کے آپ نے اس قدر خوب صورت سال گرہ نمبر نکالا ہے۔

میں پیام تعلیم کی اس کامیابی پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے پیام تعلیم ہمیشہ زندہ رہے۔

(محمد مراد الدین ۔ لکھنؤ)

پیامِ تعلیم سالگرہ نمبر ۱۹۴۵ء پہنچ گیا جتنی خوشی ہوئی اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ تمام کام چھوڑ کر پہلے سب سرخیاں دیکھ ڈالیں۔ ابھی کل پرچہ تو ختم نہیں کر پائی مگر جتنے مضمون پڑھے سبھی پسند آئے۔ خصوصاً ٹلو میاں، نئے سال کی خوشی، ہماری سواریاں، لڈو کا ٹکڑا، دُم والی تصویریں بھی نئی چیز ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ اینج کیپ، ستاروں کی دنیا، ہوائی جہاز کی کہانی، گل رُخ یہ سب بھی بہت اچھے قصے ہیں۔
ہمارا پیامِ تعلیم اُردو زبان کے تمام رسالوں سے اچھا ہے۔　　(قدسیہ خاتون نگہت۔ بانسی)

سالگرہ نمبر "پیامِ تعلیم" وصول ہوا۔ مجھے پیامِ تعلیم دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ مجھے پیامِ تعلیم میں جو سب سے اچھے مضموں پسند آئے یہ ہیں۔ ٹلو میاں، ہوائی جہاز کی کہانی، ہماری کیمپنگ، اینج کیپ، آؤ ڈراما کریں، نئے نئے کھیل، پرندوں کا سفر۔ مجھے یہ مضمون بہت پسند آئے۔ سچ پوچھئے تو سب رسالوں میں آپ کا پرچہ اچھا ہے۔ مجھے آپ کے پرچے سے بہت محبت ہے۔　　(محمد فاروق حسین، گلبرگہ)

سالگرہ نمبر بہت اچھا تھا خصوصاً "ٹلو میاں کی کہانی"　　(محمد حنیف، حیدرآباد دکن)

سالنامہ پہنچا۔ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ واقعی آپ نے اس میں بے حد محنت کی ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو بھی دکھایا انھوں نے بھی بہت پسند کیا۔
(حسن اصغر کاظمی، انبالہ)

سب مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ خاص کر ٹلو میاں، جانوروں میں تمدن، اہرام سقارہ کی سیر مجھے بہت پسند آئے۔
(محمد سلیم الدین، حیدرآباد دکن)

جناب ایڈیٹر صاحب "رتن جموں" اپنے ایک عنایت نامے میں لکھتے ہیں:-
"جنگ کی عنایات کی موجودگی میں ایسا
سالنامہ شائع کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی
آپ مستحق صد مبارک باد ہیں"

باوجود جنگ کے اور باوجود کاغذ کی مہنگائی کے آپ نے سالگرہ نمبر خوب نکالا۔ یہ بہت خوب صورت ہے اور اس میں کا ہر مضمون کہتا ہے کہ بس مجھے ہی پڑھو اور اس کی ہر نظم کہتی ہے کہ میں ہی اس پرچے کی حقیقی معنی میں لائق تھی۔ تصاویر بھی خوب ہیں۔ مجھے آپا جان کا مضمون بہت پسند آیا اور ستاروں کی دنیا والا۔
محمد عظیم قادری۔ حیدرآباد دکن

(۲)

(محمد عظیم اللہ صاحب)

اورِیلنا کا سفرنامہ پڑھ کر اور دریائے امیزن کے کنارے کا حال سن کر اور بہت سے لوگوں کو اس دریا کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں دو انگریز ہنری والٹر بیٹس اور الفریڈ رسل ویلس اس سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ ان دونوں نے پہلے کے سیاحوں سے بھی سنا تھا کہ امیزن کے پاس کے جنگلوں میں بڑے بڑے درخت۔ مختلف قسم کی بیلیں، عجیب و غریب پودے اور پھول اور عجیب عجیب قسم کے کیڑے مکوڑے اور چڑیاں ہیں۔ اس سفر سے اُن کا مقصد یہ بھی تھا کہ ان میں سے کچھ چیزیں (جو واقعی عجیب و غریب ہیں اور یورپ کے کسی عجائب خانے میں نہیں ہیں۔) جمع کریں اور اپنے ساتھ یورپ لے جائیں۔ یہ دونوں جنوبی امریکہ کے ایک بندرگاہ پارا پر اُترے۔ پارا دریائے پارا کے داہنے کنارے ایک خوب صورت شہر اور بندرگاہ ہے۔ دریائے پارا دہانے کے قریب بیس میل چوڑا ہے اور دریائے امیزن کے پاس ہی سمندر میں گرتا ہے۔ ایک تنگ آبنائے کے ذریعے یہ دونوں دریا آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ دریائے امیزن میں سفر کرنے والے جہاز اس آبنائے سے ہو کر گذرتے ہیں اور بندرگاہ پارا میں ٹھہرتے ہیں۔ ان سیاحوں نے پارا کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ یہیں سے وہ دریائے پارا اور اُس کے کنارے کے جنگلوں میں سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے ایک دن وہ دریائے ٹوکانٹنس پر پہنچ گئے۔ یہ دریائے پارا میں آکر ملتا ہے اور سولہ سو میل لمبا ہے۔ جس جگہ یہ دریا پارا میں آکر ملا ہے اس کی چوڑائی دس میل ہوگئی ہے۔ اسی دریا کے کنارے کے جنگلوں میں ایک دن ویلس پر ڈنک مارنے والی مکھیوں نے بُری طرح حملہ کیا۔ بے چارے کو بڑی مشکل سے نجات ملی۔ اس کے دو ہفتے بعد ایک اَور حادثہ پیش آیا۔ ویلس کی بندوق بھری رکھی تھی۔ اس نے کچھ عجیب چڑیوں کو دیکھا اور انھیں مارنے کے لئے بندوق اُٹھانا چاہی غلطی سے اس نے نال پکڑ کر کھینچی بندوق کا گھوڑا کسی لکڑی میں پھنس گیا اور بندوق چل گئی۔ اس حادثے میں اس کا ہاتھ

زخمی ہوگیا مگر اس نے یہ سبق بھی سیکھا کہ بندوق کبھی بھر کر نہ رکھنی چاہیئے۔

۱۸۵۰ء میں دونوں سیاحوں نے دریائے پارا چھوڑ کر دریائے ایمیزن میں سفر کیا۔ ویلیس ایک چھوٹی سی کشتی میں روانہ ہوا بیٹس ایک مہینے بعد ایک تجارتی کشتی میں روانہ ہوا۔ دونوں سیاح دریا اور اس کے کنارے کے جنگلوں میں سفر کرتے چلے جا رہے تھے مگر دونوں ساتھ ساتھ نہیں تھے۔ ایک رات کو بیٹس کی کشتی ویلیس کے پاس سے گذری مگر ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہوئی اس لئے کہ دریا بہت چوڑا ہے۔ کافی عرصے تک سفر کرنے کے بعد دونوں پھر ایک مقام "مانا اوز" (MANAOS) پر ملے۔ یہ شہر دریائے ایمیزن کے دہانے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ایمیزن کے ایک معاون دریا رالیونگرو (RIO NEGRO) کے کنارے پر ہے۔ اس جگہ ویلیس اور بیٹس کشتیوں میں گئے تھے لیکن آج کل یہاں تک سمندر کے بڑے بڑے جہاز پہنچتے ہیں۔ اور پارا سے چل کر چار روز میں مانا اوز پہنچ جاتے ہیں۔ مانا اوز میں یہ دونوں کچھ عرصے تک راستے کا سامان درست کرتے رہے۔ بعد میں یہ طے ہوا کہ ویلیس دریا رالیونگرو میں سفر کرے اور بیٹس دریائے ایمیزن میں۔

بیٹس ایک تجارتی کشتی میں روانہ ہوا۔ اس کشتی میں بادبان بھی تھے۔ لیکن دریا کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ بعض وقت بادبان اور چپو دونوں بیکار ثابت ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں یہ لوگ کشتی میں ایک موٹی رسی باندھ دیتے تھے۔ یہ رسی سامنے کے کسی بڑے درخت میں باندھ دی جاتی تھی اور پھر اس رسی کو پکڑ کر کشتی کو کھینچتے تھے۔ جب کشتی درخت کے پاس تک پہنچ جاتی تھی تو رسی کو کھول کر دوسرے درخت میں باندھ دیتے تھے۔ اور اسی طرح آگے بڑھتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کافی تیز ہوتی تھی تو بادبان سے کام لے کر کافی دور تک نکل جاتے تھے۔ مگر یہ تیز ہوا کبھی کبھی نقصان بھی پہنچاتی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس تیز ہوا نے ان کی کشتی کو کنارے کے ریت اور جھاڑیوں پر ڈال دیا۔ بڑی دقت اور پریشانی کے بعد یہ لوگ پھر کشتی کو پانی میں لائے۔

ایک رات یہ لوگ دریا کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ بیٹس سورج نکلنے سے پہلے ایک زور کے دھماکے کی آواز سن کر جاگ پڑا۔ فوراً ہی ملاح بھی جاگ گئے اِدھر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پاس ہی دریا کے اس پار دریا کا کنارا کٹ کٹ کر پانی میں گر رہا ہے۔ یہ دھماکے کی آواز دن چڑھے تک آتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے دیکھا کہ تین میل کے فاصلے پر دریا کے اس پار بے شمار درخت دریا میں بہہ رہے تھے۔ یہ درخت کوئی دو سو فیٹ لمبے تھے۔ ان کی کشتی آگے بڑھی مگر جب تک یہ لوگ دیکھ سکتے تھے یہی دیکھا کہ دریا کا کنارا کٹ کٹ کر پانی میں گر رہا تھا اور درخت دریا میں بہہ رہے تھے۔

پانچ ہفتے بعد بیٹس ایگا نامی (EGA) ایک گاؤں میں پہنچا جو مانا اوز سے ۷۰۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بیٹس نے اس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ اور اس کے قریب کے جنگلوں میں سفر کرکے عجیب و غریب جانوروں اور چڑیوں کو جمع کرنے لگا۔ ۹ سال تک وہ دریائے ایمزن اور اس کے معاون دریاؤں میں سفر کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ سُرخ ہندوستانیوں کے ساتھ رہا۔ سفید رنگ والا کوئی تاجر کبھی کبھی اس کی نظر سے گذرتا تھا۔

ان دریاؤں میں گھڑیال بہت زیادہ تھے جو اِدھر اُدھر شکار کی تلاش میں پھرتے نظر آتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک ہندوستانی بچے کا قِصہ سُنایا۔ ایک ہندوستانی بچہ دریا میں نہا رہا تھا۔ اس کا باپ اور کچھ اور لوگ کنارے پر بیٹھے تھے۔ یکایک لڑکا چیخ پڑا۔ اور اُس کے چیخنے کی آواز نے اس کے باپ کو چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گھڑیال اس کے بچے کو پانی کے اندر گھسیٹے لئے جا رہا ہے۔ وہ فوراً پانی میں کود پڑا اور گھڑیال کی آنکھ میں اپنی انگلی گڑا دی۔ گھڑیال نے لڑکے کو چھوڑ دیا۔ باپ بیٹے کنارے پر واپس آئے۔ لڑکا زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔

ایک مرتبہ بیٹس دریا کے کنارے کچھ ہندوستانیوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ یہ ہندوستانی دریا کے کنارے ریت میں کچھوے کا انڈا تلاش کرتے تھے۔ ہندوستانیوں نے دریا کے کنارے دُور ہٹ کر اپنے ٹھہرنے کا جھونپڑا بنایا تھا لیکن بیٹس، اور ایک ہندوستانی جس کا نام کارڈوزو (CARDOZO) تھا۔ پانی کے کنارے ایک جھونپڑے میں ٹھہرے تھے۔ کارڈوزو کے پاس ایک کتّا تھا یہ دونوں اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے اور کتّا آگ کے الاؤ کے پاس لیٹا تھا۔ رات کے وقت پانی سے ایک گھڑیال نکل کر ان کے جھونپڑے تک کتّے کو پکڑنے کے لئے آیا۔ کتّے کے بھونکنے سے کارڈوزو اُٹھ بیٹھا اور گھڑیال کو بھگانے کے لئے اس کو جلتی ہوئی لکڑی سے مارنے اور شور مچانے لگا۔ اس شور کو سُن کر بیٹس بھی جاگ پڑا اور اس نے دیکھا کہ کارڈوزو نے گھڑیال کو جلتی لکڑیوں سے مار کر پانی میں پہنچا دیا۔

ایک روز بیٹس کو معلوم ہوا کہ دریا ایمزن کے ایک معاون دریا ٹپاجوز (TAPAJOS) کے دوسرے کنارے پر جو ۳۰ میل چوڑا ہے۔ سفید بندر ہیں جن کو اس نے نہیں دیکھا ہے۔ اس نے پندرہ بیس آدمیوں کے ساتھ ایک بہت پرانی کشتی میں اس پار جانے کا اِرادہ کیا۔ اس میں تین بھیڑیں بھی تھیں۔ بھیڑوں کے کُھر سے لگ کر کشتی میں سوراخ ہو گیا اور کشتی کے اندر پانی آنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ کر سوراخ بند کئے اور کچھ لوگ کشتی سے پانی نکال رہے تھے۔ خدا خدا کرکے بڑی دقّت اور پریشانی کے بعد کشتی کنارے تک پہنچ گئی۔

میرا دلچسپ مشغلہ

امیر اللہ خاں، بھوپال

دسمبر کا پیام تعلیم ملا۔ اور مضمون کے مقابلہ کا سلسلہ بھی۔ جناب ہمیں تو بچپن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور خوب صورت چیز تتلی معلوم ہوئی۔ نانی جان کہا کرتی ہیں کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے لئے اکثر نئے نئے کھلونے آیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی میرا محبوب ترین کھلونا وہ ہوتا تھا۔ جو یا تو خود تتلی ہوتا تھا یا تتلی کی شکل سے ملتا جلتا۔ میرے پاس اب بھی ایک اسپرنگ سے چلنے والی جاپانی تتلی موجود ہے۔

یہ تو اس وقت کی بات ہے جب ہم نے ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ لیکن وہ دن ہمیں کبھی نہ بھولیں گے جب ہم اپنے چچا یا بڑے بھائی جان کے ساتھ روز باغ جایا کرتے تھے وہاں کوئی تو سبزے پر دوڑ لگاتا۔ کوئی اپنے کھلونوں سے کھیلتا، مگر ہم ہیں کہ تتلیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ باغ میں روز جاتے ہی تھے، کئی ہم عمر، دوست بھی بن گئے۔ ہم سب مل کر تتلیوں کا پیچھا کرتے۔ مگر بھلا وہ کب ہمارے ہاتھ آتیں۔

کتنا دلچسپ ہوتا تھا وہ منظر جب ہمیں کوئی تتلی کسی پھول پر بیٹھی دکھائی دیتی! سب نے اشارے سے کہا "چپ چپ" سب خاموش ہوجاتے اب ہم بلی کی طرح تاک لگائے ہوئے آہستہ آہستہ ایک ایک قدم پر رکتے جھجکتے اس کے پاس پہنچتے۔ اور سنبھال سنبھال کر نشانہ لے کر ہاتھ بڑھاتے۔ مگر کبھی تو ایک ذرا سے ہوا کے جھونکے سے پھول ہل جاتا اور وہ اڑ جاتی، کبھی ہماری پھولی ہوئی سانس کی آواز کو محسوس کرکے رفو چکر ہو جاتی۔ اور کبھی ہماری بے احتیاطی سے پاؤں غلط پڑ جاتا اور ہم ڈگمگا جاتے اور وہ آہٹ پاکر "یہ جا وہ جا" غرض تتلی ہمارے ہاتھ نہ آتی تو ہم تھک کر سستانے کو بیٹھ جاتے۔ روز کا ہمارا یہی

مشغلہ تھا ——— کسی روز اتفاق سے کوئی تتلی ہمارے ہاتھ آ جاتی تو پھر دیکھئے ہم کس قدر خوش! خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس وقت جو ہم ہیں سو دنیا میں کوئی نہیں! کبھی تتلی کو الٹ کر دیکھتے، کبھی پلٹ کر۔ کبھی اپنا کارنامہ دوسروں کو دکھا کر داد کے طلب گار ہوتے۔ جو تتلی کو پکڑ لیتا وہ اس روز بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ گویا اس کو مصاحبوں میں بادشاہ سمجھتے تھے۔ یہ عزت اکثر ہم ہی کو نصیب ہوتی تھی۔

تتلی کے پروں میں کچھ رنگین چمکدار سفوف سا ہوتا ہے۔ وہ جو ہمارے ہاتھوں میں لگتا تو ہم سمجھتے کہ بےچاری کو دکھ ہو رہا ہوگا اور ہم کو بوا جان (والدہ مرحومہ) کی کہی یاد آ جاتی کہ "بیٹا کسی کو، جان دار ہو یا بے جان خواہ مخواہ نہیں ستاتے۔ نہیں تو گناہ ہوتا ہے اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں" اور ہم اسے چھوڑ دیتے۔

ایک دفعہ ہمارے ہاں "بوٹ" (کچے چنے) آئے۔ بڑے مزے سے سب کے سب ایک ایک ٹہنی لئے کھا رہے تھے۔ میرے پاس جو ٹہنی آئی اس میں سے ایک موٹا سا ہرے رنگ کا کیڑا نکلا۔ میں نے ڈر کر پھینک دیا کہ کاٹ نہ کھائے۔ اور لگا پاؤں سے کچلنے مگر بڑی آپا "ہائیں ہائیں" کر کے دوڑیں اور کہنے لگیں "اسے مارو نہیں اس کی تتلی بنائیں گے جاؤ بڑے بھائی جان سے سوئیوں کی خالی ڈبیا مانگ لاؤ۔ بڑی منتوں اور خوشامدوں سے ڈبیا ملی۔ اس میں کچھ ہری پتیاں کیڑے سمیت بند کر دی گئیں۔ کیڑے کا روز معائنہ ہوا کرتا۔ پانچ چھ روز کے بعد اس کی شکل چکردار گھونگھے کی سی ہو گئی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیڑا مر گیا۔ ہلے نہ جلے۔ کوئی پندرہ دن تک یہی حالت رہی۔ ایک روز میں نے کھول کر جو دیکھا تو ڈبیا میں کچھ پھڑ پھڑایا۔ میں نے جلدی سے ڈبیا بند کر دی بڑی آپا کے پاس لے کر پہنچا۔ تتلی بن گئی تتلی بن گئی کا شور ہو گیا۔ سب بچوں نے بڑی آپا کو گھیر لیا۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے میں تتلی کو دیکھوں۔ ایک کو ایک دھکے دے رہا تھا۔ بڑی آپا نے جو ڈبیا کھولی تو انھیں بھی ایک دھکا ملا۔ ڈبیا احمد میاں کے سر پر جا کر پڑی۔ وہ بے چارے سر سہلاتے ہوئے ایک طرف کو ہوئے۔ تتلی پہلے ہی اُڑ چکی تھی ہمیں اس تتلی کو دیکھنے کی آرزو ہی رہ گئی مگر ہاں یہ یقین ضرور ہو گیا کہ تتلی اصل میں

ایک کیڑا ہوتا ہے۔ جو گھونگے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بعد میں پھر اس میں سے تتلی نکل کر اڑ جاتی ہے۔

تتلیوں کے پکڑنے کا مشغلہ ابھی چھوٹا ہے جب سے ہم اسکاوٹ ہو گئے ہیں۔ اسکاوٹ کا چھٹا قانون ہے کہ اسکاوٹ جانوروں پر مہربان ہوتا ہے۔ اسی قانون کی پابندی نے ہمیں مجبور کر دیا، نہیں تو ہمارے پاس اس وقت ایک البم ہوتا۔ اور اس میں طرح طرح کی رنگین اور خوب صورت تتلیاں چسپاں ہوتیں!

اس کے علاوہ میرا ایک اور مشغلہ ہے بہت دلچسپ؛ چھوٹے چھوٹے بچے مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ لگتے تو سب ہی کو اچھے ہیں مگر میری طرح نہیں۔

ہم جب چھوٹے تھے اور باغ میں تتلیاں پکڑنے جایا کرتے تھے، وہاں اور بھی بہت سے بچے آیا کرتے تھے۔ ہماری دوستی ان سے بہت جلد ہو جاتی تھی اب تو میں بچہ نہیں رہا۔ لیکن اب بھی مجھ میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ بچے مجھ سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں اس لئے نہیں کہ میں انھیں مٹھائی یا کھلونوں کا لالچ دے کر بہلا لیا کرتا ہوں۔ بلکہ میرا رویہ ان کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے ہل جاتے ہیں میں بچوں کی عادت اور ان کے مزاج کا بہت جلد اندازہ لگا لیتا ہوں یہی میری کامیابی کی کنجی ہے۔

سعادت

پارسال کی طرح اس سال بچوں کے پندرہ روزہ رسالہ سعادت نے بھی اپنا سالنامہ بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مضمون، نظمیں، کہانیاں، سبھی چیزیں بہت اچھی اور دلچسپ ہیں لکھنے والوں میں مولینا عبد المجید سالک جناب شفیع الدین صاحب نیر جناب حفیظ جالندھری۔ جناب نصیر احمد صاحب جناب عارف صاحب کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کئی اچھی کہانیاں اور دلچسپ نظمیں خود ایڈیٹر صاحب کی ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی بہت اچھا ہے۔ ٹائیٹل دو رنگا ہے مگر بہت سادہ اور بہت بھلا لگتا ہے غرض فاروقی صاحب کی کوشش ہر اعتبار سے قابل مبارکباد ہے۔

مقام اشاعت لاہور

تارے

تارے آسمان کے — پیارے کُل جہان کے
دن میں تم چھپے رہے — شب کو پھر چمک اُٹھے
جگمگا اُٹھے کبھی — مسکرا اُٹھے کبھی
ہلکی ہلکی روشنی — آنکھ کو لگے بھلی
آسمان گھر بنا — چاند ہم سفر بنا
بادلوں کا راز دار — بجلیوں سے ہم کنار
دے چلا ہے راحتیں — لے چلا ہے کلفتیں
تیری سرد چھاؤں میں — خوش نما ہواؤں میں
ہو کے تجھ سے بے خبر — سوؤں گا میں رات بھر
دیکھ سُن لیا ذرا — کہہ رہا ہوں تجھ سے کیا
پھر جگا کے جائیو — ہاں اُٹھا کے جائیو

تارے آسمان کے

لے میرا سلام لے

از ایس ، ایم جبرئیل جبلپور

علم کی فضیلت

علم سے انسان پاتا ہے کمال ۔ اس کے آگے ہیچ ہیں مال و منال
ہے حصولِ علم فرض انسان کا ۔ خواہ کرنا ہو سفر جاپان کا
علم والوں کو ہے دنیا میں ثبات ۔ جاہلوں کی پوچھتا ہے کون بات!
علم ہے کامل ترقی کا سبب ۔ دور کرتا ہے یہ سب رنج و تعب
علم سے انسان پاتا ہے فروغ ۔ ہے یہ سچ اس میں نہیں کچھ بھی دروغ
دولت و ثروت سبھی ہے علم سے ۔ عزت و حشمت سبھی ہے علم سے

چاہتا ہے دولت و اقبال گر ۔ علم سے غافل نہ ہو اے بے خبر
تار ، ٹیلیفون ، موٹر اور ریل ۔ علم ہی کے تو ہیں بس سارے یہ کھیل
چاہتے شہرت ہو گر اے دوستو ۔ علم کو کوشش سے تم حاصل کرو
ہیں غرض اتنے فوائد علم کے ۔ غیر ممکن ہے کہ کوئی لکھ سکے

ہے دُعا عاصیؔ کی تجھ سے اے خدا
علم کی دولت تو کر سب کو عطا

(عاصیؔ ۔ فتح گڈھی)

ریڈیو

مارکونی نے بنایا ریڈیو ۔ ہے بہت اچھا ہمارا ریڈیو
روز یہ گانے سناتا ہے ہمیں ۔ روز یہ خبریں بتاتا ہے ہمیں
روز یہ باجا بجاتا ہے ضرور ۔ گیت یہ اچھا سا گاتا ہے ضرور
ریڈیو ہم کو سناتا ہے ستار ۔ اس لئے سنتے ہیں اکثر بار بار

مارکونی نے بنایا ریڈیو
ہے بہت اچھا ہمارا ریڈیو

مصباح الدین عمر ۸ سال
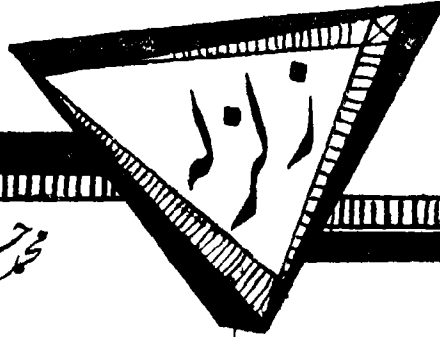
اس دنیا میں انسان پر بیسیوں مصیبتیں آتی ہیں۔ وبائیں، قحط، سیلاب، لڑائیاں وغیرہ۔ ان مصیبتوں سے بچاؤ کے لئے انسان اپنے مقدور بھر تدبیریں بھی کرتا ہے۔ مگر ایک مصیبت ایسی ہے جو آناً فاناً آتی ہے اور منٹوں اور سکنڈوں میں بے شمار عمارتوں کو تباہ ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور ہزاروں بچوں کو یتیم کر جاتی ہے تم سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا مطلب زلزلے سے ہے۔

زلزلے ہزاروں لاکھوں برس سے آتے ہیں اور اسی طرح بے سان گمان آتے ہیں۔ اگلے زمانے کے قصے چھوڑو ابھی کوئی سولہ سترہ سال ہوئے جاپان میں زلزلہ آیا تھا۔ شہر کے شہر تباہ ہو گئے، ہزاروں آدمی مر گئے بے شمار عمارتیں زمین کے برابر ہو گئیں اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا، پھر خود اپنے دیس یعنی بہار کے صوبے میں ایسا زلزلہ آیا کہ خدا کی پناہ! کہتے ہیں مونگیر مظفر پور دو شہر تو قریب قریب تباہ ہو گئے اور شہروں کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ یہاں کے بعض قصے بہت دلچسپ مشہور ہیں۔ مثلاً پہاڑوں کے پاس بعض مقامات پر ریت ہی ریت نکل آیا۔ بعض پکے مکان زمین میں دھنس گئے بعض جگہ پانی نکل آیا۔ گیا کے ضلع میں بازید پور ایک بستی ہے۔ یہ ایک ندی کے کنارے آباد ہے۔ ندی برسات کے علاوہ خشک رہتی ہے زلزلے کے زمانے میں یہ خشک تھی۔ زلزلہ آیا تو اس ندی کے کنارے کوئی ایک میل تک زمین پھٹ گئی۔ یہ شگاف کوئی چھ انچ چوڑا ہو گا۔ اس میں کئی جگہ سے پانی نکل کر بہنے لگا۔ پانی کے ساتھ مچھلیاں بھی نکل پڑیں۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہوا کہ ندی کی خشک ریت میں ہزاروں فوارے پھوٹ پڑے۔ پانی نکل نکل کر بہنے لگا۔ بعض کا پانی تو دو دو تین تین فٹ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس

خبر سے ایک شور سا برپا ہو گیا۔ لوگ زلزلے کی
پریشانی بھول گئے اور ندی کی طرف دوڑے
بڑا دل کش منظر تھا۔ پانی کے ساتھ مچھلیاں بھی
نکل رہی تھیں۔ لوگ ان مچھلیوں پر پل پڑے۔

ابھی بہار کے زلزلے کی غمناک یاد باقی
تھی کہ دو تین سال کے بعد کوئٹہ میں بہت
شدید زلزلہ آیا اور دو چار ہی منٹ میں سارا
شہر کھنڈر ہو گیا۔ بہت کم ایسے خوش نصیب
تھے جو زندہ بچے اور ایسا تو کوئی بھی نہیں تھا
جس کے خاندان میں سے دو چار آدمی نہ مرے
ہوں۔ عمارتوں اور روپئے پیسے کا نقصان تو
بے اندازہ ہوا۔

ابھی پچھلے سال ٹرکی میں بہت زبردست
زلزلہ آیا کہتے ہیں بہار کا زلزلہ بھی اس کے
آگے مات تھا۔ جان اور مال دونوں کا بہت
زیادہ نقصان ہوا۔ پھر ایک مصیبت یہ آئی
کہ زلزلے کے علاقے میں سیلاب آگیا۔ اور
درجۂ حرارت گر گیا، اس سے اور بھی تباہی آئی
کوئی دو مہینے ہوئے رومانیہ میں ایسا ہی زلزلہ
آگیا۔ اس کے دارالسلطنت بخارسٹ کو بہت
زبردست نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ اس
زلزلے کا اثر دور دور تک تھا۔

تلاش اور جستجو کا مادہ تو تم جانو انسان
کی فطرت میں ہے۔ شروع سے مختلف زمانوں
میں زلزلوں کی مختلف توجیہیں کی گئیں۔ چنانچہ ہر
ملک میں زلزلے کے بارے میں مختلف روایتیں
مشہور ہیں۔ خود ہمارے ملک میں ایک روایت
بہت عام اور بہت دلچسپ ہے۔

یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری
زمین ایک گائے کے سینگ پر رکھی ہے
گائے جب ایک سینگ پر زمین کو رکھے رکھے
تھک جاتی ہے تو اسے دوسرے سینگ پر
رکھنا چاہتی ہے۔ بس سینگ بدلتے وقت زمین
کو حرکت ہوتی ہے اور زلزلہ آجاتا ہے۔ مگر
جوں جوں دنیا نے اور اس کے ساتھ علم اور
عقل نے ترقی کی۔ یہ خیالات بھی خرافات
ثابت ہونے لگے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے سائنس
کی مدد سے بہت سی تحقیقیں کیں اور یہ سلسلہ
اب تک جاری ہے۔ ایک بالکل نئی اور تازہ
تحقیق مرتے کا نظریہ کہلاتی ہے۔ اس نظریے
کا نام ہے الاسٹک ری باؤنڈ (ELASTIC REBOUND THE-
ORY) اسے سمجھنے کے لئے ہمیں ذرا پیچھے کو مڑنا
پڑے گا۔ بہت پیچھے، جب یہ دنیا وجود میں
آرہی تھی

کہتے ہیں زمین کا وجود بھاپ کی شکل میں
ہوا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی یہ بھاپ

ٹھنڈی ہوتی گئی اور مادّا کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہ مادّا جُوں جُوں ٹھنڈا ہوتا گیا ٹھوس ہوتا گیا۔ چنانچہ زمین کے اوپر کا حصّہ بالکل ٹھنڈا اور ٹھوس ہے۔ لیکن اندرونی حصّہ ابھی تک بیچ کی منزل میں ہے۔ یعنی بہت ہی گرم مادّا ہے، جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ ہر چیز ٹھنڈی ہونے پر سکڑتی ہے۔ کوئی گرم چیز جتنی جگہ گھیرے گی ٹھنڈی چیز اس سے کم جگہ گھیرے گی۔ اچھا تو جب زمین کے اندر کا حصّہ ٹھنڈا ہو کر کچھ سکڑتا ہوگا۔ تو اس نئے ٹھنڈے ٹکڑے اور پرانے ٹھنڈے ٹکڑے کے درمیان کچھ جگہ تو ضرور خالی ہوتی ہوگی ہاں اور آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات اور سمجھ لو۔ تمھاری زمین بھی گھڑی کی کمانی کی طرح لچکدار ہے۔ تم روزانہ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد اس میں کوک دیتے ہو مگر وہ آہستہ آہستہ کھل کر پھر اپنی اصلی صورت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ زمین کے اندرونی حصّے کے سکڑنے کی وجہ سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے اوپر کے بوجھ یا دباؤ کی وجہ سے زمین کا اوپری حصّہ اس طرف جھکنا شروع ہوتا ہے۔ بوجھ زیادہ ہوتا ہے تو کم زور حصّہ ٹوٹ کر خالی جگہ میں گرجاتا ہے۔ باقی حصّہ لچکدار ہونے کی وجہ سے بہت بڑی طاقت سے واپس جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ کسی پیڑ کی باہر نکلی ہوئی شاخ کو پکڑ کر لٹک جاؤ۔ اور پھر ایک دم چھوڑ دو۔ یہ یہ شاخ بجائے اپنی جگہ پر واپس چلے جانے کے جھٹکے لیتی رہے گی۔ یہ جھٹکے پہلے بہت تیز ہوں گے، رفتہ رفتہ کم ہوتے جائیں گے۔ یہی حالت یہاں بھی ہوتی ہے۔ مگر چونکہ زمین پر دباؤ بہت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ جھٹکے بہت زبردست ہوتے ہیں۔ اور یہی زلزلہ ہے۔

اگر زلزلے کا اثر بہت دور تک ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ زمین کا بہت بڑا حصّہ بہت تیزی سے اپنی جگہ واپس آیا ہے۔ اگر تھوڑے سے علاقے میں زلزلے کے کئی کئی جھٹکے محسوس ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کا وہ ٹکڑا جو اپنی جگہ واپس آیا ہے بہت لچکدار تھا۔ اور اس ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

بلّی آڑے آئی

عظیم قادری صدف حیدرآبادی

ایک دن کا ذکر ہے کہ پھوپی امّاں ہم سے کہنے لگیں "بیٹا! دیکھنا جب کبھی تم کسی کام پر جاؤ اور بلّی آڑے آ جائے۔ تو الٹے پاؤں واپس چلے آنا، کیونکہ بلّی کے آڑے آنے سے کام نہیں بنتا۔ اور سب معاملہ الٹا پلٹا ہو جاتا ہے ہاں اور اگر کوئی اُلّو بولے تو بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اُلّو بہت منحوس جانور ہے۔" ہم بھلا روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانے کی پیداوار ان پرانی بوڑھیوں کی باتوں کو کہاں خاطر میں لاتے۔ ہم نے پھوپی اماں کے اس وہم کی وہ مذمت کی کہ وہ غصے سے لال پیلی ہو گئیں اور ہمیں پیٹنے کی دھمکی دینے لگیں۔ ہم نے ایک قہقہہ لگایا۔ مگر پھوپی امّاں سے دور جا کر اور وہیں سے کہنا شروع کیا "پھوپی امّاں! رہنے بھی دو اِن باتوں کو آخر ان فضول چیزوں میں دھرا ہی کیا ہے۔ یہ تو محض بوڑھیوں کی من گھڑت باتیں ہیں اور تمام قصور ان کی جہالت کا ہے۔" ہمارا یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی لکڑی لے کر ہماری طرف لپکیں، ہم وہاں سے چمپت ہونا چاہتے تھے۔ مگر نہ معلوم کیوں ہمارے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئیں۔ اس کی وجہ شاید پھوپی اماں کا ڈر تھا۔ ہم نے فوراً توبہ کرتے ہوئے کہا "پھوپی امّاں اب سے نہیں کریں گے معاف کر دیجئے۔" پھوپی امّاں کا غصہ تو اتر گیا۔ مگر انھوں نے فاتحانہ انداز میں کھڑے ہو کر یوں خطبہ شروع کیا۔

"ہمارے سامنے کا لَلّو اور یہ جرأت! ہماری باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ بے ادب کہیں کا میں پہلے ہی سے تیرے باپ سے کہتی تھی کہ دیکھ اسے انگریزی نہ پڑھا۔ انگریزی پڑھنے سے لڑکے بے ادب اور گستاخ ہو جاتے ہیں مگر وہ میری بات کاہے کو سنتا۔ ذرا اس چھوکرے کو دیکھو کتنا بے ادب ہو گیا ہے ہماری باتوں کو ہنسی میں اڑاتا ہے۔ اچھا

بھئیں آنے دے اپنے باپ کو کیا مزہ چکھاتی ہوں" یہ کہہ کر پھوپی اماں لکڑی رکھ بیٹھ گئیں اور ہم ڈرتے ڈرتے ان کے نزدیک پہنچے اور بہت عاجزی سے معافی کی درخواست کی اور جھوٹ موٹ رونے بھی لگے۔ اس پر ہماری رحم دل پھوپی اماں کی محبت کا دریا جوش میں آیا۔ اور انھوں نے ہمیں سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو آئندہ ایسا نہ کرنا۔ بیٹا! بڑوں کا ادب کیا کرو۔ بڑے جو بھی کہیں اس کو کان لگا کر سنو۔ فضول ضد کبھی نہ کرنا چاہئیے۔" پھر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں "اچھا تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تو میں تیرے پھوپا کا ایک قصہ سناتی ہوں۔ وہ بھی تیری طرح میری ان باتوں کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک روز صبح صبح انھیں کسی کام پر جانا تھا۔ کپڑے پہن کر دالان کے دروازے سے نکل رہے تھے کہ ایک کالی بلی آڑے آگئی۔ میں نے یہ دیکھ لیا اور انھیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ کہاں مانتے، چلے گئے جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ تمام کام الٹا ہو گیا۔ اس روز سے وہ میرے قائل ہو گئے" پھوپی اماں کی یہ تقریر سن کر سچ مانئے ہم بھی ان کے قائل ہو گئے۔

اب سنئے اس کالی بلی نے ہمارے ساتھ کیا شرارت کی۔ امتحان ختم ہو چکا تھا۔ پرچے اچھے گذرے تھے۔ مگر تاریخ و جغرافیہ میں کچھ کم نمبر آنے کی امید تھی۔ نتیجہ کو صرف آٹھ دن باقی تھے۔ ہمیں اس دن کا بہت انتظار تھا کیوں کہ امید تھی کہ ہم بفضلہ تعالیٰ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ صبح اٹھ کر وضو کیا نماز پڑھی اور بارگاہ رب العزت میں غیر معمولی طور پر گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگے، پھر ناشتہ کیا اور کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اتنے میں ہمارے ہم جماعت، ہم محلہ اور سب سے زیادہ عزیز دوست سلیم آدھمکے ہم دونوں سائیکلوں پر سوار ہوئے اور مدرسہ کا رخ کیا۔ کچھ دور پہنچے تھے کہ ہمارے منہ سے بیساختہ ایک چیخ نکل گئی "سلیم"! اور ہم دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ سائیکل ایک طرف اور ہم ایک طرف، کہیں آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ ٹکر ہو گئی۔ بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ایک موٹی تازی کالی بلی ہمارے آڑے آگئی تھی اس کو دیکھتے ہی سائیکل تلے کی زمین نکل گئی، دماغ چکرانے لگا۔ آنکھوں میں کالی بلیاں پھرنے لگیں ہم سلیم کی مدد سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے جھاڑ کر سلیم سے سارا ماجرا کہدیا

اور گھر لوٹنے کی اجازت چاہی۔ مگر سلیم ہماری وہم پرستی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے ہمیں گھر واپس جانے سے منع کیا اور پکڑ کر کسی نہ کسی طرح مدرسے لے ہی چلا۔ اب ہمیں پھوپی اماں کی بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ کانوں میں الوؤں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لطف یہ کہ اس روز دن کے وقت اُلّو بول رہے تھے۔ اور وہ بھی شہر کے اندر آنکھوں کے سامنے موٹی تازی کالی بلیاں بڑی سرگرمی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں اب ہمارے دماغ سے امتحان میں کامیاب ہونے کا خیال کوسوں دور تھا۔ اسی وحشت انگیز حالت میں ہم مدرسہ پہنچے اور نوٹس بورڈ پر کانپتی ہوئی نگاہیں ڈالیں "میرے اللہ میری مدد کر!" آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور جسم بید کی طرح کانپنے لگا۔ فہرست میں ہمارا نام موجود نہ تھا ہاں البتہ سلیم کا نام نظر آیا

کچھ دیر اس طرح کھڑے تھے کہ اتنے میں پیچھے سے سلیم نے ہماری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "بھئی مبارک! کیوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو؟ کیا ابھی اپنے نام کو دیکھ کر جی نہیں بھرا؟" سلیم کی اس حرکت پر ہمیں بڑا غصہ آیا۔ مگر ہم غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولے۔ "مذاق نہ کرو سلیم! میرا نام تو اس فہرست میں موجود ہی نہیں۔" اس پر سلیم کو بہت غصہ آیا۔ اس نے ہمیں ایک زور سے گھونسہ مارتے ہوئے کہا "ارے آنکھوں کے اندھے دیکھ تیرا نام سب سے اوپر درج ہے۔" اب جو دیکھتے ہیں تو سچ مچ ہمارا نام فہرست میں سب سے پہلے لکھا ہوا تھا۔ مگر اس وقت آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ پڑ گیا تھا کہ دیکھ نہ سکے اب ہم بہت خوش ہوئے۔ مگر پھوپی اماں پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

فونٹین پن تو اکثر پیامیوں کے پاس ہوگا۔ مگر اس پر کسی پیامی نے شاید ہی کبھی غور کیا ہو کہ یہ کب ایجاد ہوا اور کہاں بنتا ہے۔ فونٹین پن کو بعض لوگ جیبی قلم بھی کہتے ہیں

کوئی ایک سو سال پہلے پَر یا بَرو کا قلم استعمال ہوتا تھا۔ اب بھی کہیں کہیں اس کا رواج ہے۔ سو سال پہلے نب والا قلم ایجاد ہوا۔ شروع میں اسے عام طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ لیکن ۱۸۴۹ء میں بہت زیادہ استعمال ہونے لگا۔ صرف انگلستان کے ایک شہر برمنگھم میں دو ہزار آدمی روزانہ کام کر رہے تھے اور ہفتہ بھر میں ۹۲۶۰۰۰۰ قلم تیار ہوتے تھے

امریکہ میں پہلا سونے کا قلم ۱۸۳۶ء میں بنایا گیا تھا اور پہلا فونٹین پن ۱۸۴۰ء میں تیار کیا گیا۔ ابتدا میں فونٹین پین بہت قیمتی ہوتے تھے۔ اور خراب بنتے تھے۔ اس لئے عام طور پر لوگوں میں مقبول نہیں ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے میں فونٹین پن زیادہ استعمال ہونے لگے۔ اس وقت خود بخود بھرے جانے والے فونٹین پن نہیں تھے۔ گذشتہ پچیس سال سے تو فونٹین پن کا استعمال بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اب تو ہر طالب علم اور ہر پڑھا لکھا فونٹین پن رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔

فونٹین پن کے چار حصے ہوتے ہیں۔

۱۔ نیچے کا حصہ جس میں سیاہی ہوتی ہے۔
۲۔ اوپری حصہ
۳۔ چمچہ نما حصہ
۴۔ ڈھکنا۔

نیچے کا حصہ اور ڈھکنا بہترین قسم کے ربر سے تیار کیا جاتا ہے۔ پہلے ربر کو پندرہ دن گرم پانی میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو روندھا جاتا ہے۔ پھر اسے گندھک

کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور پھر گرم کیا جاتا ہے۔ اس کام کو خاص طریقے سے کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ربر میں سختی پیدا ہو جائے۔ اب قلم کے مختلف حصے تیار کئے جاتے ہیں۔ کم داموں کے قلم کے حصے مشین سے تیار ہوتے ہیں اور قیمتی قلم ہاتھ سے تیار کئے جاتے ہیں آج کل جاپان کا فوز کے سستے قلم بنا کر ہندوستان میں فروخت کرتا ہے۔ مختلف حصے تیار ہونے کے بعد ان پر پالش کی جاتی ہے پھر مختلف تجربے کئے جاتے ہیں۔ فونٹین پن کو پانی کے اندر رکھا جاتا ہے۔ اور ہوا کو پچکاری کے ذریعہ دباؤ کے ساتھ قلم کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سونے کی نب کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اسے زنگ نہیں لگتا۔ اگر ہم اس کو سیاہی میں ایک سال تک رکھ چھوڑیں تب بھی خراب نہیں ہوتی۔ اس کے خلاف لوہے کی نب کو زنگ لگ جاتا ہے۔

خالص سونے کی نب نرم ہوتی ہے۔ اور جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس میں چاندی وغیرہ ملائی جاتی ہے بعد میں ایک اور طریقہ بھی ایجاد ہوا۔ یعنی نب کی نوک پر ایک قیمتی دھات اریڈیم (IREDIUM) ملائی جاتی ہے۔ یہ دھات بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے سونے کی نب جلد خراب نہیں ہوتی اور بہت دنوں تک کام دیتی ہے۔ نب پر دھات بٹھانا بھی بہت مشکل کام ہے کیونکہ یہ سخت ہوتی ہے۔ ہیروں کے ریزوں کے ذریعہ اس کو نب کی نوک پر جمایا جاتا ہے۔ یہ دھات صرف قیمتی قلموں کے نبوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے پارکر وغیرہ

کارخانے میں جس جگہ سونے کے نب تیار ہوتے ہیں اور جہاں ان پر پالش کی جاتی ہے۔ وہاں کام کرنے والوں کو ایک خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ اس لباس کو دھویا نہیں جاتا بلکہ چند روز کے بعد اسے جلا دیا جاتا ہے۔ اور سونا راکھ سے دوبارہ حاصل کر لیا جاتا ہے۔

بیٹے انور - سلمہٗ

میں ہر لفافے میں تمھارا خط تلاش کرتا ہوں۔ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے۔ تم مجھے باقاعدہ خط لکھا کرو۔ اس میں کچھ نہیں تو ہندوستان کی اور دوسرے ملکوں کی ہفتے بھر کی خبریں ہی لکھ بھیجا کرو جیسے تم اپنے مستونگ[1] کے اسکول میں سنایا کرتے تھے۔ میں جواب میں انشاء اللہ اتنا لمبا خط لکھوں گا جتنا تم لکھو گے۔ آج بھی میں تمھیں دوبٹی کے کچھ حالات لکھ رہا ہوں۔

ذرا پہلے ایران اور عرب کا نقشہ دیکھ لو۔ دیکھو خلیج فارس میں عرب کے کنارے بندر عباس سے کوئی ۹۰ میل کے فاصلے پر دوبٹی واقع ہے۔ یہاں ۵۰ فی صدی سے زیادہ ایرانی آباد ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں تھوڑے سے ایران کے بلوچ بھی ہیں۔ یہ زیادہ تر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اُن کی اصل زبان بلوچی ہے جو کران میں بولی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور عرب ہیں۔ ان کی گذر اوقات زیادہ تر موتی نکالنے پر ہے۔

موتی نکالنے کا کام عام طور پر جون سے شروع ہوتا ہے اور اکتوبر کے آخر میں بند کر دیا جاتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں یہ لوگ کام نہیں کرتے۔ رمضان گرمیوں میں پڑ جائے تو یہ مہینہ ختم کرنے کے بعد موتی نکالنے کا کام شروع کرتے ہیں۔ موتی نکالنے کو یہاں غواصی کہتے ہیں اور موتی نکالنے والا غواص کہلاتا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں یہ لوگ بڑی بڑی کشتیوں میں کھانے پینے کا سامان لے کر غواصی کے لئے نکل جاتے ہیں اور چار یا پانچ مہینے کے بعد لوٹ کر آتے ہیں۔ اگر موتی کافی مقدار میں نکل آئے یا کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا یا کشتیوں کی مرمت کی ضرورت پڑ گئی تو پہلے بھی آ جاتے ہیں۔

یہ کشتیاں چھوٹی بڑی سبھی طرح کی ہوتی ہیں۔ اور ان میں ۲۰ سے لے کر ۸۰ تک آدمی بیٹھ سکتے ہیں

[1] مستونگ بلوچستان میں ریاست قلات کے پاس ایک قصبے کا نام ہے

بڑی کشتیاں کافی بڑی ہوتی ہیں اور ان میں اچھی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ ان کشتیوں کو یہ لوگ جہاز کہتے ہیں۔ یہ کشتیاں یا جہاز خود ہی بناتے ہیں۔ لکڑی ملیبار سے آتی ہے۔ (کشتیوں کے لئے خاص لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔)

غوّاص جب گرمیوں کے آخر میں اپنی کشتیوں پر واپس آتے ہیں تو اسے یہاں قفال کہتے ہیں۔ آج کل یہاں قفال کے دن ہیں۔ کل سے غوّاصوں کی کشتیاں واپس آرہی ہیں۔ بڑی کشتیوں میں چھوٹی چھوٹی توپیں بھی ہوتی ہیں۔ کشتی والے دوبئی پہنچتے ہی ایک ایک توپ داغتے ہیں۔ یہ گویا یہاں پہنچنے کا اعلان ہے۔ کل دن بھر وقتاً فوقتاً توپیں چلتی رہیں۔ رات بھی یہی حال رہا۔ جہازوں پر سب کے جداگانہ جھنڈے بھی لہراتے ہیں۔ اب دو تین دن یہ جہازوں کا سامان اور پردے وغیرہ نکالیں گے اور سیپیوں میں سے موتی نکال کر فروخت کریں گے۔ پھر نو دس دن تک نئے نئے کپڑے بدل کر بازاروں میں گھومیں پھریں گے۔ ان دنوں بازاروں میں خوب رونق اور چہل پہل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سب تتر بتر ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ سب لوگ دبئی کے نہیں ہیں۔ کچھ لوگ پاس کے دیہات کے بھی ہیں۔

جہاز کے مالک کو ناخدا کہتے ہیں۔ انھیں موتیوں کی قیمت کا آدھا حصہ دینا پڑتا ہے۔ کچھ حصہ یہاں کے رئیس یعنی شیخ دوبئی کو بھی دیا جاتا ہے۔ باقی آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ فقط۔ تمہارا

محمد ایوب

کبھی تم نے دلی کی سیر کی ہے۔ پرانے زمانے کی کیسی کیسی شاندار عمارتیں ہیں۔ قطب صاحب کی لاٹ، جامع مسجد، ہمایوں اور صفدر جنگ کے مقبرے اور فیروز شاہ کا کوٹلہ وغیرہ اور ہاں فوارے سے آگے بڑھ کر لال لال رنگ کی کیسی شاندار عمارت ہے۔ بھئی تم سمجھ گئے! ہاں یہی لال قلعہ ہے۔ اس کے اندر بھی کبھی گئے ہو؟ کیسی اچھی عمارتیں ہیں۔ دیوانِ خاص دیوانِ عام۔ اور موتی مسجد۔ ان عمارتوں کے گرد اگرد کس قدر زبردست اور مضبوط دیوار ہے اور باہر کی طرف اس دیوار سے لگی ہوئی کیسی چوڑی خندق ہے۔ یہ خندق اور دیوار اندر کی عمارت یا قلعے کی حفاظت کے لئے ہیں۔ خندق اب تو خشک پڑی ہے۔ پہلے اس میں پانی بھرا جاتا تھا۔ تاکہ دشمن اسے پار کر کے قلعہ کو فتح نہ کر سکے۔
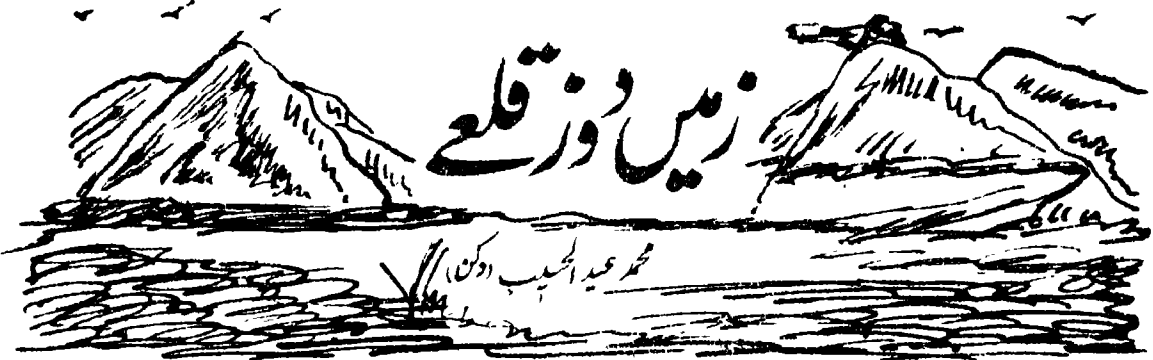
یہ قلعہ کوئی تین سو برس ہوئے شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا تھا۔ پرانے زمانے کے سبھی قلعے اسی طرح بنوائے جاتے تھے۔ اندر عمارت، اس کے چاروں طرف چوڑی دیوار یا فصیل اور پھر گہری خندق۔

مگر جوں جوں لڑائی کے فن اور طریقے میں تبدیلی اور ترقی ہوتی گئی ان قلعوں کا وجود بیکار ہوتا گیا۔ پچھلی بڑی لڑائی (سنہ ۱۹۱۴ء سنہ ۱۹۱۸ء) میں پہلے تو کھلے میدانوں میں فوجوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔ بعد میں دونوں طرف کی فوجوں کے لئے خندقیں بنوائی گئیں۔ گولہ باری انھی خندقوں میں بیٹھ کر کی جاتی تھی۔ یہ خندقیں پرانے قلعوں کی خندقوں سے بہت چھوٹی۔ بس سپاہی کے رہنے بھر کے لئے بنائی جاتیں۔ یہ خندقیں یا تو مشین کھودتی۔ یا سپاہیوں کے دستے اس کام کو انجام دیتے۔

خندق سے نکلی ہوئی مٹی دشمن کے گولوں سے حفاظت کے لئے سامنے کے حصے میں ڈھیر

کردی جاتی۔ کلدار توپیں اور بندوقیں بھی اسی پر رکھ کر چلاتے۔

خندق کھودنے سے پہلے زمین کی خاصیت معلوم کی جاتی۔ برسات میں خندق کے دھنس جانے کا اندیشہ رہتا۔ اس لئے دیواروں کو چوڑا کرکے نالے کی طرح بناتے۔ یہ خندقیں سلسلے وار نہ بناتے بلکہ جدا جدا سمتوں اور الگ الگ مقامات پر، تاکہ دشمن ایک خندق پر قبضہ کرلے تو دوسری خندقیں محفوظ رہیں۔ اس کے علاوہ ایک سیدھ میں بھی نہ بناتے بلکہ ٹیڑھی ترچھی تاکہ مخالف فوج کو گولہ باری کے لئے ٹھیک سمت معلوم کرنے میں دقت ہو۔

خندقیں عموماً دو ہوتیں۔ اگلی خندق والے لڑائی میں مصروف رہتے۔ پچھلی خندق میں سامانِ رسد اور مدد کے لئے تازہ دم فوج ہوتی۔ ان میں سامان رسد اور گولہ بارود کے علاوہ بستر اور چارپائی وغیرہ کا بھی انتظام ہوتا۔ روشنی کے لئے بجلی کے لیمپ ہوتے۔ دور کے مقامات سے بات چیت کرنے کے لئے ٹیلی فون کا سلسلہ بھی ملا دیا جاتا۔ بعض ایسی توپیں بھی ایجاد ہوئیں جو خندق کے اندر سے مخالف فوج کی خندقوں پر گولہ باری کرسکیں۔

پچھلی بڑی لڑائی میں بعض بعض اہم مقامات پر زمین دوز خندقیں بھی بنائی گئیں۔ ان بند خندقوں میں کھلی خندقوں کے مقابلے میں مخالف کے حملے سے بہت کم نقصان ہوتا تھا۔ انھی زمین دوز خندقوں سے زمینی قلعے بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے یہ خیال ایک فرانسیسی سپاہی ماژینو کے دل میں پیدا ہوا۔ یہ پچھلی بڑی لڑائی میں خندقوں میں کام کرچکا تھا۔ اور ترقی کرتے کرتے وزیر جنگ ہو گیا تھا۔ فرانس کے مشہور زمین دوز قلعے اسی کی اسکیم کے مطابق تیار ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ جرمنی سے دوبارہ لڑائی ہو تو ان کے حملوں کو روکا جائے۔ اور دوسری طرف ملک میں مقابلے کی تیاری کی جائے۔ ماژینو کا خیال ایک حد تک صحیح بھی نکلا موجودہ جنگ میں جرمن حملہ پچھلی بڑی لڑائی جیسا تیز نہیں رہا۔ پھر بھی لڑائی چھڑنے کے ایک عرصے کے بعد جرمنی ان مضبوط قلعوں کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ حالانکہ انھیں فتح کرنا ایک ناممکن بات سمجھی جاتی تھی اور ابھی تک دنیا اسی حیرانی میں ہے۔ کہ قلعہ کیوں کر فتح کیا گیا کہتے ہیں۔ فرانسیسیوں کے ہارنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت عیش و آرام میں پڑ گئے تھے۔ انھیں ماژینو لائن پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے اندرونی طور سے شہروں کو مسلح

نہیں کیا تھا۔

یہہ ماژینو لائن یا زمین دوز قلعے فرانسیسی سرحد پر سوئستان سے لکسمبرگ تک بنائے گئے بعد میں شمالی سمندر کے کنارے اور جنوب میں روم کے سمندر تک اور قلعے بنائے گئے۔ ان قلعوں کے عین مقابل جرمنوں نے بھی زیگفرینڈ لائن کے نام سے ایسے ہی زمین دوز قلعے بنائے دوسری حکومتوں نے بھی اپنی اپنی سرحدوں کے بچاؤ کے لئے اسی قسم کے قلعے تیار کرائے مثلاً فنلستان کی مانرہم لائن۔ روسی حملہ اس کی وجہ سے جلد کامیاب نہ ہوسکا۔

یہ قلعے کیا تھے، زندہ طلسمات تھے۔ ان کے لئے فرانسیسی سرحد کی ہر پہاڑی کو کام میں لانے کی کوشش کی گئی۔ جگہ جگہ پانی کا بہاؤ بدل دیا گیا۔ کہیں تالاب بنا دئے گئے تاکہ نمی سے قلعے کی دیواروں کو نقصان نہ پہنچے۔ بعض جگہ قلعوں کی توپیں چھپانے کے لئے اُگے ہوئے درختوں سے کام لیا گیا۔ یا درخت اگائے گئے کہیں مٹی کا بھراؤ ڈالا گیا، تو کہیں سے مٹی نکالی گئی۔ ہر توپ کے ساتھ نقشے رکھے گئے کہ وہ کہاں سے گولا باری کر سکتی ہے اور کس حد تک دشمن کی فوج کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ بعض توپیں دبابوں اور بڑھتی ہوئی فوج کے روکنے لئے تھیں۔ ایسی توپیں بھی رکھی گئیں جو مخالف فوج کا سایہ پڑتے ہی کام کرنے لگیں۔

ان توپ گھروں سے نیچے توپچیوں کے لئے آرام گاہیں بنوائی گئیں۔ آرام گاہوں سے مقررہ مقامات تک جانے کے لئے زمین دوز راستے بنوائے گئے۔ قلعوں کی دیواریں کنکریٹ اور فولاد سے بنائی گئیں تاکہ مسلسل گولا باری کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔ اس کا بھی انتظام کیا گیا کہ کسی وجہ سے قلعے پر دشمن کا قبضہ ہوجائے تو بارود کے ذریعے قلعے کو اُڑا دیا جائے یا پانی سے بھر دیا جائے۔ جہاں دشمن کے حملے کا خطرہ زیادہ تھا، وہاں کنکریٹ اور فولاد کی دیواریں اور بھی موٹی بنائی گئیں۔ قلعہ کے سامنے خاردار تار لگوائے گئے کہ مخالف سپاہی آگے نہ بڑھ سکیں۔ جگہ جگہ سرنگیں بچھائی گئیں۔ دبابوں کو گرانے کے لئے کمزور لکڑی سے پٹے ہوئے گڑھے بنائے گئے۔ رکاوٹ کے لئے کھڑے نوکدار لوہے یا پتھروں کے ٹکڑے یا مثلث نما لوہے کے ڈھانچے رکھے گئے۔

ان قلعوں میں ضرورت اور آرام کی ہر چیز مہیا کی گئی۔ بجلی کی روشنی، پنکھے، آرام کے کمرے، کھیل اور ورزش کے میدان، ایک قلعے سے دوسرے قلعے تک پہنچنے کے زمین دوز

ریلیں بنائی گئیں۔ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچنے کے لئے بجلی کے لفٹ لگائے گئے۔ سامان بھی بجلی کے ذریعے نیچے اوپر یا ادھر ادھر آتا جاتا تھا۔ قلعے میں آگ لگنے کے اندیشے سے میز، کرسیاں، پلنگ اور دوسرا سامان ایسی چیزوں سے بنایا گیا تھا جس پر آگ اثر نہ کر سکے۔ زہریلی گیس کے خوف سے ایسا انتظام کیا گیا کہ ہوا باہر سے بالکل نہ آ سکے۔ اور اندر بجلی کے پنکھوں کے ذریعے تازہ ہوا پیدا ہوتی رہے قلعوں کے اندر بات چیت کے لئے ٹیلی فون کے ڈھیرے تار لگوائے گئے۔

ہر قلعے میں کئی برج بنوائے گئے اور ہر برج کا انتظام الگ الگ رکھا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک برج پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو اس کے دروازے بند کر کے دشمن کے لئے راستہ بند کر دیا جائے۔ پھر دوسرے برجوں سے اس پر حملہ کر دیا جائے۔ برج کے اوپر ہر توپ میں ایک دوربین لگی ہوتی۔ اس میں برج کے نزدیک آنے والے کی تصویر نظر آ جاتی۔ برج والے توپچی اس عکس کی مدد سے نشانہ جماتے۔

ہر قلعے کی فوج کا نام اور لباس الگ الگ ہوتا تھا اور ہر پندرھویں دن پندرہ دن کے لئے سپاہیوں کو چھٹی دی جاتی تھی۔ معلوم نہیں اب جرمنی نے ان زمین دوز قلعوں کا کیا حشر کیا ہے۔

سالنامے پر ایک رائے

پیامِ تعلیم بچوں کا پرچہ ہے جو مدت سے شائع ہوتا ہے اسے اتنی محنت اور توجہ سے مرتب کیا جاتا ہے کہ اس کا ہر عام پرچہ بھی خاص نمبر معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے ہاتھ میں پیامِ تعلیم کا سالگرہ نمبر ہے اسے بہت کاوش سے مرتب کیا گیا ہے اس میں مختلف قسم کے مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ شفیع الدین صاحب نیر کی نظمیں اور کہانیاں خاص طور پر پسند ہیں علاوہ اس کے اور دوسرے اچھے مضمون نگاروں کے نام بھی نظر آتے ہیں مثلاً پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ سعد الدین انصاری صاحب۔ آپا جان۔ فضل الدین اثر تصویریں، کارٹون اور نئے نئے کھیل وغیرہ تو بہت ہی خوب ہیں۔ غرض یہ سالنامہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

سعادت لاہور

بچوں کی کوشش

کہانی

کہتے ہیں کسی زمانے میں دہلی کے قریب کے ایک گاؤں دوبہاز میں للن نامی ایک دُھنا رہتا تھا۔ مزدوری کے لئے وہ دہلی جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ دہلی جارہا تھا راستے میں گیدڑ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اب تو میاں للن بہت گھبرائے۔ سمجھے کوئی درندہ ہے کہیں پھاڑ نہ کھائے۔ چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر ڈر کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے کچھ کرتے نہ بنتی تھی۔ گیدڑ بھی ان کے ہاتھ میں کمان وغیرہ (دُھنے کا سامان) دیکھ کر ڈرا۔ سمجھا کوئی شکاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ڈرے سہمے کھڑے تھے اور اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
آخرکار گیدڑ اس سوچ بچار کی دوڑ میں آگے نکل گیا۔ ایک ترکیب اُس کی سمجھ میں آئی کہ کسی طرح للن میاں کو دوست بنانا چاہیئے اس نے پہلے للن میاں کو سلام کیا اور کہا:۔

"کاندھے دھنش ہاتھ میں بانا ؎ کہاں چلے دلی پترانا"

للن میاں نے جب یہ سنا تو اُن کی بھی ہمت بندھی جواب میں کہا:۔

"بن کے راو جگت کے رانا ؎ بڑوں کو بڑوں نے پہچانا"

اس بات چیت کے بعد ایک دوسرے کو معلوم ہوگیا کہ وہ آپس میں دشمن نہیں ہیں اور دونوں نے اپنا اپنا راستہ لیا دہلی پہنچ کر یہ قصہ للن صاحب دوستوں کو کئی دن تک سناتے اور اپنی بہادری اور گیدڑ کی عقل مندی کی تعریف کرتے پھرے

(محمد سلیم۔ حیدرآباد دکن)

ایک تاجر کی دلیری

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کوئی تاجر کسی ملک کو مال فروخت کرنے جارہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک بہت گھنے جنگل میں پہنچا۔ یکایک بہت زور کا دھماکا ہوا .... اور ایک بہت ہی لمبا اور کالا دیو سامنے آگیا۔ یہ دیکھ کر تاجر بہت گھبرایا۔ دیو کہنے لگا "بہت دنوں کے بعد تازہ شکار ہاتھ آیا۔ تاجر دل میں سوچنے لگا اس وقت اگر میں بھاگ جاؤں تو جان بچنا مشکل ہے ہمت سے کام لینا چاہیئے یہ سوچ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ یہ دیکھ کر دیو کو بہت حیرت ہوئی وہ بولا" اے آدم زاد مجھے تعجب ہوتا ہے کہ انسان مجھے دیکھتے ہی گھبرا جاتا ہے لیکن تو ہنس رہا ہے"۔ تاجر پھر ایک زور کا قہقہہ لگا کر کہنے لگا "تیرے جیسے ایک کو تو میں نے قید کر رکھا ہے۔ دوسرے کی ضرورت تھی۔ اسی کی تلاش میں پھر رہا تھا خوش قسمتی کہ تو خود میرے سامنے

آگیا اگر تو دیکھنا چاہتا ہے تو دیکھ۔ یہ کہہ کر ایک آئینہ (جس میں صورت بڑی معلوم ہوتی ہے) نکال کر دیو کے آگے رکھ دیا۔ دیو آئینہ دیکھ کر گھبرا گیا اور خیال کرنے لگا کہ یہ شخص مجھے بھی قید کرے گا اس لئے نہایت عاجزی سے رہائی کی التجا کرنے لگا مگر تاجر انکار کرتا گیا۔ آخر بڑی منت کے بعد اُسے بہت سے ہیرے، جواہرات لے کر اُسے چھوڑ دیا۔

بے وقوف جاٹ

(سراج سلطانہ۔ پربھنی)

ایک جاٹ کا لڑکا کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ میرے لئے ایک جوتا بنوا کر پارسل سے بھیج دیجئے۔ جاٹ نے سوچا پارسل پہنچنے میں دیر لگے گی اگر تار کے ذریعے بھیجیں تو جلدی پہنچ جائے گا۔ تار خط سے پہلے پہنچتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ٹیلیگراف کے تار سے جوتا باندھ دیا اور خود گھر چلا آیا۔

ادھر سے ایک راہ گیر جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نیا جوتا تار پر لٹک رہا ہے اس نے اپنے پرانا جوتا وہیں باندھ دیا اور نیا جوتا پہن کر چلا گیا۔

دوسرے دن جاٹ نے سوچا ذرا جا کر دیکھ آؤں جوتا گیا یا نہیں؟ وہاں پہنچا تو نئے جوتے کی جگہ پرانا جوتا بندھا پایا۔ جاٹ بہت خوش ہوا کہ میرا بیٹا بہت ہی سمجھ دار ہو گیا ہے۔ نیا جوتا خود پہن لیا اور پرانا میرے پاس بھیج دیا کہ وہ باپ کے کام آئے گا۔

ریچھ اور چھوٹے پرندے

زاہدہ خاتون۔ رام نگر

کسی جنگل میں ایک ریچھ رہتا تھا۔ یہ بہت مغرور تھا ایک مرتبہ یہ ریچھ اور تیندوا ساتھ ساتھ جا رہے تھے راستے میں انھوں نے ایک پرندے کا گھونسلا دیکھا۔ پرندہ کہیں چلا گیا تھا بس چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ریچھ نے کہا دیکھو میں ایک مذاق کرتا ہوں۔ میں درخت پر چڑھ کر چھوٹے چھوٹے بچوں کو ڈراؤں گا "تیندوے نے کہا" ایسا مت کرو۔ تمام جنگل کے پرندے تمھارے دشمن ہو جائیں گے ریچھ نے کہا مجھے اس کی بالکل پروا نہیں ہے وہ درخت پر چڑھ گیا۔ اپنی ناک گھونسلے میں ڈال دی اور بہت زور سے غرّایا۔ چھوٹے بچے بہت ڈرے دو منٹ بعد وہ درخت سے اُتر آیا اس نے تیندوے سے کہا "میں ایسا مذاق اکثر کرتا رہتا ہوں" مگر تیندوے کو اس مذاق میں بالکل لطف نہیں آیا جب بچوں کے ماں باپ اپنے گھونسلے کو واپس آئے تو ان کے بچوں نے کہا "آج ہم کو ریچھ نے ڈرایا تھا" تھوڑے دنوں بعد جنگل میں دو شکاری آئے وہ تمام دن جنگل میں شکار کی تلاش میں پھرے لیکن ان کو کوئی شکار نہ ملا۔ شام کو اپنے گھر لوٹتے وقت انھوں نے دیکھا کہ چڑیاں ایک جگہ چکر لگا رہی ہیں وہ اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے کے لئے قریب آئے تو چڑیاں تو شکاریوں کو دیکھ کر اُڑ گئیں اور ایک شکاری نے ریچھ کو بندوق سے مار لیا (ترجمہ) (سعید اختر۔ بھوپال)

آپ تو یہ سمجھے ہوں گے کہ میں آپ کو مضمون لکھنے کا طریقہ بتا رہی ہوں۔ بات ایک اور ہے۔ سنئے۔ایک ہیں ہماری چچی اماں۔ وہ اپنے آپ کو ہر فن میں طاق سمجھتی ہیں۔ جانے کیوں؟ اصل میں انھیں آتا کچھ بھی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بھلا میں یہ مضمون ہی کیوں لکھتی۔

چچی اماں کو مجھ سے اور میری سہیلیوں سے خاص طور پر عداوت ہے۔ جب وہ شیخی بگھارتے بگھارتے حد سے بڑھ جاتی ہیں تو پھر مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ میں ان کی بات میں کوئی نہ کوئی نقص نکال ہی دیتی ہوں اور کبھی کبھی میری سہیلیاں بھی۔ بس پھر خباب اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ وہ طوفان اٹھاتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ ہاں تو سنئے، ایک روز ہم مضمون لکھنے بیٹھے مگر چچی اماں کی غیر موجودگی میں۔ اگر وہ ہوتیں تو مضمون تو مضمون، شاید اپنا نام بھی دماغ میں نہ آتا۔ میں ذرا سا لکھ پائی تھی کہ چچی اماں نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑیں اور بولیں "کیوں بیٹی عائشہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا "چچی اماں مضمون لکھ رہی ہوں" چچی اماں طنزیہ مسکرا کر اور میری نقل اتار کر اٹھلائی ہوئی زبان میں بولیں "چچی اماں مضمون لکھ رہی ہوں" خدا کی شان یہ بھی مضمون لکھنے لگیں۔ اسی نگوڑے پیام تعلیم میں چھپواؤ گی! کیوں؟ اچھا ہاں ذرا دکھاؤ تو کیا لکھا ہے؟"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے چچی اماں کو مضمون دیا اور وہ رعب جمانے کے لئے اسے زور زور سے پڑھنے لگیں۔

" زاہدہ نے ڈرتے ڈرتے آپا کے کمرے میں قدم رکھا اور سہمی ہوئی آواز میں رک رک کر کہنے لگی " آپا"

آپا۔ کیا ہے۔

زاہدہ:۔ آپا آپ کا...... (رک جاتی ہے)

آپا۔ (جھنجھلاکر) کیا آپا آپا لگا رکھی ہے۔ بولو کیا ہوا۔

زاہدہ:۔ گر گیا۔

آپا:۔ (پریشان ہوکر) یا خدا کیا میرا بچہ گر گیا؟

زاہدہ:۔ جی ہاں۔

آپا:۔ چوٹ تو نہیں آئی۔

زاہدہ:۔ جی ہاں آئی ہے۔

اتنے میں آپا کا بچہ رشید دوڑتا ہوا آیا اسے دیکھ کر آپا کی جان میں جان آئی۔ اور زاہدہ سے ڈانٹ کر پوچھا "کیوں یہ کیا شرارت تھی۔ میرا لال تو یہ رہا" زاہدہ نے جواب دیا۔ "میں نے خدا نخواستہ ننھے کو تھوڑا کہا۔ میں نے تو آپ کے ہرن کے......" چچی اماں اتنا پڑھ کر بولیں "اونہہ مضمون لکھا ہے بغیر ہاتھ پاؤں کا۔ مضمون لکھنا کوئی آسان سمجھ لیا ہے۔ لوہے کے چنے ہیں لوہے کے۔ اگر تمھیں سیکھنا ہے تو ہم سے سیکھو ہم سے"۔

میں نے ذرا دھیمی آواز میں کہا "مگر یہ ابھی پورا کہاں ہوا ہے"۔ چچی اماں مسکرا کر بولیں "اسے پورا بھی کرلوگی تو کون سا تیر مارو گی۔ اس کی تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی ہے" یہ بات مجھے بری تو لگی مگر میں ان سے کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے بہت ہی خوشامدانہ لہجے میں کہا "تو پھر چچی اماں آپ ہی مضمون لکھنا سکھا دیجئے"۔ اب تو چچی اماں بہت سٹپٹائیں۔ مضمون تو مضمون انھیں تو اردو بھی صحیح لکھنا نہیں آتی تھی۔ لیکن آسانی سے ہار بھی ماننے والی نہیں تھیں۔ جھٹ قلم دوات لے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بہت دیر تک سوچتی رہیں، پھر چارپائی پر آبیٹھیں تھوڑی دیر میں وہاں سے اتر کر فرش پر بیٹھ گئیں۔ دماغ میں کوئی مضمون ہی نہیں آرہا تھا۔ میں چپکے سے وہاں سے کھسک آئی اور چھپ چھپ کر چچی اماں کو دیکھتی رہی۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی کمرے سے نکلیں غصے میں لال پیلی۔ قسمت کی ماری رشیدہ سامنے آگئی۔ کوئی بات نکال کر اسی پر برس پڑیں۔ میں وہاں سے نو دو گیارہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد کمرہ میں آئی تو بس کباڑی کی دکان معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں آج بہت خوش تھی۔ چچی اماں آج شکست کھا گئی تھیں۔ اور چچی اماں کا مضمون! ارے! ابھی تو انھوں نے بس مضمون کا عنوان ہی لکھا تھا "مضمون لکھنے کی ترکیب"

پیامی اس معمے (نمبر ۱۰) کے بارے میں اپنی رائے لکھ کر بھیجیں۔ جس کی رائے سب سے اچھی سمجھی جائے گی پیام تعلیم میں چھاپ دی جائے گی۔ اور اسے آئندہ معمے کے چار حل بھیجنے کا حق ہوگا رائے کم سے کم آٹھ سطروں میں تو ہو

عزیز بچیو اور بچو۔ خوش رہو اور تندرست۔

پچھلے دو مہینے بات کہتے میں گذر گئے۔ سردیاں ختم ہوگئیں۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلنے لگیں نہ زیادہ سردی ہے نہ گرمی کیسا خوش گوار موسم ہے۔

یورپ کی لڑائی اب بھی جاری ہے۔ انگریز اب پہلے سے بہت زیادہ مضبوط ہوگئے ہیں۔ انھوں نے افریقہ میں تو اٹلی کی کمر توڑ دی ہے۔ بے چارا ہر جگہ ہار رہا ہے۔ اِدھر یونان جیسے ملک سے شکست پر شکست کھا رہا ہے۔ جرمنی کو اپنے ایک ساتھی کے کمزور پڑ جانے سے بہت دھکا لگا ہے۔ اِس کے علاوہ انگلستان کو فتح کرنے میں اُسے سخت ناکامی ہوئی ہے۔ پھر بھی اس کی غرفش وہی ہے۔ سنا ہے اس نے انگلستان پر بہت بڑے حملے کی پھر دھمکی دی ہے۔ اس حملے میں زہریلی گیس بھی استعمال کی جائے گی۔ رومانیہ کے ملک پر تو گویا اس نے قبضہ کر لیا ہے۔ انگریزوں کا سفیر بھی وہاں سے واپس آرہا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جرمنی اب بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ ٹرکی اور دوسرے ملک اپنے بچاؤ کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں اس عرصے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ حکومت کے خلاف ستیہ گرہ اسی طرح جاری ہے۔ ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر سوبھاش بابو یکایک اپنے مکان سے غائب ہوگئے اور اب تک اُن کا پتہ نہیں چلا ہے۔ لڑائی کے سامان کی تیاری کے سلسلے میں یہاں بھی بہت سے کارخانے کھل رہے ہیں۔ ہوائی جہاز کا کارخانہ بھی کھلا ہے اور سنا ہے ۲۴ر جولائی تک اس کارخانے سے پہلا ہوائی جہاز تیار ہوگا۔

لکھنؤ کی شاخ کے پیامی ہر مہینے جاگو کے نام سے اپنا ایک قیمتی رسالہ نکالتے ہیں۔ کسی پچھلے پرچے میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ اس مرتبہ پیام تعلیم کے سالنامے کے ساتھ انھوں نے اپنے رسالے کا سالنامہ بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔ اس سالنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیامیوں نے اس کے لئے سب کام خود ہی کیا ہے۔ مضمون

نظمیں، کہانیاں وغیرہ سب انھی کی لکھی ہوئی ہیں۔ کارٹون اور تصویریں بھی انھی نے بنائی ہیں۔ یہاں تک کہ رسالے کا ٹائٹل بھی انھی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ مضمون بھی خاصے دلچسپ ہیں۔ اس مفید کام کے سلسلے میں ان بچوں کو بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ جیسے کتابت کی روشنائی کیا ہوتی ہے۔ کتابت کس کاغذ پر کی جاتی ہے۔ پتھر پر کاپی کیسے جمتی ہے۔ چھپائی کیسے ہوتی ہے۔ چھپائی کا کاغذ کہاں سے ملتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس کامیابی پر اپنے عزیز پیامیوں کو مبارکباد دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسری شاخوں کے پیامی بھی لکھنو والوں کی طرح آگے بڑھیں۔

اس سال مکتبے نے تمھارے لئے بہت اچھا تحفہ تیار کیا ہے۔ یہ تصویروں کا البم ہے اور اس کا نام ہے "بچوں کا البم" اردو زبان میں ہمارے خیال میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے۔ البم میں ہر قسم کی تصویروں کو تیرہ بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً پھول، پھل، درخت، ترکاریاں، سواریاں، منظر، عمارتیں وغیرہ ہر صفحہ پر نو خانے ہیں ایک خانے میں نمونے کے لئے تصویر دی گئی ہے۔ باقی خالی ہیں۔ ہر خانے کے نیچے لکھ دیا گیا ہے کہ یہاں کس چیز کی تصویر ہونی چاہیے۔

پیام تعلیم نے ٹکٹوں کے علاوہ بچوں میں ہر قسم کی تصویریں جمع کرنے کا شوق بھی پیدا کر دیا ہے۔ ان بچوں کے لئے خاص طور پر یہ چیز مفید ہوگی۔ اب کے معما نمبر ۱۵ کے صحیح حل ان بچوں نے بھیجے ہیں

صحیح حل اول انعام فی کس ۱۰؍

(۱) سید ماجد علی زیدی۔ دہلی (۲) سید عمادالدین۔ بھاولپور (۳) مقبول احمد خاں۔ جلگاؤں

(۴) فضا احمد۔ دہلی (۵) عطاءالرحمٰن بہاری۔ دہلی (۶) رحیم الدین۔ دہلی

ہر ایک کے حساب میں کل ۱۲؍ پڑتے ہیں۔ ان سب کو انعام بھیج دیا گیا۔

ان بچوں کے حل میں ایک غلطی ہے انعام فی کس ۸؍

(۱) آصفہ خاتون، ہردوئی (۲) عباس خان۔ دہلی (۳) محمد اسلم انصاری ٹڑھل گنج (۴) احمد نور۔ اجین (۵) شیخ محمد طویل۔ جبل پور۔ (۶) سید مصور حسن۔ دہلی (۷) بلقیس اختر، انبالہ (۸) محمد حسن۔ لکھنؤ (۹) احمد حسن لکھنؤ (۱۰) ریاض احمد خاں اجین (۱۱) اقبال مرزا۔ دہلی (۱۲) خورشید مصطفےٰ۔ بجنور (۱۳) عنایت احمد خاں شروانی۔ اجین (۱۴) جمیل اختر۔ دہلی (۱۵) منہاج حسین میرٹھ (۱۶) میر یوسف الزمان سنبھل (۱۷) عطاءالرحمٰن۔ دہلی (۱۸) محمد مسلم انصاری۔ ٹڑھل گنج۔ (۱۹) شمس العارفین۔ دہلی (۲۰) عبدالوحید۔ دہلی۔

اس مرتبہ معما بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۸ مارچ ہے اس کا خیال رکھنا

تمھارا۔ محمد حسین حسان

معما نمبر ۱۶

پہلا اِنعام ...... ۵ روپے
دُوسرا اِنعام ...... للعہ

مشقی کوپن

ل	ج	■	ش	س	ج	ل	د
ط	ق	■	ر	و	ب	ح	م
ت	■	ع	■	د		■	ا
■	ل	غ	س	■	ل	س	غ
گ	ا	ر	و	ج	■	ب	■
ہ	■	ب	ی	ر	ع	■	
ن	ج	■		ا	■	ل	ی
ا	و	ا	ل	ج	■		ہ

اشارات

دائیں سے بائیں

(۱) معما خالی اوقات کا ایک ...۔ مشغلہ ہے
(۴) مزا تو جب ہی ہے کہ معما صحیح ... ہو۔
(۸) موجودہ حالات نے ہر حکومت کو .... کر دیا ہے کہ وہ جنگی تیاری کرے۔
(۹) قلم میں اگر ... نہ ہو تو اچھا نہیں لکھا جا سکتا۔
(۱۰) اگر ...۔ سے کوشش کی جائے تو معمے میں انعام آنا مشکل نہیں (الٹا)
(۱۲) روزانہ .... کرنا صحت کے لئے بہت مفید ہے۔
(۱۴) .... خور آدمی ذلیل نظر سے دیکھا جاتا ہے۔
(۱۶) تندرست رہنا چاہتے ہو تو سادہ .... کھاؤ۔
(۱۸) جو شخص .... ہو تا ہے اس سے ہمدردی کرنا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔
(۲۰) آج کا کام ... پر مت چھوڑو۔
(۲۲) ایک اور ایک گیارہ۔
(۲۳) بے گانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
... سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا
(۲۴) بالک ... مشہور ہے
(۲۵) شادی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔

اُوپر سے نیچے

(۱) معما حل کرتے وقت ذرا اس پر بھی زور دینا چاہئے
(۲) گنگا ... کو ہندو پاک سمجھتے ہیں۔ (الٹا)
(۳) یعنی شرارت (بے ترتیب)
(۴) مسلمانوں کے ہاں اس کا کھانا حرام ہے۔
(۵) برسات میں چیونٹی کے بھی نکل آتے ہیں۔
(۶) ہمیشہ ... بات کہنی چاہئے۔
(۷) سچ بتاؤ کہ معما حل کرنے میں تمھیں ... آتا ہے یا نہیں۔
(۱۱) سورج مشرق سے نکل کر ... میں ڈوبتا ہے۔
(۱۳) بے ... لوگ کسی کی مصیبت میں کام ہی کیا آ سکتے ہیں۔ (الٹا)
(۱۴) ایک قسم کا ساگ (بے ترتیب)
(۱۵) نہیں
(۱۶) .... صحبت سے بچنا ہی اچھا ہے۔
(۱۷) غیر سے راز کی بات .... نادانی نہیں تو کیا ہے۔
(۱۸) .... میں خدا کو یاد رکھو۔
(۲۱) زلف
(۲۳) ایک انار .... بیمار

(۱) معما بجائے پندرہ کے ۱۸ مارچ تک بھیج سکتے ہو۔
(۲) ایک ہی لفافے میں کئی حل بھیجے جا سکتے ہیں۔
(۳) لفافے کی قیمت اب پانچ پیسے ہوگئی ہے۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اُستاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔
(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ آٹھ حلوں کی ۶ ہے۔
(۴) دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے قرعہ اندازی نہ ہوگی
(۵) تمام حل ۱۸ مارچ سنہ ء تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔
(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
(۷) پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔
(۸) کوپن کے چاروں طرف جو نقطے والی لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔
(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔
(۱۰) ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمے آنے چاہئیں۔
(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہیے
(۱۲) معما حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔
(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔
(۱۴) دال اور ڈال کا فرق نمایاں ہو۔ (د - ڈ)
(۱۵) چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی - ے)
(۱۶) جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے۔
(۱۷) املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔
(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں۔
(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔
(۲۰) پتہ :- سب ایڈیٹر پیام تعلیم، مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

معما نمبر ۱۵ کا صحیح حل

۱ م	ب	۲ ا	۳ ر	ک	■	۴ و	۵ ا
ن	■	۶ ا	و	■	۷ ر	■	ن
■	۸ د	■	۹ س	خ	ت	■	ج
۱۰ ا	ک	■	ی	■	۱۱ ن	۱۲ ی	ا
۱۳ ن	ر	۱۴ ا	■	۱۵ ی	■	۱۶ ا	م
گ	■	۱۷ د	ر	ر	■	د	■
و	■	ب	■	۱۸ ن	۱۹ و	■	۲۰ پ
۲۱ ر	خ	■	۲۲ ب	ہ	د	۱۰	ر

معما نمبر ۱۶ کوپن نمبر

۷ ل	۶		۵ پ	۴ س	۳ چ	۲ ل	۱ و
	۹ ق			و	ب		۸ م
ف		۱۱			۱۰		
	۱۵	غ	۱۴		ل	۱۳	۱۲ غ
۱۷ ک	ا	ر		۱۶			
			ی	ر	۱۹		۱۸
ن	۲۳			۲۲ ا		۲۱ ل	۲۰
	و	ا	ل	۲۵			۲۴ ہ

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۶ کوپن نمبر

۷ ل	۶		۵ پ	۴ س	۳ چ	۲ ل	۱ و
	۹ ق			و	ب		۸ م
ف		۱۱			۱۰		
	۱۵	غ	۱۴		ل	۱۳	۱۲ غ
۱۷ ک	ا	ر		۱۶			
			ی	ر	۱۹		۱۸
ن	۲۳			۲۲ ا		۲۱ ل	۲۰
	و	ا	ل	۲۵			۲۴ ہ

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۶ کوپن نمبر

۷ ل	۶		۵ پ	۴ س	۳ چ	۲ ل	۱ و
	۹ ق			و	ب		۸ م
ف		۱۱			۱۰		
	۱۵	غ	۱۴		ل	۱۳	۱۲ غ
۱۷ ک	ا	ر		۱۶			
			ی	ر	۱۹		۱۸
ن	۲۳			۲۲ ا		۲۱ ل	۲۰
	و	ا	ل	۲۵			۲۴ ہ

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۶ کوپن نمبر

۷ ل	۶		۵ پ	۴ س	۳ چ	۲ ل	۱ و
	۹ ق			و	پ		۸ م
ف		۱۱			۱۰		
	۱۵	غ	۱۴		ل	۱۳	۱۲ غ
۱۷ ک	ا	ر		۱۶			
			ی	ر	۱۹		۱۸
ن	۲۳					۲۱ ل	۲۰
	و	ا	ل	۲۵			۲۴ ہ

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

قیمت حصہ اول ۵ـ

،، ،، دوم ۵ـ

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

اردو ڈراما عدالت میں کا ایک منظر

اردو ڈراما عاشق صاحب کا ایک منظر

انگریزی ڈراما پولش جیو کا ایک منظر

ارے!

مرسلہ عبدالوحید صمدی

ڈراما کلب کے بچوں کی مشغلوں کی نمائش

پیامِ تعلیم دہلی

ایڈیٹر: محمد حسین حسان

فی پرچہ	قیمت سالانہ
۳ر	عہ

نمبر ۴	اپریل ۱۹۴۱ء	جلد ۲۴

فہرست مضامین

پچھلے پرچے میں ٹائٹل کی تصویر کے بارے میں ہم نے جو کچھ لکھا تھا بعض پیامیوں نے اِس کا مطلب غلط سمجھا۔ ہم ٹائٹل پر بہت ہی خاص خاص تصویریں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کسی تاریخی عمارت کی۔ کسی بہت اچھے منظر کی، کسی ننھے بچّے کی جو کھیل رہا ہو یا شرارت کر رہا ہو۔ یا کسی بہت مشہور شخصیت کی۔ بعض پیامیوں نے خود اپنی تصویریں ٹائٹل پر شائع کرنے کے لیے بھیج دی ہیں۔ یہ ہم اگلے پرچوں میں اندر کے صفحوں پر چھاپ دیں گے۔

اس پرچے کے ٹائٹل پر سر شاہ سلیمان مرحوم کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ یہ خاص تصویر ہمیں مرحوم کے پرسنل اسسٹنٹ صاحب کی نوازش سے ملی ہے ان کی اس عنایت کا دلی شکریہ۔ مرحوم کے حالات اگلے صفحوں پر شائع کیے گئے ہیں۔

پٹنے کے بچوں نے ہمارے پرانے پیامی اور مضمون نگار محمد یحییٰ صاحب کی نگرانی میں ایک ڈراما کلب قائم کیا ہے۔ اس کلب کے چھوٹے چھوٹے ممبر اب تک کئی ڈرامے کر چکے ہیں اِن کھیلوں کے چند منظروں کی تصویریں اِس پرچے میں چھپی ہیں۔ کسی اگلے پرچے میں اُن کے دو ایک ڈرامے بھی شائع کئے جائیں گے۔

ایک پُرانے پیامی عزیزی محمد اسمٰعیل دسنگاریی کا رئیز کے ایک خط سے یہ معلوم کر کے دلی افسوس ہوا کہ اُن کے والد جناب محمد غوث صاحب نے یکایک دِل کی حرکت بند ہو جانے سے اِنتقال کیا۔ ہمیں اور تمام پیامیوں کو اِس حادثے میں عزیزی اسمٰعیل سلمہٗ سے دلی ہمدردی ہے۔

پچھلی ۱۹ر فروری کو ہمارے ایک پُرانے جامعی جناب ملک محمد اسلم صاحب بیرسٹر لاہور کی والدہ کا اِنتقال ہو گیا۔ خدا مرحومہ کو جنّت میں جگہ دے اور اُن کے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

منیجر صاحب مکتبہ کو شکایت ہے کہ بعض بچے سلجھوں کی صورت میں صرف کتاب کی قیمت بھیجتے ہیں۔ محصولِ ڈاک نہیں بھیجتے۔ ڈاک کا محصول کتاب کی قیمت کے علاوہ ہوتا ہے اور خریدار کو دینا پڑتا ہے۔

اُمید ہے کہ آیندہ پیامی اس بات کا خیال رکھیں گے ؏

سرشاہ سلیمان مرحوم

۱۳ر مارچ کی صبح کو اخبار پڑھتے وقت بڑی بڑی سرخیوں میں سرشاہ سلیمان کے مرنے کی خبر دیکھی دل دھک سے ہو گیا۔ سرشاہ سلیمان بہت بڑے آدمی تھے۔ ہندوستان ہی کے نہیں دنیا کے بڑے آدمیوں میں اُن کا شمار تھا۔ آج کل یہ ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت فیڈرل کورٹ کے جج اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔

سرشاہ سلیمان ۳ر فروری ۱۸۸۶ء کو جون پور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے جون پور کے ایک بزرگ نے فلسفے پر ایک مشہور کتاب لکھی تھی "شمس بازغہ" یہ کتاب اب بھی عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ شاہ سلیمان مرحوم انھی ..... بزرگ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرشاہ سلیمان بچپن ہی سے بہت محنتی اور ذہین تھے۔ اُنھوں نے جون پور ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان بہت نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ پھر میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی اے کی ڈگری لی۔ امتحان میں اول آنے والوں میں اُن کا نمبر سب سے پہلا تھا۔ اسی لئے حکومت نے انھیں ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا۔ انگلستان میں بھی اُنھوں نے قانون اور حساب کے امتحانوں میں شان دار کامیابی حاصل کی۔

ولایت سے واپسی کے بعد کوئی ۱۹۱۲ء میں وہ الہ آباد میں بیرسٹری کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی بیرسٹری خوب چلنے لگی۔

آٹھ سال بعد وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج بنا دئے گئے۔ تین سال بعد الہ آباد ہائی کورٹ کے مستقل جج ہو گئے۔ آخر ۱۹۳۲ء میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس یعنی سب سے بڑے جج بنا دئے گئے سر سلیمان دوسرے ہندوستانی تھے جنھیں یہ بڑا عہدہ ملا تھا۔

اس کے پانچ سال بعد جب ہندوستان میں سب سے بڑی عدالت فیڈرل کورٹ کے نام سے قائم کی گئی تو اس کے ایک جج سر سلیمان منتخب ہوئے اُن کی قانونی قابلیت کا لوہا بڑے بڑے جج مانتے تھے

اپنی قانونی مصروفیتوں کے ساتھ وہ دوسرے قومی کاموں کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ انھوں نے الہ آباد میں ایک اِسکول جاری کیا۔ بدایوں اور علی گڑھ کی ایجوکیشنل کانفرنسوں کی صدارت کی الہ آباد کے مشہور عربی مدرسہ سبحانیہ کے بہت دنوں تک صدر رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو بار وائس چانسلر بنائے گئے۔

ان کا علمی شغل بھی برابر جاری رہتا تھا۔ سائنس اور حساب میں ان کی قابلیت کو دُنیا کے بڑے بڑے لوگ مانتے تھے۔ اپنی مادری زبان اُردو سے بھی انھیں بہت محبت تھی۔ خود بھی بہت بڑے ادیب تھے۔

مرحوم کی عمر ابھی کل پچپن برس کی تھی تندرستی اچھی خاصی تھی بس کوئی دو ہفتے بیمار رہے گلے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی یہی جان لیوا ثابت ہوئی۔ جنازے میں کیا انگریز کیا ہندوستانی ہندوستان کے سب بڑے بڑے لوگ شریک تھے حضرت نظام الدین اولیاء کے قبرستان میں دفن ہوئے اور اب یہی اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُن کے مرنے سے قوم میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ بھر نہیں سکتی اس وقت تو یہ بات ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ ہمیشہ کے لئے ٹھیک ہو اور خدا کرے کہ ہمارے نونہالوں میں بہت سے سلیمان پیدا ہوں۔
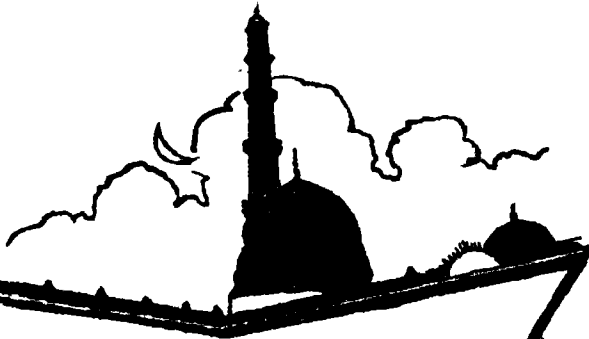
ہمارے نبیؐ

از حضرت مولانا محوی صدیقی لکھنوی

زمانے میں پھیلی ہوئی تھی برائی — ہمارے نبیؐ نے وہ آکر مٹائی
بُری عادتیں جو پڑی تھیں چھڑائیں — جو تھی راہ سیدھی وہ سب کو بتائی
جو تھے خوابِ غفلت میں اُن کو جگایا — جو مجبور تھے اُن کی ہمت بڑھائی
جو بیہودہ رسمیں تھیں اُن سے بچایا — جو تھی کام کی بات سب کو سکھائی
جو تھے نیک کام اُن کا خوگر بنایا — گناہوں کی باتوں سے نفرت دلائی
جو ٹوٹے تھے رشتے تو اُنھیں پھر سے جوڑا — محبت بڑھائی، عداوت گھٹائی
جو بھٹکے ہوئے راہِ حق کھو چکے تھے — اُن اندھوں کی دن رات کی رہنمائی
خدا کا پیام آکے سب کو سُنایا — جو دشمن تھے باہم ہوئے بھائی بھائی
ہوئے رہنما وہ زمانے کے آخر — سمجھتے نہ تھے جو بھلائی بُرائی
ہزاروں ہی کیں نیکیاں ہر کسی سے — مگر کوئی نیکی نہ اپنی جتائی
کچھ ایسا کیا ذوق سینوں میں پیدا — طبیعت بُری راہ پر پھر نہ آئی
دیے قوم نے دُکھ مگر جی نہ چھوٹا — بھلا کس کے دل میں ہے ایسی سمائی
عزیز اور احباب راحت اُٹھائیں — خود اس کے لیے ہر مصیبت اُٹھائی

درود و سلام اُس نبیؐ پر خدا کا
جو رحمت کا پیکر تھا پُتلا وفا کا

سونا چھوڑو جاگو بھائی

شجاعت سندیلوی

جاگو بھائی جاگو بھائی
رات گئی ہے صبح ہے آئی

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے چلتی
دل کی کلی ہے جس سے کھلتی

پھولوں کی ہے خوشبو بھینی
چھائی چمن میں ہے رنگینی

چڑیوں نے ہے گانا گایا
میٹھا پیارا گیت سنایا

مرغے بانگیں اب ہیں دیتے
کاؤں کاؤں کوّے کرتے

لو وہ اذانیں اب ہیں ہوتی
اور نمازیں بھی ہیں ہوتی

پوجا کرنے پجاری نکلے
ہر ہر کرتے، مالا جپتے

اللہ اللہ کرتا کوئی
پیارا قرآں پڑھتا کوئی

بھشتی پانی بھرنے نکلے
مہتر جھاڑو دینے نکلے

تن پر چھوٹی دھوتی باندھے
ہلوا ہا نکلا ہل لے کے

کاہل، غافل، دولت والے
اب بھی پڑے ہیں دیکھو سوتے

ان کو دیا ہے سکھ یہ جس نے
ہائے اسی کو سکھ میں بھولے

ناشکرے ہیں سب یہ بندے
تن کے اجلے من کے گندے

جھلمل جھلمل کرکے تارے
ہو گئے رخصت سب بے چارے

بات یہ اس دم مانو بھائی
سونا چھوڑو جاگو بھائی

ٹلّو میاں

(۳)

محمد شفیع الدین صاحب نیّر

اب ٹلّو میاں کے ہوش ذرا ٹھکانے ہوئے۔ اُن کو انڈے کی تاثیر یاد آئی اُنھوں نے انڈے کو اپنے ہاتھ میں اچھی طرح پکڑ لیا اور دیو کی طرف دیکھنے لگے۔

دیو اُٹھا۔ ٹلّو میاں کی طرف لپکا۔ قریب تھا کہ ان پر حملہ کرکے انڈا چھین لے کہ اُنھوں نے ڈانٹا۔

"خبردار! ایک قدم بھی آگے بڑھا تو انڈے کو زمین پر پٹک کر توڑ دوں گا"

یہ سُننا تھا کہ دیو کی جان ہی تو نکل گئی وہ جھٹ رُک گیا اور بہت عاجزی سے کہنے لگا۔ "میں اب حضور کا غُلام ہوں۔ حضور جو کچھ کہیں گے وہی کروں گا۔ جس چیز کی ضرورت ہوگی ذراسی دیر میں لادوں گا حضور اس انڈے کو نہ توڑیں"

ٹلّو میاں کڑک کر بولے۔ "تو بس میرا حُکم یہ ہے کہ تُم مُجھ سے سو قدم دُور رہو۔ اور جو کُچھ میں کہتا جاؤں کرتے جاؤ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ انڈا توڑ ڈالوں گا"

دیو بولا۔ "جو کچھ حضور کہیں گے وہی کروں گا"

ٹلّو میاں آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اُوپر آئے۔ یہاں پری اور اُن کے بھائی کھڑے گھبرا رہے تھے۔ ٹلّو میاں کو دیکھتے ہی خوش ہوگئے۔ ٹلّو میاں نے اُن سے کہا۔ "اِس دیو کی جان اب میرے

قبضے میں ہے - یہ کچھ بھی نہیں کرسکتا"
یہ بات سن کر تو پری اور بھی خوش ہوئی
ٹلّو میاں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔
ایک کرسی پر پری بیٹھ گئی - دو اور کرسیوں
پر ٹلّو میاں کے دونوں بھائی بیٹھ گئے۔
ٹلّو میاں نے دیو کو حکم دیا" میرے
سامنے آکر کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے دیووں
سے کہو کہ اس پری کے ماں باپ کو
خبر کریں اور ابھی اُن کو لے کر آئیں"
پری نے نشانی کے لئے اپنی
انگوٹھی دے دی۔ اُسی وقت دیو تخت
لے کر گئے۔ بات کی بات میں پری کے
ماں باپ آموجود ہوئے اور اپنی بیٹی کو
سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
پری نے دیو اور ٹلّو میاں کا حال بیان
کیا دیو کا حال سن کر اس کے باپ کو اتنا
غصہ آیا کہ ایک ڈنڈا لے کر اس نے دیو کو
پیٹنا شروع کیا۔ ٹلّو میاں نے کہا۔" بس
اب مارنے سے کیا فائدہ - تمھاری بیٹی
آزاد ہے اس کو لے جاؤ" اُنھوں نے
ٹلّو میاں کا بہت شکریہ ادا کیا - اور
اپنی بیٹی کو لے کر روانہ ہوئے - چلتے
ہوئے پری کے باپ نے ایک ڈبیا
نکالی اور ٹلّو میاں کو دی - اس نے کہا
" اس ڈبیا میں ایک دوا بند ہے اِس
دوا کی تاثیر سے تمھارا قد ٹھیک ہو جائے
گا۔ اور پھر تمھارا قد بھی اور بچوں کی طرح
بڑھے گا"
ٹلّو میاں نے دیو سے اقرار لیا
کہ وہ آئندہ کسی انسان کا گوشت کبھی
نہ کھائے گا نہ کسی پر ظلم کرے گا۔
اس کے بعد ٹلّو میاں نے بہت
سا مال و دولت اور ہیرے جواہرات
گٹھریوں میں بندھوائے اور بہت سی

کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی چیزیں
اپنے ساتھ لیں۔ کئی ایک گھوڑے
منگوا کر یہ سب چیزیں ان پر لدوائیں

اچھی زندگی گذاروں گا کبھی بھول کر بھی
کسی کو نہ ستاؤں گا۔ بھولے بھٹکے مسافروں
کی ہمیشہ مدد کروں گا۔"

اور اپنے گھر کا راستہ لیا۔ دیو بہت دور
تک اُن کے ساتھ آیا۔ اُس نے حضرت
سلیمانؑ کی قسم کھا کر کہا۔" میں اب ہمیشہ
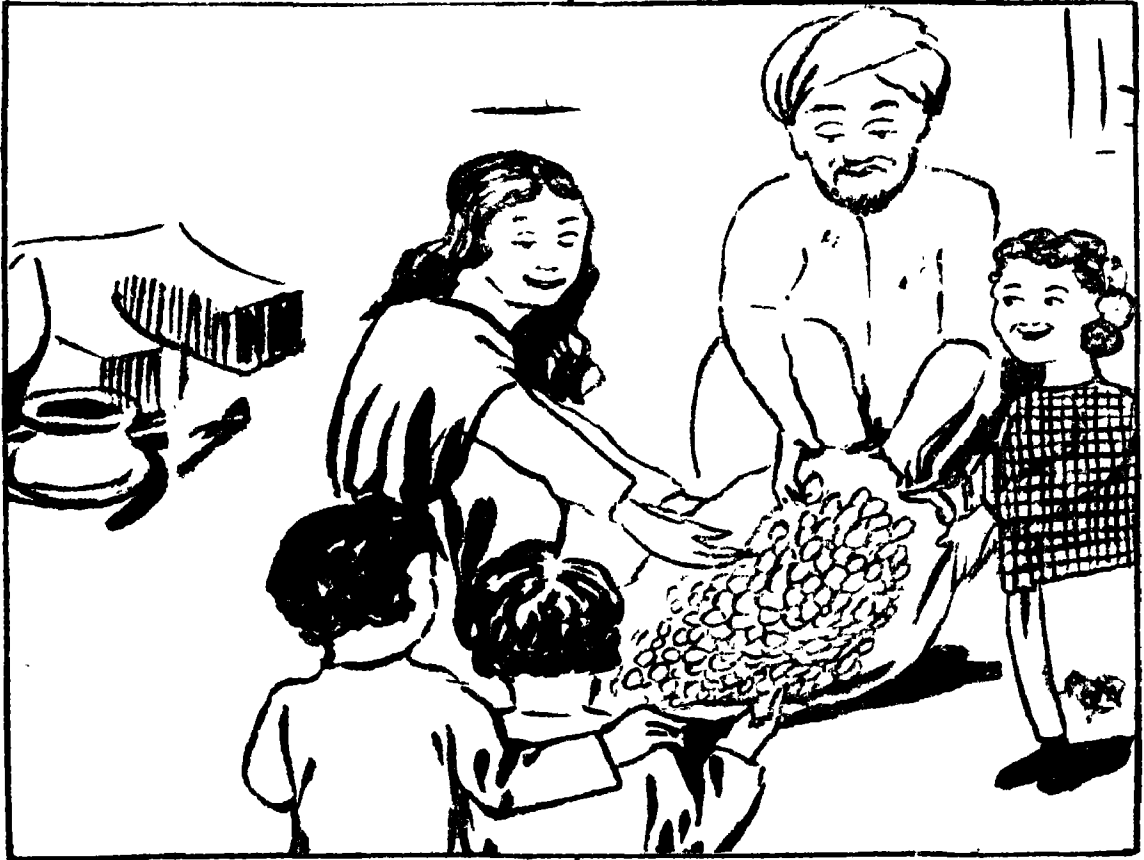
یہ قسم لے کر ٹلو میاں نے وہ
انڈا دیو کو واپس کر دیا۔ یہ دیکھ کر دیو
بہت خوش ہوا۔ اُس نے ٹلو میاں کی

بہادری اور شرافت کی بہت تعریف کی۔ اور ان کو بہت سی دعائیں دیں اس نے اپنی ڈاڑھی کے کچھ بال بھی دے کہ اگر آپ کو کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو اِن کو آگ پر رکھ دیجیے۔ میں اسی وقت مدد کو آجاؤں گا۔ ٹِلّوں میاں یہ مال و دولت لے کر اپنے گھر آئے۔ ماں باپ اپنے بچوں کے غم میں سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر باغ باغ ہوگئے اُنھوں نے دوڑ کر سب کو گلے لگایا اور بہت پیار کیا۔ ٹِلّو میاں نے ساری دولت ماں باپ کے قدموں میں ڈال دی۔ اور اپنی ساری کہانی کہہ سنائی۔ اُس دوا کا ذِکر بھی کیا جو پری کے باپ نے اُسے دی تھی۔ اور جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُس نے اُسی وقت وہ دوا نکالی اور کھالی دیکھتے دیکھتے اس کا قد بڑھ گیا اور وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح ٹھیک ہوگیا۔

اب تو ماں باپ اور بھی خوش ہوئے اُنھوں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

ٹلّو میاں نے ایک شان دار مکان بنوایا۔ گھر کا سامان خریدا۔ یہ سب ماں باپ اور بھائی خوشی اور چین سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ٹلّو میاں کے پاس اتنی دولت تھی کہ ان سب کی ساری زندگی بڑے آرام سے بسر ہوئی۔

(۲)

نورالحسن صاحب ہاشمی

اچھا اب ایک بات اور سنو! اب تک تو جتنے طریقے ہوا میں اُڑنے کے نکالے گئے اُن سب میں گدھ، عقاب، سارس جتنی بڑی بڑی چڑیاں ہیں سب ہوا سے بھاری چڑیاں ہیں۔ آخر یہ کیسے اُڑ لیتی ہیں۔ اگر

گلائڈر
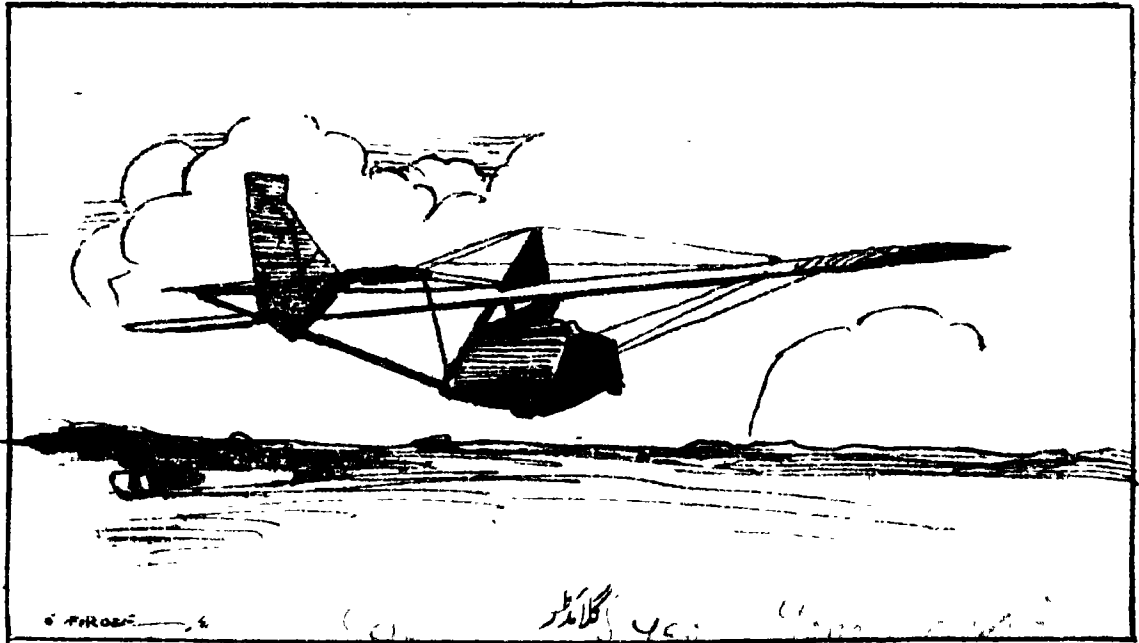
یہ بات پیش نظر تھی کہ کوئی چیز ہوا سے ہلکی ہو۔ ہوا کے ذریعے ہم اوپر اُٹھ سکتے ہیں اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے لیکن اب سائنس دانوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ آخر چیلیں یہ اُڑ سکتی ہیں تو انسان بھی اُڑ سکتا ہے۔ صرف انسان کے لئے پروں کی کمی ہے۔ اور اُڑنے کا طریقہ جاننے کی کسر ہے۔ لوگوں نے ان سائنس دانوں کی اس بات

کا بڑا مذاق اڑایا اور کہا یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ صرف
ہوا سے ہلکی چیزوں کے ذریعے ہی اڑا جا سکتا ہے۔

مگر سائنس دان ان مذاق کرنے والوں سے بالکل نہیں
جھجکے۔ امریکہ میں دو بھائیوں نے جن کا نام رائٹ تھا
یہ ترکیب کی کہ بڑے بڑے صندوق پتنگ کے نمونے پر
بنائے۔ ان پتنگ نما صندوقوں کو کسی پہاڑی پر سے
نیچے کی طرف زور سے دوڑا کر پھسلاتے تھے۔ جب اس کے
پروں کے نیچے ہوا کا دباؤ زیادہ ہو جاتا تو یہ بکس ہوا
میں معلق ہو کر ہوا میں تیرنے لگتے۔ بالکل اسی طرح جیسے
تم کاغذ کے ہوائی جہاز بنا کر ہوا میں پھینکو تو وہ بھی اسی
طرح ہوا میں تیریں گے۔

کچھ دنوں بعد ان بھائیوں نے اس میں کچھ اور
جدتیں کیں اور اسی پتنگ نما صندوق کو ترقی دے کر
ایسی چیز بنائی جسے عام طور گلائیڈر کہتے ہیں۔ اس میں
کوئی انجن نہیں ہوتا تھا۔ ایک بھائی اس گلائیڈر کو پہاڑی
پر زور سے دوڑاتا اس کے نیچے پھسلنے والی لکڑی لگی
ہوتی تھی اس لئے یہ خوب آسانی سے آگے پھسلتا تھا
جب خوب ہوا کا اس کے نیچے دباؤ ہو جاتا تو وہ بھائی
اس کے اندر اچک کر بیٹھ جاتا تھا اور گلائیڈر بجائے
اس کے بوجھ سے نیچے گر جانے کے اس کو ہوا میں
اڑا لے جاتا۔ اور آہستہ آہستہ تھوڑی دیر
میں زمین پر گر جاتا۔

گویا اس طرح انسان نے پروں کے ذریعے
اپنی پہلی اڑان کر لی۔ لیکن ابھی تک وہ دور تر جا سکتا
تھا۔ ضرورت تھی کہ اس میں کوئی انجن لگایا جائے تاکہ
وہ ہوا کو کاٹ کر جہاز کو دور تک لے جا سکے۔ چنانچہ
۱۸۹۶ء میں پروفیسر لینگلے نے ایک گلائیڈر بنایا
جس میں ایک چھوٹا سا انجن لگا دیا۔ یہ مشین بغیر کسی مدد
کے آدھ میل تک اڑتی رہی۔ یہ ایک بڑا کام ہوا
اور لینگلے نے خوش ہو کر اسے اور ترقی دینا شروع
کی۔ اب کے ایک ایسا چھوٹا سا جہاز بنایا جس میں خود
بخود چلنے والا انجن لگایا اور ایک آدمی کو بھی اس میں
بٹھایا۔ ایک ہزار کا مجمع اس عجیب تماشے کو دیکھنے کے
لئے اکٹھا ہوا۔ لیکن افسوس مشین میں نہ جانے کیا خرابی
ہو گئی کہ مشین تھوڑی دور اڑ کر زمین پر گر گئی اور یہ جہاز
ٹوٹ پھوٹ گیا۔ لوگوں نے خوب مذاق اڑایا۔ خوب
ہنسے۔ اور اس جہاز کا نام "لینگلے کی حماقت" رکھا۔

لیکن پروفیسر کے اسی خیال کو لے کر انہی
دو بھائیوں نے کام کرنا شروع کیا جن کا نام رائٹ
تھا اور لینگلے کے جہاز کے ٹوٹنے کے نو دن بعد دسمبر
۱۹۰۳ء میں ایک ایسی مشین (چھوٹے ہوائی جہاز کو
بھی مشین کہتے ہیں۔) اڑائی جس میں ایک چھوٹا سا انجن
لگا تھا۔ (انجن اس کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چلے
جیسے ریل کا انجن موٹر کا انجن وغیرہ) جو موٹر کی طرح
پٹرول سے چلتا تھا۔ اس میں ایک پائلٹ (ہوائی جہاز
کا ڈرائیور۔ جس کو ہواباز بھی کہتے ہیں) بھی بٹھایا۔ یہ

مشین ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر اُڑتی رہی۔ ان دونوں بھائیوں کے دل خوشی سے کس قدر بھر گئے ہوں گے۔ جب اُنھوں نے یہ پہلی اُڑان کی ہوگی یہ دونوں بھائی گویا پہلے انسانی پرندے تھے۔ اور انسانوں کی وہ پرانی آرزو کہ کاش آدمی بھی اُڑ سکتے آخرکار پوری ہو گئی۔

رائٹ بی پلین

اس کے بعد سے تو پھر ہوائی جہاز میں بڑی تیزی سے ترقیاں ہونے لگیں۔ دو پروں والے۔ ایک پروالے سمندر پر اُترنے والے ہر طرح کے ہوائی جہاز بننے لگے۔ اور خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد تو اس میں بڑی بڑی ترقیاں ہوئیں اور فوراً ہی لنڈن سے پیرس تک لوگ اس کے ذریعے سفر کرنے لگے۔ اس قسم کے چھوٹے سفروں کے علاوہ یہ بھی سوچا جانے لگا کہ بڑے بڑے سفر بھی ہوائی جہاز سے کئے جائیں۔ چنانچہ
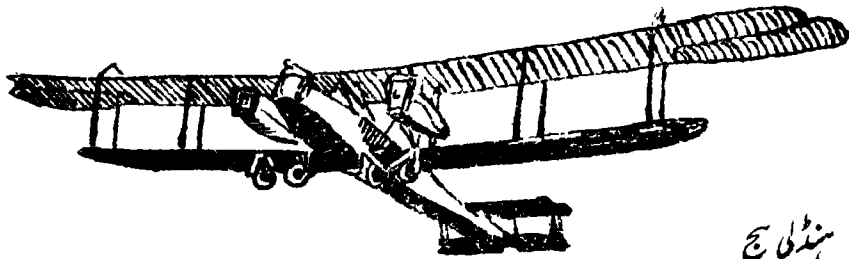
کیپ رونی

ہنڈلی پیج

تین ہوا بازسی ۱۹۱۹ء میں نیویارک سے لندن کی طرف اُڑے اُن کے نمبر تھے این سی نمبر ۱۔ این سی نمبر ۳۔ این سی نمبر ۴۔ پہلا تو طوفان کی وجہ سے تھوڑی ہی دور جا سکا۔ دوسرا سمندر میں انجن کی خرابی کی وجہ سے گر گیا۔ تیسرا البتہ نیوفاؤنڈلینڈ اور ازورس رُکتا ہوا آئرلینڈ ۲۰ گھنٹوں میں پہنچ گیا۔ اس سے بڑھ کر کارنامہ کپتان جان الکاک اور لفٹیننٹ آرتھر براؤن نے دکھایا یہ دونوں بغیر کہیں بیچ میں رُکے ہوئے ۱۹۶۰ میل کا سفر طے کر کے نیوفاؤنڈلینڈ (امریکہ سے ملا ہوا انگریزوں ایک جزیرہ ہے۔) سے آئرلینڈ ۱۶ گھنٹے اور ۱۲ منٹ میں پہنچ گئے۔ ذرا خیال تو کرو کولمبس یورپ سے امریکہ کئی مہینوں میں جا کر پہنچا تھا اور ابھی پچاس ساٹھ برس پہلے بھی امریکہ پہنچنے میں پانچ، چھ ہفتے لگتے تھے اب گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ خود اپنے ہندوستان کو دیکھو۔ پہلے انگریز یہاں سال بھر بعد پہنچا کرتے تھے
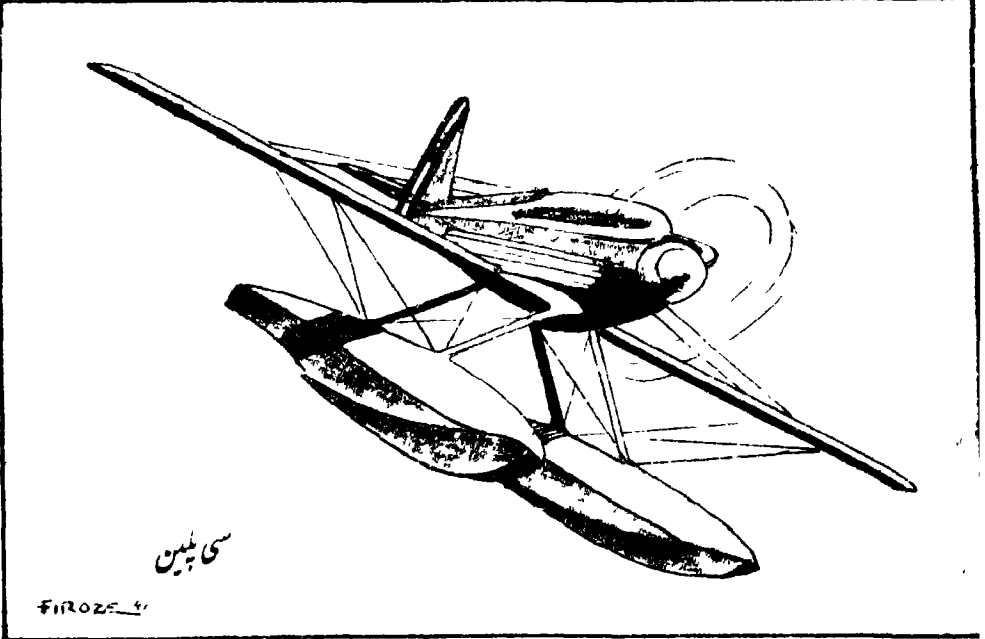
مونوپلین

سی پلین

اور جب سے نہر سوئیز کھلی اور انجن والے جہاز چلنے لگے تب بھی ایک مہینہ لگ جاتا تھا۔ آج کل ہم ہندوستان سے ولایت جو ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے دو یا ڈھائی دن میں پہنچ جاتے ہیں۔ ابھی چند سال ہوئے فرانس سے آسٹریلیا تک ایک اُڑان کا مقابلہ ہوا تھا یہ راستہ ۱۵، ۱۶ ہزار میل کا ہے لیکن سب سے اوّل جو جہاز آیا تھا ۲، گھنٹوں میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

خدا نے آدمی کو بھی عجیب عقل عطا کی ہے۔ اسی عقل کی بدولت ہم وقت اور فاصلے پر قابو پا سکتے ہیں۔ یعنی تھوڑی دیر میں جہاں چاہے جتنا فاصلہ ہو پہنچ جاتے ہیں۔ پہلے جو سفر برسوں میں طے ہوتے تھے اب گھنٹوں میں طے ہوتے ہیں۔ دوسرے ملک والے لوگوں سے ملتے ہیں۔ اس طرح آپس میں ایک دوسرے سے میل جول بھی بڑھتا ہے عقل کا استعمال کرنا شرط ہے اس کی بدولت کوئی کام ایسا نہیں جو نہ ہو سکے۔

بچہ اور دریا

خالد حسن قادری - آگرہ

بچہ

ارے ننھے دریا کہاں جا رہا ہے ۔ بتا دے مجھے بھی یہ کیا گا رہا ہے
کنارے پہ کیوں تو چڑھا آ رہا ہے ۔ چٹانوں سے کیوں سر کو ٹکرا رہا ہے
روانی میں تیری تسلسل ہے کیسا ۔ یہ کیوں ہلکے ہلکے چلا جا رہا ہے
کہاں تک اسی طرح بہتا رہے گا ۔ بہت ہلکے ہلکے یہ تو جا رہا ہے
ذرا تیز چل راستہ جلد طے کر ۔ مصیبت میں کیوں تو پھنسا جا رہا ہے

دریا

مرے پیارے بچے ذرا غور سے سن ۔ پہاڑوں سے میں اب چلا آ رہا ہوں
بہت دور ہے اس جگہ سے مرا گھر ۔ وہیں پر میں بہتا چلا جا رہا ہوں
نہ ٹکرا رہا ہوں چٹانوں سے سر کو ۔ حقیقت یہ ہے دل کو بہلا رہا ہوں
میں آہستہ آہستہ چلتا ہوں یوں ہی ۔ تمھیں چند باتیں یہ سمجھا رہا ہوں
نہ جلدی کرو تم کسی کام میں بھی ۔ سبق تم کو ہمت کا سکھلا رہا ہوں
پڑے راستے میں جو تم پر مصیبت ۔ سہو جس طرح میں سہے جا رہا ہوں
جو مدِ مقابل ہوں دشمن تمھارے ۔ تو ٹکراؤ جیسے میں ٹکرا رہا ہوں
کیے جاؤ یوں کام تم بھی برابر ۔ برابر میں جیسے بہا جا رہا ہوں
کروگے جو محنت تو پاؤ گے پھل بھی ۔ یہی درس تم کو دیے جا رہا ہوں

اسی میں ہے عزت اسی میں ہے راحت
اسی میں مسرت میں سب پا رہا ہوں

روسی بچوں کو مشینی تعلیم

ابو محمد امام الدین ۔ رام نگری

یوروپ میں بچوں کو کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت، کاشتکاری اور کل پرزوں کی تعلیم بھی دی جاتی ہے ۔ روس میں اس کا تمام ملکوں سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے ۔

ایک ہندوستانی مسٹر ڈی جی تینڈولکر روس گئے تھے ۔ وہاں انھوں نے بچوں کو صنعت اور مشنیری کا کام کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔

سنٹرل چلڈرنس ورک شاپ

روس میں بچوں کی صنعت و حرفت اور کل پرزوں کی تعلیم کے لئے جگہ جگہ ورک شاپ قائم ہیں ۔ ان کا مرکز روس کے دارالسلطنت "ماسکو" میں ہے ۔ اس کا نام "سنٹرل چلڈرنس ورک شاپ" ہے ۔ مسٹر تینڈولکر ماسکو میں یہ ورک شاپ دیکھنے کی غرض سے وہاں کے منتظم سے ملے تو اس نے کہا "آپ ہمارے بچوں کا ورک شاپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ بچوں کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو اس کا فائدہ اچھی طرح معلوم ہو جائے گا ۔"

"ہمارے بچے جب کوئی کھلونا دیکھتے ہیں تو انھیں یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا پہیا کیسے چلتا ہے ؟ اور اس کے دوسرے حصے کیسے حرکت کرتے ہیں ؟ پھر ان بچوں کے دل میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی ویسا ہی کھلونا بنائیں ۔"

ہر چیز خود بنانے کے شوق نے روسی بچوں میں مشنری سے گہری دلچسپی پیدا کر دی ہے ۔

۱۹۲۳ء میں حکومت کے محکمۂ تعلیم نے ایک ورک شاپ قائم کیا تھا ۔ اس کا خاص مقصد بچوں میں کل پرزوں کے کام سے دلچسپی پیدا کرنا تھا ۔

ضلع ورک شاپ

سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں سوویٹ حکومت کے محکمۂ تعلیم نے بچوں کو کل پرزوں کی تعلیم دینے کے لئے ایک ورک شاپ قائم کیا ۔ اب تو روس کے قریب

قریب ہر ضلع میں بچّوں کے لئے ورک شاپ قائم ہوگئے ہیں۔ اِن کی تعداد ساڑھے سات سوؔ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تمام ورک شاپ حکومت کے تعلیمی محکمے کی طرف سے چلائے جاتے ہیں، جو ورک شاپ کارخانوں اور کلبوں کی جانب سے قائم ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان ورک شاپوں کی تعداد بھی کئی سو ہے۔ اِن ورک شاپوں میں ایک لاکھ سے زیادہ کاریگر اور انجینیر بچّے کام کرتے ہیں۔

ینگ کمیونسٹ لیگ

ان ورک شاپوں کا انتظام ایک خاص انجمن کے ہاتھ میں ہے۔ اِس کا نام ینگ کمیونسٹ لیگ ہے۔ اس انجمن کی بہت سی شاخیں ہیں جو عام چندے اور سرکاری اِمداد سے چلتی ہیں۔

یہ انجمن برابر بڑے بڑے ماہرِ فن انجینیروں کو اپنے یہاں بلاتی رہتی ہے تاکہ وہ کل پرزوں کے متعلق بچّوں کی اُلجھنوں اور شبہوں کو دور کرتے رہیں، اور انھیں نئی نئی باتیں بتاتے رہیں۔ ہر کام کے لئے علیحدہ ورک شاپ ہیں۔ مثلاً

(۱) انجینیری کے کام کے لئے۔
(۲) بڑھئی کے کام کے لئے۔
(۳) ہوائی جہازوں کے ماڈل بنانے کے لئے۔
(۴) موٹروں کے ماڈل بنانے کے لئے۔
(۵) کشتی سازی کے لئے۔
(۶) بجلی کے لئے۔
(۷) ریڈیو کے لئے۔
(۸) فوٹوگرافی کے لئے۔

جہازوں کے ماڈل

مسٹر تینڈولکر میوزیم بھی گئے تھے۔ اِس شہر کے بچّے جہاز سازی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہاں اُنھوں نے بچّوں کے بنائے ہوئے بہت سے ماڈل دیکھے۔ اِن میں سے تین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں

(۱) اوشن لائنر۔ (بحرِ اعظم میں چلنے والے جہاز) کا ماڈل۔
(۲) بیس توپوں والے جنگی جہاز کا ماڈل۔
(۳) باربرداری کے جہاز کا ماڈل۔

مسٹر تینڈولکر نے کراسنوڈار میں بھی بچّوں کے بنائے ہوئے جہازوں کے ماڈل دیکھے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ کراسنوڈار کے دو اِسکولی بچّوں نے مجھے ریڈیو کی لہروں سے چلنے والے جہاز کا ماڈل دکھایا میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ جہاز پانی میں ریڈیو کی لہروں کی مدد سے اصلی جہاز کی طرح چلنے لگا۔

پہلے جہاز کے پُل کی بجلی روشن ہوئی۔ پھر

اس کے مستول پر سوویٹ روس کا نشان (ہنسیا ہتھوڑا) اُڑنے لگا۔ اس کے بعد خود بخود جہاز کا لنگر اُٹھ گیا۔ اور ریڈیو کے اشارے سے رفتہ رفتہ جہاز آگے بڑھا۔

بچوّں کا جہازی بیڑہ

دریائے نیپر کے ساحل پر بچوّں کا ایک چھوٹا سا جہازی بیڑہ بھی ہے۔ پہلے یہ شاہی محل کے قریب ایک چھوٹا سا جہازی اڈا تھا۔ جو اب ایک بڑے اسکول کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس درسگاہ میں عام جہاز بنانے، اندر کے حصّے کی بناوٹ اور خبر رسانی کے مختلف طریقوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس درس گاہ میں وہی بچے داخل کئے جاتے ہیں جو عقل مند، ذہین اور زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ اکثر نوجوان یہاں کام سیکھنے کے بعد بحری زندگی اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ سینکڑوں لڑکے جو کبھی اس اسکول میں ملّاح تھے۔ آج بڑی بڑی جہازی کمپنیوں میں کام کر رہے ہیں۔

یہاں کے طلبا کو دریائے نیپر میں کشتی رانی کی معقول تعلیم دی جاتی ہے۔ اس فن میں اِنھیں اتنی مہارت حاصل ہو جاتی ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ سرکاری بیڑے میں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہوتے ہیں۔

"وول چالنسک" کا ورک شاپ ۱۹۳۵ء سے قائم ہے۔ اس کے ماتحت اُنیّس ورک شاپ اور بھی جاری ہیں۔ اس میں کھیتی باڑی کا بھی ایک شعبہ ہے۔ اس شعبے کا ایک اپنا باغ ہے کھیت ہیں اور ایک چڑیا خانہ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا چودہ سال کی ایک لڑکی نے جس کا نام "دایا" تھا۔ ایک خاص قسم کا "پٹیلا" (زمین برابر کرنے کا آلہ) بنایا تھا۔ یہ پٹیلا اتنا مفید اور کار آمد ثابت ہوا کہ آج تمام روس میں اسی کا رواج ہے۔ حکومت نے اس کا نام "دایا پٹیلا" رکھ دیا ہے

روسی سائنس داں اور انجینیر بچوّں کو برابر مدد دیتے رہتے ہیں۔ وہ ان کے بنائے ہوئے ماڈل کا معائنہ کرتے ہیں۔ ان کو مفید اور ضروری مشورے دیتے ہیں اور اُن کی کانفرنسوں میں شریک ہوتے ہیں۔

ماسکو کا سنٹرل چلڈرنس ورک شاپ بھی ماتحت ورک شاپوں کے بچوّں کی مدد کرتا رہتا ہے۔ بچے خط کتابت کے ذریعے بھی مرکزی ورک شاپ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اس ورک شاپ سے سالانہ تیس چالیس ہزار جواب ماتحت ورکشاپوں کے بچوّں کے پاس بھیجے جاتے ہیں

بچوّں کو ماڈل بنانے کے لئے سامان کی فکر

نہیں کرنی پڑتی، کنولیس، کاغذ، سلک، موٹر وغیرہ تمام چیزیں انھیں ورک شاپ سے مل جاتی ہیں۔

ماسکو میں ایک محکمہ "سنٹرل ایرپلین ماڈل لیبورٹری" کے نام سے قائم ہے۔ یہ ہر طرح کے مفید مشورے اور ضروری آلات سے بچّوں کی امداد کرتا ہے۔ ایسے اور بہت سے محکمے ہیں جو تمام روس میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں لینن گراڈ کے ایک بچّے "میشا" نے ہوائی جہاز کا ایک ماڈل تیار کیا ہے۔ اس ماڈل نے دُنیا میں ایک خاص ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ بین الاقوامی ہوائی فیڈریشن نے اس کی رجسٹری کی ہے۔ یہ ماڈل ۳۰ منٹ ۳۰ سکنڈ تک ہوا میں قائم رہا۔

ماسکو کے ایک اِسکولی بچّے نے ہوائی جہاز کا ایک ماڈل بنایا تھا۔ اس میں ½ گھوڑے کی طاقت کی ایک گیسولین موٹر فٹ تھی۔ اس موٹر کو بھی لڑکے نے خود ہی تیار کیا تھا۔ اس ماڈل نے بھی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یہ ماڈل ۱۳ میل سے بھی بلند ہوا میں اُڑا تھا۔

بچّوں کی ریلیں

سوویٹ یونین کی جانب سے روس کے مختلف شہروں میں بچّوں کے لئے گیارہ ریلیں جاری ہیں اور تین اور تیار ہو رہی ہیں۔ بچّوں کی یہ سب سے پہلی ریل ۱۹۳۵ء میں ٹفلیس میں جاری ہوئی تھی یہ شہر سوویٹ جارجیا کا پایہ تخت ہے۔ اب وہاں دو ریلیں اور چل رہی ہیں۔ ایک بجلی سے چلتی ہے اور دوسری بھاپ سے۔

یہ ریلیں اصلی ریلوں کا چھوٹا سائز ہیں۔ اِن ریلوں کے منتظم بھی بچّے ہیں۔ اور ان کے ڈرائیور بھی بچّے ہی ہیں۔ اِن ریلوں میں ۱۲ سے ۱۶ برس تک کے بچّے کام کرتے ہیں۔ یہی بچّے انجن چلاتے ہیں۔ ٹکٹ چیک کرتے ہیں۔ سگنل دیتے ہیں اور اسٹیشن ماسٹر کا کام کرتے ہیں۔

سوویٹ حکومت ان ریلوں کی خاص طور پر سرپرستی کرتی ہے ۱۹۳۶ء میں حکومت نے اِن ریلوں کے خرچ کے لئے تیس لاکھ روبل منظور کئے تھے (ایک روبل آٹھ آنے کے برابر) گویا پندرہ لاکھ روپئے۔ ان ریلوں میں تین سے پانچ برس تک کے بچّے سفر کرتے ہیں، ۱۲ برس کی عمر کا کنڈکٹر اُن کی دیکھ بھال کرتا ہے اور تقریباً اِسی عمر کے وہ لڑکے انجن چلاتے ہیں۔

ان ریلوں کے ڈبے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ۱۲ سیٹیں ہوتی ہیں۔ ڈبے صاف سُتھرے ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ سُرنگیں بنی ہوئی ہیں جن کے اندر

سے ریلیں گذرتی ہیں۔ یہ زیادہ تر بڑے بڑے پارکوں میں بنائی گئی ہیں۔ ان ریلوں کی سڑکیں اکثر سو امیل لمبی ہوتی ہیں۔ ان کی پٹری ڈھائی فٹ چوڑی ہوتی ہے۔ ایک ٹرین میں چھ ڈبے ہوتے ہیں۔ گاڑیاں پلیٹ فارموں پر ٹھہرتی ہوئی چلتی ہیں۔ ہر اسٹیشن پر ٹکٹ گھر، اسٹیشن ماسٹر کا دفتر (جس میں ٹیلی فون بھی ہوتا ہے) اور تار آفس ہوتے ہیں۔ ریلوں کا ٹائم ٹیبل بھی لگا رہتا ہے۔ تمام چیزیں خوب صاف ستھری ہوتی ہیں۔ پٹری ریت پر بچھی ہوتی ہے۔

بچوں کو باری باری کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر بچہ چھ روز میں صرف ۲ گھنٹے کام کرتا ہے۔

مسٹر تینڈولکر نے ان تمام چیزوں کے دیکھنے کے بعد ماسکو کے سنٹرل چلڈرنیس ورک شاپ" کے ڈائرکٹر سے سوال کیا۔" آپ کی اس زبردست جہد وسعی کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟"

ڈائرکٹر نے جواب دیا۔" ہماری کوششوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے بچوں کو ابتدا ہی سے کل پرزوں سے دلچسپی ہو جائے گی۔ اسی لیے ہم ہر طرح کے کاموں میں اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

آج سوویٹ روس میں سینکڑوں بڑے بڑے انجینیر، ڈیزائنر، ریڈیو آپریٹر، سائنس دان، ہوائی جہاز اور دوسری چیزوں کے ماہر اور صناع موجود ہیں۔ انھوں نے مشینری کی ابتدائی تعلیم بھی چھوٹے چھوٹے ورک شاپوں میں پائی ہے روسی بچے کھیل بھی کھیلتے ہیں تو مشین اور آلات کا۔ ایم ایم گرومو‌ف روس کا ایک مشہور ہواباز ہے۔ اس نے اپنے بچپن میں ایک ہوائی جہاز دیکھا جو مسٹر نیسٹ روف کا بنایا ہوا تھا۔ اس جہاز کو دیکھ کر گروموف کو بھی ہوائی جہاز کے بنانے کا شوق ہوا۔ اور اس نے اپنے باپ کے کمرے کی کھڑکی کی چق، کاغذ اور ربر سے ہوائی جہاز کا ماڈل تیار کر لیا۔ جو اڑانے پر اڑا بھی۔

گروموف کے باپ کو معلوم ہوا تو اس نے اس ماڈل کو منگا کر دیکھا اور باقی چقوں سے باپ بیٹوں نے مل کر ایک اور ماڈل تیار کیا۔ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گروموف بڑا ہو کر ایک مشہور ہواباز بنا ہے

ایک عرب کے پاس ایک خوب صورت عربی گھوڑا تھا۔ ایک مال دار یہ گھوڑا عرب سے خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے عرب سے کہا "دو اونٹوں کے بدلے میں مجھے یہ اپنا گھوڑا دے دو۔" لیکن عرب نہ مانا۔ مال دار دس اونٹ دینے لگا۔ پھر بھی عرب نہ مانا۔ آخر وہ دس اونٹ کے علاوہ بہت سا روپیہ بھی دینے لگا لیکن عرب گھوڑا دینے پر رضامند نہ ہوا۔

مال دار نے دل میں سوچا کہ یہ عرب بڑا ضدی معلوم ہوتا ہے، یوں راضی نہ ہوگا۔ کسی حکمتِ عملی سے اس کا گھوڑا لینا چاہیے۔

بہت دنوں بعد ایک بار اس عرب کو کسی گاؤں کو جانا پڑا۔ اس مال دار نے یہ پتہ چلا لیا کہ کب اور کس راہ سے جانے والا ہے۔ وہ بھکاری کا لباس پہن کر اس کے رستے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اور کراہنے لگا۔

عرب گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا کہ اس نے رستے میں دیکھا۔ کوئی غریب پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے رحم آیا۔ وہ فوراً گھوڑے سے اُتر کر قریب آیا اور کہا: "تم یہاں کیوں بیٹھے کراہ رہے ہو؟"

مال دار نے آواز بدل کر کہا: "کیا کروں بابا! مجھے ایک گاؤں کو جانا ہے۔ لیکن چلتے چلتے پیٹ میں سخت درد اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس کی وجہ سے اُٹھا بھی نہیں جاتا، چل کیسے سکتا ہوں۔ شاید خدا نے میری موت یہیں لکھ دی ہے۔"

یہ سُن کر عرب کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اور کہنے لگا۔ "تم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ اچھا تم میرے گھوڑے پر بیٹھ کر چلو۔ میں پاؤں پاؤں چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر عرب نے اُسے گھوڑے پر چڑھا دیا۔ گھوڑے کی لگام اُس کے ہاتھ میں دے دی اور خود ساتھ چلنے لگا۔

گھوڑے کی لگام ہاتھ میں آتے ہی مال دار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا بھاگا اور ایسا

ہوا ہُوا کہ ذرا کی ذرا میں نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ عرب فوراً پہچان گیا کہ دھوکا ہوا۔ اُس نے زور سے آواز دے کر کہا :۔ "ارے بیمار آدمی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، میری بات سُنتا جا پھر گھوڑا دوڑا کر چلے جانا"۔

مال دار کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ عرب نے کہا۔ میں سمجھ گیا، تم نے میرے گھوڑے پر اس ترکیب سے قبضہ کیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں لیکن دیکھو یہ بات کسی سے کہنا مت کہ میں نے اس ترکیب سے گھوڑا پایا ہے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اور یہ بات ظاہر ہو گئی تو کوئی مُسافر کبھی کسی کے کام نہ آئے گا

اِس عرب کی یہ بات سُن کر مال دار کو بڑی شرم آئی۔ اُس نے اُسی وقت عرب کا گھوڑا عرب واپس کر دیا اور معافی مانگی ۔ (ترجمہ)

اپنے پیامیوں سے

ضروری باتیں

۱۔ پیامِ تعلیم ہر ماہ کی ۲۸ تاریخ کو شائع ہوتا ہے اور تمام خریداروں کے پاس ۸ تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ ۱۵ تاریخ تک خط لکھ کر دفتر سے دوبارہ منگا لیں۔ ۱۵ کے بعد ہم رسالہ نہ بھیج سکیں گے۔

۲۔ تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں نیا نمبر خریداری سب کے رسالے پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ تمام خریدار پیامی اپنے اپنے پتوں کی چِٹ سے نمبر خریداری نوٹ کر لیں۔

۳۔ خریدار پیامی خطوں پر اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری مع نام و پتہ [illegible] لکھا کریں۔ جو خط بغیر نمبر خریداری کے ہمارے پاس آئیں گے ان کی ہم تعمیل نہ کر سکیں گے۔

منیجر رسالہ "پیامِ تعلیم" دہلی

کنارے پر پہنچنے کے بعد بیٹس اور ایک ہندوستانی بندوقیں لے کر جنگل میں گھسے۔ جنگل کے اندر بیٹس کا پیر ایک ریٹل اسنیک کے اوپر پڑ گیا۔ جو راستے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ سانپ جب تک چھیڑا نہ جائے حرکت نہیں کرتا اور چھیڑنے پر وہ اپنی دُم ہلاتا ہے جس سے ترتراہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ بیٹس نے اس کو گولی سے مار ڈالا۔

ایک مرتبہ ایک اناکونڈا (ANACONDA) (پانی کا سانپ) نے بیٹس کو پریشان کر دیا۔ اس کی کشتی کنارے پر بندھی ہوئی تھی اور وہ اکیلا اس میں سو رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب کشتی میں زور کا دھکا لگا......... جیسے ہی وہ جاگا اس کو دریا میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ اب بیٹس نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا مگر کہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ صرف پنجرے کی چڑیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ یہ پنجرا کشتی کے ایک کنارے لٹک رہا تھا۔ بیٹس ہر طرف ایک مرتبہ پھر دیکھ کر سو گیا۔ صبح کو کیا دیکھتا ہے کہ چوزے کشتی میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ پنجرے میں ایک سوراخ بنا ہوا ہے اور دو چڑیاں غائب ہیں اسی طرح اور لوگوں کی چڑیاں غایب ہو چکی تھیں۔ اب ہندوستانیوں نے اور بیٹس نے مل کر چور کا پتہ لگانا چاہا۔ اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ چور کوئی پانی کا سانپ ہے تلاش کرتے کرتے وہ لوگ پریشان ہو گئے لیکن اس کا پتہ نہ لگا۔ آخر کار وہ لوگ ایک نالے میں پہنچے اور دیکھا کہ یہ سانپ ایک لٹھے پر لیٹا ہوا ہے۔ ہندوستانیوں نے اس کو اپنے اپنے ہارپون کے ذریعے مار ڈالا۔ بیٹس نے اس کی پیمائش کی تو معلوم ہوا ۱۹ فیٹ لمبا تھا اس طرح کے اور بہت سانپ مارے گئے جن میں اکثر ۲۱ فیٹ لمبے اور ۲ فیٹ موٹے تھے۔

دریائے امیزن خطِ استوا کے قریب سے ہو کر بہتا ہے۔ یہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے آب و ہوا گرم اور مرطوب اور تندرستی کے لئے مُضر ہے یہ مقام مسافروں کے لئے موزوں نہیں ہے اسی وجہ سے بیٹس یہاں بہت سخت بیمار ہو گیا کمزوری

بُہت زیادہ بڑھ گئی۔ اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی تو ۱۸۵۹ء میں اِنگلینڈ واپس چلا گیا۔ اتنے عرصے میں بٹیس نے تقریباً پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) نمونے جانوروں، چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں کے جمع کئے۔ ان میں آٹھ ہزار (۸۰۰۰) سے زیادہ یورپ والوں کے لئے نئے تھے۔

بٹیس تو اب گھر پہنچ گیا۔ آئیے ہم لوگ اب ولیس کو دیکھیں اس کی کیا حالت ہے۔ اِسے ہم لوگوں نے دریائے نگرو میں جاتے ہوئے چھوڑا تھا۔ ولیس نے صرف ۴ سال تک دریائے نگرو اور اس کے معاون دریاؤں کا سفر کیا اور پھر انگلینڈ واپس چلا گیا۔ جو کچھ اُس نے دیکھا اور بیان کیا ہے وہ بھی کافی پُرلطف ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ ”دریائے نگرو کے معاون دریا اوپیں (UAUPES) کے کنارے ہندوستانیوں کی ایک قوم ملی جو ننگی پھرتی تھی۔ ان کا بدن لال، پیلے اور کالے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان میں مردوں کے بال لمبے اور ان کی چوٹیاں گندھی ہوئی تھیں۔ یہ پیچھے کی طرف پیٹھ سے نیچے دُم کی طرح لٹک رہی تھیں اِن کے سر کے بالوں میں ایک کنگھی لگی ہوئی تھی جو چڑیوں کے پروں سے مزیّن تھی۔

یہ ہندوستانی اپنی زندگی شکار کرکے اور مچھلی پکڑکے بسر کرتے تھے۔ تیر کمان اور تفنگ کے بڑے ماہر تھے۔ چُپکے سے درخت کے نیچے پہنچ جاتے تھے اور تیر کمان کے ذریعے چڑیوں کو مارتے جاتے تھے اور اس طرح مارتے تھے کہ دوسری چڑیوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اُڑتی بھی نہیں تھیں اُن کی امداد سے ولیس نے کافی نمونے جمع کر لئے۔

اس زمانے میں کشتیوں میں غُلام پکڑنے والی جماعتیں چلا کرتی تھیں اور ہندوستانیوں کو پکڑ کر غُلام بناتی تھیں ولیس نے ایک جماعت کو دیکھا جس میں ۲۰ ہندوستانی گرفتار تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچّے تھے۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ زمانہ بہت خوفناک تھا۔ اس لئے ولیس کو کشتی کے لئے ہندوستانی ملاح بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ اب ولیس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اور مانا اوز تک واپس آنے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ جو ملّاح ملتے بھی تھے وہ دُور تک نہیں جاتے تھے کچھ دُور جاکر واپس چلے آتے تھے۔ ولیس ہندوستانیوں کو کلہاڑی، چاقو اور آئینے اِنعام میں دے دے کر کسی طرح مانا اوز تک پہنچا۔ یہاں سے وہ ایک جہاز میں بیٹھ کر انگلینڈ کو روانہ ہوگیا۔ یہ جہاز ۱۲ر جولائی ۱۸۵۲ء میں پارا سے روانہ ہوا تھا تین ہفتے تک جہاز نے کافی سفر طے کیا۔ ایک صبح کو جہاز کے ایک حِصّے میں سے جس میں سامان رکھا ہوا تھا دھنواں اُٹھنا شروع ہوا۔ ملّاح فوراً سامان ہٹانے اور آگ تلاش کرنے میں مشغول ہوگئے۔ اور نچلے حِصّے میں ایک سوراخ کر دیا گیا تاکہ پانی آکر آگ کو

بجھا دے۔ لیکن تمام کوششیں بیکار گئیں اور آگ بھڑک اٹھی۔ آخر کار کپتان نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاز چھوڑ کر کشتی پر سوار ہو جائیں۔ اور سب کے بعد میں خود بھی کشتی میں آگیا۔

ایک مصیبت ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسری نے آگھیرا۔ کشتی عرصے سے پانی میں نہیں آئی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے تختے سوکھ کر سکڑ گئے تھے اور ان میں دراز پڑ گئے تھے۔ ان درازوں کے ذریعے کشتی میں پانی آنا شروع ہوگیا۔ تمام آدمی اور تمام سامان جو کشتی کے اندر تھا بھیگ گیا۔ ملاحوں کی تمام رات کشتی سے پانی باہر نکالنے میں کٹی۔ صبح کو کپتان نے قریب کے ملک کی طرف رخ کیا۔ مگر بدقسمتی سے ہوا موافق نہ تھی، ملاحوں کو بڑی تکلیف ہوئی۔ پینے کا پانی بھی ختم ہوگیا اور سورج کی گرمی قیامت ڈھا رہی تھی۔ پیاس سے آدمیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لوگ گھر پہنچنے اور زندہ بچنے سے نا اُمید ہوگئے تھے۔ ہر ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا اور اپنی بے چارگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا تھا۔ سوائے خدا کے اور تمام اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں اُن کی آنکھیں آسمان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ گویا ہر ایک خدا کی درگاہ میں دُعائے خیر مانگ رہا تھا۔ آخر خداوند عالم نے جو ہر کمزور کا مددگار اور ہر بے چارے کا چارہ گر ہے۔ اپنا کرشمہ دکھلایا اور دور سے ایک جہاز آتا دکھائی دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں لوگ اس جہاز میں عافیت کی سانس لینے لگے۔ اب ویلس کو اپنی محنت و مشقت سے جمع کیے ہوئے ذخیرے کے نقصان کا صدمہ ہوا۔ جنگلوں کی خاک چھان کر اور دریاؤں کی دقتوں سے دو چار ہو کر جو کچھ اس نے جمع کیا تھا اس میں سے ایک چیز بھی نہ بچی جس کو انگلینڈ پہنچ کر وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا۔ اب بھی یہ لوگ آرام سے نہیں رہے سمندر میں طوفان اُٹھ رہا تھا اور موجیں جہاز کو ہلا ہلا دیتی تھیں۔ ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ ابھی سفر بھی کافی دور دراز کا تھا۔ اس جہاز پر بھی کافی کھانے پینے کا سامان نہیں تھا دوسرے آدمیوں کے بڑھ جانے سے اور کمی پڑ گئی۔ لوگوں کی خوراک نصف کر دی گئی دوسرے جہازوں سے کھانے کا سامان خریدا گیا۔ مگر پھر بھی آسودگی نہ ہوئی۔ آخر کسی نہ کسی طرح جہاز انگلینڈ پہنچ گیا اور ویلس بارا سے چلنے کے ۰۰ دن بعد اپنے وطن پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اپنے وطن کی زمین پر چل کر اس کو بے حد خوشی ہوئی ؀

ہمارا باغیچہ

ننھا منا سا باغیچہ — سبزی کا گویا غالیچہ
آئیے صاحب آئیے صاحب — منظر دیکھتے جائیے صاحب
چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری — الگ سے ایک جدا ہی کیاری
کہیں ہے جوہی کہیں چنبیلی — جیسے دلہن نئی نویلی
پیچھے ہے یہ رات کی رانی — سب کی ہے جانی پہچانی
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں — ہم سب کی محنت کے صلے ہیں
دیکھئے پھولوں کی رنگینی — سونگھئے خوشبو بھینی بھینی
باغیچہ ہے یہ چھوٹا سا — ہم نے مگر سب کچھ ہے بویا
پالک، میتھی، گاجر، مولی — سویا، دھنیا، آلو، گوبھی
شلجم، لوکی، سیم، چقندر — جو کھائے ہو مست قلندر

مرکز کی تعلیم نرالی
آتش قومی باغ کا مالی

نفیس الدین احمد متعلم ابتدائی چہارم - تعلیمی مرکز نمبر ۱
(عمر ۱۱ سال)

تتلی

پیاری تتلی، پیاری تتلی — امّاں دیکھو ہماری تتلی
تتلی اُڑتی پھرتی آئی — پھول پھول پہ گرتی آئی
باغ میں آئی در میں آئی — اُڑتے اُڑتے گھر میں آئی
گھر میں آئی ہم نے دیکھی — ہم نے دیکھی فوراً پکڑی
بھیّا بولا "ہم کو نے دو" — میں بولا" لو اس سے کھیلو"
اُس نے جونہی ہاتھ بڑھایا — ہم دونوں نے دھکا کھایا
چٹکی کو کچھ ڈھیلا پاکر — فوراً بیٹھی پھول پہ جاکر

اپنے ہُنر میں فائق وہ تھی
آزادی کی شائق وہ تھی

ملک ابرار احمد متعلم جماعت ششم شاہجہانپور

برکھارُت

چھم چھم کرتی بوندیں آئیں — ساتھ میں بجلی بادل لائیں
بادل گرجے بجلی چمکی — بوندوں کی بوچھار لگی تھی
لڑکیوں نے جھولے ڈلوائے — بیٹھ کے اُن پر گیت سُنائے
سب نے پھر پکوان پکائے — پھر وہ سب نے مل کر کھائے

دِل پر خوب خوشی تھی چھائی
راضیہ نے یہ نظم سُنائی

راضیہ خاتون علی گڑھ (عمر ۹ سال)

ارے یہ کس چیز سے تم اپنی سلیٹ صاف کر رہے ہو؟ گندے کپڑے سے؟ توبہ توبہ! اسپنج کیوں نہیں استعمال کرتے۔ واہ بھئی واہ اسپنج نہیں جانتے ایہ تو بہت ہی پرانی چیز ہے۔ اب سے ہزاروں برس

تہہ میں رہتا ہے۔ اس کا جسم بہت نرم ہوتا ہے بالکل ریشم کی طرح۔ اور بالکل ہلکا پھلکا۔ اپنے جسم کا نیچے کا حصہ تہہ میں کسی نہ کسی چیز سے پھنسائے رکھتا ہے۔ ورنہ پانی کی ذراسی حرکت سے اِدھر سے اُدھر
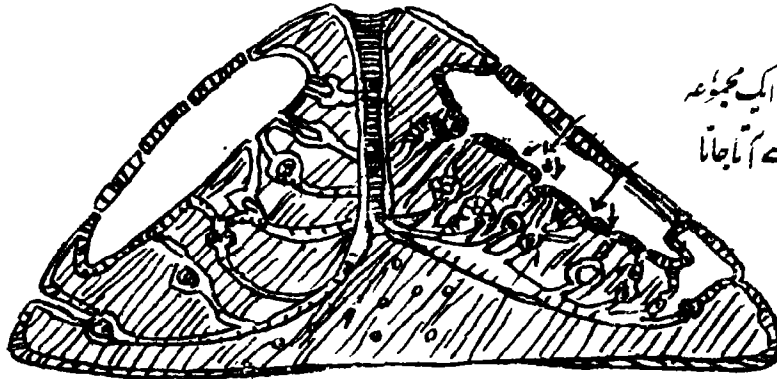
اِسپنج یوں سمجھو کہ سوراخوں کا ایک مجموعہ ہے اور سمندر کا پانی اس میں سے آتا جاتا رہتا ہے۔ جہاں جہاں تیر کا نشان ہے وہاں اسی قسم کے سوراخ ہیں۔

پہلے لوگ اسے جانتے تھے ایک بہت ہی پرانے شاعر ہومر نے اپنی نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں اسے خود کے اندر کے حصے میں لگاتے تھے۔

یہ اصل میں ایک دریائی کیڑا ہے اور سمندر کی

بہتا پھرے۔ اس میں شہد کے چھتے کی طرح کے خانے بنے ہوتے ہیں یہ سب گویا اس کے مُنہ ہیں انھی سے کھاتا اور انھی سے سانس لیتا ہے۔ یہ مُنہ وہ جب چاہے کھول سکتا اور بند کر سکتا ہے مُنہ کا باہر کا حصہ بڑا ہوتا ہے اور پھر چھوٹا ہوتا جاتا

ہے۔ تہہ کے اندر کے کیڑے مکوڑے اُس کی غذا ہیں۔ اس کی غذا کہیں پندرہ گھنٹوں میں ہضم ہو جاتی ہے۔ جہاں آب و ہوا اچھی ہوتی ہے اور غذا افراط سے ملتی ہے وہاں پل کر خوب بڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں غذا کم ملتی ہے وہاں زیادہ بڑا نہیں ہونے پاتا۔ اس کے جسم میں خون نہیں ہوتا۔ اور کوئی چیز اسے چھوتی ہوئی گذر جائے تو اسے ذرا احساس نہیں ہوتا۔

دوسرے جانداروں کی طرح یہ انڈے بھی نہیں دیتا۔ بلکہ ایک خاص عمر کے بعد اسپنج اپنے جسم کے کئی ٹکڑے کر لیتا ہے۔ یہی ٹکڑے نئے اسپنج ہیں جو تھوڑے دنوں بعد پانی کی گہرائیوں میں رہنے لگتے ہیں۔

بہاماس، فلوریڈا۔ لیوانٹ اور جنوبی کیارولین میں اسپنج زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ موسمی حالات گرمی، سردی کی کمی یا زیادتی اور پانی کی گہرائی کے اعتبار سے ان کا استعمال بھی الگ ہوتا ہے۔ مثلاً نرم اسپنج نہانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ذرا سخت قسم کے سلیٹ وغیرہ صاف کرنے اور مالش کرنے کے لئے۔ یہ لچک دار بھی بہت ہوتا ہے۔ اس لئے گدی دار کرسیوں اور بستروں وغیرہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اسپنج ناکارہ بھی ہوتے ہیں۔ ان میں معدنیات کا جز زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے:۔ چاک وغیرہ

بی لومڑی

گنگا موہن رائے - بریلی

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک جنگل میں لومڑی کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ نر لومڑی کے نو دُمیں تھیں۔ ایک دن میاں لومڑے مُردہ بن کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ بی لومڑی وفادار ہیں یا نہیں۔

بی لومڑی کو اپنے میاں کے مرنے کی خبر ہوئی تو چھت پر گئیں اپنے کمرے میں تالا لگایا اور لومڑے کے کمرے میں جاکر رونے لگیں۔ تھوڑی دیر میں سب کو معلوم ہو گیا کہ بی لومڑی کے میاں اللہ میاں کے یہاں سدھارے ان کی ماما بڑی بلی باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا اور کہا:-

پُوسی پُوسی باہر آؤ
مجھ کو تم یہ بات بتاؤ
آج ہے کیوں خاموشی چھائی
لومڑی دیتی نہیں دکھائی

بڑی بلی نے جاکر دروازہ کھولا تو دیکھتی ہے کہ ایک جوان لومڑا کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ

میاں لومڑے فوت ہوئے ہیں
چھت پر دیکھو مرے پڑے ہیں
بی بی لومڑی اوپر جاکر
روتی ہیں آواز بنا کر

لومڑے نے کہا: "اوپر جاؤ اور بی لومڑی سے کہو ایک لومڑا آیا ہے اور ان سے شادی کرنا چاہتا ہے"۔ بڑی بلی اوپر گئیں اور بولیں:-

بی بی میں اک بات بتاؤں
تم کو اک خوش خبری سناؤں
ایک لومڑا سجا سجایا
تم سے بیاہ رچانے آیا

لومڑی بولی:-

اس سے جاکر یہ پوچھو تم
کے رکھتا ہے اپنی دُم
نو اس لومڑے کے ہیں دُمیں اگر
کرلوں گی شادی خوش ہوکر

بڑی بلی بولی کہ "اس کے صرف ایک دم ہے"
لومڑی بولیں۔ "تو میں اس سے شادی نہ کروں گی

بلّی نیچے گئی اَور اُس سے انکار کر دیا۔ رفتہ رفتہ بہت سے لومڑے آئے۔ کسی کے ایک دُم تھی کسی کے دو۔ کسی کے پانچ۔ آخرکار ایک لومڑا آیا جس کے نو دُمیں تھیں۔ جب بی لومڑی کو نو دُموں والے کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑیں۔ اَور بولیں :-

اس بڈھے کی لاش کو پھینکو
گھر کے باہر جاکر دیکھو
جاؤ بی بی بلّی جاؤ
دوستوں کو دعوت دے آؤ

لیکن جب شادی کا سب سامان تیار تھا اَور بھانوریں پڑنے والی تھیں کہ یکایک میاں لومڑے اُٹھ بیٹھے اَور بھری برات کو اپنے موٹے ڈنڈے سے مار بھگایا۔

کچھ دنوں بعد میاں لومڑے سچ مچ بیکنٹھ سدھارے۔ پھر ایک بھیڑیا آیا اَور بڑی بلّی سے بولا " آداب عرض! آج آپ کیا پکا رہی ہیں "

بڑی بلّی۔ "آج میں گوشت روٹی پکا رہی ہوں۔ کیا آپ کھانے کے وقت تک رکیں گے یا میں ایک گلاس شربت پلاؤں "

بھیڑیا۔ "شکریہ! شاید بی لومڑی ہیں نہیں۔"

بڑی بلّی۔ "ہیں تو مگر لومڑے میاں انتقال فرما گئے لہٰذا وہ ماتم کر رہی ہیں "

بھیڑیا۔ "جاؤ کہو بھیڑیا آیا ہے اگر آپ شادی کرنا چاہیں تو حاضر ہے "

بڑی بلّی۔ "میں ابھی اوپر جاتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیے "

بڑی بلّی نے ایک کرسی بھیڑیے کے بیٹھنے کو دی اَور کان ہلاتی مونچھیں چاٹتی اوپر گئی۔ اوپر جاکر اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا اَور بی لومڑی سے پیغام کہا۔ بی لومڑی بولیں " کیا اس کے پنجے میاں لومڑے کی طرح لال ہیں " بلّی بولی " نہیں " لومڑی بولی " تو میں شادی نہیں کروں گی " اس کے بعد بہت سے جانور آئے مگر بی لومڑی نے سب کو یہی جواب دیا۔ بالآخر ایک لومڑا آیا جس کے پنجے لال تھے تب بی لومڑی بلّی سے بولیں :-

سارے گھر کو صاف کراؤ
اَور مخمل کا فرش بچھاؤ
بڈھا مرا جوان کو پایا
کیا ہو تیرا شکر خدایا
لومڑی کو پھر دلہن بنایا
لومڑے کو بھی خوب سجایا
مولوی آئے پنڈت آئے
دونوں کے پھر ہاتھ ملائے

نامی نے یہ قصہ سنایا ہے جو بچوں کے من کو بھایا

(ترجمہ)

آج عید کا دن ہے۔ سب بچے صبح سویرے خوش خوش اُٹھے۔ نہائے دھوئے کپڑے بدلے اور خوشیاں منانے لگے۔ ہم سب اس خوشی میں مصروف تھے کہ ہمارے ملازم نے آواز دی "ڈاک لے جاؤ"۔ اس ڈاک میں پیام تعلیم کا سال گرہ نمبر بھی تھا میں نے اُسے لے لیا اور پڑھنے لگا اتنے میں سب بچے میرے اِرد گرد جمع ہوگئے اور ہر بچہ یہ کوشش کرنے لگا کہ سب سے پہلے میں سال گرہ نمبر کو دیکھوں۔ ہماری آپا جان بھی اس چھینا جھپٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولیں "لاؤ میں تم سب کو پڑھ کر سنادوں"۔ سب بچوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور انھوں نے سنانا شروع کیا۔ سب بچے کبھی ہنستے کبھی کودتے، کبھی اُداس بیٹھ جاتے یعنی جب اُنھوں نے ٹلو میاں کے مضمون میں یہ سنا کہ ٹلو میاں مع اپنے بھائیوں کے جنگل میں راستہ بھول گئے ہیں تو انھیں بہت افسوس ہوا۔ لیکن اُن کا یہ افسوس فوراً ہی "آؤ ڈراما کریں" مضمون کو سن کر خوشی میں تبدیل ہوگیا اور بولے "ہم بھی ایسا ڈراما کریں گے"۔ اس کے بعد جب اُنھوں نے "منہ کی کھائی" نظم سنی تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ سال گرہ نمبر کے سب سے آخر میں یہ پڑھا گیا کہ ہر بچہ پیام تعلیم کے سال گرہ نمبر کے متعلق اپنی رائے بھیجے، میرا چھوٹا بھائی "محبوب" جو اس وقت یہاں بیٹھا تھا بولا کہ ہمیں تو "لدو کا تترا اتنا لگا" (لڈو کا ٹکڑا اچھا لگا) ہر بچے نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ حالانکہ ان میں بہت سے بچے ایسے تھے جو پڑھنا لکھنا تو درکنار ٹھیک سے بولنا بھی نہیں جانتے تھے۔

اس سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سال گرہ نمبر میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے لڑکوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ یہ تو وہ عام پسندیدگی ہوئی جو ہر بچے نے پیام تعلیم کے سال گرہ نمبر کے متعلق ظاہر کی تھی۔ اب میری ذاتی رائے سنئے جو میں نے پیام تعلیم کے اس سالنامے کو دیکھ کر قائم کی ہے۔

سالنامے تو اور بہت سے بچوں کے رسالوں کے نکلے مگر ہمارے پیامِ تعلیم کے اس خاص نمبر میں کئی خصوصیتیں ہیں جو اور کسی بچوں کے رسالے میں نہیں پائی جاتیں۔

ہمارا پیامِ تعلیم ہندستانی زبان کے تمام دوسرے بچوں کے رسائل پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ ہمارا خاموش رہبر اور اچھا اُستاد ہے۔ دیسے تو ہر مہینے یہ ہم کو اپنے اچھے اچھے اور مفید مضامین سے مستفید کرتا رہتا ہے مگر سالگرہ نمبر کے مضامین دلچسپ، مفید اور بہت کام کے ہیں۔ ہر مضمون کے پڑھنے سے ہمیں نیا مزا آتا ہے اور اچھے اچھے سبق حاصل ہوتے ہیں۔ مضامین اور نظموں کے ساتھ ایسے عمدہ عمدہ کارٹون اور تصاویر دی گئی ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر نہ صرف ہماری دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ہمارے دماغوں میں ایسا نقشہ جم جاتا ہے جن سے ہم ان مضامین کی یاد ایک عرصے تک تازہ رکھ سکتے ہیں۔ زیادہ تر مضمون اور نظمیں بالکل نئی اور سلیس اُردو میں لکھی ہوئی ہیں۔ جن کو چھوٹے بچے بھی آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

اب رہا مضامین کا معیار تو وہ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے لکھنے والے بڑے بڑے اہلِ قلم اور ادیب ہیں۔ جن پر سارا ہندوستان نازاں ہے اور ان پر رائے زنی کرنا ہم جیسے چھوٹے اور کم لیاقت بچوں کا کام نہیں۔ "چھوٹا مُنہ بڑی بات"

ہم سب پیامیوں کو یہ دعا کرنا چاہیے کہ ہمارا پیامِ تعلیم دن دُونی رات چوگنی ترقی کرے اور اس کے کارکن ہمیشہ خوش رہیں اور اس کو اسی شان و شوکت کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھیں۔ مگر یہ سب کچھ جبھی ہوگا جب اس کے پڑھنے والے بھی پیامِ تعلیم کی مدد کریں اور اپنے دوستوں کو اس کا خریدار بنائیں۔

بچوں کی کوششیں
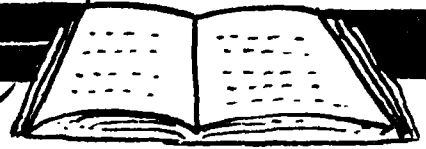
ایک نیک لڑکا

وقت ـ ـ ـ ـ ـ ـ دوپہر
جگہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اسکول کے سامنے

اشخاص
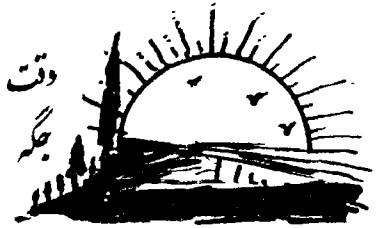
اکرام ـ ایک نیک لڑکا
بابا مُظفر ـ ایک فقیر
یوسُف ـ فقیر کا لڑکا
سعید، ذاکر، محمود ـ تین شریر لڑکے
پروفیسر سلیم ـ اکرام کا والد

پہلا منظر

(اسکول کی چھٹی ہوتی ہے۔ سب لڑکے خوش خوش باہر نکلتے ہیں۔ دو تین شریر لڑکوں کی ایک ٹولی کی نظر ایک فقیر پر جا پڑی۔)

سعید :۔ اس اندھے فقیر کے ساتھ کچھ مذاق کرنا چاہیے

ذاکر :۔ ہاں سعید اسے اس میدان میں چھوڑ آئیں۔

محمود :۔ بابا ہم اِسکول سے آرہے ہیں۔ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ہمارے گھر چلو۔ ہم تمھیں کھانا کھلائیں گے۔

(وہ اُسے بہکا کے میدان میں لے گئے۔ اِکرام ملتا ہے۔)

اکرام :۔ یار آج تم اتنے خوش کیوں ہو ؟

ذاکر :۔ ہم ایک بڈھے فقیر کو میدان میں چھوڑ آئے ہیں۔

دوسرا منظر وقت سورج ڈوبنے کے قریب ۔۔ ۔۔ جگہ :۔ میدان

اکرام :۔ جو تمھیں بہکا کر یہاں لائے ہیں وہ تین شریر لڑکے ہیں۔ چلو میرے گھر چلو۔ وہاں میں تمھیں کھانا کھلاؤں گا۔

فقیر :۔ تمھیں خدا بہت دیر تک زندہ رکھے۔ (اُسے اپنے گھر لے جاتا ہے)

تیسرا منظر وقت :۔ شام کا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جگہ :۔ اکرام کا گھر

اکرام :۔ ابا جان ہمارے اسکول کے تین چار لڑکوں نے اس اندھے فقیر کو میدان میں چھوڑ دیا۔ میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔

پروفیسر سلیم :۔ شاباش۔ بیٹا نیک بچوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بڑے ہو کر نیک بنوگے

(کھانا کھلا کر اکرام اُسے اس کے گھر پہنچا آیا۔) (ممتاز ظفر درجہ دوم عمر ۹ سال)

انجن کیسے بولتے ہیں؟

ایک دفعہ ایک پہلوان ایک بُڈھے آدمی سے لڑ رہا تھا۔ اِدھر سے ایک ہاتھی آیا۔ ہاتھی نے جب دیکھا کہ ایک پہلوان ایک بُڈھے آدمی سے لڑ رہا ہے تو اس نے پہلوان سے کہا "لڑنا ہو تو مجھ سے لڑ" جب پہلوان نے یہ سُنا تو اس کی جان نکلنے لگی۔ بھاگا دم دبا کر۔ سامنے ایک چنے کا کھیت تھا۔ پہلوان جھٹ پٹ چنے کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ ہاتھی دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ خیر پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا کہ جب اُترے تو پکڑوں گا۔ تھوڑی دیر بعد پہلوان کو بہت پسینہ آیا اور بہنے لگا۔ ہاتھی پسینے کی دھار کو پکڑ کر جھٹ پیڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ پہلوان پھر بھاگا۔ ہاتھی بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ سامنے ایک لوٹا رکھا تھا پہلوان اُس میں گھس کر ٹونٹی میں سے نکل گیا۔ ہاتھی نکل تو گیا لیکن بے چارے کی دُم اٹک گئی۔ لوٹا بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بڑا مزا آیا اس کی دُم ہلتی تھی۔ اُس کے ساتھ لوٹا بھی ہلتا تھا۔ چلتے چلتے دریا پر پہنچے۔ اتفاق سے وہاں ایک ہی کشتی تھی۔ پہلوان ملاح کے پاس پہنچا اور اس سے کہا "مجھے پار پہنچا دے۔ تجھے اچھی مزدوری دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ اس کنارے پر کشتی نہ لائیو" ملاح نے یہ شرط مان لی۔ ملاح نے پہلوان کو پار پہنچا دیا اور ہاتھی بے چارہ پھر رہ گیا۔ جہاں پہلوان تھا وہاں کچھ دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ اور چھوا چھو کی آواز آ رہی تھی۔ پہلوان بھاگا بھاگ وہاں گیا اور دھوبیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہربانی فرما کر چھوا چھو نہ کرو۔ کہیں وہ ہاتھی چھوا چھو پر چڑھ کر نہ آ جائے۔" دھوبیوں نے کپڑے دھونے بند کر دئے اب پہلوان ادھر سے اُدھر پھرنے لگا۔ آخر بڑے جوش میں آکر اس نے زور سے کہا "ٹلی لی لی جھر" ہاتھی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسی ٹلی لی لی جھر پر چڑھ کر آ گیا۔ پہلوان پھر بھاگا اور ریل کی ایک لائن پر پہنچا۔ وہاں ایک انجن کھڑا تھا۔ پہلوان اس میں سے ہو کر چمنی میں سے نکل کر بھاگ گیا۔ ہاتھی بھی گیا لیکن چمنی میں اٹک گیا۔ اس لئے رونے لگا اب جب انجن سیٹی دیتا ہے تو اصل میں وہ اس ہاتھی کے رونے کی آواز ہوتی ہے۔

مہیشور دیال درجہ دوم۔ عمر ۹ سال
(ماڈرن ہائی اسکول۔ نئی دہلی)

نئے نئے کھیل

الطاف علی صاحب [illegible]
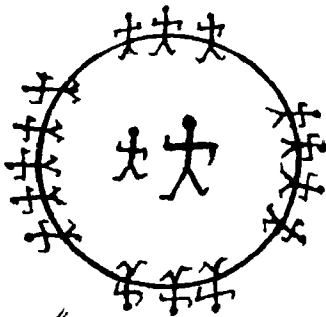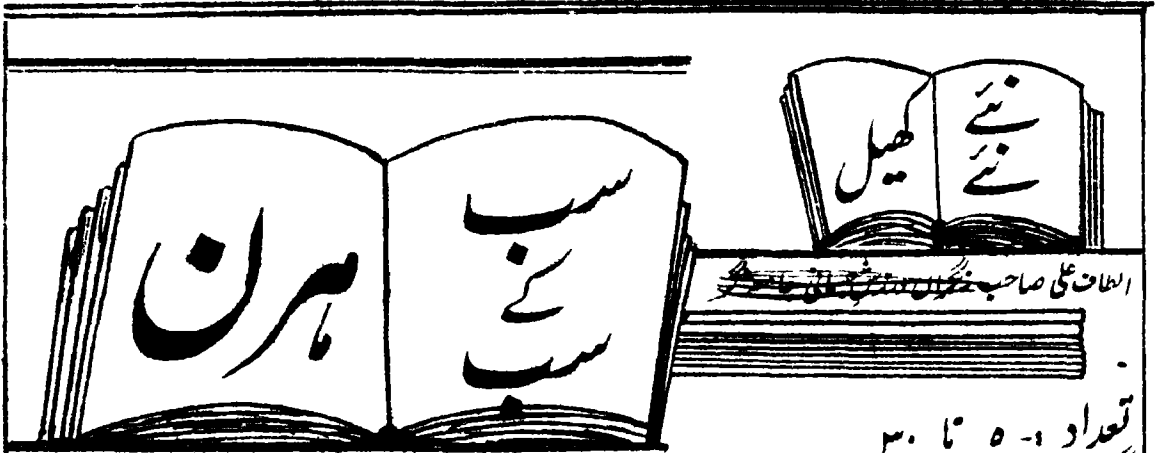
تعداد:- ۵ تا ۳۰

جگہ:- میدان، کمرہ یا صحن۔

طریقہ:- سب کھلاڑی دائرہ بناکر کھڑے ہو جائیں کھلانے والا پہلے یہ اعلان کرے کہ وہ ہر کھلاڑی کا نام کسی نہ کسی جانور پر رکھے گا۔ پھر وہ ہر کھلاڑی کے کان میں آہستہ سے ایک ہی جانور کا نام کہے۔ فرض کرو وہ جانور "ہرن" ہے۔ اس طرح ہر کھلاڑی کا نام ہرن ہوگا۔ مگر اپنی جگہ ہر کھلاڑی یہی خیال کرے گا کہ اس کا نام دوسرے سے جدا ہوگا۔ اس کے بعد کھلانے والا سب کھلاڑیوں کو ہدایت کرے کہ جب وہ کسی جانور کا نام لے تو وہ دوڑ کر دائرے کے بیچ میں رکھی ہوئی چیز کو پکڑے۔ اور ایک چیز دائرے کے بیچ میں رکھ دے۔ جب یہ ہو چکے تو کسی جانور کا نام پکارے۔ ظاہر ہے کہ اس نام پر کوئی کھلاڑی آگے نہ آئے گا۔ پھر کسی اور جانور کا نام پکارے۔ اس پر بھی کوئی کھلاڑی آگے نہیں آئے گا۔ تیسری بار "ہرن" کا نام لے۔ اس پر سب کے سب کھلاڑی دائرے کے بیچ میں رکھی ہوئی چیز پر ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ نظارا دیکھنے کے قابل ہوگا۔

احتیاط:- (۱) کوئی کھلاڑی اپنا نام دوسرے کو نہ بتائے۔

(۲) کھیل سے پہلے کسی کھلاڑی کو کھیل کے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔ ورنہ کھیل کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔

(۳) دائرے کے اندر ایسی چیز رکھی جائے جس کے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

دنیا میں سب سے چھوٹی چڑیا جزیرہ کیوبا میں پائی جاتی ہے۔ وہاں کی زبان میں اس چڑیا کو "پہارو موسکا" کہتے ہیں۔ اس نام کے معنی ہیں "مکھی چڑیا"۔ یہ چڑیا افریقہ کی مشہور چڑیا "ہمنگ برڈ" کے خاندان سے ہے۔ لیکن قد میں "ہمنگ برڈ" سے بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ یعنی کوئی ایک انچ کے برابر ہوتی ہے۔

اکثر ترکاریوں اور پھلوں کا تین چوتھائی حصہ پانی میں ہوتا ہے اور ان کی قدر و قیمت کا اصلی سبب وہ معدنی نمک ہوتا ہے جو اُن کے اندر پایا جاتا ہے یہ نمک خون کا صاف کرنے والا اور ہڈیوں کی نشو و نما کا باعث ہوتا ہے۔

لکڑی کی ایک مستطیل ڈبیہ تیار کر کے اُس کا آدھا ڈھکنا سُرخ رنگ کے شیشے کا بنائیے اور آدھا نیلے رنگ کے شیشے کا۔ پھر اس ڈبیہ کے اندر کیچوے بند کیجئے تو وہ سب کے سب اُس نصف حصے میں جمع ہو جائیں گے جس کے اوپر سُرخ رنگ کا شیشہ ہے۔ اسی طرح بعض اور کیڑے بھی نیلے رنگ سے نفرت رکھتے ہیں۔

پیاری بجیو اور بچو، خوش رہو اور تندرست۔ بھائی دلی میں تو گرمی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ دوسری جگھوں پر بھی یہی حال ہوگا۔ اب جون تک اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ بعض بعض جگھوں پر سالانہ امتحان بھی شروع ہو گئے ہیں اور کہیں امتحان کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہم ان سب پیامیوں کی کامیابی کے لئے دل سے دعا کرتے ہیں۔

یورپ کی لڑائی میں ابھی تک برطانیہ اور اس کے ساتھی یونان کا پلہ بھاری ہے۔ افریقہ میں انگریزی فوجیں اٹلی والوں کو شکست پر شکست دے رہی ہیں۔ ادھر یونانی فوجیں اٹلی کی فوج کو ہر جگہ ہرا رہی ہیں۔ سنا ہے یونان سے لڑنے والی فوج کی کمان مسولینی نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ جرمنی یونان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے اٹلی کی فوجیں یونانیوں کو البانیہ سے نکال دیں تاکہ کچھ تو اٹلی کی عزت باقی رہ جائے۔ ادھر بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں کچھ عجیب کش مکش میں ہیں۔ بلغاریہ پر تو یوں سمجھو کہ جرمنی کا قبضہ ہوگیا۔ یوگوسلاویہ سے بھی جرمنی کا کچھ معاہدہ ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھوٹی سی ریاست بھی جرمنی کی طاقت کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگئی۔ ادھر ترکی و جرمنی میں بات چیت جاری ہے مگر راز میں ہے۔ دیکھئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ بظاہر تو ترکوں کا میلان انگریزوں کی طرف ہے

امریکہ نے آخر برطانیہ کی امداد کا بل پاس کر دیا۔ اس سے اگر ایک طرف انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا ہے تو دوسری طرف جرمنی میں بہت پریشانی پھیل گئی ہے۔ امریکہ، اربوں ڈالر انگریزوں کی امداد میں خرچ کرے گا۔

ہم نے پچھلے پرچے میں پیامیوں سے درخواست کی تھی کہ وہ معمّا نمبر ۱۶ کے بارے میں اپنی رائے لکھیں بہت سے پیامیوں نے اس کی بس تعریف ہی تعریف لکھ بھیجی۔ ہم چاہتے ہیں کہ پیامی یہ بتائیں کہ اس معمّے میں کیا خوبی یا برائی ہے کس چیز کے گھٹانے یا بڑھانے سے معمّا زیادہ آسان اور دلچسپ ہو سکتا ہے۔ بہر حال دو بچوں کی رایوں کا

خلاصہ یہاں لکھا جاتا ہے۔ عزیزی محمد اسماعیل نئی دہلی سے لکھتے ہیں "........ اس کے اِشارے ہی سے بڑے صداقت آ رہی ہے۔ اور کامیابی فتح کا جھنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے پیامیوں کو دکھلا رہی ہے .... اس کے ریشمی پردوں میں سے حمدِ خدا اور یادگار حالی کا عکس بھی جگمگاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ علاوہ ازیں محبت وہمدردی نصیحت ودلچسپی کے سبق اُس کے "اشارات" میں موجود ہیں جنھیں معلوم کرنے کے لئے ضرور تھوڑی سی کوشش کافی ہے ...."

عزیزی میر صادق علی خاں حیدرآباد دکن سے لکھتے ہیں "بعض حضرات کا خیال ہے کہ معما حل کرنا وقت اور پیسوں کا برباد کرنا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ بالکل غلط ہے .... معما حل کرنا اپنے معلومات میں اضافہ کرنا ہے، معما جتنا مشکل ہو لڑکوں کے لئے بہتر اور مفید ہے ...." معما نمبر ۱۷ کے بارے میں بھی پیامی اپنی رائے لکھ کر بھیجیں مگر خوب سوچ سمجھ کر۔

معما نمبر ۱۶ کا صحیح حل صرف ایک آیا اور وہ یہ ہے

(۱) رحیم الدین دہلی۔　　انعام .... ۶؎

ایک غلطی والے حل:۔　　فی کس ۳؎

محمد اسماعیل خاں، دہلی۔ محمد احمد عظیم، دہلی۔ ایم نور الرحمٰن، بھاگل پور۔ نور احمد، دہلی۔ سید مصور حسن۔ دہلی محمد نثار احمد پٹنہ۔ مشتاق احمد، پٹنہ۔ محمد فصیح احمد، پٹنہ۔ سید عطاء الرحمٰن بہاری۔ دہلی۔ محمد ظفر الہدیٰ، دہلی۔ سید ماجد علی دہلی۔ عبد الوحید، دہلی۔ خلیل الرحمٰن، بارہ بنکی۔ اقبال مرزا دہلی۔ وارث رشید، دہلی۔ (جمیل اختر۔ دہلی)

معما جانچنے والے صاحب نے اس سلسلے میں ایک نہایت ضروری بات ہمیں لکھ کر بھیجی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "کوپنیں دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اکثر حل کرنے والے بچے الفاظ تو معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کو مختلف کوپنوں میں ترتیب سے لکھنا نہیں جانتے اگر اس بات کا خیال رکھا جائے تو زیادہ حل کرنے والوں کو انعام ملے۔ جن کوپنوں پر ٹکٹ نہیں ہوتے یا تصدیق نہیں ہوتی وہ جانچ میں شامل نہیں کئے جاتے۔ اس مرتبہ یہ کوپنیں بغیر ٹکٹ یا بغیر تصدیق آئی ہیں۔

بغیر ٹکٹ:۔ محمد سعید اختر، پورپنہ۔ افضال الحق، دہلی۔ انوار العمر، دہلی۔ سید اشفاق حیدر، میرٹھ۔

بغیر تصدیق:۔ عزیز اختر، جھانسی۔ سعیدہ ادھمی، بستی۔

ہمیں اُمید ہے کہ عزیز پیامی معما جانچنے والے صاحب کی بات کو غور سے سُنیں گے اور آئندہ اس پر عمل کی کوشش کریں گے ہاں ایک بات اور کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ چار کوپنوں کی فیس ۳؎ ہے لیکن دو کوپنوں کے ساتھ ۱؎ کے نہیں بلکہ دو آنے کے ٹکٹ بھیجنے پڑیں گے علاوہ اس کے کسی ریاست کا ٹکٹ قبول نہ کیا جائے گا۔ اچھا اب رخصت۔ تمھارا۔ محمد حسین حسان

معمّا نمبر ۱۷

پہلا انعام ...... ۶ روپے
دوسرا انعام ...... ۱۲ ؍ روپے

مشقی کوپن

اشارات

دائیں سے بائیں

۱۔ بنیادی قومی تعلیم کی دوسری کانفرنس ۱۱ اپریل سے ..... نگر میں ہو رہی ہے

۴۔ اگر ہندو کی (ہ) اور مسلمان کی (م) مل جائے تو ... آزاد ہو جائیں۔

۵۔ معمولی ... کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے

۶۔ مناسب مشق سے ہر کام میں ..... پیدا ہو سکتی ہے۔

۹۔ بُری ... ڈالنا تو آسان ہے لیکن چھوڑنا ذرا مشکل ہے۔

۱۰۔ ۱۲ مارچ کی رات کو ڈاکٹر ... شاہ سلیمانؒ دہلی میں انتقال ہوا۔

۱۱۔ بے وقوف آدمی کو کہتے ہیں۔ (الٹا)

۱۲۔ صرف ... دیکھ کر بھی مجرم پہچانا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ بمعنی مندر (بے ترتیب)

۱۵۔ بچوں کا خلاف عادت و خلاف معمول زیادہ ... والدین کی فکر کا باعث ہو جایا کرتا ہے۔

۱۸۔ سُنا جاتا ہے کہ نباسپتی کے استعمال کی وجہ سے ... کے مریض زیادہ ہونے لگے ہیں۔

۱۹۔ گرمیوں میں بعض لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں۔

اوپر سے نیچے

۱۔ دہلی کی ... مسجد شاہ جہاں نے بنوائی تھی۔

۲۔ انتہائی ... کی زندگی رفتہ رفتہ آدمی کو گناہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔

۳۔ ... جان دار موت کا مزا چکھتا ہے۔

۴۔ کھانا کھاتے ہی پڑھنا آنکھوں کے لئے ... ہے

۷۔ کھلاڑی وہی ہے جو ... میں ہمت نہ ہارے۔

۸۔ پرانے طرز کے مکانوں میں عام طور پر ... ضرور ہوتے ہیں۔ (بے ترتیب)

۱۰۔ محنتی طلبا پڑھنے کے لئے ایسے مقام کی تلاش میں رہتے ہیں۔

۱۲۔ چہرہ۔

۱۴۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب ... چلے گا بنجارہ۔

۱۶۔ ہم تم اور ....

۱۷۔ ... کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو (اقبال)

(۱) معما بجائے پندرہ کے اٹھارہ اپریل تک بھیج سکتے ہو۔
(۲) ایک ہی لفافے میں کئی حل بھیجے جا سکتے ہیں۔
(۳) معما نمبر ۱۷ کے ہر صحیح حل بھیجنے والے کو ایک خاص انعام بھی دیا جائے گا۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اُستاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔
(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ ۔ آٹھ حلوں کی ۶ ہے۔[لہ]
(۴) دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی
(۵) تمام حل ۱۸ اپریل ۱۹۴۱ء تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانا چاہئیں۔
(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا
(۷) پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔
(۸) کوپن کے چاروں طرف۔ جو نقطے والی لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔
(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔
(۱۰) صرف پیامیوں کے لیے تصدیق ضروری نہیں ہے۔
(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہئے۔
(۱۲) معما حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔
(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔
(۱۴) دال اور واؤ کا فرق نمایاں ہو۔ (ڈ ۔ وٗ)
(۱۵) چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ۔ ے)
(۱۶) جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو۔ وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے۔
(۱۷) املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔
(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں۔
(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط ہو۔
(۲۰) سب ایڈیٹر پیام تعلیم ۔ مکتبہ جامعہ
قرول باغ ۔ نئی دہلی۔

معما نمبر ۱۶ کا صحیح حل

ل	ح	■	ی	س	ج	ل	د
ط	ق	■	ر	و	ب	ج	م
ف	■	م	■	د	ل	■	ا
■	ل	غ	ج	■	ل	س	غ
ک	ا	ر	و	خ	■	ح	■
ہ	■	ب	ی	ر	ق	■	س
ن	س	■	ا	ا	■	ل	ر
ا	و	ا	ل	ب	■	ٹ	ہ

لہ چار حلوں کی رعایتی فیس داخلہ ۳ ہے لیکن دو کوپنیں بھیجنے میں ا ر نہیں۔ ۲ ر کا ٹکٹ لگانا پڑے گا۔ کسی ریاست کا ٹکٹ قبول نہیں کیا جائے گا۔

معمانمبر ۱۷
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معمانمبر ۱۷
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معمانمبر ۱۷
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معمانمبر ۱۷
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

معما نمبر ۱۷ کوپن نمبر

۴ م	۳	■	ہ	۲ ع	م	ا	۱ ج
ض	ر	۵	■		■	■	
	■	■	ت	ر	۸	۷ ہ	۶
■		۱۰ س	■	ت	د		۹ ع
■	ل	ک	۱۲	■		۱۱ ر	■
■		د	ش	۱۴	۱۳ ا	■	■
۱۷ ج	■		■	ا	ن	۱۶ و	۱۵
	۱۹ خ	■		۱۸ و	■		■

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۷ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۷ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

معما نمبر ۱۷ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

تصدیق ....

ٹکٹ

پکستان میں ایک فوج — مرسلہ علی عباس لکھنؤ

ایک خوبصورت سڑک (مرسلہ عبدالوحید دہلوی)

محمد شاہد (عمر ۹ سال) کان پور

Regd. L. No. 1961

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

بمبئی میونسپلٹی کا دفتر
(موہن ڈرائو)

راجہ بھائی کلاک ٹاور
(موہن ڈرائو)

وکٹوریہ ٹرمینس
(موہن ڈرائو)

سپاہی دستی بم پھینک رہا ہے

پیامِ تعلیم

ایڈیٹر

محمد حسین حسّان

جلد ۲۴ نمبر ۵

قیمت سالانہ عہ
فی پرچہ ۳ر

فہرست مضامین

مئی سنہ ۴۱ء

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی ۔ محبوب المطابع پریس دہلی

FIROZE .۔ ۴۱.

دو تین مہینے سے ہم نے بچّوں کی نظموں کے علاوہ بچّوں کی نثر کے لئے بھی دو صفحے مخصوص کر دیے ہیں بہت سے بچّوں کو شکایت تھی کہ اُن کی نظمیں اور مضمون دیر میں شائع ہوتی ہیں۔

اِس مرتبہ ہم نے نظموں کے صفحوں کی لکھائی باریک کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے پہلے سے دوگنی نظمیں اِس پرچے میں آگئی ہیں۔ لیکن نثر کے مضمونوں کی مشکل اب بھی رہ جاتی ہے۔ اِس کے لئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ کچھ صفحے بڑھا دئے جائیں۔ کم سے کم ایک صفحہ۔

بعض بچّوں نے ہمیں لکھا ہے کہ اب پیام تعلیم میں ٹکٹوں کی خبریں نہیں چھپتیں تو بھئی بات یہ ہے کہ نئے ٹکٹ تو زیادہ تر یورپ ہی میں چھپتے تھے اور وہ آج کل لڑائی کی پریشانی میں مبتلا ہے۔ اِس لئے یہ خبریں تو اب لڑائی کے بعد ہی چھپ سکیں گی۔

کچھ دنوں سے خط کتابت کا صفحہ بھی پیام تعلیم میں نہیں ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچّوں نے اِس عرصے میں ایسے خط ہمیں بہت کم بھیجے ہیں ایک اور شکایت ہے اور وہ یہ کہ اکثر بچے ہمیں بہت لمبے لمبے خط لکھتے ہیں اگر اُن کے یہ خط شائع کر دئے جائیں تو خط کتابت کا پُورا صفحہ بھر جائے۔

پیامی اپنے خط پیام تعلیم میں چھپوانا چاہتے ہیں تو ہر مہینے کی زیادہ سے زیادہ ۵ تاریخ تک ہمارے پاس بھیج دیا کریں۔ یہ خط جتنے مختصر ہوں گے اُتنے ہی جلد چھپ سکیں گے۔ لمبے خط تو شاید چھپ ہی نہ سکیں۔

پیامی ہمیں خط لکھتے وقت اپنا پُورا پتہ صاف اور خوش خط لکھا کریں۔ صرف خریداری نمبر لکھنا کافی نہیں ہے۔ ہاں منیجر صاحب کے خط میں نمبر خریداری کافی ہے۔

پیامِ تعلیم کے خاص شاعر جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کے صاحب زادے عزیزی محمد صالح سلمہٗ تعلیمی مرکز جامعہ میں پڑھتے ہیں۔ اس سال اُنھوں نے دُوسرے درجے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اِس خوشی میں عزیزی صالح نے اپنے درجے کے ساتھیوں اور اُستادوں کی دعوت بھی کی۔ صالح میاں کے نانا جناب ڈاکٹر سعید صاحب۔ بریلوی نے اِس دعوت میں چند اچھی اچھی رباعیاں پڑھیں یہ رُباعیاں اُنھوں نے اپنی نوازش سے پیامِ تعلیم کو مرحمت فرمادیں۔ اِنھیں ہم نیچے نقل کرتے ہیں۔　　(ایڈیٹر)

دُنیا ہے کتاب اِس کو پڑھتے ہی رہو　　زینہ ہے یہ علم اِس پہ چڑھتے ہی رہو
پیچھے نہیں ہٹتا کبھی مردوں کا قدم　　اب آگے بڑھے تو آگے بڑھتے ہی رہو

دریا کی جو گہرائی سے ڈر جاتے ہیں　　بدبخت ہیں عُمر بھر وہ پچھتاتے ہیں
بکھرے ہوئے تہ میں ہیں کروروں موتی　　غوطہ جو لگاتے ہیں وہی پاتے ہیں

ماں باپ کی آنکھوں کا ہے تارا صالح　　اُستادوں کو بھی ہے دِل سے پیارا صالح
چمکے اُفقِ قوم پہ سُورج بن کر　　ہم فخر سے یُوں کہیں ہمارا صالح

شام کی سیر

رقی۔ م طاہر صدیقی
حیدرآبادی

شام ہوئی اب سیر کو جائیں
باغ میں جاکر جی بہلائیں
غنچۂ دل کو اپنے کھلائیں سیرِ چمن کا لطف اٹھائیں
کھیلیں کودیں شور مچائیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

رنگ چمن کا کتنا پیارا دل کش ہے ہر ایک نظارا
ندی کنارے ٹھنڈی ہوائیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

چھائے بادل پیلے پیلے گائیں چڑیاں گیت رسیلے
ہم بھی مل کر نغمے گائیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

مینہ کی ہلکی ہلکی پھواریں لائیں چمن میں تازہ بہاریں
آؤ جھولیں پینگ بڑھائیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

ہنس ہنس کر کلیوں کا کھلنا ڈالیوں کا بھی جھوم کے ہلنا
دل کو یہ بھائیں پیاری فضائیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

اچھی صحت گر ہم چاہیں کھائیں چمن کی تازہ ہوائیں
مانیں رقی کی نیک صلاحیں
شام ہوئی اب سیر کو جائیں

اڈیپس

ساجدہ حلیمی - پٹنہ

یہ آج سے کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یونان کے شہر تھیبس THEBES میں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ ایک دن دربار کے ایک نجومی نے یہ پیشن گوئی کی کہ راجہ اپنے بیٹے ہی کے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔ راجہ کو یہ سُن کر بڑا دُکھ ہوا۔ سچ پوچھو تو یہ دُکھ کی بات بھی تھی۔

تھوڑے ہی دِنوں کے بعد سچ مُچ راجہ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا بڑا خوب صورت اور تندرست تھا۔ لیکن راجہ نجومی کی پیشین گوئی بھولا نہ تھا۔ اُس نے اپنے ایک وفادار نوکر کو حکم دیا کہ بچے کو دُور کسی جنگل میں چھوڑ آئے۔ مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟ ایک لکڑ ہارے نے اس جنگل میں ایک دودھ پیتے بچے کو دیکھا۔ پہلے تو اُسے بڑا اچنبھا ہوا، لیکن چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے بہت خوش ہوا۔ خوشی خوشی اُسے اپنے وطن کورنتھ (CORINTH) لے گیا۔ یہ لڑکا وہیں پلا اور پل کر جوان ہوا۔ یہ بڑا بہادر طاقت ور اور تلوار کا دھنی تھا۔ لکڑ ہارے نے اس کا نام اڈیپس رکھا۔

اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ ایک آدمی، جسے بھی چاہتا لڑنے کی دعوت دے سکتا

تھا۔ اڈیپس تو بڑا بہادر اور من چلا نوجوان تھا۔ اُس کے دل میں خود راجہ سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ایک دن تھیبس جا کر اُس نے راجہ کو لڑنے کی دعوت دی۔ اِس لڑائی میں یہ جیت بھی گیا۔ ایک دو روز کے بعد سُنا گیا کہ راجہ مرگیا۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ راجہ خود اس کا باپ تھا۔ نجومی کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

تھیبس کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تھیبس کا راج اب اُسے دیا جائے گا جو اسفنکس (SPHINX) کے سوال کا جواب دے دے۔

اسفنکس ایک عجیب مخلوق تھی۔ اِس کا سر تو عورتوں کا سا تھا لیکن جسم شیر کی طرح تھا۔ یہ تھیبس کے پاس ہی ایک پہاڑی پر رہتی تھی۔ یہ تھیبس کے لوگوں پر بڑا ظلم کرتی تھی۔ پہاڑی کی طرف سے جو شخص بھی گذرتا تھا اُس سے وہ ایک سوال کرتی۔ لیکن کوئی بھی جواب نہ دے پاتا۔ اور اس لئے وہ اِسے پہاڑی سے گرا کر ہلاک کر دیتی۔ اڈیپس نڈر اور دلیر تو تھا ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ مجھے تھیبس کا راج جیتنا ہے۔ وہ بڑی دلیری سے اسفنکس کے پاس پہنچا۔ اسفنکس نے کہنا شروع کیا "ایک عجیب مخلوق ہے جس کی مثال دُنیا میں نہیں ہے۔ پہلے وہ چار پیروں سے چلتی ہے۔ پھر دو پیروں سے اور پھر تین پیروں سے۔ مجھے تم اِس عجیب مخلوق کا نام بتاؤ؟ اڈیپس بڑا ذہین تھا۔ فوراً بولا "وہ عجیب مخلوق آدمی ہے"۔ اسفنکس نے کہا کہ ثابت کرو"۔ اڈیپس نے ثابت کیا کہ آدمی بچپن میں دونوں پیر اور دونوں ہاتھوں سے چلتا ہے جسے تم نے چار پیروں سے چلنا کہا ہے۔ پھر آدمی

جوان ہو جاتا ہے تو ہاتھوں کو پیر نہیں بناتا۔ صرف پیروں ہی سے چلتا ہے۔ اور جب یہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو تین پیروں سے چلتا ہے اور یہ اس طرح کہ دو پیروں کے علاوہ ایک لاٹھی بھی استعمال کرتا ہے، جو ٹانگ ہی کا کام دیتی ہے۔

اسفنکس کو اپنے سوال کا جواب مِل گیا۔ اُس نے سوچا کہ اب دُنیا میں میرا کام ختم ہو گیا تو جینے سے کیا فائدہ؟ اُس نے اپنے کو پہاڑوں سے گرا کر ہلاک کر دیا۔

تھیبس کی رعایا بہت خوش ہوئی۔ یہ خوشی اور بھی بڑھ گئی جب اڈیپس جیسے بہادر، نڈر، قوی اور اولوالعزم جوان کو تاج پہنا کر لوگوں نے راجہ مان لیا۔

محمد رسول اللہ:۔

از جناب مقبول احمد صاحب سیوہاروی۔ یہ کتاب مقبول احمد صاحب نے چھوٹے بچوں کے لئے نئے تعلیمی اصولوں کے مطابق بہت اچھے انداز میں لکھی ہے۔ زبان اتنی آسان اور انداز بیان ایسا انوکھا اور دلچسپ ہے کہ بچے اسے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور دلچسپی ہی دلچسپی میں انھیں اپنے پیارے رسول کی مبارک زندگی کی بہت سی مفید باتیں معلوم ہو جائیں گی حالات کی ترتیب، لکھائی، چھپائی، کاغذ سب چیزیں بہت اچھی۔ بلاک کی تصویروں کے بارہ صفحے۔ آں حضرت کے زمانے کا عرب کا ایک اچھا سا نقشہ اس کے علاوہ۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر چھپی ہے۔ ۱۶۰ صفحے ہیں۔ جلد بھی بندھی ہے قیمت عہ رہے۔ لیکن اسکولوں کے ساتھ خاص رعایت کی جائے گی۔ ملنے کا پتہ

حاجی محمد اسمٰعیل، مقبول احمد، ۵ؕ موتی سیل اسٹریٹ، کلکتہ

آنکھ کے دھوکے

برکت علی صاحب فراق
(دہلی، بی، اے جامعہ)

میاں اَفن کو سوالات کرنے کا مرض ہے۔ کبھی کبھی تو میں گھبرا جاتا ہوں اور بڑی مشکل سے جان چھڑاتا ہوں۔ ایک دن شام کے وقت میں انھیں ساتھ لے کر سیر کے لئے نکلا۔ چلتے چلتے ہم ریل کی پٹری کے پاس پہنچ گئے۔ اَفن میاں نے ریل کی پٹری کو بہت غور سے دیکھا اور کہنے لگے "چچا میاں یہ پٹریاں یہاں تو اتنی چوڑی ہیں۔ مگر وہ دیکھئے آگے جا کر جیسے مل گئی ہیں پھر ریل کیسے چلتی ہوگی؟" میں نے ہنس کر کہا "واہ بھئی واہ یہ سوال تم نے خوب کیا! اچھا ایک بات بتاؤ جو کچھ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو وہ سب صحیح ہوتا ہے؟" اَفن میاں چمک کر بولے "جی اور کیا آنکھوں دیکھی بات بھی غلط ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا اچھا تم اس جگہ کوئی نشان مقرر کر دو جہاں ریل کی پٹریاں ملی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور یہاں پٹریوں کی چوڑائی ناپ لو" کہنے لگے جی ہاں میں نے نشان مقرر کر لیا وہ جو بجلی کا کھمبا سا نظر آ رہا ہے نا؟ بس وہ۔ اَفن میاں کو اپنی بات کا یقین تھا دوڑے دوڑے کھمبے کے نشان تک پہنچ گئے۔ اب وہاں بھونچکے اور پریشان کھڑے ہیں۔ وہیں سے چیخ کر بولے "ارے چچا میاں جانے کیا بات ہے یہاں تو اتنی ہی چوڑائی ہے جتنی وہاں تھی" میں نے ہنس کر کہا "آپ کو میری بات پر یقین نہ آتا تھا اب آپ پھر آگے کی طرف دور تک دیکھئے۔ کیوں؟ آگے جا کر پھر مل گئی ہیں نا پٹریاں! جناب یہ پٹریاں نہیں ملی ہیں۔ آپ کی آنکھیں آپ کو دھوکا دے رہی ہیں" اَفن میاں کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولے "تو یہ آنکھیں دھوکا کیوں دے رہی ہیں اللہ، بتا دیجئے چچا میاں" میں نے کہا "ابھی نہیں گھر چل کر۔ پہلے تو آپ کو ایسی اور بہت سی چیزیں بتاؤں گا جنھیں دیکھ کر آپ کی نظر دھوکا کھائے گی اور عقل چکرائے گی۔"

اب اَفن میاں کی بے تابی دیکھنے کے قابل تھی مجھ سے دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر تھی۔ اَفن میاں پیچھے پڑ گئے کہ جب تک کھانا تیار ہو آپ وہ بات بتا دیجئے۔ میں نے ایک کاغذ پر دو گول نقطے بنا دئے۔ اَفن میاں سے کہا

"اچھا اپنی داہنی آنکھ موند لیجیے اور بائیں آنکھ سے ۱ والا نقطہ دیکھئے تھوڑی دیر میں آپ کو ایک ہی نقطہ نظر آئے گا۔" میں آہستہ آہستہ کاغذ

ا ب

کو اُن کے پاس لے گیا۔ جب کاغذ میں اور اُن کی آنکھوں میں کوئی ۱۰ انچ کا فاصلہ رہ گیا تو چلا کر کہنے لگے "ارے چچا دایاں نقطہ تو غائب ہو گیا۔ جانے کیا بات ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے کہا "بات وات کچھ نہیں ہے آپ کی آنکھیں آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔ اچھا اور دیکھئے"، کتاب میں دو مربعے (تصویر نمبر ۲) بنے ہوئے تھے۔ ایک کالی زمین پر سفید اور ایک سفید زمین پر کالا۔ کالا مربع سفید سے تھوڑا سا بڑا

۲

تھا مگر سفید ہی بڑا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا "اچھا بتائیے کہ کون سا مربع بڑا ہے؟" افن میاں بے ساختہ بولے "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے سفید مربع بڑا ہے" میں نے پیمانہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں کو ناپ کر ان کی حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے کہا "ٹھہرئیے ابھی اور تماشا دکھاتا ہوں۔" میں نے اوپر سے نیچے ایک موٹی لکیر کھینچی اور اُس لکیر پر کوئی ۳۰ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے ایک پتلی سی لکیر موٹی لکیر کے دونوں طرف کھینچ دی۔ اوپر کی طرف اس پتلی لکیر سے ذرا فاصلے پر ایک لکیر اور کھینچ دی اور افن میاں سے کہا "بتائیے (ا، ب) ایک سیدھ میں ہے یا (ا، ج)" (تصویر نمبر ۳) کہنے لگے (ا، ج) میں نے کہا

۳

"جی نہیں جناب۔ (ا، ب) ذرا ناپ کر دیکھئے۔ اچھا اور لیجیے۔

اب میں نے دو متوازی لکیریں دو جگہ کھینچ دیں اور ان دونوں کے دونوں طرف مچھلی کے کانٹوں جیسی چھوٹی چھوٹی لکیریں بنا دیں اور افن میاں سے کہا "دیکھئے یہ دونوں متوازی لکیریں

ہیں .... (شکل نمبر ۳) افن میاں بات کاٹ کر بولے" واہ چچا میاں۔ متوازی لکیروں میں تو فاصلہ ہر جگہ برابر ہوتا ہے اور یہاں شکل (ا) میں بیچ میں دونوں لکیریں کھنچی ہوئی ہیں اور (ب) میں دونوں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا "اچھا ذرا "سٹ اسکوائر" سے ناپ کر دیکھئے۔ ہیں دونوں برابر؟ اچھا اب ان تصویروں کو دیکھئے۔ ٹیڑھی نظر آرہی ہیں مگر ہیں سب متوازی۔ (شکل نمبر ۵)"
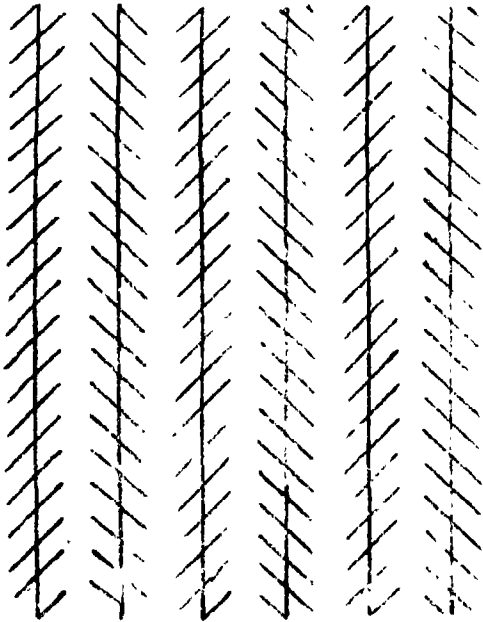
سٹ اسکوائر تو آپ کے پاس ہے ناپ کے دیکھ لیجئے۔ افن میاں کی حیرانی اور اچنبھا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے انھیں زیادہ ستانا اچھا نہیں سمجھا۔ اور اصلی بات بتا دی۔ میں نے کہا "دیکھو یہ سب تماشا تمھاری آنکھ کی پتلی کے سیاہ دانے کی بدولت ہے۔ یہ سیاہ دانہ اندھا ہوتا ہے۔ اس کی سیدھ میں جو چیز آجاتی ہے وہ نظر نہیں آتی۔ دونوں نقطوں میں جو ایک غایب ہوا تھا اور یہ سیدھی اور متوازی لکیریں جو تمھیں ٹیڑھی نظر آئیں سب اسی دانے کی بدولت۔"

(۴)

افن میاں اب قائل ہو گئے تھے میں نے

(۵)

انھیں دو تین چیزیں اور دکھائیں۔ انھیں دیکھ کر انھیں

تعجب تو ہوا مگر میری بات مان گئے - آؤ تمھیں بھی دو ایک چیزیں دکھائیں مگر افن میاں کی طرح تم بھی دھوکا نہ کھانا - دیکھو یہ نیچے کا مربع صحیح ہے یا غلط - واہ بھئی تم بھی افن میاں کی طرح دھوکا کھا گئے
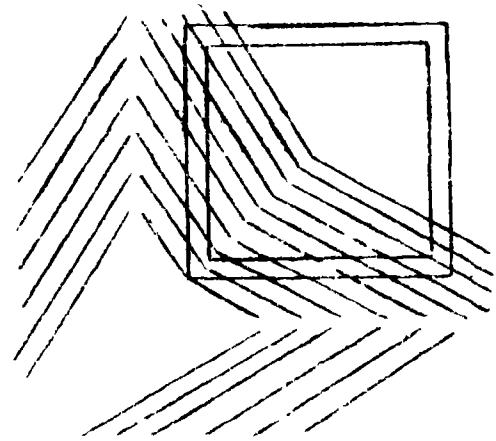
(۶)

یہ مربع بالکل ٹھیک ہے - کیونکہ نیچے کا بایاں کونا جھکا ہوا ہے - ذرا اس دائرے کو دیکھو - ارے یہ بھی غلط! نہیں بھائی ذرا اس پرکار سے ناپ کے دیکھو

اچھا اب نیچے کی شکل دیکھو جو مثلث ہے - تمھیں یہ ضلعے سیدھے نظر نہ آتے ہوں گے بلکہ جہاں جہاں یہ دائرے کی

لکیرے چھوٹے ہیں - وہاں ٹیڑھے معلوم ہوں گے مگر ہیں یہ بالکل سیدھے یقین نہ آئے تو ناپ کر دیکھ لو -

پہیلیاں[۵]

(۱) اندر تھا تو بولتا تھا - باہر ہوا تو بولتا نہیں -

(۲) آدھا تو کعبہ میں رہتا ، اور آدھا میخانہ میں - سارا بشر کی بستی میں جو آتا ہے آدھا آنہ میں

(۳) چھم چھم کرکے شور مچائے - سوتوں کو وہ آن جگائے - ایک پل میں نشان دکھائے - روتوں کو وہ آن ہنسائے

(۴) سیدھی ہے بہشت میں اور الٹی تیرے پاس - سیدھی تجھ کو جب ملے جب تو ہو خدا شناس

(۵) ایک ڈبے میں بتیس دانے - بوجھنے والے بڑے سیانے -

(۶) گھر گھر تالیاں بجیں -

(عقیلہ بانو)

[۵] جواب :- (۱) ناریل (۲) جم اور جام (حجام) (۳) بارش (۴) حور - روح (۵) دانت (۶) روٹیاں

اپنے عزیز پیامیوں کے لئے ہم جو کہانی لکھ رہے ہیں یہ چھاما کی بہت سی کہانیوں سے میں سے ایک ہے۔ اگر تمھیں یہ پسند آئی تو سب کہانیاں ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں چھاپ دیں گے۔

چھاما کا اصلی نام سلمہ ہے۔ پیار میں لوگ اسے چھاما چھاما کہتے ہیں۔ یہ لڑکی بھولی بھالی اور بہت پیاری پیاری ہے۔ اس کے ابا اماں چاہتے ہیں کہ سلمہ بہت اچھی لڑکی بن جائے۔ وہ اُسے طرح طرح کی کہانیاں سُناتے ہیں۔ چھاما اچھی بات کو بہت جلد سمجھ جاتی ہے۔ اور اس پر عمل بھی کرتی ہے اچھا اب نیچے ہم وہ کہانی لکھتے ہیں جو چھاما نے اپنی ماں کو سُنائی۔

چھاما:۔ "امی"

ماں:۔ "کیوں؟"

چھاما:۔ "امی یہ شاعر بھی بڑے پاگل ہوتے ہیں"

ماں:۔ "کیوں، کیا ہوا۔ شاعر تو بڑے اچھے ہوتے ہیں"

چھاما:۔ "نہیں امی۔ پاگل ہوتے ہیں۔ نرے بدھو"

ماں:۔ "بیٹی خیر تو ہے۔ تم بے چارے شاعر پر کیوں اس قدر خفا ہو۔ کچھ بات تو بتاؤ"

چھاما:۔ "میں نے آج ایک اور کہانی پڑھی ہے۔ اس میں ایک شاعر کا قصہ ہے۔ بڑا پاگل تھا امی"

چھاما کی ماں کچھ سمجھ نہ سکیں۔ کہنے لگیں "اچھا وہ کہانی" چھاما کہنے لگی:۔ "جہاں ہمارے نبی پیدا ہوئے تھے کیا نام ہے اُس ملک کا امی؟"

ماں:۔ "عرب۔ عرب میں پیدا ہوئے تھے ہمارے رسولؐ"

چھاما:۔ ہاں ہاں عرب۔ تو عرب میں ایک بادشاہ تھا۔ بڑا پاپی، مطلبی، ظالم، مسلمان نہیں امی کافر تھا کافر۔ بتوں کو پوجتا تھا۔ اس کا ظلم تو سُنو امی۔ میرے اللہ۔ سال میں اُس نے ایک دن مقرر کیا تھا۔ اُس دن جسے وہ سب سے پہلے دیکھ لیتا۔ اُسے پکڑوا کر سب لوگوں کے سامنے پھانسی پر چڑھا دیتا تھا"

اس کے دربار میں ایک شاعر تھا۔ وہ

اُسے بہت مانتا تھا۔ مگر شاعر دل ہی دل میں بادشاہ کو کوستا تھا۔ وہ لوگوں پر ظلم ہوتے دیکھتا تو اسے بہت تکلیف ہوتی۔ جب اس سے یہ ظلم نہ دیکھا گیا تو اُس نے بادشاہ کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ پھرتے پھراتے وہ ایک دوسرے ملک میں پہنچا۔ وہاں کا بادشاہ بہت نیک تھا۔ شاعر اُس کے دربار میں چلا گیا۔ نیک بادشاہ نے بہت عزّت کے ساتھ اپنے دربار میں رکھا۔

کچھ عرصے کے بعد دونوں بادشاہوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ نیک بادشاہ نے شاعر سے کہا "تم اس پاجی بادشاہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ صُلح کر لے کیوں ناحق لڑائی پر تُلا ہوا ہے۔ اُس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ بے چارے سپاہیوں کا خون ہو گا۔"

شاعر ڈرتا تو تھا ہی، پہلے جانے سے انکار کیا۔ مگر جب بادشاہ نے بہت کہا تو تیّار ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا "دیکھو جلد آنا۔ میں تمھاری راہ دیکھوں گا۔"

چلا چل، شاعر جب ظالم بادشاہ کے شہر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ سیدھا اپنے گھر آیا۔ کئی دنوں کا تھکا ماندہ تھا۔ پہلے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے کھانا کھایا۔ اپنے بچّوں سے ملا پیار کیا اور سو گیا اگلے دن صبح ہی صُبح اُٹھا۔ ہاتھ مُنہ دھویا اور بادشاہ سے ملنے پہنچ گیا۔ شاعر اُس کے انتظار میں محل کے باہر کھڑا تھا۔ بادشاہ باہر نکلا۔ شاعر نے اُسے سلام کیا۔ مگر اُس نے ڈانٹ کر کہا "تجھے معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟" شاعر یہ سُن کر کانپنے لگا، وہ سمجھ گیا کہ آج بادشاہ کے قہر و غضب کا دن ہے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "ہاں سرکار معلوم ہے آج آپ جس کو سب سے پہلے دیکھیں گے اُسے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔" یہ کہہ کر رونے لگا۔

کچھ دن چڑھے بادشاہ نے دربار کیا۔ سارے شہر کے لوگ جمع ہوئے۔ پھانسی دینے والا پہلے ہی سے موجود تھا۔ پھانسی پر چڑھانے سے پہلے بادشاہ نے اس سے کہا "تو میرا پُرانا دوست ہے مرنے سے پہلے کچھ کہنا ہو تو کہہ لے۔ تیری بات پوری کی جائے گی۔" شاعر نے کہا "حضور سے صرف ایک سال کے لئے رحم مانگتا ہوں۔ تاکہ جس کام سے آیا تھا، وہ پورا ہو جائے۔"

بادشاہ نے اُسے چھوڑ دیا اور کہا "یاد رکھ اگر تو ایک سال کے بعد حاضر نہ ہوا تو تیرے تمام بچّوں کو قتل کرا دوں گا۔"

شاعر نے اور کوئی بات تو کی نہیں۔ دربار سے چلا اور سیدھا نیک بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور سارا حال اُسے کہہ سنایا۔ نیک بادشاہ یہ سُن کر بہت غصہ ہوا اور لڑائی کی تیّاریاں کرنے لگا۔ سال کے ختم ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے کہ شاعر

کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ اس نے نیک بادشاہ سے کچھ کہا سنا بھی نہیں اور گھوڑے پر سوار ہو ظالم بادشاہ کے شہر کی راہ لی۔

راستہ بہت لمبا تھا۔ دو دن راستے ہی میں لگ گئے۔ شاعر بہت دوڑا۔ اس کے ننھے منے سے بچے اُس کو رہ رہ کر یاد آرہے تھے۔ وہ رنج سے نڈھال ہو رہا تھا مگر ابھی ہمت نہیں ہاری تھی گھوڑے کو برابر دوڑاتا رہا نہ کچھ کھایا نہ پیا لیکن پھر بھی ایک منزل باقی تھی کہ صبح ہو گئی اور وہ دن آن پہنچا۔

صبح ہو گئی تھی لیکن شاعر ابھی دربار میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ بادشاہ کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں اُس نے اُس کے تمام بچوں کو پکڑوا منگایا۔ ماں روتی چلاتی دربار میں آئی۔ ننھے منے بچے ماں کو روتے دیکھ کر اور بھی جی چھوڑے دے رہے تھے۔ دربار لگ چکا تھا۔ بادشاہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ چلّا کر کہنے لگا۔ "جو وعدہ کرکے پھر جائے اس کی سزا موت ہے۔ کہاں ہے جلّاد"

اُس نے کہا ہی تھا کہ ایک کالا بھجنگ شیطان کی شکل کا آدمی ہاتھ میں تلوار لئے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اُسے حکم دیا۔ "شاعر کے ایک بچے کو یہیں ذبح کر ڈالو۔" حکم پاتے ہی جلّاد شاعر کے بڑے بیٹے کو گھسیٹتا ہوا لایا اور اُسے قتل ہی کیا چاہتا تھا کہ دور سے گرد اُڑتی ہوئی دکھائی دی۔ لوگوں نے شور مچایا "ٹھہرو کوئی آرہا ہے، ہو نہ ہو یہ شاعر ہی ہے" تھوڑی دیر کے بعد گھوڑا نظر آنے لگا۔ پھر ایک غُل ہوا لو وہ شاعر آگیا۔ جہاں پناہ! شاعر آگیا"

شاعر کے جسم اور کپڑوں پر خاک اَٹ رہی تھی۔ دو دن سے اُس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ بھوک پیاس سے بے جان ہو رہا تھا۔ گھوڑے سے اُترتے ہی بے ہوش ہو کر گرا اور مر گیا۔ اس کی زبان سے صرف اتنی بات سنائی دی "میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اب میرے بچے بے قصور ہیں"

"دیکھا امی تم نے وہ پاگل نہیں تھا تو کیا عقل مند تھا مفت میں اپنی جان دے دی اور اپنے بچوں کو بے سہارا چھوڑ گیا"

ماں :۔ "تو کیا کرتا بھلا"

چھاما :۔ "ارے امی! تم بھی نہ سمجھیں۔ اچھا اُسے چھٹی تو مل گئی تھی نا؟ وہ چپکے سے آتا اپنے گھر اور بیوی بچوں کو لے کر نیک بادشاہ کے ملک کی راہ لیتا"

ماں نے اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لئے اور بولیں "توبہ توبہ اللہ" تو کیا شاعر دھوکا دیتا۔ پگلی۔ پھر اُسے جھوٹا نہیں کہتے لوگ؟"

چھاما :۔ تو وہ بادشاہ ہی کون سا سچا اور نیک تھا امی۔

ماں :۔ بادشاہ بُرا تھا تو کیا شاعر بھی اس کے ساتھ

بُرا بن جاتا۔ اَور ہمارے نبی کی نصیحت تو تو بھول ہی گئی۔ جو اپنے وعدے کو پُورا کرتا ہے وہ بہت نیک اَور اچھا آدمی ہے۔"

چھاما نے پیارے نبی کی بات سُنی تو ایسی چُپ ہوئی جیسے گونگی ہوگئی ہو۔ ماں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

پیامِ تعلیم

چند ماہرینِ تعلیم کی رائیں

عالی جناب خان صاحب مولوی سیّد علی احمد صاحب جعفری بی اے ال ٹی سپرنٹنڈنٹ تعلیمات مونسپل کمیٹی دہلی تحریر فرماتے ہیں "میں آپ کو ایک بہت دلچسپ اَور جاذبِ نظر سالنامے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مضامین کا انتخاب اَور اُن کی ترتیب بہت صحیح ہے
مضامین ہر قسم اَور ہر نوع کے ہیں، ذہانت، ہنسی مذاق کی خبریں، کھیل معلومات عامہ، تعلیم۔ غرض بچّوں کی دلچسپی کی ہر چیز فراہم کی گئی ہے۔ زبان شروع سے آخر تک سلیس ہے۔ اگر بعض لوگوں کے زندگی کے حالات اِس میں اَور ہوتے تو بچّوں کے لئے اَور زیادہ مفید کارآمد اَور ولولہ انگیز ہوتے۔

عالی جناب مولوی سیّد ساجد علی صاحب۔ بی اے۔ بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع بیدر تحریر فرمائے ہیں :۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ آپ نے پیامِ تعلیم کو جس قدر مفید اَور دلچسپ بنادیا ہے۔ وہ قابلِ تحسین ہے۔ یہ نہ صرف بچّوں کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے اَور انھیں اپنی فرصت کو مفید طور سے گذارنے میں مدد دیتا ہے۔ بلکہ یہ اساتذہ صاحبان کے لئے بھی فائدہ بخش ہے۔

بمبئی کی سیر

محمد نور کھٹکھٹے ۔ بمبئی

بمبئی ہمارے دیس کا بہت خوب صورت شہر ہے شان دار اور خوب صورت عمارتیں، ہوٹل، سنیما گھر کلب گھر اور پرفضا سیرگاہیں۔ ایک بار جو اس شہر کی سیر کر جاتا ہے اسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو رہتی ہے۔

بمبئی کے رہنے والوں کو سیر و تفریح سے بہت دلچسپی ہے۔ یہاں سیرگاہیں بھی دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ شام کے وقت بمبئی کی کسی سیرگاہ پر جایئے، بے شمار لوگ سیر و تفریح کرتے دکھائی دیں گے۔ ان میں بچے بھی ہوں گے۔ بڑے بھی ہوں گے، بوڑھے بھی ہوں گے اور .... کتے بھی ہوں گے!

میں بمبئی کا رہنے والا ہوں، مجھے بھی سیر و تفریح سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی یہاں کے دوسرے لوگوں کو ہو سکتی ہے۔ اس لئے آج میں بمبئی کی ایک خوب صورت اور نئی بنی ہوئی سیرگاہ کے متعلق کچھ لکھوں گا۔ اُمید ہے کہ پیامی اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے اور خود بھی اپنے شہر کی کسی سیرگاہ کا حال "پیامِ تعلیم" میں چھپوانے کے لئے بھیجیں گے۔

بمبئی میں ایک نئی سیرگاہ اور بنی ہے۔ شہر کے مغربی حصے میں سمندر کے کنارے چوپاٹی سے قلابہ تک ایک چوڑی دیوار تعمیر کی گئی ہے۔ لمبائی میں یہ دیوار کوئی ڈھائی میل ہوگی۔ بمبئی والے اس دیوار کو (SEA WALL) یعنی سمندری دیوار کہتے ہیں۔ دیوار سے ملی ہوئی ایک بہت چوڑی فٹ پاتھ ہے۔ اور فٹ پاتھ کے ساتھ ہی موٹر کی ایک وسیع اور کشادہ سڑک ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ چھوٹے پودوں کی ایک قطار لگائی گئی ہے۔ اس کے ایک طرف سے موٹریں آتی ہیں اور دوسری طرف سے چلی جاتی ہیں۔ اس طرح سے ان موٹروں کے ٹکرانے کا خوف بالکل نہیں رہا۔ موٹروں کی سڑک کے اس طرف جانے کے لئے ان پودوں کے درمیان کچھ کچھ فاصلے پر جگہ چھوڑی گئی ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لئے علیحدہ جگہ چھوڑی گئی ہے۔ یہاں پر شام کے وقت پولیس کا ایک سپاہی کھڑا رہتا ہے۔ اور جیب بہت

سے آدمی سڑک پار کرنے لگتے ہیں تو یہ ہاتھ کے اشارے سے موٹروں کو روک دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو معلوم نہیں کتنے آدمی موٹر کے نیچے آکر اپنی جان کھو بیٹھیں۔ کیونکہ شام کے وقت یہاں پر موٹروں کی آمدورفت بہت زیادہ رہتی ہے اور ان کی رفتار بھی بہت تیز رہتی ہے۔ چونکہ یہ سڑک سمندر کے کنارے بنائی گئی ہے، اس لئے اس کا نام میرن ڈرائیو (MARINE DRIVE) یا سمندری سڑک رکھا گیا ہے۔

میرن ڈرائیو موٹر کی سیر کے لئے بمبئی کی بلکہ ہندوستان کی بہترین سڑک ہے۔ تین میل تک سمندر کے کنارے موٹر میں بیٹھ کر سیر کرنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس موٹر نہیں ہے تو بس کے ذریعے اس شوق کو پورا کر سکتے ہیں۔ پورے میرن ڈرائیو کی موٹر بس سے سیر کی جائے تو صرف چھ پیسے خرچ ہوں گے۔

شام کے وقت میرن ڈرائیو پر بے شمار لوگ ہواخوری کے لئے آتے ہیں اور سمندری دیوار پر بیٹھ کر سمندر کی ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے اپنی دماغی اور جسمانی تھکن دور کرتے ہیں۔ کسی تعطیل کے دن تو اکثر یہ تین میل لمبی دیوار لوگوں سے پُر ہو جاتی ہے۔ اور بیٹھنے کے لئے مشکل سے جگہ ملتی ہے۔ اُس وقت دور سے دیوار پر بیٹھے ہوئے لوگ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بجلی کے تار پر کووّں کی قطار۔ فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرنے والے ہجوم کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔

مرین ڈرائیو کی خوب صورتی میں اور اضافہ کرنے کی غرض سے حال ہی میں ناریل کے پودے اس کی فٹ پاتھ پر ایک قطار میں لگائے گئے ہیں۔ جب یہ پودے پورے قد کے درخت بنیں گے مرین ڈرائیو کی رونق اور خوب صورتی دوبالا ہو جائے گی۔ سمندر کے کنارے ایک قطار میں یہ درخت دیکھنے والوں کے لئے ایک خوش نما اور دلفریب منظر پیش کریں گے۔

اب سے چند سال پہلے جب یہ خوب صورت سیرگاہ تعمیر نہیں ہوئی تھی یہاں پر سمندر ہی سمندر تھا اور اس کے دوسری طرف جہاں اب کئی نئی سڑکیں اور بیسیوں خوب صورت عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں سمندر سے ملا ہوا ذرا سا میدان تھا۔ جو ناریل کے درختوں، پتھروں اور لمبی لمبی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اس میدان کے بیچ سے بی۔ بی اینڈ سی آئی کی لوکل ٹرین آیا جایا کرتی تھی۔ مگر اب تو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے کہ کبھی یہاں بھی ریلوے ٹرین کی آمدورفت تھی۔

مرین ڈرائیو کا خاکہ سنہ ۱۹۱۵ء میں بنایا گیا۔ آہستہ آہستہ کام ہوتا رہا۔ سب سے پہلے سمندر کا ایک حصہ بڑے بڑے پتھر، مٹی اور ریت ڈال کر پاٹ دیا گیا۔ پھر وہ دیوار بنائی گئی جس کا ذکر میں اوپر کر چکا

ہوں۔ ۱۹۳۹ء تک یہ خاکہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور شہر کا یہ حصّہ جہاں پہلے سمندر ہی سمندر تھا موٹر کی ایک بے مثال سڑک اور ایک ایسی خوب صورت سیر گاہ اور صحت گاہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا جس کی مثال مشرقی شہروں میں ملنا مشکل ہے۔

مرین ڈرائیو کے نصف حصّے میں ۴۰۰،۳۰ کے قریب نئی وضع کی خوب صورت عمارتیں سمندر کے سامنے تعمیر کی گئی ہیں۔ سوائے دو چار عمارتوں کے اونچائی اور لمبائی سب عمارتوں کی ایک ہی جیسی ہے۔ رنگ بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے رکھے گئے ہیں۔ دور سے دیکھنے پر سب عمارتیں ایک سی معلوم ہوتی ہیں مگر قریب سے دیکھنے پر ہر عمارت آپ کو الگ الگ نمونے کی نظر آئے گی۔

مسلم جم خانہ، ہندو جم خانہ، پارسی جم خانہ اور دوسرے کلب گھر بھی یہیں پر ہیں۔ بمبئی کا مشہور بربورن اسٹیڈیم (BRABOURNE STADIUM) جہاں ہر سال پنج رنگی کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کے میچ ہوا کرتے ہیں۔ مرین ڈرائیو کے جنوبی حصّے میں واقع ہے۔

جو شخص آج سے ۵ سال پہلے بمبئی سے غیر حاضر رہا ہو اگر اب بمبئی آئے گا تو اس کو اندازہ ہوگا کہ بمبئی نے اس قدر مختصر عرصے میں کتنی ترقی کرلی ہے۔ اور اپنے رہنے والوں کے لئے مرین ڈرائیو کی صورت میں کتنا اچھا تحفہ پیش کیا ہے کیونکہ شہر کا یہ حصّہ ہندوستانی شہروں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اللہ دین کے چراغ کی مدد سے یورپ یا امریکہ کے کسی شہر کے ایک حصّے کو جنوں کے ذریعے منگوا کر بمبئی میں لا کھڑا کیا ہے۔

امید ہے کہ آپ نے بمبئی کی اس خوب صورت سیر گاہ کا حال پسند کیا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو آئندہ بھی کسی اور سیر گاہ کا حال لکھنے کی کوشش کروں گا۔

حال اب تو اجازت دیجئے۔

عبدالحسیب، حیدرآباد دکن

پہلے دو دشمن ملکوں میں لڑائی اگر ہوتی تھی تو بس دونوں کی فوجوں میں ہوتی تھی۔ شہری اور کاروباری لوگوں سے اِسے کچھ مطلب نہ تھا۔ لیکن اب لڑائی کی شکل بدل گئی ہے۔ اب تو دشمن کے ہوائی جہاز زنزناتے ہوئے شہر کی طرف آتے ہیں اور شہری آبادی پر اپنے بازوؤں کے نچلے حصے سے ہزاروں بم گراتے ہیں۔ ہزاروں آدمی زخمی اور ہلاک ہوتے ہیں۔ اور بے شمار عمارتیں تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ شہری آبادی میں بدحواسی پھیلے اور اس طرح ملک کو فتح کرنے میں آسانی ہو۔

یہ ہوائی جہاز سے گرنے والے لمبوترے بم بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اُن کا وزن ۵۰ پونڈ سے لے کر ۲۰۰۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔ کبھی اس سے بھی زیادہ۔ ان بموں میں زہریلا دھواں یا آگ پھیلانے والا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ زہریلے دھوئیں والے بم بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ خصوصاً جہاں لوگ اس سے حفاظت کی تدبیریں نہ جانتے ہوں۔ آگ پھیلانے والا بم بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ یہ عموماً دو پونڈ سے زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ ایک بم پھینکنے والے بڑے جہاز میں اس وزن کے چار ہزار بم لے جانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایسے بم تمام گنجان آبادی میں آگ لگا دینے کے لئے کافی ہیں۔

جو بم ہوائی جہاز کے اڈوں فوجی بارکوں اور سمندری جہازوں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان میں ایک مشہور قسم کی بارود ٹی، ین، ٹی ہوتی ہے۔ ایک اور قسم کے بم فوجوں کو زخمی کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اِن بموں کے پھٹنے پر دھاتوں کے ٹکڑے تیزی کے ساتھ بکھر جاتے ہیں یہ چھوٹے ٹکڑے بندوق کی گولیوں کا اثر رکھتے ہیں۔ فوج کی نقل و حرکت کو چھپانے کے لئے دھوئیں کے بم خود ان کی اپنی فوج چھوڑتی ہے۔ ایک بے ضرر بم ہے اس میں گھنٹی کی اور چیخنے کی زوردار آواز نکلتی ہے۔ اِن بموں میں گھڑیوں کے سے کل پُرزے لگے ہوتے ہیں۔ ایسے بموں سے شرارت

اور لوگوں کا پریشان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

بم بجلی کی مدد سے گرائے جاتے ہیں۔ ہاتھ سے جلد اور ٹھیک نشانے پر نہیں پھینکے جا سکتے۔ علاوہ اس کے بموں کو منہ کے بل گرانا پڑتا ہے ورنہ بم اپنا کام نہ کرنے پائیں۔ منہ کے بل گرنے سے بار فوڈ مسلک جاتی ہے اور بم پھٹ جاتا ہے۔ بعض بم ہوائی جہاز سے گرتے ہی یا مقررہ وقت کے بعد پھٹتے ہیں۔ بم جتنی بلندی سے پھینکا جائے اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتا ہے۔ مثلاً ۱۶ ہزار فٹ کی بلندی سے پھینکا جائے تو پہلے سکنڈ میں ۱۶ فٹ نیچے آئے گا۔ دوسرے سکنڈ میں ۳۲ فٹ۔ اسی طرح نیچے آتے آتے اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور بم زور دار آواز کے ساتھ پھٹ جاتا ہے۔

کسی خاص نشانے پر بم پھینکنا مشکل اور خطرناک کام ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کو ایک ہی بلندی پر اڑنا پڑتا ہے جس سے خطرہ رہتا ہے کہ کہیں ہوا مار توپیں جہاز کو نیچے نہ گرا لیں۔ بم پھینکنے سے پہلے ہوائی جہاز کی رفتار، بلندی اور ہوا کی رفتار معلوم کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہوا تیز ہو تو بم سیدھا نشانے پر نہ گرے گا بلکہ کچھ دور ہٹ کر گرے گا۔ اس لئے بم گرانے سے پہلے ٹھیک طور پر آلات کے ذریعے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ بم کہاں گرے گا۔ جب ایک خاص جتھے کو بہت سے ہوائی جہاز نشانہ بناتے ہیں تو ایک ہوائی جہاز بم پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرا ہوائی جہاز دوسرا بم گراتا ہے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرا اسی مقام پر واپس آ کر بم گرا جاتا ہے۔

اگر کسی خاص چیز کو نشانہ بنانا نہیں ہے تو اندھا دھند بم برسائے جا سکتے ہیں اور ہوائی جہاز جس سمت اور جتنی بلندی پر چاہے رہ سکتا ہے۔ بڑے بم گراتے وقت جہاز نشانے کے قریب آئے تو بم کے پھٹنے سے جہاز نیچے گر سکتا ہے۔ بموں کو ایک مقررہ بلندی ہی سے پھینکا جاتا ہے۔ ہاں بلندی سے غوطہ لگا کر بم گرائے جاتے ہیں تاکہ جہاز ہوا مار توپوں کا نشانہ نہ بنایا جا سکے بم ٹھیک نشانے پر گرانے کے لئے بہت مشق کی ضرورت ہے۔ پہلے تو ایک نقشے پر مصنوعی بم گرانے کی تعلیم دی جاتی ہے اور پھر بلا بارود کے بم جہاز میں لگا دئے جاتے ہیں اور ایک نشانے پر گرانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

دستی بم بہت زمانے سے رائج ہیں۔ یہ موجودہ زمانے میں بھی ضروری ثابت ہوئے ہیں۔ اسپین کی آپس کی لڑائی میں یہ بہت کام آئے۔ ایک ماہر دستی بموں کو تیس گز تک پھینک سکتا ہے۔

دستی بم انار کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کا وزن ۱½ پونڈ ہوتا ہے۔ بم کے بیچوں بیچ ایک اسپرنگ ہوتا ہے۔ اسے لوہے کا ٹکڑا دبائے رکھتا ہے۔ بم استعمال کرتے وقت لوہے کا ٹکڑا نکال کر اسپرنگ کو ہاتھ سے

دبائے رکھتے ہیں۔ بم ہاتھ سے چھوٹتے ہی اسپرنگ کھُل جاتا ہے اور ایک بتی اسپرنگ کھلنے سے سُلگ جاتی ہے۔ اس سے بارود کا ایک چھوٹا حصّہ پھٹ جاتا ہے تو پہلے ایک چھوٹی آواز آتی ہے اور پھر ایک زور دار آواز سُنائی دیتی ہے۔ بم کے دو الگ حصّے صرف بم پھینکنے والے کی حفاظت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ دستی بم رائفل میں رکھ کر ایک خاص ترکیب سے چھوڑے جاتے ہیں ۔

جاگو

متین سرمست حیدرآبادی

عرش بریں کے اچھے نظارے — پھیکے پھیکے چاند ستارے
سورج کے معصوم شرارے — کرتے ہیں چھپ چھپ کے اشارے
جاگو نیند کے ماتو جاگو

متوالی ہر ایک کی ادا ہے — مندر میں ٹن ٹن کی صدا ہے
دور سے آتی ایک ندا ہے — کوئی تمھارا بھی تو خدا ہے
جاگو نیند کے ماتو جاگو

خود ہی رسوا ہوتے ہو تم — ہنستے ہیں سب روتے ہو تم
پاتے ہیں سب کھوتے ہو تم — دنیا جاگی سوتے ہو تم
جاگو نیند کے ماتو جاگو

توپ کے منہ پر اڑنا سیکھو — طوفانوں سے لڑنا سیکھو
گرنا، اٹھنا، بڑھنا سیکھو — جینا ہو تو مرنا سیکھو
جاگو نیند کے ماتو جاگو

جاکے فلک سے تارے لاؤ — دھرتی کو آکاش بناؤ
پرچم آزادی لہراؤ — اپنے متین کے نغمے گاؤ
جاگو نیند کے ماتو جاگو

بہت دن ہوئے میں نے تمھیں رُوم کے تین چار قصّے سُنائے تھے۔ یہ بھی ایک وَیسا ہی قِصّہ ہے۔ اگر تُم ان قصّوں کو بھول چکے ہو تو اپنے رسالہ "پیامِ تعلیم" کے پچھلے نمبر اُٹھا کر دیکھ لو۔

اِس سے پہلے تم پڑھ چکے ہو کہ ہنی بال نے اپنی جان توڑ کوششوں سے "گال" اَور "اتروریہ" کو فتح کر لیا تھا۔ اس فتح سے رُومی ہنی بال سے بہت ڈرنے لگے۔ اَور رُوم کے بڑے بوڑھوں کو یہ فکر ہوئی کہ کوئی اَیسا سپہ سالار ڈھونڈا جائے جو ہنی بال سے مقابلہ کر سکے۔ ان دنوں فیبؤس میکسمؤس کی بہادری کا بڑا شہرہ تھا اَور رُوم والے اس کا نام بڑی عزّت سے لیتے تھے۔ بس اُنھوں نے فیبؤس ہی کو ہنی بال سے لڑنے کے لئے چُن لیا۔ اَور وہ فوراً رُومی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔

فیبؤس کو اپنے وطن اَور وطن والوں سے بڑی محبّت تھی۔ اَور وہ دِل سے چاہتا تھا کہ کسی طرح رُوم کو ہنی بال کے چنگل سے بچائے۔ اَور جب فیبؤس نے یہ سُنا کہ رُوم کی دو بڑی فوجیں کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ دی گئیں تو اُسے بڑا دُکھ ہوا اَور ایک بہادر اِنسان کی طرح اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے وطن کو غُلام نہ ہونے دے گا۔ پھر اُس نے رُوم کے خداؤں سے دُعا کی کہ وہ اُس کے وطن پر نظرِ کرم کریں اَور اس کے اِرادوں میں برکت دیں تاکہ رُوم کو فتح حاصل ہو۔

فیبؤس نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی اس نے ہنی بال سے لڑنے کا ایک نرالا طریقہ سوچا تھا۔ یعنی یہ کہ خود کبھی پہل نہ کرے بلکہ دشمن کی فوجوں کا پیچھا کرتا رہے۔ اَور سچ تو یہ ہے کہ یہ ترکیب تھی بھی بہت مُناسب۔ چنانچہ جہاں کہیں ہنی بال کی فوجیں جاتیں وہ خود بھی اپنی فوج کے ساتھ وہیں موجود ہوتا۔ اگر "کارتھیجیہ" والے پڑاؤ کرتے تو فیبؤس کی فوج بھی وہیں ڈیرا ڈال دیتی۔ اگر وہ آگے بڑھتے، فیبوس کی فوج بھی آگے بڑھتی۔ لیکن فیبؤس نے کبھی اپنے سپاہیوں کو دوبدو نہیں لڑوایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے سوائے

نقصان کے کوئی فائدہ نہیں۔

مگر رفتہ رفتہ فیبؤس کے سپاہیوں کو یہ بات بُری معلوم ہونے لگی۔ اُن کا جی تو یہ چاہتا تھا کہ کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کریں اور اپنی بہادری دکھائیں۔ فیبؤس کے ماتحت افسر آپس میں چہ میگوئیاں کرتے اور کہتے کہ اگر وہ دوبدو لڑکر ہنی بال کو شکست دیتے تو ان کا اور اُن کے وطن رُوم کا کتنا نام ہوتا؟ یہی سوچ سوچ کر اُنھیں غصّہ آتا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ فیبؤس کی اس ترکیب کے خلاف جو شخص سب سے آگے تھا وہ تھا سالار مینی کوس۔ جس کے ماتحت پوری فوج تھی اور خود صرف فیبؤس کے ماتحت تھا۔

مینی کوس ہر وقت فیبؤس کے خلاف زہر اُگلا کرتا کبھی وہ اسے "بڈھی عورت" کہتا، کبھی بزدل۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سپاہیوں کے دل میں فیبؤس کی عزت کم ہونے لگی اور مینی کوس کو سپہ سالار بنانے کی تمنّا کرنے لگے

مینی کوس نے جب فوج کے سپاہیوں کو اپنی طرف مائل پایا تو اُس کے غرور کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اور وہ اب کھلے بندوں فیبؤس کی برائیاں کرنے لگا فیبؤس کا ہمیشہ یہ طریقہ تھا کہ اپنی فوج کو کسی اونچے ٹیلے یا پہاڑی پر ٹھہراتا تاکہ اس کی فوج پر پیچھے سے حملہ ہونے کا ڈر نہ ہو۔ مینی کوس نے فیبؤس کے دوستوں سے کہا اگر لڑنے کی ہمت نہیں تھی تو فیبؤس کو کیا ضرورت تھی کہ ہنی بال کے مقابلے پر آئے؟

فیبؤس نے جب یہ سنا تو جواب دیا:-

"یہ سچ ہے کہ میں ہنی بال سے ڈرتا ہوں لیکن میں اس سے اپنی ذات کے لیے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے وطن کے لیے ڈرتا ہوں۔ اپنے ملک کے لیے ڈرتا ہوں اپنی قوم کے لیے ڈرتا ہوں تاکہ میری غفلت یا جلدبازی کی وجہ سے کہیں کوئی بڑی آفت نہ آجائے۔ میں اپنی قوم کو تباہی سے بچانا چاہتا ہوں اور اس لیے اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ اگر ایک سپہ سالار دشمن کی فوجوں کو تھکا کر جیتنا چاہتا ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا آتا ہے۔ اس کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ شہروں اور گاؤں پر قبضہ کرتا آرہا ہے۔ لیکن ہر بار ہر شہر، ہر گاؤں کی فتح کے بعد اُس کے آدمی کم ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ہم صبر سے کام لیں تو ایک دن ہم اُس کی فوج کو پریشان پائیں گے اور پھر وہ موقع ہوگا کہ ایک بارگی حملہ کریں اور فتح حاصل کرلیں۔ یاد رکھو کوئی سپہ سالار کتنا ہی بہادر اور روشن دماغ کیوں نہ ہو بغیر فوج اور سرمایہ کے نہیں جیت سکتا۔"

(باقی)

بچّوں کی نظمیں

محمد شفیع الدین صاحب نیّر
کی
اصلاح کے بعد

کبوتر

محمد صالح۔ درجہ دوم جامعہ عمر ۹ سال ۹ ماہ

ہم نے ایک کبوتر پالا | بھولا بھالا پیارا پیارا
پنجرا ہم نے ایک خریدا | اچھا اچھا پیارا پیارا
کھانے کو دیتے تھے دانا | کھا لیتا تھا اپنا کھانا

برسات کی بہار

پران ناتھ سیٹھی موڈرن ہائی اسکول ۱۱ سال

کالے کالے بادل آئے | چاروں طرف سے گھر کر چھائے
کوئل کو کو کو کو کرتی | گانا گا کر جی بہلاتی
مینڈک ٹر ٹر ٹر ٹر کرتے | بھونرے چاروں طرف سے آتے
آؤ ہم سب سیر کو جائیں | سیر کو جا کر جی بہلائیں
اے لو ابر نے مینہ برسایا | کوئل نے پھر گیت سنایا
پہلے ایک ایک قطرہ آیا | پھر بوندوں نے تار لگایا
خوب ہی زور کی بارش آئی | ہر جانب ہریالی چھائی
چھپر دے کر سب چھپتے ہیں | بجلی گرنے سے ڈرتے ہیں
ندی نالے بھرے ہوئے ہیں | سارے دریا چڑھے ہوئے ہیں
دھنک کماں ہے نکلی کیسی | رنگ برنگی پیاری پیاری
سیٹھی نے یہ نظم بنائی | اپنے پرچے میں چھپوائی

حمد

سارہ بی

مالک ہے تو ہمارا خالق ہے تو ہمارا
تو ہی ہمارا داتا تو ہی ہمارا والی
پیدا کیا ہے یارب تو نے یہ سارا عالم
خاکی بدن بنا کر پھر اس میں جان ڈالی
لازم ہے حمد تیری اے دو جہاں کے والی
اے بے نیاز خالق درجہ ہے تیرا عالی
آنکھوں میں نور آیا دل نے سرور پایا
کیا صبح کی ہوا میں تاثیر تو نے ڈالی
دنیا کا کارخانہ کیسا بنایا تو نے
اک ذرہ بھی نہیں ہے حکمت سے تیری خالی
سارہ کی یہ دعا ہے اس کی یہ التجا ہے
ہاں بخش علم ہم کو تو ہے ہمارا والی

بچپن کی یاد

بنیاد حسین احمد صدیقی۔ اناؤ

آتا ہے یاد مجھ کو بچپن کا وہ زمانہ
ہمجولیوں سے مل کر ہر سمت غل مچانا

ننھے کا پاؤں چلنا اور لڑکھڑا کے گرنا
آپا کے پاس جا کر آپا کا مُنہ چڑھانا
باجی کا جھنجھنا کے کوٹھے پہ جا بجانا
اماں کی جھڑکیوں پر میرا وہ کھلکھلانا
گھر سے چلے مدرسے لیکن سڑک پہ رک کر
بستہ زمیں پہ رکھ کر دل کھیل میں لگانا
لڑتے جھگڑتے آخر پہنچے جو مدرسے میں
اُستاد کا ادب کر چپکے سے بیٹھ جانا
اُستاد ہٹ گئے تو آفت اُٹھائی ہر سو
لڑنے لگے سبھی سے اک دم سے غُل مچانا
ناصر کی روشنائی چپکے سے جا گرائی
یکھی سلیٹ لے کر حرف اس کے سب مٹانا
اسکول سے چلے جب پا کر وہاں سے چھٹی
بازار میں پہنچ کر آلو کی چاٹ کھانا
بچپن کا چلبلا پن باقی نہیں رہا اب
اس واسطے کہ میں اب کچھ ہو گیا سیانا
اکرم کبھی کلی سی ہوتی ہے اس گھڑی جب
آتا ہے یاد اس کو بچپن کا وہ زمانا

پیاری چڑیا

محمد اکرام۔ لاہور

جب جب تو اے پیاری چڑیا
گھر میں ہمارے آتی ہے
اپنی ننھی چونچ سے گا کر
میٹھے گیت سناتی ہے
اُس دم کیا بتلاؤں
کیسی میرے دل کو بھاتی ہے
آتا ہوں میں دوڑ کے تجھ تک
بہت بھی دوڑی آتی ہے
لیکن جب ہم پاس ہیں آتے
تو پھر سے اُڑ جاتی ہے
ڈرتی ہے کیوں پیاری ہم سے
خوف اتنا کیوں کھاتی ہے

صُبح کا گیت

محمد اقبال۔ دہلی۔ عمر ۱۰ سال

چڑیوں کا چہچہانا
پھولوں کا مسکرانا
پیڑوں کی ڈالی ڈالی
اُن کی ادا نرالی
سورج کا بھی نظارا
منظر سحر کا پیارا
دل کو ہے یہ لُبھاتا
مجھ کو ہے خوب بھاتا
اقبال تم بھی اُٹھو
منظر سحر کا دیکھو

یہ عجیب واقعہ اب سے کوئی دو سو سال پہلے کے انگلستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانے میں انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی تاریخوں میں گیارہ دن کا فرق رہتا تھا۔ یعنی انگلستان میں جب پہلی تاریخ ہوتی تو اٹلی اور فرانس میں ۱۲ ہوتی، جب انگلستان میں ۲ ہوتی تو دوسرے ملکوں میں ۱۳ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے بیشتر ملکوں نے اب سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے ایک نیا کیلنڈر[1] اختیار کر لیا تھا، اس لئے اُن کے یہاں سال مہینہ اور تاریخوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ انگلستان والے ہمیشہ سے پُرانی لکیر کے فقیر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے یہاں کا کیلنڈر نہیں بدلا اور پُرانا کیلنڈر ہی قائم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور دوسرے ممالک کی تاریخوں میں فرق رہنے لگا۔

اس کے سمجھنے کے لئے ایک بہت آسان مثال ہندوستان کے کیلنڈروں کی ہے۔ ہندوستان میں بہت سے کیلنڈر جاری ہیں ان میں سے عیسوی[2] ہجری اور ہندی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تینوں کا حساب الگ الگ ہے اور تینوں کی تاریخ میں فرق رہتا ہے اور یہ فرق گھٹتا بڑھتا ہے۔ ہندی مہینے چاند کے حساب سے ہوتے ہیں۔

عیسوی کیلنڈر میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ سورج کی گردش کے حساب پر مبنی ہے۔ اس لئے موسم ہمیشہ ایک ہی مہینوں میں آتے ہیں۔ دسمبر میں ہمیشہ جاڑا ہوتا ہے اور مئی میں ہمیشہ گرمی پڑتی ہے۔ ہجری[3] یا چاند کے حساب میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ کبھی رمضان شریف گرمیوں میں

[1] جس سے تاریخوں، دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب لگایا جاتا ہے۔
[2] اسے شمسی بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا حساب سورج (شمس) کی گردش سے لگایا جاتا ہے۔ عام بول چال میں اسے انگریزی حساب بھی کہا جاتا ہے۔
[3] ہجری میں اسے قمری بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کا حساب چاند (قمر) کی گردش کے مطابق رہتا ہے۔

آتے ہیں اور روزے بڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی جاڑوں میں آتے ہیں اور روزے اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ چھوٹے بچے بھی آسانی سے رکھ لیتے ہیں۔ ہندو لوگ بہت ہوشیار ہیں، وہ نہ چاند کو چھوڑنا چاہیں اور نہ سورج کو۔ دونوں دیوتا۔ اُن میں سے کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے انھوں نے یہ ترکیب رکھی ہے کہ تاریخیں چاند کے اعتبار سے شمار کرتے ہیں لیکن جب بھی اُن کے اور سورج کے (یعنی عیسوی) حساب میں زیادہ فرق پڑ جائے تو لونڈ کا مہینہ لگا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔

سورج اور چاند کا حساب بتاتے بتاتے ہیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اِن سب باتوں کے بتانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ تاریخوں میں فرق پڑ جانے کا معمّا آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔

تو انگلستان اور دوسرے ملکوں کی تاریخوں میں فرق رہتا تھا اور اس فرق سے لین دین کے معاملات اور خط کتابت میں گھپلا پڑتا تھا۔ اور طرح طرح کی دقتیں پیش آتی تھیں۔ مثلاً کوئی شخص ۲۵ جنوری کو فرانس سے انگلستان روانہ ہوا۔ وہاں دوسرے دن پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی ۱۵ جنوری ہے۔ ان سب دقتوں کو دور کرنے کے لئے انگلستان کے وزیر نے یہ ترکیب سوچی کہ انگلستان بھی وہی کیلنڈر اختیار کرے جو یورپ کے دوسرے ملکوں میں جاری ہے لیکن اس کے لئے اپنے یہاں کی تاریخوں کا بدلنا ضروری تھا لہٰذا اس وزیر نے ایک مشہور حساب دان مسٹر بریڈلے (MR. BRADLEY) کی مدد سے ایک نیا قانون تیار کرایا اور پھر اُسے پارلیمنٹ میں پاس کرا دیا۔ نئے قانون کی رُو سے انگلستان کی تاریخ گیارہ دن آگے بڑھا دی گئی یعنی جس تاریخ کو پہلے حساب کے مطابق ۳ ستمبر ہونا چاہیے تھی، اُسے ۱۴ ستمبر کر دیا گیا۔

لیکن لوگ اس قانون سے خوش نہیں ہوئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تبدیلی سے واقعی ان کا گیارہ دن کا نقصان ہو گیا اور اُن کی عمر میں سے گیارہ دن کم ہو گئے اس کے علاوہ نئے حساب سے تیوہاروں میں بھی فرق پڑ گیا، کیونکہ ہر تیوہار پچھلے حساب کے مقابلے میں گیارہ دن پہلے ہونے لگا لوگ کہتے ہیں کہ تیوہاروں میں اس طرح گڑبڑ کرنا گناہ کی بات ہے' اس سے اللہ میاں خفا ہو جائیں گے، غرض نئے قانون کے خلاف کچھ عرصے لوگوں نے خوب شور مچایا جب پارلیمنٹ کے نئے ممبروں کے چناؤ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے اُمیدوار ممبروں سے مطالبہ کیا کہ "ہمارے گیارہ دن واپس دلاؤ" کئی سال گذرنے پر جب مسٹر بریڈلے کا بہت دنوں بیمار رہنے کے بعد انتقال ہوا تو بہت سے لوگوں نے کہا کہ اللہ میاں نے انھیں اُن کے کئے کی سزا دی۔

ہماری شرارت

[illegible]

خدا کے فضل سے اب تو ہم ساتویں درجے میں پڑھتے ہیں۔ اور ہمارا شمار بڑے لڑکوں میں ہے۔ مگر ابھی کوئی دو برس گذرے ہوں گے ہم پانچویں درجے میں پڑھتے تھے۔ اسکول بیچ بازار میں تھا۔ ہمارے مولوی صاحب جو ہمیں درجے میں اُردو پڑھاتے تھے ہمارے محلے سے تھوڑی دور رہتے تھے۔

ہمارے درجے میں مولوی صاحب کا اُردو کا پہلا گھنٹہ ہوتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے ہم لوگوں کی ملاقات مولوی صاحب قبلہ ہی سے ہوتی تھی مولوی صاحب کی عمر اس وقت کوئی ۵۰ سال سے اوپر ہوگی گورے چٹے آدمی تھے۔ قد میانہ جسم اتنا موٹا کہ کرسی پر ذرا مشکل ہی سے آتے تھے۔ پرانی قسم کا بند دار انگرکھا، سرخ نری کی جوتی۔ دو پلی ٹوپی، ایک لمبی مگر گول، دائرے نما ڈاڑھی۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا دانت سب برقرار مگر آنکھ صرف ایک تھی۔ پان بہت کثرت سے کھاتے۔ سیدھی طرف کی آنکھ بے کار تھی اتفاق سے ہم سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھتے تھے جس سے ہم کافی امن میں رہتے تھے۔ مولوی صاحب قبلہ اُلٹے ہاتھ کو بیٹھنے والے لڑکوں کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے ہم سیدھے ہاتھ کی بنچ پر نمبر اول پر بیٹھتے تھے اس لئے مولوی صاحب ہم سے بہت قریب تر رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اُردو میں ہم قابل لڑکوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مولوی صاحب کو نہ ہمیں کبھی اُردو پڑھانے کی ضرورت ہوئی اور نہ کبھی اُردو کے گھنٹے میں ہم نے پڑھا۔ اور یہ سمجھ کر کہ ہمیں اُردو پڑھنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے مولوی صاحب نے ہمارے ذمے ایک نجی کام کر دیا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا کہ مولوی صاحب جوں ہی ہمارے درجے میں داخل ہوئے اُنھوں نے ہمیں کچھ پیسے اور ایک پرچے پر سودے کی فہرست لکھی ہوئی دے دی۔ اسکول تو بازار میں تھا ہی۔ ہم اسکول کے پھاٹک سے باہر آئے سودا لیا اور ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف چل دئے۔ مُلانی صاحبہ کو سودا سلف دیا اور کچھ باتیں بنائیں اگر مولوی صاحب جلدی میں گھر سے پان لے جانا بھول گئے یا بٹوے میں چھالیا کم تھی تو

اُن کو دے کر اور ذرا اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے گھنٹے کے آخر تک درجے میں پہنچ گئے۔ مولوی صاحب نے خیریت دریافت کی اور ہم بیٹھ گئے اب ہمیں نہ یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے کیا پڑھایا اور نہ یہ کہ کل ہمیں کیا پڑھنا ہوگا۔ ہم بہت دنوں تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے خیال تھا کہ شاید مہینہ دو مہینے میں ہماری ڈیوٹی بدلے۔ مگر مولوی صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں اردو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ہم سودا اچھا اور مناسب داموں پر خریدتے تھے۔ اور پان چھالیا بغیر کسی دست برد کے اُن تک پہنچا دیتے تھے۔ ایسی حالت میں ہماری ڈیوٹی کیوں کر بدل سکتی تھی اور ہم ہیں کہ اس کام سے اُکتائے ہوئے۔ ہماری حالت یہ کہ جب تک گھر میں ہیں باتزار تو بازار پلنگ سے اُٹھنا دشوار۔ پیاس لگی آس پاس کسی کو نہ دیکھا تو ہلکی سی ایک چیخ ماری۔ قریب ہی کے دالان سے آپا جان دوڑ پڑیں "کیا ہوا" ہم نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا کہ اس کو کھینچ کر گھڑونچی تک پہنچا دو۔ بڑی پیاس لگی ہے" وہ سیکڑوں سناتی ہوئی گئیں اور پانی پلا دیا۔ ہم اس قسم کے تو سست آدمی ٹھہرے۔ پھر بھلا ہم سے مولوی صاحب کا یہ کام کب تک ہوتا۔ آخر ایک دن ہم نے اپنے چھٹکارے کی تدبیر سوچ ہی لی۔ سنیچر کا دن تھا۔ اسکول چار دن کو بند ہونے والا تھا۔ مولوی صاحب نے ہمیں پیسے اور پرچہ دیا۔ ہم بازار میں آئے اور کچھ مٹھائی اور میوہ خریدا۔ دو چار دوستوں نے خوب کھایا۔ جب کھا پی کر بےفکر ہو گئے۔ تب مولوی صاحب کے پاس آئے اور بہت مغموم صورت بنائی۔ مولوی صاحب نے وجہ پوچھی تو ہم نے کہا کچھ نہیں۔ آپ نے جو پیسے دیے تھے وہ جیب سے گر گئے یہ سُن کر مولوی صاحب بہت ناخوش ہوئے۔ اور نصیحت آمیز باتیں کر کے ہم سے کہنے لگے۔ جاؤ گھر سے دام لاکر ہمیں سودا لاکر دو۔ اُن کا مطلب تو یہ تھا کہ ہم اپنے گھر سے دام لائیں۔ مگر یہ فقرہ سنتے ہی ہم وہاں سے مڑے اور مُلّانی صاحبہ سے جا کر کہا مولوی صاحب نے سودے کے لئے دام مانگے ہیں آج اُن کے پاس کچھ ہے نہیں۔ مُلّانی صاحبہ نے ہمیں ایک معتبر قاصد سمجھ کر ایک روپیہ نکال کر دے دیا۔ ہم فوراً بازار آئے اور سودا خرید کر مولوی صاحب کے پاس اطلاع دینے پہنچے کہ سودا خرید لائے ہیں سودا دیکھ کر فرمانے لگے "بیٹا آج دیر ہو جانے سے گوشت تو ملا نہ ہوگا کہیں مرغی مل جائے تو لے کر دے آنا ہمارے پاس کوئی ۱۰، ۱۱ بجے تھے۔ وہیں پڑوس سے ایک مرغی خرید کر مُلّانی کو دے دی اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب نے مرغی کا حکم دیا تھا۔ بہت عمدہ پکائیے گا۔ ہم تو اس کے بعد مدرسے آ گئے۔ مولوی صاحب شام کو گھر پہنچے تو اُنھیں یہ قصہ معلوم ہوا بہت غصہ ہوئے اور بولے "سودے کے پیسے تو گئے ہی تھے ایک روپیہ اور

دھرے گیا۔ بیوی کو ڈانٹا ہمارے گھر آئے ہم تو پہلے ہی ستے تاڑ گئے تھے۔ مولوی صاحب کے ہاتھ آنے والے کب تھے مدرسے میں چوتھے روز ملاقات ہوئی تو غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور ہم سے مدرسے میں لڑکوں کے سامنے زیادہ صاف صاف کہہ بھی نہیں سکتے تھے کچھ دبی زبان سے کہا تو ہم نے نہایت ادب سے جواب دے دیا کہ آپ نے تو ایسا حکم دیا تھا ہم کیا کریں اس روز سے انھوں نے پھر ہم سے کبھی نہ سودا منگایا اور نہ کسی اور کام سے بازار بھیجا۔ دل میں ہم سے ناراض رہتے تھے اور جب کبھی ان کے گھنٹوں میں لڑکوں نے شور کیا تو انھوں نے بجائے اس کے کہ مجرم کو سزا دیں ہم پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا بھی کہ ہماری کیا خطا ہے تو فرماتے کہ ہم کچھ نہیں جانتے ہمارے درجے میں کوئی شرارت یا شور کرے گا تو جو ہمارے قریب ہوگا ہم اُسے ماریں گے۔" چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہم اُن کے گھنٹے میں لڑکوں کو چپ اور خاموش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا سزا دینے کا یہ اصول بالکل نیا تھا۔ افسوس کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ خدا مغفرت کرے

ایک آدمی

محمد صالح - درجہ دوم - عمر ۸ سال ۹ ماہ - تعلیمی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

ایک آدمی تھا اُس کے ایک لڑکی تھی۔ وہ اُس کا سب کام کاج کیا کرتی تھی۔ ایک دِن جب وہ اپنے کام سے گھر واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی مُردہ پڑی ہے۔ اُسے بہت اچنبھا ہوا اس نے کہا کہ میری لڑکی مر گئی اب مجھے کون روٹی سالن پکا کر دے گا۔ کہ پھر لڑکی زندہ ہو گئی۔ اور کہا میں تو یہ ہوں

میں تو مُردہ بن گئی تھی۔ اب آدمی کو بہت اچنبھا ہوا کہ ابھی تو وہ مردہ تھی اور ابھی زندہ ہو گئی۔ لڑکی بولی میں نے تو سانس روک لیا تھا آپ نے تو مردہ ہی سمجھ لیا۔

صحرا

محمد خلیق الزماں۔ اندور

خشک اور جلی ہوئی زمین جہاں نہ ندی نالے ہوں نہ لہلہاتے کھیت بلکہ جہاں تک نظر کام کرے ریت ہی ریت دکھائی دے۔ چھوٹے چھوٹے درخت یا ذرا ذرا سی جھاڑیاں کہیں کہیں ہوں بس یہی صحرا ہے۔

دنیا میں بہت سے صحرا ہیں۔ سب سے بڑا صحرا افریقہ میں ہے۔ آسٹریلیا میں بھی ایک وسیع صحرا ہے۔ عرب میں بھی اور ہندوستان میں بھی سندھ اور راجپوتانہ کا صحرا مشہور ہے۔

صحرا بنجر کیوں ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش بالکل نہیں ہوتی۔ زمین تپ کر بالکل خشک ہو جاتی ہے اور صحرا بن جاتی ہے۔ صحرا کو ریت کا سمندر کہتے ہیں۔ ریت کے سمندروں کو عبور کرنا دشوار کام ہے۔ سوائے صحرائی جہاز کے کسی چیز سے اُسے عبور نہیں کر سکتے۔ صحرائی جہاز کون ہے؟ اونٹ خدا نے اُسے اس طرح بنایا ہے کہ بلا تکلف صحراؤں کو طے کر جاتا ہے۔ صحرا میں بعض بعض جگہ درخت اُگے ہوتے ہیں۔ وہاں پانی بھی ملتا ہے۔ وہاں جاندار رہ سکتے ہیں ایسے مقامات کو نخلستان کہتے ہیں۔ قافلہ والے ایسے ہی مقامات پر منزل کرتے ہیں یہاں آدمیوں اور جانوروں کے لئے کھانے پینے اور آرام کرنے کا سامان قدرت کی طرف سے مہیا ہوتا ہے۔

اس ترقی کے زمانے میں صحرا میں رہنے والے لوگ ایک ترکیب سے جہاں چاہتے ہیں نخلستان بنا لیتے ہیں بڑے بڑے کی طرح کا اوزار سے کر زمین میں سوراخ کر لیتے ہیں اس میں سے پانی نکل آتا ہے۔ پانی سے زمین کو سیراب کر کے زرخیز بنا لیتے ہیں پھر یہی زمین آہستہ آہستہ نخلستان بن جاتی ہے۔ صحرائے بلوچستان میں اس قسم کا نخلستان ہے۔

صحرا میں سخت آندھیاں آتی ہیں۔ ان کو صحرائی طوفان کہتے ہیں۔ اس سے قافلے کے قافلے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ مسافروں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک چیز بادِ سموم ہے۔ جب بادِ سموم چلتی ہے۔ قیامت آ جاتی ہے۔ ریت کے بادل کے بادل اُٹھتے ہیں۔ آسمان میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اونٹ زمین پر لیٹ جاتے ہیں نتھنے بند کر لیتے ہیں۔ آدمی چادر سے منہ ڈھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ راستے کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا۔ صحراؤں میں ایک اور عجیب بات ہے مسافر دور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ سامنے کھجور کے درخت ہیں اور پانی لہریں مار رہا ہے مگر جب اس کی طرف جاتا ہے تو وہ نظارہ نظر سے غائب ہو جاتا ہے اور ریت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

بہار

سید علی عباس رضوی

دُور جنگل کے ایک کنارے ایک جھونپڑا کمان کی طرح جھکی چھت کو اُٹھائے کھڑا تھا۔ فرش پر آگ جل رہی تھی۔ ایک عجیب شکل کا بڈھا آگ کے قریب اپنی چٹائی سمیٹے بیٹھا تھا۔ اس کے بال پالے کی طرح سفید تھے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں اور پیٹھ میں ایک چھوٹا سا کُبھ نکلا ہوا تھا۔

بوڑھے نے ایک لکڑی گٹھر میں سے اُٹھائی اور آگ میں رکھ دی۔ جنگل کی تیز ہوا ننگے درختوں سے ٹکراتی گذر رہی تھی۔

بوڑھا ساری رات آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی چٹائی اور آگ کے قریب کرلی۔ اُسے سردی لگ رہی تھی۔ صُبح ہونے سے پہلے وہ اپنی آخری لکڑی بھی جلا چکا تھا۔ "یہ میری آخری لکڑی ہے۔ اب میں کیا کروں گا۔ جب یہ بھی جل جائے گی۔ آگ ٹھنڈی پڑجائے گی"

اُس نے اپنا سر اپنے بازوؤں پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کے سفید بال اس کے چہرے پر گر پڑے اور اُسے ڈھانپ لیا۔ آگ ختم ہورہی تھی۔

ہو۔۔۔و۔۔۔و۔۔۔و۔۔۔ ہوا دیو کی طرح چلاتی چیختی پھر رہی تھی۔ شاید کوئی آرہا ہے۔ اُس نے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ دروازے پر ایک خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کے کالے بال ایڑیوں تک پڑے تھے پھولوں سے سارا سر چھپا تھا۔ بوڑھے نے اُس سے جھجکتے ہوئے اندر آنے کو کہا۔ اور کپکپاتے ہونٹوں سے پوچھا "کون ہو تم؟ میں تو جاڑا ہوں اور سردی لاتا ہوں" لڑکی مسکرائی اور جھونپڑے میں آکر کہنے لگی "میں بہار ہوں، میرے آنے سے پھول کھلنے لگتے ہیں" "چلی جاؤ!" بوڑھے نے کڑک کر کہا "میں تمھیں ابھی سردی سے ٹھٹھرا دوں گا" اُس نے اپنی چلم بھری۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے بادل ہوا میں اُڑاتے ہوئے کہنے لگا "میں جب آتا ہوں تو .... برف گرنے لگتی ہے! کہرا پڑنے لگتا ہے! اور سمندر، جھیل، دریا برف سے پٹ جاتے ہیں! دنیا سنسان ہوجاتی ہے" لڑکی

نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " میری سانس سے
ہوا سہانی ہو جاتی ہے۔ دریاؤں سے برف گھلنے
لگتی ہے۔ چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں۔ پھولوں کی بارش
ہونے لگتی ہے۔"

بوڑھا غصے سے کانپنے لگا۔ اُس نے غصے
میں بھر کر جواب دیا " میں جب چلتا ہوں تو سرد
ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ درختوں سے پتیاں گرنے
لگتی ہیں۔ گھاس برف سے دب جاتی ہے۔ یہ سب
کیوں ؟ اس لئے کہ جاڑا آ جاتا ہے۔" لڑکی اکڑ کر
کہنے لگی " جب میں آتی ہوں سورج چمکنے لگتا ہے
درختوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔ پھول کھلنے لگتے
ہیں۔ ہوا سہانے گیت گانے لگتی ہے کیوں کہ
بہار آ جاتی ہے!" یہ کہتے ہی اُس نے بڈھے کو چھوا۔
اُس کا سر جھک گیا آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ فرش پر
گر پڑا اس کے منہ سے پانی بہنے لگا۔ بال پگھل کر بہہ گئے
جھونپڑا گر پڑا۔ لڑکی چلی گئی۔

سہانی ہوائیں چلنے لگیں درختوں نے جھومنا
شروع کیا۔ پھولوں نے اس کا یہ استقبال کیا کہ جہاں جاتی پھول کھلتے۔

(ترجمہ)

پچھلے مہینے کئی ہفتوں سے اخباروں میں یوگوسلاویہ کی خبریں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں آرہی تھیں۔ بلقان کی ریاستوں میں یہ ہے تو ایک چھوٹی سی ریاست مگر ایسی جگہ واقع ہے کہ موجودہ لڑائی میں اسے بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

یوگوسلاویہ اصل میں ایک ملک نہیں ہے۔ نہ اس کا یہ نام کوئی پرانا نام ہے۔ بلکہ اب سے کوئی بیس سال پہلے اور پچھلی بڑی لڑائی کے بعد سربیا اور مانٹی نگرو دو پرانی ریاستوں اور اُن کے علاوہ آسٹریا ہنگری کے کئی صوبوں کروشیا، بوسنیا۔ دلماتیا ودادیا کو ملا کر ایک ملک بنا دیا گیا اور اس کا نام رکھا گیا "سرب کروٹ اور سلاوی قوموں کی سلطنت"۔ اس کا موجودہ نام یعنی یوگوسلاویہ بہت بعد ۱۹۲۹ء میں رکھا گیا۔

یوگوسلاویہ کا رقبہ بچانوے ہزار مربع میل ہے۔ اور آبادی ایک کروڑ چھپن لاکھ۔ دارالسلطنت بلگریڈ ہے۔ اس ملک میں مختلف قومیں آباد ہیں۔
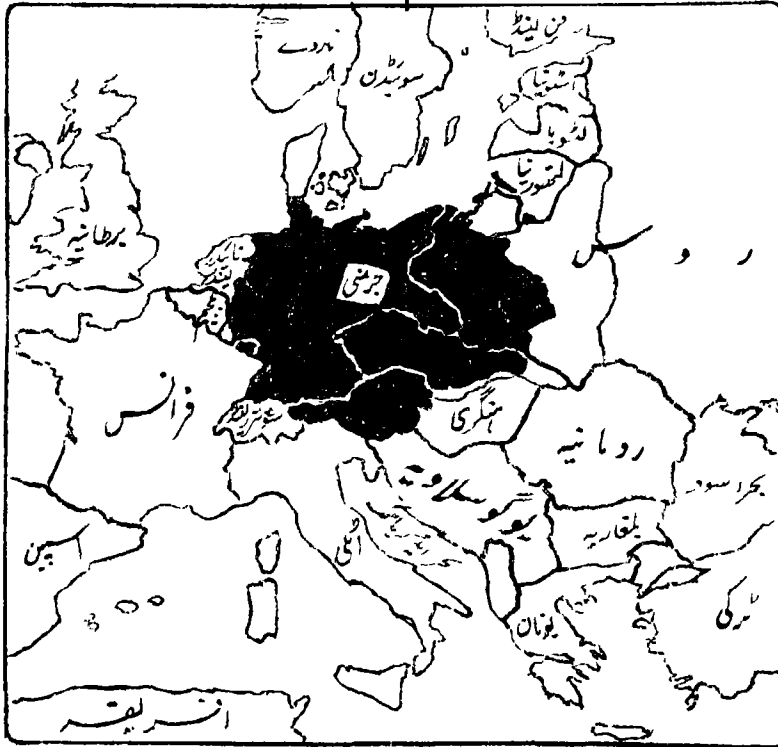
۱؎ یورپ کا پورا نقشہ اس لئے دیا گیا ہے کہ تمہیں آسانی سے معلوم ہو جائے کہ یورپ میں یوگوسلاویہ کس جگہ ہے۔

۶۵ لاکھ تو سرب ہیں۔ ۴۰ لاکھ کروٹ۔ ۱۰ لاکھ سلاو
۵ لاکھ ۵۰ ہزار ہنگری کے رہنے والے۔ ۳ لاکھ جرمنی
البانیہ، بلغاریہ میسیڈونیا وغیرہ کے رہنے والے
اور کوئی ۱۵ لاکھ مسلمان۔ ان قوموں کی عادتیں، رہنے
سہنے کے طریقے (یعنی تہذیب و تمدن) الگ الگ
ہیں۔ اور شاید اسی لئے ان مختلف قوموں میں ہمیشہ
لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ اس آپس کے جھگڑے کی وجہ سے
آج سے بارہ برس پہلے وہاں کے بادشاہ نے حکومت
کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اور ملک
کا نام یوگوسلاویہ رکھ دیا۔

یوگوسلاویہ کوئی ایسا بڑا ملک تو ہے نہیں۔ نہ
کچھ ایسا دولت مند ہے۔ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی
کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے سیسے اور تانبے
کی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ مگر ہم پہلے لکھ چکے
ہیں کہ آج کل کی لڑائی میں اسے خاص اہمیت حاصل
ہو گئی ہے۔ اس اہمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ
اس کے اور اٹلی کے درمیان بس بحرِ ایڈریاٹک
حائل ہے۔ جرمنی بحرِ ایڈریاٹک سے بہت آسانی
کے ساتھ بحرِ روم میں اپنے دوست اٹلی کے پاس
پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے جرمنی یوگوسلاویہ کے
راستے سے یونان پر بڑی آسانی سے حملہ کر سکتا
ہے۔ تیسرے جنوبی اور شمالی یوگوسلاویہ کی سرحدیں
جرمنی کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ اور جرمنی بڑی سہولت
سے اپنی فوجیں اور فوجی سامان اِدھر سے اُدھر لا
اور لے جا سکتا ہے۔ اسی لئے انگریز اور جرمنی دونوں
اس کوشش میں تھے کہ یا تو یوگوسلاویہ کو غیر جانب دار
رکھا جائے یا اُسے اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ جرمنی نے
کسی نہ کسی طرح ساز باز کر کے یوگوسلاویہ کو اپنی طرف
ملا بھی لیا۔ مگر ملک کے لوگ جرمنی کے خلاف تھے انھوں
نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔ آخر کار وہاں کی حکومت
کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اور اس کی جگہ عام لوگوں کی مرضی
کے مطابق نئی حکومت بنی۔ جرمنی اپنے بنے ہوئے کام
کو یوں بگڑتے ہوئے دیکھ کر بہت جھلایا اور اُس نے
پوری طاقت سے یوگوسلاویہ پر حملہ کر دیا۔ یوگوسلاویہ
کی فوج نے جرمنی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر تم
ہی سوچو ایک تو اس ننھے سے ملک کی جرمنی کے مقابلے
میں بساط ہی کیا۔ پھر آج کل کی لڑائی تو سائنس کی
لڑائی ہے۔ اور یوگوسلاویہ کے پاس لڑائی کا وہ نئے
سے نیا سامان نہیں ہے جو جرمنی کے پاس ہے۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ جرمنی نے زبردستی اُس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اب بھی یوگوسلاویہ کی فوجیں جہاں موقع پاتی ہیں
جرمنی کی فوجوں پر حملہ کر دیتی ہیں اور جرمنی کی فوجوں
کو بہت نقصان پہنچاتی ہیں ✦

الطاف علی صاحب نگراں ورزش جسمانی جامعہ نگر۔ اوکھلا

تعداد :- ۱۰ تا ۵۰

جگہ :- ایک کشادہ کمرہ۔ صحن۔ کھیل کا میدان

طریقہ :- ۲، ۴، ۶ یا ۸ کھلاڑیوں کو کمرے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا جائے۔ باقی کھلاڑیوں کو دو قطاروں میں آمنے سامنے کھڑا کر لیا جائے۔ اس طرح کہ ایک کھلاڑی کے ٹھیک سامنے دوسرا کھلاڑی ہو۔ پھر بیچ میں کم از کم ۳ فٹ کا فاصلہ ہو۔ آمنے سامنے کے کھلاڑی اپنا ایک ایک پاؤں آگے بڑھائیں اور انگوٹھوں کو ملالیں۔ اس کے بعد دروازہ کھول کر ایک باہر کے کھلاڑی کو اندر بلایا جائے۔ قطاروں کے ایک سرے پر لے جاکر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ دونوں قطاروں کے بیچ میں سے اس طرح گذرے کہ کسی کے پاؤں پر اس کا پاؤں نہ آئے۔ اس کے بعد قطار کے کھلاڑیوں سے اشارے سے کہا جائے کہ وہ اپنے اپنے پاؤں کو بیچ میں سے ہٹالیں۔ جب آنکھوں پر پٹی والا کھلاڑی ان کے بیچ میں سے گذرے گا تو وہ قدم پھونک پھونک کر رکھے گا۔ اس طرح باہر کے تمام کھلاڑیوں کو باری باری اندر بلا کر کھیل کو جاری رکھا جائے اور لطف اٹھایا جائے۔

احتیاط :-

(۱) کسی کھلاڑی کو یا کم از کم باہر والے کھلاڑیوں کو کھیل کے متعلق پہلے سے کسی قسم کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) پاؤں ہٹانے کا اشارہ کرنا چاہیے۔ زور سے نہیں کہنا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ قطاروں والے کھلاڑیوں کو پہلے ہی سے ہدایات دی جائیں کہ وہ فلاں موقع پر اس طرح کریں۔ تاکہ اشارہ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔

عزیز بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔ اب تو تم سب اپنے اپنے امتحان سے فارغ ہوگئے ہوگے۔ بعض بچوں نے تو ہمیں امتحان میں پاس ہونے کی خوش خبری بھی بھیجی ہے۔ ہم ان سب بچوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔

یورپ[1] میں لڑائی کا بازار پھر گرم ہوگیا ہے۔ ابھی ایک مہینہ پہلے تو بس افریقہ میں انگریزوں اور اٹلی والوں میں چھڑی ہوئی تھی اور اٹلی کی فوجیں ہر جگہ ہار رہی تھیں۔ یا پھر یونانیوں اور اٹلی والوں میں لڑائی ہو رہی تھی اور یونانی بہادروں نے اٹلی والوں کو پریشان کر دیا تھا۔ جرمنی اب تک بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کو پھسلانے میں لگا ہوا تھا۔ بلغاریہ کو تو اس نے اپنی طرف کر بھی لیا، یوگوسلاویہ بھی اس کے کہنے میں آگیا۔ مگر اس ملک کے تمام لوگوں نے حکومت کی بات نہیں مانی۔ یہاں تک کہ یوگوسلاویہ کی وزارت کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اور نئی وزارت بنی جس نے جرمنی اور یوگوسلاویہ کے معاہدے کو ٹھکرا دیا۔ اب تک وہاں نوعمر شاہزادہ پیٹر کے چچا شاہزادے کی طرف سے حکومت کر رہے تھے۔ اب خود شاہزادے نے حکومت ہاتھ میں لے لی۔ جرمنی کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور اس نے پوری طاقت سے یوگوسلاویہ پر حملہ کر دیا۔ اب یہ بے چارا ننھا سا تو ملک ہے، پھر انگریزوں کی مدد بھی وقت پر اور پورے طور پر پہنچنے نہ پائی اور جرمنی کی فوجوں نے زبردستی اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یوگوسلاویہ کی فوجوں نے ابھی ہار نہیں مانی ہے اور جہاں موقع ملتا ہے جرمنی کی فوجوں کو پریشان کرتی ہیں۔ یوں سمجھو کہ گوریلا وار لڑ رہی ہیں۔ جرمنی نے یوگوسلاویہ کو پورے طور پر فتح کرنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور یونان پر چڑھ دوڑا۔ اب یونان میں بہت سخت لڑائی ہو رہی ہے۔ انگریز بھی یونانیوں کی پوری مدد کر رہے ہیں اسی لئے اسے فتح کرنے میں جرمنی کو بہت دقت پیش آرہی ہے۔ بے شمار جرمن سپاہی اب تک کام آچکے ہیں باوجود اس کے ملک کے تھوڑے حصے پر قبضہ کر پائے ہیں۔ آج ۲۴ اپریل تک کی خبر یہ ہے کہ لڑائی بہت شدت سے جاری ہے۔ یونان کا بادشاہ اپنے دارالسلطنت سے کریٹ چلا گیا ہے۔

افریقہ میں انگریزوں نے اٹلی کو ہر جگہ بری طرح شکست دی ہے۔ حبشہ سے اٹلی کی فوجیں یوں سمجھو کہ بالکل ہی بھاگ

[1] یوگوسلاویہ والے مضمون میں یورپ کا نقشہ شائع کیا گیا ہے اسے ضرور دیکھ لینا۔

گئی ہیں۔ اس لئے کہ اب بہت تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی ہے۔ جہاں اٹلی والوں کا قبضہ ہے اور جب تک پیام تعلیم تمھارے پاس پہنچے گا حبشہ اٹلی والوں سے پاک ہو چکا ہوگا ہیل سلاسی شاہ حبشہ حبشہ کے دارالسلطنت ادیس ابابا میں داخل ہو گئے ہیں اور ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

دوسری طرف جرمنی اٹلی کی مدد کو پہنچ گیا ہے۔ دونوں نے مل کر ایک مقام بن غازی پر قبضہ کر لیا ہے۔ انگریز اور ہندوستانی فوجیں بڑی بہادری سے دشمن کے حملے کو روک رہی ہیں۔ ادھر بلقان کی ریاستوں میں ترکی ابھی تک غیر جانب دار ہے۔ جرمنی اور برطانیہ سے بات چیت کا سلسلہ مدتوں سے جاری ہے۔ بظاہر تو اس کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف ہے۔ لیکن آخری فیصلے کا انتظار ہے۔

ادھر ہندوستان کے پورب میں جاپان نے بہت گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ چینیوں کو وہ برابر دبا رہا ہے۔ وہ جرمنی کا ساتھی ہے۔ روس سے بھی اس کا معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس معاہدے سے شاید ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ روس اب چین کی زیادہ مدد نہ کر سکے گا۔ دوسرے امریکہ اور برطانیہ سے اس کی لڑائی ہوئی تو اطمینان سے لڑ سکے گا امریکہ اور برطانیہ بھی اس بات سے بے خبر نہیں ہیں۔ برطانیہ نے سنگاپور میں پورا انتظام کر لیا ہے۔ برما میں بھی پورا انتظام ہو رہا ہے۔ انگلستان اور جرمنی پر ہوائی حملے برابر ہو رہے ہیں کبھی کبھی یہ بہت شدید ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے شہریوں کے جان و مال کو ان حملوں سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔

ادھر ہندوستان میں ستیہ گرہ برابر جاری ہے۔ حکومت اور ہندوستانیوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ بمبئی میں اسی لئے ایک کانفرنس بھی ہو چکی ہے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا ہے۔ ڈھاکہ اور احمد آباد میں ہندو مسلمانوں میں بہت سخت فساد بھی ہو چکے ہیں۔ بہت سے لوگ بے قصور مارے گئے۔ بہت سے زخمی پڑے ہیں اور ہزاروں، لاکھوں کا مالی نقصان ہو چکا ہے۔ ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا ہندو مسلمانوں کو سمجھ دے۔

پچھلے مہینے جامعہ نگر اوکھلا میں دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی۔ مشہور قومی لیڈر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ تمام ہندوستان سے کوئی تین سو سے زیادہ نمائندے شریک ہوئے۔ ان سب نے بچوں کو پڑھانے کے بارے میں بہت اچھی اچھی تجویزیں سوچیں۔ تعلیمی نمائش بھی ہوئی اس میں مختلف صوبوں کے مدرسوں کی بنائی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ نمائش بھی بہت اچھی تھی

معمّا نمبر ۱ کے حل ان بچوں کے صحیح ہیں[۱]۔

صحیح حل اوّل انعام فی کس ۱۲

(۱) مبارک زماں خاں۔ قائم گنج

محمد صدیق قریشی۔ نئی دہلی

[۱] شوالہ بہت سے بچوں نے الف سے لکھ کر بھیجا ہے۔ معمّا بنانے والے صاحب نے اسے ہ سے لکھا تھا۔ مگر آج کل الف سے لکھنے کا بھی رواج ہو گیا ہے اس لئے انھوں نے اسے غلطی شمار نہیں قرار دیا

(۳) سید عطاء الرحمٰن بہاری - دہلی
(۴) سید مصور حسین - دہلی
(۵) صالحہ خاتون - دہلی

ان بچوں کے حلوں میں ایک غلطی ہے۔

انعام فی کس ۲۰

(۱) احمد ابراہیم صدیقی - دیوکنڈہ
(۲) خلیل الرحمٰن قدوائی - بارہ بنکی
(۳) ماسٹر رزی ٹھکرال - سیتاپور
(۴) محمد عبد الباری - بلند شہر
(۵) عتیق الرحمٰن - بڑا گاؤں
(۶) وارث رشید قدوائی - تعلیمی مرکز - دہلی
(۷) محمد مسعود - علی گڑھ
(۸) سرتاج بیگم - دہلی
(۹) یقار اللہ عثمانی - جامعہ نگر
(۱۰) سید محمد عمر دربھنگہ
(۱۱) عبد الجلیل - بہار شریف
(۱۲) احسن حسن علوی - لکھنؤ
(۱۳) جمیل احمد - بہار شریف
(۱۴) سید عطاء الرحمٰن - دہلی
(۱۵) سراج المستحسن - جامعہ نگر
(۱۶) نور احمد - دہلی
(۱۷) عبد المالک - دہلی
(۱۸) جمشید اختر - سائیکل اسٹریٹ
(۱۹) احمد حسن - دہلی
(۲۰) محمد عزیز الحسن - مرزاپور
(۲۱) محمد اسماعیل خان - حیدرآباد دکن
(۲۲) عثمان بیگ - حیدرآباد دکن
(۲۳) محمد لئیق احمد صدیقی - دہلی
(۲۴) ماجد علی زیدی - دہلی

پچھلے پرچوں میں پیامیوں سے ہم نے خواہش کی تھی کہ معمّے کے بارے میں اپنی رائے اور تنقید ضرور بھیجا کریں - مگر بہت کم بچوں نے اس طرف توجہ کی ہے - اُمید ہے کہ معمّا نمبر ۱۸ میں بچے اپنی رائے ضرور بھیجیں گے

تمہارا محمد حسین حسان

بچوں کا تحفہ

معما نمبر ۱۸

پہلا انعام ۶ روپے

دوسرا انعام للعہ

مشقی کوپن

۵	■	ب	۴ ی	۳ و	ت	۲ ا	۱ س
ق	۷	■		۶	■		
ل	۱۰	■	ی	ر	۹	۸ پ	■
■	ت	۱۳	۱۲ م	■	ن		۱۱ ن
۱۷ ن		۱۶ ا	■	۱۵ م	ا	ر	۱۴ ا
ا	■	ح	۱۹ ر	۱۸	■	■	و
ص	■	د		۲۱ ع	■	ج	۲۰ ا
	■	■	ش		۲۲	■	

دائیں سے بائیں

(۱) ۱۷ اپریل سے تعلیمی مرکز جامعہ میں ...... جماعت بھی کھل گئی ہے۔

(۶) اس تک (الٹا)

(۷) ہمیشہ .. بات کہنی چاہیے۔

(۸) برطانیہ کے پاس اگر ... طاقت نہ ہوتی تو موجودہ جنگ میں رکنا ذرا مشکل ہی تھا۔

(۱۰) اولاد

(۱۱) سچ ہے کہ ... نہیں تو جان نہیں۔

(۱۳) سب کو آتی ہے۔

(۱۴) چاہتا تو ہر شخص یہی ہے کہ .... سے زندگی بسر کرے

(۱۶) آج کل دنیا کے ... کو خطرے میں ڈالنے کی ذمہ داری زیادہ تر ہٹلر پر ہے۔

(۱۸) حسرت موہانی نے غالب کے کلام کی بہت اچھی ... لکھی ہے۔

(۲۰) .. نقد کل اُدھار

(۲۱) ایک خاص لکڑی کا نام جو سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔

(۲۲) بعض اوقات انسان انتہائی .... میں بھی اپنے کام بگاڑ لیتا ہے۔

اوپر سے نیچے

(۱) .. کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
غالب

(۲) ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا .... ہو جو جنگ کی صحیح خبریں دیتا ہو۔

(۳) جو پہلے ... کرے اسی کی جیت ہے۔

(۴) دنیا کے اکثر بڑے آدمی بچپن ہی میں .... ہو گئے ہیں۔

(۵) بچے کے ہر کام میں کچھ نہ کچھ اس کا دخل بھی ہوتا ہے

(۷) ایک اسمی کا نام ہے۔

(۹) اس کا عطر مشہور ہے۔

(۱۱) ایسے شخص کو لوگ ذرا مشکل ہی سے دوست بناتے ہیں۔

(۱۲) اللہ .... ہے۔

(۱۵) شمع کی جمع (بے ترتیب)

(۱۷) اگر بچے کو ابتدا ہی میں اچھا .... مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔

(۱۸) مشہور نوجوان شاعر

معمّا بنانے والے صاحب کا خیال تھا کہ اب کے صحیح حل بہت کم آئیں گے اِس لئے اُنھوں نے ہر صحیح حل پر انعام کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اُن کا خیال غلط نکلا اور بہت سے لڑکوں کے حل صحیح آئے اس کا مطلب یہ ہے کہ بچّے اِس کو سمجھ گئے ہیں کہ معمّا کس طرح حل کرنا چاہیے۔ اور معمّا بنانے والے صاحب کو اِس بات کی بہت خوشی ہے۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچّے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اُستاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ آٹھ حلوں کی ۶ ہے۔

(۴) دونوں انعام تقسیم کر دئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

(۵) تمام حل ۱۸ مئی تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔

(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۷) پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔

(۸) کوپن کے چاروں طرف جو نقطے والی لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔

(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مِٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مُقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

(۱۰) ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمّے آنے چاہئیں۔

(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہیے

(۱۲) معمّا حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔

(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

(۱۴) دال اور واؤ کا فرق نمایاں ہو (د ۔ و)

(۱۵) چھوٹی ی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے۔ (ی ۔ ے)

(۱۶) جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے۔

(۱۷) اِملا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں۔

(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔

(۲۰) پتہ :- سب ایڈیٹر پیام تعلیم، مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

معمّا نمبر ۷ا کا صحیح حل

۴م	۳ہ	■	ہ	۲ع	م	ا	۱ج
ض	ر	۵م	■	س	■	■	ا
ر	■	■	ت	ر	۸آ	۷د	۶م
■	ر	۱۰س	■	ت	د	ز	۹ع
■	ل	ک	۱۲ش	■	ل	۱۱ر	■
■	ہ	و	ش	۱۴ل	۱۳ا	■	■
۱۷ج	■	ن	■	ا	ن	۱۶و	۱۵ر
س	۱۹خ	■	ق	۱۸د	■	ہ	■

وسیم الدین آگرہ

محمد ثناء اللہ چغتائی

ڈیرہ اسماعیل خاں

نہا رہے ہیں

(مرسلہ عبدالواحد بمبئی)

جگ سلائی تالاب کا ایک نظارا

(مرسلہ فضل محمد ٹاٹا نگر)

Regd L. No. 1961

بچوں کے لئے یہ دونوں مزے دار کہانیاں ابھی ابھی چھپی ہیں ہر ایک کی قیمت ۴/-

پرندوں کا ایکا

ننّھا ٹٹّو

مکتبہ جامعہ دہلی

پیامِ تعلیم
جون ۸۲
مکتبہ جامعہ دہلی

سنکری ریت کے بوروں کے بنے ہوئے دروازے میں (ہوائی بچاؤ)

ہوا مار توپ
(ہوائی بچاؤ)

حقہ

مرسلہ عبدالصمد بمبئی

نزاکت حسین شکوہ آباد

فہرست مضامین جون سنہ ۴۱ء

FIROZA

پرنٹر وپبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی ۔ محبوب المطابع پریس دہلی ۔

پچھلے پرچے میں ایک مضمون چھپا تھا مرین ڈرائو مضمون کے سلسلے میں دو تین تصویریں بھی چھپی تھیں۔ ان تصویروں کے نیچے مرین ڈرائو لکھ دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تصویریں اس مضمون (مرین ڈرائو) کے سلسلے کی ہیں۔ مگر بعض بچوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ عمارتیں بھی مرین ڈرائو ہی میں ہیں۔ حالانکہ یہ شہر کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب ان بچوں کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

کچھ عرصے سے لڑائی کے ہتھیاروں اور سامان پر عزیزی عبدالحسیب سلمہٗ کے مضمون شائع ہو رہے ہیں۔ یہ وقت کی چیز ہے اور سبھی پیامی اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ ان مضمونوں کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رہے گا۔ ہم عبدالحسیب صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیامی بھائیوں کے لئے ایسے مفید اور دلچسپ مضمون اس قدر محنت اور توجہ سے لکھتے ہیں۔

اس پرچے میں یوں تو سبھی مضمون اچھے ہیں۔ مگر کانٹ۔ ننھی سمدھن۔ اور ادکھلے سے غازی آباد خاص طور پر مفید اور دلچسپ ہیں۔ اُمید ہے کہ پیامی انھیں دلچسپی سے پڑھیں گے۔

اس مرتبہ بچوں کی کوششوں کے لئے دو ہی صفحے نکل سکے ہیں اور کئی مضمون باقی ہیں۔ یہ اگلے پرچے میں چھپیں گے۔ بچے اپنے مضمون بہت صاف اور خوش خط لکھ کر بھیجیں۔ مضمون جتنا مختصر ہوگا۔ اتنا ہی جلد چھپ سکے گا۔

پیامی تصویریں چھپنے کے لئے برابر بھیجتے رہتے ہیں مگر یہ عموماً یا تو بہت معمولی درجے کی ہوتی ہیں یا پھر ایسی خراب چھپی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کا بلاک اچھا نہیں بن سکتا۔ تصویریں جس قدر گہرے کالے اور چمکیلے رنگ کی ہوں گی اتنا ہی اُن کا بلاک اچھا بنے گا۔

ٹائٹل کے لئے تصویر بھیجتے وقت پیامی چند باتوں کا خیال رکھیں۔ تصویر ٹائٹل کے تصویر والے چوکھٹے سے کسی قدر بڑی ہو۔ لمبائی چوڑائی سے بہرحال زیادہ ہو ص

ص تصویر یا تو کسی خاص منظر کی ہو یا کسی خاص تاریخی عمارت کی۔

مادرِ دکن

حضرت بڑی بیگم صاحبہ قبلہ (مادر دکن) والدہ محترمہ حضور نظام مدظلہٗ العالی کا انتقال بروز یک شنبہ بتاریخ ۱۳ اپریل ۱۹۳۷ء مطابق ۱۵ ربیع المنور ایک بج کر ۴۰ منٹ پر ہوا۔

اِنّا للہ و اِنّا اِلیہ راجعُون ط

انتقال پُرملال کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام مدظلہٗ العالی کا فرمان جو شائع ہوا اس میں سے کچھ حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"میں بصد دلی قلق یہ اعلان کرتا ہوں کہ میری حقیقی والدہ صاحبہ قبلہ جن کا نام اُمتہ الزہرا بیگم تھا، بہ عُمر ۰۰ سال کم و بیش ۲ ماہ علالت کے بعد قضا کر گئیں۔ انا للّٰہ و انّا الیہ راجعوں۔ گذشتہ سال ان پر بیماری کا جو سخت حملہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی جاں بری کی توقع کم تھی مگر چونکہ عُمر کے دن ان کے پورے نہیں ہوئے تھے لہذا ان کو صحت نصیب ہوئی۔ مگر ساتھ ہی اس دور میں ان کی صحت جیسی چاہئے ویسی نہیں رہی۔ اس کی وجہ کبر سنی و اضمحلال قویٰ اور سابق میں اصل مرض ذات الجنب تھا (دوسرے مضر اجزا کی شرکت کے ساتھ) اور اس دفعہ تپ لازم تھی (بوجہ خرابی جگر و گردہ وغیرہ)، مگر حالت دفعتہً جو خطرناک ہوئی تو اس کی وجہ شُشش پر سردی کا حملہ تھا۔ جو کہ اندروں ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی سبب سے جس کی وجہ سے بخار میں بے انتہا حدت بڑھ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے کمزور قلب نے اس حملے کو برداشت نہ کرکے جواب دے دیا یعنی اُن کی رُوح نے اعلیٰ علّیین کی طرف یوم یک شنبہ ۱۵ ربیع الاوّل شب کے ڈیڑھ بجے پرواز کی۔ اور اس آسانی کے ساتھ اُس نے جسم سے مفارقت کی کہ دیکھنے والوں کو اس کا احساس بھی نہ ہوسکا کہ کب اور کس طرح سے یہ نکل گئی جو کہ نیک بختوں کے حصّے میں ایسی "مرگ سعادت" آتی ہے۔

خیر مضطے ما مضطے کہ ہر ایک جان دار کو ایک نہ ایک دن موت کا سامنا کرنا ہے کہ بغیر اس کے چارہ کار نہیں۔ دوسری طرف الحمد للہ کہ جملہ مراتب دینوی ان کو حاصل ہو چکے تھے (دو دورِ حکومت میں) لہٰذا مزید کسی دوسری نعمت کے حصول کی تمنا باقی نہیں رہی تھی اور اگر بالفرض کوئی تمنا تھی تو ایک ہی امر کی کہ جس طرح سے اُن کے بیٹے نے ان کے عین حیات ان کی خدمت کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ آخری خدمت بھی (منزلِ مقصود تک کی) وہی انجام دے کہ اکثر اس کی دعا مانگتی رہتی تھیں اور یہ دعا قبول ہوئی۔"

محترمہ بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ مذہب کی بہت پابند تھیں۔ خیر خیرات بھی زیادہ کرتی تھیں۔ اعلیٰ صفات کی نیک بی بی تھیں۔ اسی وجہ سے عوام آپ کو مادرِ دکن کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں
انتقال پرانی حویلی میں ہوا۔ اسی میں آپ رہتی تھیں۔ نمازِ جنازہ بھی وہیں ادا کی گئی تجہیز و تکفین مسجد جودی میں عمل میں آئی۔

جس وقت لوگوں کو یہ خبر پر ملال پہنچی ہر ایک نے اپنا اپنا کاروبار بند کر دیا اور پرانی حویلی کے چاروں طرف جمع ہونا شروع ہوئے۔ ان میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ تقریباً سوا پانچ بجے نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

ساڑھے پانچ بجے جنازہ پرانی حویلی کے باہر لایا گیا۔ جنازے کے ہمراہ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی اور شہزادہ سر اعظم جاہ بہادر وغیرہ پیدل چل رہے تھے۔ مجمع اس قدر تھا کہ راستہ چلنا مشکل تھا۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کو ایک حلقے میں لے لیا گیا۔ حیدرآباد میں اتنا بڑا مجمع کبھی دیکھنے میں نہ آیا کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی نے پیدل چار میل کا سفر طے کیا۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام بندگانِ عالی نے والدہ کی خدمت گذاری کا جو عملی نمونہ قائم فرمایا ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ آپ روزانہ اپنی والدہ ماجدہ کے پاس جاتے تھے۔ بلکہ والدہ ماجدہ کی بیماری میں روزانہ کئی مرتبہ دن رات میں آپ کے پاس جاتے تھے جو ایک مثال تھی کہ ہر ایک فرزند کو کس طرح ماں کی خدمت بجا لانی چاہیے۔

(عبد الحی۔ حیدرآباد دکن)

جناب کامل صاحب ایڈیٹر شاہد بمبئی
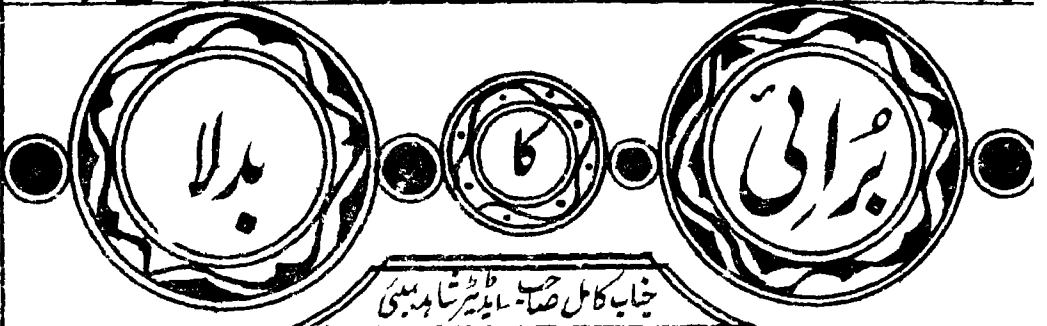
گرمیوں کے تھے مہینے بند تھے کُل مدرسے
تھا مہینہ جون کا ہر اک پریشاں حال تھا
شدتِ گرما سے چوپائے نکالے تھے زباں
پھونکتی تھی سینۂ عالم کو گرمی کی تپش
کوئی بھی باہر نکلنے کا نہ کرتا تھا خیال
فاختہ کے مارنے کا دِھیان تھا اُس کو بندھا
گھر میں چپکے لیٹے لیٹے اُس کا جی گھبرا گیا
چپکے سے پھر اپنی چپل ہاتھ میں لے کر اُٹھا
دوپہر کی وہ ہوائے گرم ، شدت دھوپ کی
وہ اُچھلتا کودتا محمود کے گھر پر گیا
کھول دو دروازہ اے محمود! آیا ہے ایاز
سُن کے یہ محمود فوراً گھر سے باہر آگیا
تھی غلیل اک ہاتھ میں اور جیب میں غلّے پڑے
آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا جانے اُنھوں نے کیا کہا
ہوگئے تیار چلنے کو وہ دونوں بے گماں
سامنے سے آگئے محمود کے والد نظر
لائے پھر محمود کو سمجھا کے گھر آخر سنیاز

لڑکے ڈر سے اپنے گھر میں تھے چھپے چھوٹے بڑے
دھوپ کی شدت سے سبزہ باغ کا پامال تھا
پیٹ پانی ہی سے بھرتا تھا ہر اک پیر و جواں
ہو رہی تھی الغرض محسوس ہر دل میں خلش
ہاں ایازِ شوخ کو تھا گھر میں رہنے کا ملال
اور ماں ، بھائی بہن کو دل ہی دل میں کوستا
اور جب وہ سارے گھر والوں کو سوتا پا گیا
اور دبے پاؤں نکل کر اِک طرف کو چل دیا
ایسے عالم میں شرارت ایک جانب سے چلی
اور پھر دروازے پہ یوں آ کے چلّانے لگا
اک خبر اچھی نئی دِلچسپ لایا ہے ایاز
اور اِس حالت میں اپنے دوست کو پایا کھڑا
جانگیہ پہنے ہوئے تھا ہاتھ کانوں پہ دھرے
ہم نہیں سمجھے خُدا جانے اُنھوں نے کیا کہا
دو قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ فوراً ناگہاں
دونوں گھبرائے کہ اب جائیں کہاں بھاگیں کدھر
چھٹ گئے اک دوسرے سے آہ محمود و ایاز

ہوکے اب مجبور تنہا باغ کی جانب چلا
غور سے چاروں طرف کچھ دیکھتا تکتا ہوا

بے زباں ننھے پرندے خشک پتوں میں چھپے
پیڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے پر کو پھیلائے ہوئے

چپکے چپکے اک شجر کے پاس وہ آکر رکا
ہاتھ اس کا تھا تنفس کی وجہ سے کانپتا

آنکھ بائیں بند کرکے لائے سینے تک ربر
ایک دانستہ نشانہ اس نے مارا تاک کر

پھڑ پھڑا کر خوف کھاکر ایک دم بے ساختہ
سہمی گھبرائی ہوئی فوراً اڑی اک فاختہ

چند سوکھے پتے اس دم کھڑکھڑا کے گر پڑے
چوٹ سے غلّے کے ٹوٹے اور نیچے گر پڑے

ایک تو چڑیا کے اڑ جانے کا تھا اس کو ملال
دوسرے اپنے ربر کے ٹوٹ جانے کا خیال

ہوکے شرمندہ غرض جب اپنے گھر کو وہ چلا
یعنی یوں کہیے کہ تھا انگور کا کھٹا مزا

تھی یہ حالت دھوپ کی ذرّے تھے شعلوں سے سوا
لو کے جھونکے چل رہے تھے یا تھی دوزخ کی ہوا

جل رہا تھا آسماں بھی اور تپتی تھی زمیں
اب ایاز احمد کو اپنی نانی یاد آنے لگیں

باپ کے ڈر سے پریشاں حال گھبرایا ہوا
آرہا تھا گھر کی جانب دل میں شرمایا ہوا

گھر پہ آکر اور دروازے سے پہلے جھانک کر
اپنے گھر والوں کو خوب اچھی طرح سے بھانپ کر

چپکے چپکے دھیرے دھیرے چارپائی پر گیا
دونوں آنکھیں بند کرکے دیر تک لیٹا رہا

لگ گئی تھی لو اسے اس کو چڑھا تھا اب بخار
اور اس تکلیف سے وہ ہو رہا تھا بے قرار

جب کہ گھر والوں نے سن پایا یہ سارا ماجرا
باری باری سب نے اس کو خوب ہی ڈانٹا بکا

رات بھر وہ اپنی اس تکلیف سے روتا رہا
اس طرف محمود خوش خوش رات بھر سوتا رہا

جو کوئی ماں، باپ کا کہنا کبھی سنتا نہیں
اور جو اپنے بزرگوں کا کہا کرتا نہیں

بد دعائیں بے زبانوں کی جو لیتا ہے کوئی
اور جانداروں کو جو تکلیف دیتا ہے کوئی

اک نہ اک دن وہ سزائے سخت پاتا ہے ضرور
اس کا یہ جور و ستم اس کو رلاتا ہے ضرور

اک مثل ہے ظلم کی ٹہنی میں پھل آتا نہیں
سچ یہ ہے جور و ستم خالق کو بھی بھاتا نہیں

کانٹ کا نام پڑھ کر بہت سے بچے سوچ رہے ہوں گے یہ کسی جانور کا نام ہے! بعضے شاید یہ سمجھیں گے کہ یہ کوئی کھانے کی چیز ہے۔ لیکن کانٹ نہ جانور ہے اور نہ کھانے کی چیز۔ یہ ایک بہت مشہور فلسفی کا نام ہے جو اب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے جرمنی میں رہتا تھا۔ بعض بچے پوچھیں گے کہ فلسفی کسے کہتے ہیں؟ فلسفی اُسے کہتے ہیں جو فلسفے کا ماہر ہو۔ لیکن فلسفہ کسے کہتے ہیں؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ بس یوں سمجھو کہ کسی چیز کی اصلیت کے کھوج لگانے کو فلسفہ کہتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ کھاتے ہیں پیتے ہیں، کماتے ہیں اور پھر عمر پوری کر کے مر جاتے ہیں اور کبھی کچھ سوچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سوچتے ہیں کہ ہم کیوں پیدا ہوئے، کس لئے پیدا ہوئے۔ دنیا کس طرح پیدا ہوئی، دنیا کس طرح بنائی گئی وغیرہ وغیرہ اسی قسم کے سوچنے والے لوگوں کو فلسفی کہتے ہیں۔

یورپ کے کسی ملک میں اتنے زبردست فلسفی پیدا نہیں ہوئے جتنے جرمنی میں۔ کانٹ جرمنی کا اور سنئے زمانے کا سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کی زندگی کے بعض واقعات بہت دلچسپ ہیں۔

کانٹ کا بچپن غریبی میں گذرا۔ اس کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ لیکن اس نے ان دقتوں کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا۔ بچپن ہی سے اُس نے دو باتیں اپنے دل میں طے کر لی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی سے مدد نہ مانگے گا، دوسرے یہ کہ وہ ہر ایسا کام کرنے کے لئے آمادہ رہے گا جس سے وہ ایمان داری کے ساتھ روزی کما سکے۔ ان دونوں باتوں پر وہ آخر تک قائم رہا۔

اعلیٰ تعلیم اُس نے جرمنی کی ایک چھوٹی سی یونیورسٹی میں حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُسے اسی یونیورسٹی میں ایک اعزازی پروفیسری مل گئی (یعنی نام کو تو پروفیسر ہو گئے لیکن تنخواہ ایک کوڑی نہیں) بڑی مشکل سے ٹیوشن کر کر کے اُس نے پانچ سال گذارے۔ اس کے بعد یونیورسٹی سے تنخواہ بھی ملنے لگی۔ لیکن یہ اتنی تھوڑی

تھی کہ کانٹ کا کام بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ کانٹ کو قہوے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ وہ قہوے کا خرچ نکال سکے۔ اِس کے لئے اس نے یہ ترکیب کی کہ تین لڑکوں کو نجی طور پر پڑھاتا تھا، اِس شرط پر کہ اُن میں سے ایک قہوہ لائے، دُوسرا دودھ اور تیسرا شکر۔ اس طرح کانٹ کا قہوہ تیار ہوتا تھا۔

کانٹ وقت کا بے حد پابند تھا۔ اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ لوگ اُسے دیکھ کر اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔ وہ رات کو ٹھیک گیارہ بجے بستر پر لیٹ جاتا تھا۔ تین منٹ کے اندر اُسے نیند آ جاتی۔ ٹھیک صبح ۶ بجے اُٹھتا اور ایک پائپ پیتا۔ زندگی بھر اس نے روزانہ صبح کے ایک پائپ کے علاوہ کبھی دُوسرا پائپ نہیں پیا۔ پھر ۹ بجے تک وہ لکچر (سبق) کی تیاری کرتا اور ۹ سے دوپہر کے ایک بجے تک یونیورسٹی میں لکچر دیتا ایک سے ڈیڑھ تک کھانے کا وقت تھا۔ پہلے کانٹ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ لیکن وہاں لوگ اس سے باتیں کرتے اور کانٹ کھاتے وقت بات کرنا پسند نہ کرتا تھا، اِس لئے تنگ آکر آخر اُس نے گھر پر کھانا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سے ساڑھے تین بجے تک ٹہلنے کا وقت تھا۔ جس سڑک پر وہ ٹہلنے جاتا تھا وہ اب فلسفی کی سڑک کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ٹہلنے میں ہمیشہ ۸ میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ ساڑھے تین سے رات کے گیارہ بجے تک کا وقت سوچ بچار اور پڑھنے کے لئے وقف تھا۔

کانٹ صرف وقت ہی کا پابند نہ تھا بلکہ اور بہت سی عادتوں میں بھی اِسی طرح پابند تھا۔ اِس کے محلّے میں ایک گرجا تھا۔ اس کی بُرجی اس کے مکان کی کھڑکی میں سے نظر آتی تھی۔ کانٹ اس کھڑکی میں بیٹھ جاتا اور بُرجی کی چوٹی پر نظر جما کر سوچ بچار کیا کرتا۔ ۱۵ سال برابر اس کا یہی دستور رہا۔ اس عرصے میں کسی محلّے دار نے کانٹ کے گھر اور گرجا کے درمیان کچھ درخت بو دیئے۔ یہ درخت آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور پندرہ سال میں بہت بڑے ہو گئے۔ ایک روز کانٹ جب اپنی کھڑکی میں سوچنے کے لئے بیٹھا تو اُسے گرجا کی چوٹی نظر نہ آئی۔ درختوں کی پھننگوں نے اسے بالکل ڈھانپ لیا تھا۔ کانٹ نے اپنے پڑوسی سے التجا کی کہ خدا کے لئے اپنے درخت کاٹ دو۔ اگر یہ بُرجی مجھے نظر نہ آئی تو میں کچھ بھی نہ سوچ سکوں گا۔ میرا دماغ بے کار ہو جائے گا اور میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ پڑوسی کو یہ سن کر ہنسی تو ضرور آئی ہوگی لیکن اُس نے کانٹ کی خاطر وہ درخت کاٹ دیئے۔ کانٹ اس کے بعد ۲۵ سال اس برجی کو دیکھ دیکھ کر سوچ بچار کرتا رہا۔

کانٹ کی ایک اور عادت تھی وہ جب درجے میں لکچر (سبق) دیتا تو کسی طالب علم کے کوٹ کے دوسرے بٹن پر نظر جما لیتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس طالب علم کا وہی بٹن ٹوٹ کر کہیں گر گیا۔ کانٹ نے جب لکچر شروع

کرنا چاہا تو وہ بٹن نہ پایا۔ بٹن کے نہ ہونے سے اُس کے خیالات پریشان ہوگئے اور وہ لکچر نہ دے سکا۔

کانٹ بہت تھوڑے لوگوں سے ملتا تھا۔ اس کا صرف ایک دوست تھا۔ اس کا نام گرین تھا۔ یہ ایک انگریزی تاجر تھا۔ اس نے کانٹ کی اکثر موقعوں پر مدد کی۔ مزے کی بات یہ کہ گرین کانٹ سے بھی زیادہ وقت کا پابند تھا۔ ایک بار گرین نے کانٹ کو ۸ بجے بلایا تاکہ دونوں گرین کی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کرنے جائیں۔ ٹھیک ۸ بجے گرین اپنی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ کانٹ کو ۲ منٹ کی دیر ہوگئی تھی۔ وہ گرین کو رستے میں ملا۔ گرین نے اُسے اپنی گاڑی میں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس بات پر دونوں میں جھگڑا نہ ہوا اور دونوں کی دوستی ویسے ہی قائم رہی۔

کانٹ کا ٹہلنے کا وقت مقرر تھا اور چالیس سال کے عرصے میں صرف دو بار وہ وقت پر ٹہلنے نہ جا سکا وہ ہمیشہ اکیلا جاتا تھا۔ کبھی کسی کو ساتھ نہ لیتا تھا۔ البتہ بارش کے وقت اس کا ملازم لیمپ چھتری لگا کر اس کے ساتھ جاتا۔ کانٹ خود ٹھگنا اور بدصورت تھا لیکن اس کا ملازم بہت لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ لیمپ نے کانٹ کی ۳۰ سال خدمت کی۔ مرنے سے ۲ سال پہلے کانٹ کو معلوم ہوا کہ لیمپ نے اُسے حساب کے معاملے میں ہمیشہ دھوکا دیا ہے۔ اس پر کانٹ نے خفا ہو کر اُسے نکال دیا۔ لیمپ نے کہا "پروفیسر صاحب سب نوکر اپنے آقاؤں کو دھوکا دیتے ہیں۔ میں نے کون سی نئی بات کی ہے" لیکن کانٹ اسے دوبارہ رکھنے کے لئے تیار نہ ہوا لیمپ نے کہا "پروفیسر اگر تم مجھے ملازم نہیں رکھتے تو پھر مجھے پنشن دو۔ ورنہ تم مانو یا نہ مانو میں زبردستی تمھاری خدمت کروں گا۔" آخرکار کانٹ نے اُس کی پنشن مقرر کر دی۔ جو اُسے باقی تمام عمر ملتی رہی۔

کانٹ چالیس سال برابر سوچ بچار کرتا رہا، لیکن اُس نے کوئی کتاب نہ لکھی۔ وہ اپنے دوستوں کو خطوں میں لکھتا رہا کہ اب میں ایک ایسی زبردست کتاب لکھنے والا ہوں کہ اس جیسی کتاب نہ اب تک لکھی گئی ہے اور نہ آئندہ کبھی لکھی جا سکے گی۔ سال پر سال گذرتے چلے گئے۔ لیکن یہ کتاب کانٹ کے دماغ ہی میں رہی۔ آخرکار ۶۰ سال کی عمر میں وہ کتاب لکھنے بیٹھا۔ جو چیز اُس نے ۴۰ سال میں سوچی تھی وہ تین مہینے میں لکھ ڈالی۔ اس کے بعد کانٹ نے چند اور کتابیں لکھیں۔ یہ سب کام اُس نے ۶ سال میں پورا کر لیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً ۱۵ سال اور زندہ رہا لیکن اُس نے کوئی اور کتاب نہ لکھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ بجائے فلسفے کے معمولی کتابیں دل بہلانے اور وقت گذارنے کے لئے پڑھا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "فلسفے کا سارا علم میں نے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ اب اور کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکتی۔ میرے بعد کے آنے والے

لوگوں کا بس یہ کام ہو گا کہ جو کچھ میں نے لکھ دیا ہے اُسے آسان بنا کر دوسروں کو سمجھائیں۔" یہ دعوے تو غلط ہے لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں ابھی تک کوئی فلسفی ایسا پیدا نہیں ہوا جس پر کانٹ کے خیالات کا گہرا اثر نہ پڑا ہو۔

رام پور میں بچّوں کا میلہ

اسکول کے بچّوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رام پور کے بچّوں کی دلچسپی کے لئے عید الضحیٰ کے بعد ۱۱ جنوری کو ایک میلہ کریں گے۔ ۱۰ جنوری تک میلے کی تمام تیاریاں پوری ہو گئیں۔ ۱۱ جنوری کو عالی مرتبت صاحب ہوم منسٹر بہادر نے بچّوں کے میلے کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں بچوں کے کام کی تعریف فرمائی۔ میلے میں چار دوکانیں اور ایک ہوٹل تھا۔ دو کانوں پر کھلونے، سردی کے موسم میں کام آنے والے موزہ، بنیان، کتابیں اور چارٹ کے بکنے کا انتظام تھا۔ ہوٹل میں چائے کے ساتھ کیک پھل اور میوے وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔ اس میلے سے رام پور کے بچّوں نے اس قدر دلچسپی لی کہ اسے ۱۲ جنوری کو بھی جاری رکھنا پڑا۔ اور دوسرے دن تو ہر مدرسے کے بچے آئے اور میلے کی گرماگرمی میں شریک ہوئے۔

ماڈل اِسکول کے بچّوں نے میلے کے انتظام کے ساتھ اپنا تعلیمی کام بھی جاری رکھا اور میلے کے سلسلے میں انھوں نے جو سوالات کئے تھے، جو تصویریں، مٹی کے کھلونے اور ماڈل بنائے تھے اور عید اور حج کے متعلق جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی نمائش بھی کی۔ یہ چیزیں بہت سے مہمانوں اور بالخصوص عالی مرتبت صاحب ہوم منسٹر بہادر کو بہت پسند آئیں۔ عالی مرتبت صاحب ہوم منسٹر بہادر نے بچوں کی دوکان سے متعدد چیزیں خریدیں اور کھلونوں کی دوکان سے ماڈل اسکول کے تمام بچوں کے لئے ایک ایک کھلونا خرید کر اپنی طرف سے بطور تحفہ پیش کیا۔

(محکمہ تعلیم ریاست ۔ رام پور)

ننھی سمدھن

سید ابو تمیم - فرید آبادی

وہ بچاری ایک دِن دلہن کے ساتھ آئی ۔ وہ دِن اور آج کا دِن سارا گھر سمدھن کہنے لگا۔ اب تک کہتا ہے۔

میں بھی سمدھن کہتا ہوں۔ مگر مزے دار بات یہ ہے کہ میری سمدھن کی عُمر کوئی پانچ سال کی ہے ۔ وہ ذرا توتلی ہیں۔ اور کافی عقل مند۔ دِل سے بچاری مجبور ہیں۔ اس دل کی خاطر بہت تکلیف اُٹھاتی ہیں ۔ بڑا ہی نرم دل ہے ۔ ہر ایک سے اُن کو ہمدردی ہوجاتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر آتی ہیں۔ آسیہ خانم سے اُن کا بہناپا ہے۔ جب آتی ہیں آسیہ کی گڑیوں کی اتنی خدمت کرتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ آسیہ خانم جب ان کے ہاں جاتی ہیں تو کسی گڑیا کی ٹانگ چیر دیتی ہیں یا ڈوپٹہ پھاڑ دیتی ہیں۔ مگر سمدھن کا دِل میلا نہیں ہوتا۔

ایک دِن ہمارے ہاں گڑیوں سے کھیلتے کھیلتے اُن کا دِل گھبرا گیا۔ آسیہ کا دل تو بہت پہلے سے گھبرا چُکا تھا۔ برابر کے مکان میں تفریح کرنے چلیں۔ آسیہ خانم نے منظر میاں کو بھی ساتھ لے لیا۔ یہ منظر میاں بڑے فتنہ ہیں۔ چار سال کی عُمر ہے مگر بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔

کچھ دیر تک سب کھیلتے رہے۔ اچانک رونے کا شور اُٹھا۔ شور تو ہمارے گھر میں ماشاء اللہ ۲۰ گھنٹے رہتا ہے مگر یہ شور اس زور کا تھا کہ سب گھر والے گھبرا کر اور بھی شور کرنے لگے۔ "ہائے ہائے مار ڈالا"۔ "ہائے بچی" "دہی اللہ خونم خون کر دیا"۔ "ارے کوئی آنا" کی آوازیں اتنے زور سے آنے لگیں کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے صحن کی طرف دیکھا تو کوئی درجن بھر بچے ۔ ہر قد اور ہر عُمر کے سہمے ہوئے چلے جا رہے تھے اور سمدھن پوری طاقت سے رو رہی تھیں۔ بڑی عُمر کی عورتیں پوری طاقت سے چیخ رہی تھیں پڑوسی مہمان، کنجڑن اور بوا حمن اس طرح بول رہی تھیں جیسے لاکھوں کے مجمع میں تقریر کر رہی ہیں۔ میں نے بھی گلا صاف کر کے اور کھنکار کے پوری طاقت سے چیخ کر پوچھا:۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟ ۔ سمدھن کیوں رو رہی ہیں ؟"

گھر کے ہر کونے سے جواب ملنے لگا۔ مگر اتنے جواب آگے پیچھے ملے کہ کچھ پتہ نہ چلا:۔

"تو تم بیٹھے ہو۔ واہ بیٹے شاباش ۔۔۔۔ "

"دوی میاں ظلم کرتے ہو۔ دیکھتے نہیں ۔۔۔۔۔ "

"چچا جان کیا کہتے ہیں یہ آپ کی سمدھن ہیں نا۔ کیا کہتے ہیں ۔ جی ہاں اُن کے ۔۔۔۔ "

"اے بھائی دوڑو۔ خدا کے واسطے ۔ ہائی پوری بچّی ۔ ہائے ہائے ظُلم ۔۔۔۔ "

"میراں جی کی کسم ۔ چھوٹے میاں لہو لُہان کر دیا مٹ جائے اللہ مارا۔"

"بھائی میاں ، وہ ہے نا چچا مقبول کا کتا ، وہ ہمارے کالو کا بیٹا ۔۔۔۔۔ "

"مٹ جائے یہ کالو کی اولاد۔ محلہ بھر۔۔۔ "

"نہیں جی کالو کا کیوں ہوتا ۔۔۔۔۔ "

"بھائی مقبول کا نہیں ہے وہ ۔ ظہور کا ہے ہاں اللہ کی قسم ۔۔۔۔۔۔ "

"لڑکی کا بُرا حال ہوا جا رہا ہے ۔ تُم کمرے سے نکلو تو سہی ۔۔۔۔۔۔ "

"نہیں نہیں چچا مقبول کا ہے وہ ۔ گردن کے نیچے سفید دھاری ہے ۔۔۔۔۔۔ "

"کیا سنگ دِل مردوا ہے ۔ مُڑ مُڑ دیکھ رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ "

آخری فقرہ پھپھو کا تھا اور پہلا چچی کا ۔ باقی فِقروں کا پتہ نہیں کون بولا اور کہاں سے بولا میں نے سوچا کہ اگر ایک منٹ بھی اور ٹھہرا تو پھپھو اپنی لکڑی جس کے بل وہ راستہ طے کرتی ہیں پھینک کر ماردیں گی ۔ چنانچہ اس بھیڑ میں جا گھسا۔ سمدھن کا سیدھا کان خون سے بھرا ہوا تھا۔ گردن پر بھی خون تھا ۔ اور سر سے بھی خون بہتا نظر آتا تھا ۔ روئی کی صدری بھی خون میں تر تھی ۔ بچاری کا کان کٹ گیا تھا ۔ ابھی میں اس دیکھ بھال سے فارغ نہ ہوا تھا کہ پھر پھپھو اور چچی نے لعن طعن شروع کی:۔

"کیا جب وہ مر جائے گی جبھی تم ہلوگے؟"

"بیٹا کوئی تم ڈاکٹر تو ہو نہیں ۔ بس دیکھ چکے سر کو ۔"

پڑوسن بولیں:۔ "اگر میں نہ پہنچوں تو لڑکی کا خاتمہ تھا ۔"

کسی بچے نے کہا :۔ "پرسوں ہماری آپا کے بھی اُس نے بکٹا بھرا تھا ۔"

پھپھو نے پڑوسن کو جواب دیا :۔ "بُوا تُم نے تو بچا لیا ، مگر یہ لڑکا اس بچّی کا خاتمہ ہی کروا کے رہے گا ۔ دیکھتی نہیں ہو ؟"

میں نے سمدھن کو گود میں لیا اور گھر سے ہی بھاگنا شروع کر دیا ۔ میرے پیچھے بچّے بھاگے ۔ گلی سے نکل کر بڑے رستے پر آیا تو مُلاجی ملے ۔ پوچھا "خیر تو ہے ؟" میں نے کہا "خیر ہے" ۔ آگے سقہ ملا ۔ پوچھا "کیا ہوا؟"

میاں کہاں بھاگ رہے ہو" آگے بنیا ملا" اجی میاں جی ذرا ہم غریبوں کی بھی سُن لو" میں نے قدم آہستہ کرکے پوچھا" سُنا بھی تو بھی سُنا" کہنے لگا" کیا بات ہے" میں نے کہا کوئی بات نہیں" اِنڈلا کر بولا" اپنے بنئے سے چھپاتے ہو۔ (خون دیکھ کر) او رام رام"

غرض ہر قدم پر سوال ہوا۔ جواب کیا دیتا۔ خبر ہی نہ تھی کہ کیا ہوا۔ سمدھن اِس طرح رو رہی تھی گویا ریڈیو بج رہا ہے۔ یہ ریڈیو بھی نہیں تھکتا۔ اور سمدھن بھی نہیں تھکیں۔ بارے شفا خانہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب غائب تھے۔ دل میں آئی کسی سے لڑ لوں۔ مگر لڑائی کا موقع نہ تھا۔ میر صاحب کمپونڈر نظر پڑے میں نے کہا:۔ اجی ذرا لپک کر آؤ۔ بڑا سخت معاملہ ہے" وہ اپنی معمولی رفتار ہی سے آئے۔ پہلے تو سمدھن کو دھمکایا پھر مجھ سے کہنے لگے" گھبرانے کی کیا بات ہے"۔ میں نے کہا" گھر بھر گھبرا رہا ہے" جواب دیا" اینہہ ان عورتوں کا کیا ہے"۔ مگر جب سمدھن کا کان بیچ میں سے کٹا دیکھا تو سناٹے میں آئے کہنے لگے ٹانکے لگانے پڑیں گے۔ مگر ہمارے ہاں سوئی بہت موٹی ہے۔

میں نے کہا" اتنا سا تو بچاری کا کان ہے"۔

پوچھا" ہوا کیا"

میں نے کہا" خبر نہیں"

سمدھن بولیں" تتے نے کاٹ لیا"۔

میں نے پوچھا" کتے کے پاس تم کیوں گئی تھیں"

بولیں" آچیا تو کاتنے آ رہا تھا۔ ہم نے تجی سے مالا"

کمپونڈر صاحب نے کان دھونا شروع کیا اور سمدھن نے چیخنا۔ روتی جاتی تھیں اور اماں کے پاس جانے کا تقاضا کرتی جاتی تھیں

"میں نے پوچھا" اماں کیا کریں گی۔ وہ تو الٹا تم کو ماریں گی"۔

سمدھن نے روتے روتے کہا" نہیں۔ اماں تتھا لدا دیں دیں۔ (کتھا لگا دیں گی)"

کمپونڈر صاحب اِن جھگڑوں قصّوں سے بے پروا اپنا کام کرتے رہے۔ جب پٹّی کا وقت آیا تو معلوم ہوا شفا خانے میں پٹّی ختم ہو چکی ہے۔ ایک ملازم بازار کپڑا لینے دوڑا۔ سمدھن کو اپنا دوپٹہ یاد آ گیا مجھ سے کہنے لگیں" بھائی دان۔ ہمارا دوپٹہ آپ کے دھڑ میں ہودا۔ منگا لو۔ اُس تی پٹّی باندھ لینا"۔

اتنے پٹّی آنے میں نے ساتھ آنے والے بچّوں سے پوچھا کہ بھئی یہ کیا قصّہ ہوا۔

سمدھن روتے روتے بول پڑیں" ہم تو کھیل رہے تھے۔ آچیا نے اُس تتّے تو مالا۔ وہ بھاگا نہیں ہم نے اس تو پھدایا تو بچ کاٹ لیا۔ دیتھا بھائی دان کان کاٹ لیا۔ اللہ ترے مل جائے وہ تتّا"۔

مٹھائیوں کے لالچ سے سمدھن کے آنسو رُکے اُن کی اماں کے ہاں بھیجا گیا۔ دوسرے دن ایک اور شفا خانے لے جا کر ٹانکے لگوائے۔ مگر ٹانکوں سے

پہلے سمدھن کی مٹھی میں قلاقند کی پڑیا دی گئی۔ اور جب ان کو لٹایا گیا اور جب تک ٹانکے لگے۔ برابر مٹھائی کا ذکر ہوتا رہا .... "بہت ساری مٹھائی لیں گے۔ بس ساری کی ساری اپنی ننھی سی سمدھن کو دیں گے۔ خوب کھانا۔ ہاں؟ اگر بچ جائے تو ہم کو بھی ذرا سی دے دینا" آخری فقرے کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ "نہیں آپ تو نہیں۔ ہم تو آچیا تو دے دیں۔"

میں نے مان لیا۔ بولا "اچھا آسیہ کو دے دینا لیکن پھر بھی بچ جائے تو؟" اس پر وہ راضی تھیں۔ آسیہ کی بچی بھی (پڑیا) دینے پر تیار تھیں۔ بچاری کے تین ٹانکے لگے۔ ہر ٹانکے پر بلی بلا جاتی۔ میں فوراً حلوائی کی دکان کا ذکر شروع کر دیتا۔

اس واقعے کا تمام بچوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اب کوئی بچہ کتّے کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اور سمدھن تو کتّے کی صورت دیکھتے ہی دبک جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت نفع کی یہ بات ہوئی کہ کمیٹی نے دو تین کالے کتّے مروا دئے۔

آج تک یہ بات نہ کھلی کہ سمدھن کے کان کا قاتل ظہور کا کتّا تھا یا بھائی مقبول کا کتّا۔ جب اس قصّے کا ذکر آتا ہے کانگریس اور مسلم لیگ کی طرح دو پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ دونوں پارٹیاں قسمیں کھاتی ہیں۔ دلیلیں دیتی ہیں۔ مگر فیصلہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ دونوں کتّے مارے جا چکے ہیں۔

کچھ دنوں سے بچوں کا رسالہ پھول اور بچوں کے دوسرے رسالوں میں مولوی شفیع الدین صاحب نیّر کی نظمیں دوسرے ناموں سے برابر چھپ رہی ہیں۔ یہ بہت بُرا مرض ہے جو بچوں میں پھیل رہا ہے۔ پھول کے تازہ پرچے میں ایک نظم چھپی ہے "میری اچھی اماں جان" یہ نظم پیامِ تعلیم کے سالگرہ نمبر ۱۹۴۱ء میں چھپ چکی ہے۔ اور شاید خود ایڈیٹر صاحب کی نظر سے بھی گذری ہوگی۔

ہمیں اُمید ہے کہ رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان آیندہ زیادہ احتیاط رکھیں گے۔

ایڈیٹر

ہوائی بچاؤ

محمد عبدالحسیب - حیدرآبادی

دشمن کو دھوکا دینے کے لئے آج کل عجیب عجیب دلچسپ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً برفیلے میدانوں کے سپاہیوں کو سفید لباس پہنایا جاتا ہے۔ عمارتیں ایسے رنگوں سے رنگ دی جاتی ہیں کہ بم برسانے والے ہوائی جہاز دھوکا کھا جاتے ہیں۔ توپ کو چھپانے کے لئے اس پر ایسی جالی ڈال دی جاتی ہے جس پر پتوں کے نشان ہوں۔ فوجی پڑاؤ اور کل دار گاڑیوں کو ایسی ہی بڑی جالیاں اڑھا دیتے ہیں۔ اوپر سے درختوں کی ٹہنیاں، گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ڈال دیتے ہیں۔ ایسی جگہیں دور سے سبزہ زار معلوم ہوتی ہیں اور ہوائی حملے سے بچ جاتی ہیں۔ توپیں گنجان جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ پگ ڈنڈیوں کو بھی چھپانا پڑتا ہے۔ جھاڑیوں کے قریب پگ ڈنڈی ختم ہو جائے تو ہوا باز سمجھ جاتا ہے کہ یہاں ضرور فوجی ہتھیار چھپے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان پگ ڈنڈیوں کو دھوکا دینے والی جالیوں کے ذریعے دوسرے گاؤں کی پگ ڈنڈیوں سے ملا دیا جاتا ہے۔

بڑی بڑی عمارتوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کچھ اس طرح رنگ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمارتیں گاؤں کی جھونپڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ کارخانوں کی چمنیاں بھی اسی طرح چھپا دی جاتی ہیں۔ ایسی جھونپڑیوں اور جنگلوں کا سایہ صبح، شام، دوپہر ہر وقت ایک ہی طرف رہتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز دن بھر ایک ہی جگہ اڑتے رہیں تو یہ بھید کھل جاتا ہے۔ انھی ترکیبوں سے بعض دفعہ جھوٹ موٹ کی توپیں اور شہر بنائے جاتے ہیں۔ اور دشمن کے بم خواہ مخواہ برباد ہوتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کو چھپانے کے لئے یا تو ہوائی اڈوں کی عمارتیں رنگ دی جاتی ہیں یا میدان میں ان پر رنگی ہوئی جالیاں اڑھا دی جاتی ہیں۔ بلکہ خندقیں تیار کر دیتے ہیں۔

رات کے وقت شہروں کی روشنی گل کر دی جاتی ہے تاکہ ہوائی جہازوں کو کچھ پتہ نہ چل سکے بچے، بوڑھے، عورتیں اور وہ لوگ جن کا رہنا شہر میں ضروری نہیں ہے دیہات میں بھیج دئے جاتے

نیز شہر میں رہنے والی آبادی کے لئے زمین کے اندر پناہ گاہیں بنائی جاتی ہیں۔ ریت کے تھیلوں کے کمرے بھی بنائے جاتے ہیں۔ جب ہوائی حملے کا خطرہ ہوتا ہے تو بھونپو یا گھنٹی بجائی جاتی ہے تاکہ لوگ محفوظ جگہوں میں چلے جائیں۔

شہری اور فوجی لوگوں کے ایسے دستے بنائے جاتے ہیں جو بمباری کے بعد ملبہ اٹھانے آگ بجھانے اور زہریلے دھوئیں کے اثر کو دور کرنے اور زخمیوں کی امداد کا کام کرتے ہیں۔

شہروں میں ہوائی جہازوں کو نیچے گرانے کے لئے ہوامار توپیں بھی ہوتی ہیں۔ جب تک ہوائی جہاز اڑتے رہتے ہیں یہ ہوامار توپیں برابر ان پر حملے کرتی رہتی ہیں۔

ان توپوں کے چلانے میں بہت سے آلوں سے مدد لی جاتی ہے۔ ایک قسم کا بڑا سا کیمرا ہوتا ہے۔ جب ہوائی جہاز کیمرے میں نظر آتا ہے تو خود بخود جہاز کی اونچائی رفتار اور سمت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ توپچی کو بجلی کے ایک تار کے ذریعے بتاتا ہے کہ نشانہ کہاں لگنا چاہیے۔ اس کام میں اس آلے کو ایک اور آلے سے مدد ملتی ہے۔ ان توپوں کی زد سے بچنے کے لئے ہوائی جہاز سیدھا نہیں اڑ سکتا۔ بلکہ ادھر ادھر بل کھاتا ہوا اڑان کرتا ہے۔ بعض وقت تو ایک ہی آلہ دو چار ہوامار توپوں سے ملا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ایک وقت میں ہوائی جہاز پر چاروں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے۔

ایک دوسرے آلے سے ہوائی جہاز کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اسے آواز نما کہتے ہیں۔ آواز سننے کے لئے بڑے بڑے دھاتی کٹورے آلے کی اوپری جانب دونوں طرف ہوتے ہیں۔ آواز نما ایک گاڑی پر لگایا جاتا ہے تاکہ جہاں ضرورت ہو لے جایا جائے۔ اس آلے کا رخ جس طرف چاہیں پھیر سکتے ہیں۔ جب دشمن کے ہوائی جہاز آ پہنچتے ہیں تو آلہ اس وقت تک گھمایا جاتا ہے کہ دونوں طرف کے کٹوروں میں سے برابر کی آواز سنائی دے۔ اس کے بعد جہاز کی اونچائی اور اڑنے کی سمت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے۔ روشنی کے مقابلے میں آواز کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ اس بات کا خیال ہوامار توپچی رکھتا ہے کہ آواز کی سست رفتاری سے گولا باری میں خلل نہ آئے۔ آواز نما بادلوں کے وقت اور رات کے اندھیرے میں مفید ہے۔ جب کہ کیمرے سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اب دوزوں اور میدانی توپوں کو ڈھونڈھنے کے لئے ایک اور قسم کے آواز نما استعمال ہوتے ہیں۔

کھوج لگانے والی روشنی (سرچ لائٹ) رات کے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ تاکہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ ہوامار توپیں نشانے پر کام کر رہی ہیں۔ یہ روشنی کا لیمپ کام کے دوران میں بہت گرم ہو جاتا ہے۔ اسے کئی طریقوں سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ ایک

دفعہ ہوائی جہاز اس روشنی کے اندر آجاتا ہے تو لیمپ والا اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیشہ ہوائی جہاز روشنی کی زد میں رہے تاکہ شکاری ہوائی جہاز یا ہوا مار توپیں اسے نشانہ بنا سکیں۔ اسی قسم کی روشنی سے سمندری جہاز اندھیرے میں ہوائی جہاز اور آب دوزوں کا پتہ لگایا کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں غبارہ کشتی بھی عجیب چیز ہے۔ یہ تقریباً دس ہزار فٹ اونچی اڑ سکتی ہے۔ غبارے ہوائی جہازوں کو اونچی اڑان پر مجبور کرتے ہیں۔ کم بلندی سے یہ جہاز اڑیں تو ہوا مار توپیں انھیں نشانہ نہیں بنا سکتیں۔ اور پھر یہ جہاز بغیر کسی خطرے کے نشانے پر بم پھینک سکتے ہیں۔ یہ غبارے ضرورت کے وقت جلد نیچے اتر سکتے ہیں۔ کچھ کچھ وقفے سے غبارہ معائنہ اور ہائیڈروجن بھرنے کے لئے اتار لیا جاتا ہے۔ غبارے ایسے ہوائی جہاز کی شکل کے ہوتے ہیں جس کے اگلے بازو اور اگلا حصہ نہ ہو۔ پتنگ کی طرح اس کی ڈوریاں بھی بالکل نیچے ہی ہوتی ہیں۔ اسی لئے کبھی کبھی اونچائی سے اڑنے والے جہاز ان بے دیکھی ڈوریوں میں الجھ کر برباد ہو جاتے ہیں۔

ننھا ٹٹو

یہ ننھا منا بڑے مزے کا قصہ ہے جمیل میاں کو ننھے ٹٹو دبکری کے بچے) سے کچھ ضد سی ہو گئی تھی۔ ننھے ٹٹو کی اماں (بکری) نے بھی ان کی خوب خبر لی۔ آخر جمیل میاں اپنی شرارت پر پچھتائے۔ پھر تو بکری نے بھی ان کے سینگ نہیں مارے ننھا ٹٹو اور اس کی ماں ان کے ساتھ کھیلتے کودتے۔ اس کہانی کی زبان بھی بہت مزے دار ہے اور قیمت بھی بس ۲ر ہے

پرندوں کا ایکا

ایک جنگل میں کچھ گڑبڑ ہوئی۔ سب پرندے گھبرا کر ایک جگہ جمع ہو گئے اب ان میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اس آفت کو دور کرنے کے لئے کیا کیا تجویزیں سوچی گئیں۔ کس طرح سب نے ایکا کر کے اس مصیبت کو ٹالنے کا فیصلہ کیا کون بادشاہ بنا کون وزیر۔ یہ سب باتیں کہانی میں پڑھو تبھی مزا آئے گا۔ بس دیکھ کر پھڑک ہی تو جاؤ گے۔ اس کی قیمت بھی ۲ر ہے۔

مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

نیکی کا بدلا

محمد رفیق - ثانوی اوّل - تعلیمی مرکز جامعہ

کسی گاؤں میں ایک غریب لوہار رہتا تھا۔ اُس کی دو بیٹیاں تھیں - بڑی لڑکی کا نام حمیدہ تھا، چھوٹی کا نام سعیدہ - ماں باپ سعیدہ کو بہت چاہتے تھے - یہ رحم دل اور نیک مزاج تھی - ایک دفعہ سعیدہ نے کہا اماں میں نانی کے یہاں جاؤں گی " ماں بولی " بیٹی شوق سے جاؤ " وہ نانی کے یہاں جارہی تھی تو راستے میں اُسے دریا ملا - دریا اس سے بولا " بیٹی میری کاہی صاف کرتی جا " اس نے جواب دیا " بہت اچھا " اور ساری کاہی صاف کردی - پھر راستے میں ایک پیپل لا - بولا " بیٹی کہاں جارہی ہو " اس نے کہا " نانی کے ال جارہی ہوں " پیپل بولا :- " میری جڑ میں جھاڑو یتی جاؤ " اس نے جھاڑو دے دی - چلتے چلتے راستے ں ایک حلوائی کی دکان آئی وہ بولا " بیٹی کہاں جارہی و " سعیدہ نے کہا " نانی کے ہاں جارہی ہوں " لوائی کہنے لگا " ذرا آگ جلا دو " اُس نے آگ لادی - اور نانی کے مکان کی طرف جانے لگی - ابھی یادہ دور نہ گئی تھی کہ ایک بڑھیا ملی " کہنے لگی :-

" میرے سر میں جوئیں ہوگئی ہیں ذرا ان کو نکال دو " سعیدہ نے جوئیں نکال دیں اور نانی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی - نانی کے ہاں پہنچ کر نانی کو آداب کیا نانی نے بہت سی دعائیں دیں - اس نے نانی کے ہر کام میں ہاتھ بٹایا - دو تین دن رہنے کے بعد نانی سے گھر جانے کی اجازت مانگی - اُنھوں نے جواب دیا " آج نہیں کل چلی جانا " نانی نے اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی، چوڑیاں پہنائیں - دو تین جوڑے کپڑوں کے دے کر رخصت کیا - وہ اپنے گھر جارہی تھی کہ راستے میں وہی بڑھیا ملی - اور بولی " بیٹی اللہ کرے تیرے ماتھے پر چاند اور ٹھوڑی پر ستارے! اس کے بعد وہ آگے گئی - راستے میں وہی حلوائی ملا اور کہنے لگا " جس قدر جی چاہے مٹھائی لیتی جاؤ " " سعیدہ نے بہت سی مٹھائی ساتھ لے لی اور بہت سی مٹھائی کھالی - آگے بڑھی تو پیپل ملا - بولا بیٹی میرے نیچے بہت سی دولت ہے وہ سب تم نیچے سے لے لو - سعیدہ نے نیچے سے دولت نکال لی - آگے دریا

ملا۔ اس نے کہا "یہ ہیرے موتی لے جاؤ۔" سعیدہ نے وہ ہیرے موتی بھی لے لئے۔ ان سب چیزوں کو لے کر وہ گھر آئی۔ ماں باپ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور سعیدہ کو بہت دعائیں دیں۔ یہ دیکھ کر حمیدہ کے دل میں حسد پیدا ہوا اور سوچنے لگی کہ "میں نانی کے گھر جاؤں اور اتنی ہی دولت لے کر آؤں۔ حمیدہ نے اپنی ماں سے کہا "اماں میں بھی نانی کے ہاں جاؤں گی۔" ماں نے کہا جاؤ وہ جانے لگی۔ راستے میں اُسے وہی دریا ملا اور کہنے لگا۔ "لڑکی میری کائی صاف کرتی جاؤ۔" حمیدہ نے جواب دیا "دور پار اتنی دیر میں تو میں نانی کے ہاں پہنچ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ آگے پھر وہی پیپل ملا۔ اور بولا۔ "بیٹی میری جڑ میں ذرا جھاڑو دیتی جاؤ۔" اُس نے جواب دیا "دور پار اتنی دیر میں تو میں نانی کے ہاں پہنچ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی چلتے چلتے پھر وہی حلوائی ملا۔ اور کہنے لگا۔ "بیٹی میری آگ جلاتی جا۔" اُس نے جواب دیا "دور پار اتنی دیر میں تو میں نانی کے ہاں پہنچ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی کہ وہی بڑھیا ملی۔ کہنے لگی۔ "بیٹی میرے سر سے جوئیں نکال دو۔" حمیدہ نے جواب دیا "دور پار اتنی دیر میں تو میں نانی کے ہاں پہنچ جاؤں گی۔" نانی کے ہاں جا کر حمیدہ نے آداب کیا۔ اور نہ کچھ کام کیا۔ بس جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ دو، تین دن رہی اور کہنے لگی اب میں جاتی ہوں۔" نانی نے کہا اچھا۔" نہ مہندی لگائی نہ چوڑیاں پہنائیں۔ ویسے ہی رخصت کیا راستے میں وہی بڑھیا ملی۔ اور کہنے لگی۔ خدا کرے تیرے ماتھے پر دو سینگ نکل آئیں۔ اب راستے میں وہ جس جس کے پاس جاتی سب بددعائیں دیتے گھر جاتے جاتے دو سینگ بھی نکل آئے ماں باپ یہ دیکھ کر بہت گھبرائے جب حمیدہ نے اپنا قصہ سنایا اور سعیدہ نے اپنا قصہ سنایا تو ماں باپ کہنے لگے "نیکی کرو۔ اور نیکی پاؤ۔ برائی کرو۔ برائی پاؤ۔ سعیدہ نے نیکی کی۔ نیکی پائی۔ تم نے برائی کی برائی پائی۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے۔

"جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

ہندوستانی مہینے

خلیل الرحمٰن مستقیمی۔ سرائے میر

پچھلے پرچے میں تم نے ایک مضمون پڑھا ہوگا "گیارہ دن کا نقصان" بہت دلچسپ اور مفید مضمون تھا۔ اس میں ہندوستانی مہینوں کا ذکر بھی آگیا تھا۔ آج کل تو انگریزی مہینوں کا چلن کچھ اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ بہت سے پیامیوں کو تو ہندوستانی مہینوں شاید نام بھی نہ معلوم ہوں۔ اپنے انھی پیامیوں کے لئے ہم ان ہندوستانی مہینوں کا تھوڑا سا حال لکھتے ہیں۔ ان مہینوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) چیت (۲) بیساکھ (۳) جیٹھ (۴) اساڑھ (۵) ساون (۶) بھادوں (۷) کنوار (۸) کاتک (۹) اگہن (۱۰) پوس (۱۱) ماہ (۱۲) پھاگن

ان مہینوں کا رواج دیہات میں زیادہ ہے ہمارے کسان انھی مہینوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کا سال چیت کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔ جس طرح دوسرے ملکوں میں سال کا پہلا مہینہ مبارک سمجھا جاتا ہے اسی طرح چیت کا مہینہ ہمارا مبارک مہینہ ہے۔ اس مہینے میں جاڑا رخصت ہونے کو ہوتا ہے اور گرمی آنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اس مہینے میں ربیع کی فصل اپنی جوانی پر پہنچ جاتی ہے اور پودوں کی ڈالیاں جھوم جھوم کر عجب سماں پیش کرتی ہیں۔ اس وقت کسانوں کے دلوں کی خوشی کا کیا پوچھنا جب کسان اپنے کھیت کے سامنے سے گذرتا ہے تو کھڑی ہوئی فصل دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں کچھ دنوں کے بعد کسان اپنی فصل کاٹتے ہیں یہ وقت بھی بہت ہنسی خوشی کا ہوتا ہے۔ ان کی عورتیں گیت گا گا کر اور اُن کے لڑکے ناچ کود کر اُن خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ چیت کے مہینے میں ہر کسان اپنے کو دولت مند اور خوشی کے خزانے کا مالک سمجھتا ہے۔

چیت کے بعد بیساکھ کا مہینہ آتا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ بھی سہانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن لو گرمی اسی مہینے میں تشریف لاتی ہیں۔ سورج کی کرنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ کام کرتے وقت بدن پسینے سے تر ہو جاتا ہے۔ کپڑوں سے بدبو آنے لگتی ہے۔ لیکن پھر بھی کسان تو اس

سے گھبراتے نہیں۔ وہ تو برابر کام کئے چلتے ہیں۔

لیجئے جیٹھ کا مہینہ شروع ہوا اور بھی قیامت آ گئی۔ دن رات ایک بے کلی سی ہے۔ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دوپہر کو گھر سے نکلئے تو آنکھوں کی پلکیں بھی جل جائیں۔ میدانوں اور کھیتوں میں آگ سی برس رہی ہے۔ ہر شخص سایہ ڈھونڈتا ہے۔ پیاس بہت لگتی ہے اور ٹھنڈا پانی ایک نعمت ہے۔ ہر وقت یہی جی چاہتا ہے کہ نہایا کرو۔ دن جوں توں کر کے ختم ہوا تو رات آئی۔ مچھروں کی فوج بھن بھن کرتی ہوئی پہنچی۔ ادھر گرمی اُدھر مچھروں کی یورش نیند کیا خاک آتی۔ رات رات بھر کروٹیں بدلتے گذر جاتی ہے۔

اساڑھ کا مہینہ آندھیاں لے کر آیا۔ کچھ دنوں کے بعد کالے کالے بادل بھی دکھائی دینے لگے۔ دل کے کنول کھل گئے۔ کسانوں کی اُمیدیں بر آئیں گرمی کی امس گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں لیکن کبھی ان بادلوں کو پُروا ہوا اُڑا لے جاتی ہے تو پھر گرمی آ پہنچتی ہے۔

ساون کا مہینہ برکھا رُت کا پیغام لے کر آیا۔ بادلوں کی چڑھائی ہوئی۔ چھم چھم چھم چھم پانی برسا۔ دل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسان کندھوں پر پھاوڑا لے کر دھان کی کیاریوں میں پہنچ گئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کیاری کی مینڈیں ٹھیک کیں۔ اب دھان بوئے جائیں گے۔ جوار، باجرہ اور مکئی، تلی وغیرہ بھی بوئی جانے لگی۔ باغوں میں آم پکنے شروع ہو گئے۔ لال، پیلے اور زرد سب طرح کے۔ سیندوریا آم دیکھ کر تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ رکھوالے باغوں میں پھوس کی ایک ایک منڈھی ڈالے ہوئے ہیں۔ آم درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔ اُن کے چننے میں بڑا مزا آتا ہے۔

ادھر گاؤں میں ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ بچے بچیاں، نوجوان اور بوڑھی عورتیں سب مل کر ساون منا رہی ہیں۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں اور ان پر ساون گایا جا رہا ہے۔ لڑکوں کی الگ جماعت ہے۔ لڑکیاں الگ ٹولی بنا کر جھولا جھول رہی ہیں۔ کوئل اور پپیہے اپنے رس بھرے گیت سنا رہے ہیں۔ تالابوں میں مینڈکوں کی ٹرٹر سن کر عجب اُمنگ پیدا ہوتی ہے جھینگروں نے الگ شور مچا رکھا ہے۔ بھادوں بھی انھیں چہچہوں میں گذر گیا۔

اب کنوار کا حال سنئے۔ کسانوں نے اپنے کھیت جوتنے کی تیاریاں کیں۔ جس کا کھیت کنوار میں سب سے زیادہ جوتا جائے گا اُس کے یہاں سب سے زیادہ اناج پیدا ہوگا۔

کاتک کا مہینہ بھی شور مچاتا ہوا پہنچ گیا۔ ہر طرف ایک ہل چل سی مچی ہوئی ہے۔ کھیتوں کی بوائی شروع ہو گئی۔ کتنا اچھا سماں ہے۔ گاؤں کے باہر آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ سب لوگ اپنے کھیتوں کی بوائی میں مصروف ہیں۔

اگھن کا مہینہ آگیا۔ کسان اپنے کھیتوں کو بو کر مطمئن ہیں۔ البتہ خدا پر بھروسہ ہے۔ بار بار اُن کے دِل میں خُدا کی مہربانیوں کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صرف وہی غلّہ پیدا کرے گا۔ وہی ہر آفتوں سے بچائے گا۔ اب دھان کی فصل تیار ہوگئی۔ کسان بار بار کیاریوں میں جا کر دیکھتے ہیں۔ آخر دھان بھی کٹنے شروع ہوگئے

آخر پوس آیا اور اپنے ساتھ جاڑا لایا۔ سردی سے ہاتھ، پاؤں ٹھٹھرے ہوئے ہیں۔ لوگ آگ پر گرے پڑتے ہیں۔ کسانوں کو پیال کے بستر پر مزہ آرہا ہے۔ الاؤ بھی لگا ہے۔ چاروں طرف چھوٹے بڑے عورتیں، مرد سب بیٹھے ہوئے ہیں۔ مزے مزے کی باتیں ہورہی ہیں۔ ہاتھ میں چلم ہے یا نریل کا حقہ پیتے جاتے ہیں۔ باتیں کرتے جاتے ہیں۔

لو اب کھیتوں کی سینچائی کا بھی وقت آگیا۔ صبح صبح جاڑے پالے میں اُٹھ کر کسان کھیتوں میں پانی دے رہے ہیں کنوئیں پر بھیڑ لگی ہے۔ ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ ہر شخص پانی دینے میں ایک دوسرے کی مدد کررہا ہے

ماگھ کا مہینہ اپنے ساتھ برف اور پالا لایا۔ سردی سے نہیں رہا جاتا۔ بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔ دانت بج رہے ہیں۔ ہاتھ، پیر کٹے جا رہے ہیں۔ پانی اس قدر ٹھنڈا کہ پیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

پھاگن اپنے ساتھ خوشبوؤں کو لے کر پہنچا۔ کیا فرحت کا مہینہ ہے! سرسوں کے رنگین پھولوں کی بھینی بھینی مہک ہواؤں کے ساتھ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے کھیتوں اور میدانوں میں دور دور تک پیلا ہی پیلا دکھائی دیتا ہے۔ جاڑا رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بدن میں عجیب فرحت سی محسوس ہوتی ہے

اوکھلے سے غازی آباد تک

یوسف اشفاق متعلم جامعہ

رات کے ۸ بجے ہم بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ بورڈنگ کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے ایک زوردار نعرہ لگایا "اللہ اکبر" لڑکے اپنے اپنے کمروں سے بھڑوں کی طرح نکل آئے۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام" ہم نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں اچھے تو رہے! کچھ لطف بھی آیا!"

"ہاں بھئی اچھے رہے۔ باقی آئندہ" ہم جملہ پورا کرکے کمرے میں داخل ہو گئے۔ لڑکے بھی ہمارے پیچھے۔

"باقی آئندہ وائندہ کچھ نہیں۔ ہم تو اسی وقت سُنیں گے"

"ہم کہتے ہیں ہم اس وقت کچھ نہیں سنائیں گے"

"ہم کہتے ہیں ہم ابھی سُنیں گے"

"ہم کہتے ہیں ...."

"ابھی سُنیں گے" ایک صاحب نے میرا جملہ پورا کیا

"ایک دفعہ کہہ دیا۔ جاؤ نہیں سُناتے۔ جو کچھ کرنا ہو کرلو" اور ہم بھاگے۔ لیکن بھاگتے کہاں چارپائی سے لگی ٹھوکر اور ہم چاروں شانے چت۔ جو صاحب ہمارے پیچھے تیزی سے دوڑے تھے وہ ہمارے اوپر اور اُن کے پیچھے آنے والے اُن کے اوپر۔ عجیب حالت تھی۔ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے کسی کی ٹانگ میں کسی کی گردن۔ کسی کی گردن میں کسی کی ٹانگ۔ ہمارا غصہ ختم ہوگیا۔ اچھا سناتے ہیں۔ لیکن مجھ سے کیوں ضد کرتے ہو۔ اور لڑکے بھی تو ہیں"

"ہم تو تم سے سُنیں گے" ایک صاحب نے اپنی زخمی کہنی پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو سُنو لیکن خاموش رہنا"

ہم آرام سے چارپائی پر لیٹ گئے اور کہنا شروع کیا۔

دس، گیارہ میل کا پیدل سفر تھا۔ اس لئے

جمعرات کو سورج نکلنے سے پہلے ہی روانگی کا ارادہ تھا لیکن دیر ہوگئی اور صبح کوئی ساڑھے سات بجے ہم اپنی پیٹھ پر ایک ایک کمبل، کچھ ضروری کپڑے اور ہاتھ میں ایک ہاکی اسٹک لے کر روانہ ہوگئے۔

ذرا دور نکل گئے تو ایک صاحب سے گانے کی فرمائش کی گئی۔ گاتے اچھا ہیں اس لئے بڑی خوشامدوں کے بعد گانا شروع کیا۔ ابھی اُنھوں نے پہلا ہی مصرع پڑھا تھا کہ ہمارے ایک ساتھی بیٹھے ہوئے آخ تھو آخ تھو کا وظیفہ پڑھنے لگے۔

"ارے کیا ہوا" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوا کیا۔ ان سے کہو خدا کے لئے گانا بند کردیں آوازہی سُن کر گھن آنے لگی"

گانے والے صاحب شرمندہ ہو کر چپ ہوگئے۔

اِس طرح ایک میل کا سفر ختم ہوا۔

یہاں سے یہ طے ہوا کہ کوئی کھیل کھیلتے ہوئے چلیں۔ ایک اچھا سا کھیل چُنا گیا[1] اور دو جماعتیں بن گئیں۔ میں آگے چلنے والے گروپ میں تھا۔

ہم زمین پہ نشان بناتے چلے جا رہے تھے۔ کہیں تو گھاس سے بناتے کہیں پودوں سے اور کہیں ڈھیلے رکھ کر۔

اب ہم میدان میں تھے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے کیا ہیں کہ دوسرا گروپ چلا آرہا ہے حالانکہ وعدے کے مطابق انھیں ۱۵ منٹ کے بعد روانہ ہونا چاہیے تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ جلدی سے نشان بنا کر پرچہ لکھا گیا۔

ہم بخیریت یہاں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آپ نے وعدہ خلافی کی۔ سزا دی جاتی ہے کہ آپ میں سے کوئی صاحب دس شعر کی ایک نظم گائیں۔ نظم پڑھنے کے بعد آپ لوگ آگے جا سکتے ہیں۔"

پرچہ چھپا کر آگے روانہ ہوگئے۔

سامنے ایک گاؤں نظر آرہا تھا۔ ہم جلدی سے گاؤں میں داخل ہوگئے۔ یہاں ہم نے بڑی مشکلوں سے ایک دیہاتی سے کپڑے لئے۔ ایک مَیلی سی قمیص مَیلی سی دھوتی۔ باریک سی پگڑی۔ یہ سب کپڑے اپنے ساتھی کو پہنا کر۔ لکڑی ڈھونے کا کام اُن کے سپرد کیا گیا۔ اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔

ابھی گاؤں سے نکلے ہی تھے کہ سامنے رہٹ چل رہا تھا۔ ایک تجویز ذہن میں آئی۔ فوراً ہی رہٹ والے کے پاس پہنچ کر اس سے کپڑے مانگے۔ وہ کہنے لگا "تم ہمارے کپڑے لے کر بھاگ جاؤگے" اتنے میں کچھ اور دیہاتی آگئے۔ ان میں سے ایک نے فوراً ہی دے دئے۔ رہٹ والے کو ہم نے الگ کیا۔ اس کی جگہ لینے کے لئے مجھے تجویز کیا گیا۔ میں فوراً راضی ہوگیا۔ میرے ساتھی مجھے چھوڑ کر آگے روانہ ہوگئے۔

میں نے جلدی سے قمیص اُتار کر حوض پر رکھ دی۔ جوتے اس کے نیچے چھپا دئے اور اس دیہاتی کی

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھو

ایک پھٹی ہوئی قمیص پہن لی۔ نیکر پر اس کی میلی دھوتی اور سر پر اس کی چادر کا بڑا سا پگڑ۔ بسم اللہ کہہ کر ہم نے بیل کو چابک رسید کیا۔ رہٹ چوں چوں کی آواز پیدا کرتا ہوا گھومنے لگا۔

ہہ ، ہہ ، ہہ ہم نے بیل کے پیٹ میں لکڑی گھسیڑی وہ تیز ہو گیا۔

بانسری کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ ہمارے پچھلے گروپ کا ایک ساتھی بجا رہا تھا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ..... اب پکڑے گئے۔ ہہ ، ہہ ، ہہ کرکے میں نے بیل کو چابک دکھایا اور اُن کی رفتار کی تیزی کے ساتھ میں بھی تیز ہو گیا۔

" ہم پانی پی سکتے ہیں "

ہہ ، ہہ ، ہہ میں نے بیل کو چابک لگا کر آہستہ سے گردن ہلا دی۔

گاؤں والے بھی ہمارے اس کھیل میں دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے ڈرتے ہوئے گردن موڑی۔ دیہاتی ہنس ہنس کر حقّے کے کش لگا رہے تھے

" پکڑے گئے " میں نے دل میں کہا۔ کیونکہ میں نے قمیص حوض پر رکھ دی تھی اور لڑکے قمیص کے پاس ہی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے تو غضب ہی کر دیا۔ میری قمیص پر اپنے چنوں کی پوٹلی رکھے ہوئے شوق سے کھا رہے تھے اور دوسروں کو دعوت بھی دے رہے تھے۔

" خدا کا شکر نہیں .... " ابھی ہم نے دل میں جملہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ وہی حضرت زور سے چیخے " ماسٹر صاحب اشفاق کی قمیص " سب لڑکے دوڑ کر اُن کے قریب آ گئے۔

" قمیص تو اشفاق کی ہے اور یہ جوتا بھی اسی کا ہے " ایک لڑکے نے دونوں چیزیں غور سے دیکھ کر کہا۔

" حضرت کہیں چھپے ہیں " دوسرے صاحب بولے۔

" ان گیہوں کے کھیتوں میں دیکھو۔ کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا "

سب بھر بھر کھیتوں میں گھس گئے۔

جان بچی لاکھوں پائے۔ مجھ پر کسی کو شک نہ ہوا۔ میں نے مسکرا کر دیہاتیوں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

" پتہ نہیں کہاں چھپا ہے " ایک صاحب منہ لٹکا کر بولے۔

" ارے درخت پر نہ بیٹھا ہو " دوسرے صاحب نے جلدی سے کہا۔ جیسے انھیں معلوم ہی تو ہو گیا ہے۔ سب کے سب درختوں کی طرف بھاگے جیسے دیکھنے پنجوں پر اُچک اُچک کر درختوں کی ڈالیوں کو گھور رہا ہے۔

یہ اسکاوٹ کا ایک کھیل ہے۔ اس میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک آگے نشان بناتی ہوئی جاتی ہے دوسری جماعت ان نشانوں کی مدد سے پہلی کو تلاش کرتی ہے

"یہاں بھی نہیں"

"جس لڑکے کی قمیص ہے وہ کہاں گیا تمھیں معلوم ہے" میرے قریب سے آواز آئی۔ کوئی صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"میں نے حواس قائم رکھے ہ ہ ہ یہ کہہ کر میں نے سیل کو تیز کیا اور بغیر جواب دیے آگے بڑھ گیا۔

"کبھی نہیں ملتا قمیص اور جوتا ے چلو" ایک صاحب بولے۔

انھوں نے کپڑے اُٹھائے ہوئے تھے کہ یہ یہاں نے جس کے کپڑے میں پہنے ہوئے تھا۔ میرے کپڑے اُن سے چھین لیے۔ وہ کہتا تھا کہ ایک لڑکا اپنے کپڑے رکھوا کر گیا ہے۔

بہت دیر کے بعد لڑکے ملنے اور آگے روانہ ہوئے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ میں نے ایک ساتھی کو آواز دی۔ "عثمان صاحب" سب کے سب میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر واپس آکر ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا "کیوں کس نے آواز دی تھی" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لڑکے آگے بڑھ گئے۔ میں نے پھر آواز دی لیکن کسی نے نہیں سُنی۔ مجبوراً کپڑے بدل کر اُن کے پیچھے بھاگا۔ وہ لوگ کافی دور نکل گئے تھے۔

"اشفاق کسی نے پیچھے سے پکارا"

میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا یہ وہی حضرت تھے جنھیں ہم پچھلے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ لڑکے اِن کے قریب گئے ہی نہیں۔ شاید نشانات سے ہٹ کر آ رہے ہیں۔

ابھی آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک درخت کے نیچے لڑکے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ دونوں گروپ ـــــ سستا رہے ہیں۔

درخت کے نیچے تھوڑی دیر تک سب نے آرام کیا قریب کے کھیت سے گاجریں خرید کر کھائی گئیں پھر آگے روانہ ہوئے۔ یہاں یہ طے پایا کہ جو گروپ آگے تھا وہ پیچھے آئے گا۔ اگلا گروپ روانہ ہو گیا۔

اب ہم پیچھے نشان دیکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے بعض جگہ بڑی دقت کا سامنا ہوتا۔ نشان ملتے نہیں اور اُن کی وجہ سے پیچھے لوٹ کر پھر دیکھنے پڑتے۔

تھوڑی دور کے بعد ہمیں اگلے گروپ کا ایک پرچہ جھاڑی میں ملا لکھا تھا "اس پودے کے گرد ناچئے پھر آگے بڑھیے۔ ہمیں وہاں ناچنا پڑا۔ مجبور تھے پھر آگے روانہ ہوئے۔

"کوئی صاحب پیچھے ہمیں پکار رہے تھے"

"ارے آپ یہاں کہاں؟ آپ تو اگلے گروپ میں تھے" میں اُن سے مخاطب ہو کر بولا۔

"باقی آئندہ"

سید احسن ، مارہروی

عزیز کے ابا جی کا تبادلہ باندہ کے تھانے سے بلیا ہونے والا تھا۔ عزیز کی عمر اس وقت ۷، ۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اسکول کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ گھر ہی ایک مولوی صاحب پڑھانے آتے تھے۔ اُن کا "آنا" اُس کے لئے موت کے فرشتے سے کم نہ تھا۔ آئے تو ہاتھ میں بید لئے ہوئے۔ بات کرتے تو بید سے۔ خود بھی بہت دُبلے پتلے تھے۔ اس لئے بید کی طرح کانپتے رہتے تھے۔ پڑھاتے وقت بھی بید کی طرح لرزتے جاتے تھے۔

داروغہ جی نے آج کل کے انگریزی اسکولوں میں پڑھا تھا۔ لیکن عزیز کو وہ پُرانے ڈھنگ پر پڑھانا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے اُسے مولوی صاحب کے سُپرد کر دیا تھا۔ یہ اُسے اُردو فارسی پڑھاتے تھے۔ مولوی اسمٰعیل کی پہلی تین کتابیں پڑھ کر عزیز کو اُردو تو اچھی خاصی آگئی۔ لیکن فارسی میں آمدنامہ یاد نہ ہوتا تھا۔ مولوی صاحب آتے ہی مصدر کی گردان کرنے لگتے آمدن ، آمد ۔ آمدند .... وغیرہ خود بھی کہتے جاتے تھے اور عزیز سے بھی کہلواتے جاتے تھے۔ جب تک مولوی صاحب رہتے مصدر اور قواعد اس کے دماغ میں رہتے۔ اِدھر مولوی صاحب کی پیٹھ پھری اور مصدر بھی رفو چکر ہوئے۔

ایک دن سُننے میں آیا کہ داروغہ جی باندہ سے بلیا جائیں گے۔ عزیز خوش تھا کہ مولوی صاحب سے جان بچی۔ دو چار دن میں سفر کا سامان ٹھیک ہوگیا اور ایک دن وہ آیا کہ مولوی صاحب نے اسے آخری سبق پڑھایا۔ اس روز وہ اپنی مہربانی سے خالی ہاتھ تشریف لائے۔ جب آخری بار سبق پڑھا چکے تو چلتے وقت داروغہ جی سے بھی ملے۔ وہ برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ مولوی صاحب بھی وہیں جاکر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "داروغہ جی بڑی خوشی ہے کہ آپ ترقی پر جا رہے ہیں۔ خدا کرے آپ بہت جلد سپرنٹنڈی کا عہدہ پائیں" داروغہ جی نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے "کہیے آپ کے شاگرد کا کیا حال ہے۔ مجھے اپنی ترقی کی خوشی کے ساتھ اس بات کا رنج ہے کہ میرے لڑکے سے

اب آپ جیسے شفیق اُستاد کا ساتھ چھوٹ گیا ہے۔

عزیز کمرے میں کھڑا یہ باتیں سُن رہا تھا جی میں کہنے لگا "جی ہاں جیسے شفیق اُستاد ہیں ہمارا ہی دل جانتا ہے"۔ مولوی صاحب نے جواب دیا "مجھے بھی ننھے میاں کے جانے کا بہت افسوس ہے لیکن کیا کیا جائے دیکھئے بلیا یہاں سے بہت دور تو نہیں ہے کبھی چھٹی میں وہاں آنے کی کوشش کروں گا۔ عزیز نے پھر اپنے دل میں کہا" یہ کیا آفت آئی۔ خُدا خُدا کرکے تو اُن سے پیچھا چھٹا ہے۔ اب یہ بلیا بھی پہنچیں گے

غرض اس قسم کی باتوں کے بعد مولوی صاحب رخصت ہوگئے۔ اور دو ایک دن بعد عزیز اور اس کے گھر والے بلیا پہنچ گئے۔

داروغہ جی کو آٹھ دس دن آئے ہوئے گذر گئے تو اُن کے پاس ملنے کے لئے لوگ آنے شروع ہوگئے قصبے کے زمیندار صاحب۔ شفا خانے کے ڈاکٹر۔ چُنگی کے داروغہ۔ قصبے میں ایک اِسکول بھی تھا۔ داروغہ جی کے ملنے والوں میں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے۔ پچاس سے اوپر عُمر۔ دُبلے، پتلے مولوی صاحب کے پتلے بید کی طرح ایک موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر آئے تھے۔ اُن کے قدم پڑنے سے پہلے ہاتھ کا ڈنڈا اُٹھتا تھا۔ جہاں اُن کا قدم پڑتا تھا اس سے پہلے اُن کا ڈنڈا راستہ صاف کر دیتا تھا۔ آتے تو گھنٹوں بیٹھتے۔ ایک دن بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ عزیز گھر سے نکل کر کہیں بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ ننگے پاؤں اور بدن پر بنیائن اور نیکر۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے داروغہ جی سے پوچھا۔ یہ کس کا بچہ ہے؟ داروغہ جی نے کہا "آپ ہی کا بچہ ہے"۔ اور یہ کہہ کر عزیز کو آواز دی جب عزیز پاس آیا تو کہنے لگے "یہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں۔ ان کو سلام کرو" عزیز نے ادب سے تسلیم کی اور پاس کھڑا ہوگیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اُسے پاس بلایا اور سر پر ہاتھ پھیرا اس کے بعد اُنھوں نے داروغہ جی سے پوچھا یہ کس درجے میں پڑھتے ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ ماسٹر صاحب ابھی تک تو یہ کسی درجے میں نہیں ہیں۔ باندہ میں ایک مولوی صاحب آیا کرتے تھے۔ وہ گھر ہی پر ان کو پڑھاتے تھے۔ اُردو کی تین کتابیں پڑھ چکے ہیں اور اب فارسی کا آمدنامہ پڑھ رہے ہیں۔ "سناؤ تو بیٹے۔ "آمدن" کی گردان"، داروغہ جی عزیز کی طرف دیکھ کر بولے۔ عزیز نے ایک سانس میں۔ آمد۔ آمدند سے لے کر آخر تک گردان سُنا دی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے "کہ ان کو آپ اسکول کیوں نہیں بھیج دیتے فارسی کے ساتھ ساتھ دوسری چیزوں کی پڑھائی بھی ہوجائے گی۔ اس کے بعد عزیز تو چلا گیا اور داروغہ جی اور ہیڈ ماسٹر صاحب میں کچھ اور باتیں ہوتی رہیں۔

دوسرے دن صبح داروغہ جی نے عزیز کو اچکن ٹوپی اور جوتا پہنوا کر ایک منشی جی کے ساتھ اسکول بھیج دیا اسکول گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب

ایک کمرے میں بڑی سی میز بچھائے بیٹھے تھے۔ چاروں طرف اور بھی کرسیاں پڑی تھیں۔ عزیز کو ایک کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ ذرا دیر بعد وہ اُسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں اور بھی لڑکے تھے۔ کمرے کے سرے پر ایک کرسی پر عزیز کو بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پڑھائی شروع ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خود لڑکوں کو پڑھا رہے تھے۔ ایک بات تو رہ گئی کہ جب عزیز اسکول میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے سامنے والے در میں ایک گھنٹی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ گھنٹی ایسی نہ تھی جیسے اسکولوں میں ہوتی ہے۔ بلکہ ٹوپی دار تھی اس کے اندر والا کھٹکا اس سے لگ کر بجتا تھا۔ اس گھنٹی کو ایک رسّی سے باندھ دیا گیا تھا اور رسّی پہیوں پر سے گھوم کر اسکول کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اسکول بہت غریب تھا، کوئی چپراسی وغیرہ اس کام کے لئے نہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے لڑکوں کے سپرد یہ کام کر دیا تھا۔ روزانہ ایک ایک لڑکے کی ڈیوٹی اس کام کے لئے تھی۔ ہیڈ ماسٹر قاعدے کے بہت پابند تھے اُنھوں نے لڑکوں کو حکم دے دیا تھا کہ گھنٹی بجنے سے پہلے وہ سب اسکول کے میدان میں کھیلتے رہیں۔ لیکن جیسے ہی گھنٹی بجے تمام لڑکے باری باری کمرے میں داخل ہو جائیں۔ اگر کوئی لڑکا کسی کو دھکّا دے کر کمرے میں آتا تھا تو اُس کی مرمّت کی جاتی تھی ہیڈ ماسٹر صاحب خود کھڑے ہوئے ایک ایک لڑکے کو اندر آتے..... ہوئے دیکھتے تھے۔ اور یہی حکم واپسی کے لئے تھا۔ جب چار بجے اسکول کا وقت ختم ہو جاتا تھا تو ایک لڑکا اُٹھ کر گھنٹی بجاتا تھا۔ گھنٹی کی ٹن ٹن پر لڑکے اپنی جگہ سے اُٹھتے اور ایک ایک کر کے باہر جاتے تھے۔ بدقسمتی سے جس دن عزیز اسکول پہنچا اُس دن اس لڑکے کی باری تھی جس کی خالی جگہ پر عزیز کو بٹھایا گیا تھا۔ گھنٹی بھی عزیز کو بجانی تھی۔

اسکول میں ایک ہی درجہ تھا اور ایک ہی ماسٹر تھے۔ وہی ہیڈ ماسٹر تھے اور وہی سکنڈ ماسٹر۔ ان کے طالب علم ۴۰، ۵۰ تھے۔ چار بجے ہیڈ ماسٹر صاحب لڑکوں کو پڑھا رہے تھے جب چار بج گئے تو وہ رُک گئے۔ پہلے لڑکوں نے پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے عزیز کی طرف دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہر شخص اپنا اپنا بستہ سنبھالنے لگا۔ اس دن عزیز زیادہ کتابیں نہ لے گیا تھا، صرف ایک کتاب اور کاپی تھی۔ اُس نے بھی ان دونوں کو سنبھال لیا۔ اور اپنی جگہ بیٹھا رہا لیکن اب لڑکے اُسے اور بھی گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ پاس بیٹھنے والوں نے انگلی سے ٹھونکنا شروع کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی گھورنے لگے مگر عزیز کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ لوگ اسے کیوں گھور رہے ہیں۔ ایک ایک لڑکا بغل میں کتابیں دبائے بھاگنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن کوئی کمرے سے باہر نہ جاتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر بھی میز کی دراز میں حاضری کا رجسٹر اور دوات قلم بند کر چکے تھے۔ وہ بھی کھڑے دیکھ رہے تھے لیکن کوئی اپنی جگہ سے ہٹتا نہ تھا۔ ایک

لڑکے نے عزیز سے چپکے سے کہا، "جاکر گھنٹی کیوں نہیں بجاتے۔" عزیز کی سمجھ میں اُس کی بات نہ آئی۔ تب ہیڈ ماسٹر صاحب نے چلاکر کہا "اور قاعدے سے بے خبر کیا تجھے معلوم نہیں کہ آج گھنٹی تو بجائے گا۔ کیوں دوسروں کو روکتا ہے اور میرا وقت بھی خراب کرتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو یہ تو یاد تھا کہ اس جگہ بیٹھنے والے کی باری ہے مگر غالباً یہ بھول گئے تھے کہ عزیز اسکول میں بالکل نیا تھا اور یہاں کے قاعدے کو نہ جانتا تھا۔ عزیز اب سمجھا کہ گھنٹی شاید اُسی سے بجانے کو کہہ رہے ہیں وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ دو چار لڑکوں نے اُسے پیچھے سے دھکیلا اور کہنے لگے کہ "یار جلدی سے جاکر گھنٹی بجاؤ۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" وہ تیز قدم اُٹھاکر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک کرسی میں پاؤں پھنس گیا اور گرتے گرتے بچا۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب کو اور بھی تاؤ آیا۔ عزیز اُن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھاکر اُسے آگے کھینچا اور گھنٹی کی رسّی کے پاس لے جاکر کہا "اس کو کھینچو۔" عزیز نے جیسے ہی ایک پر سے رسّی کو کھول کر کھینچی۔ ٹن ٹن کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز سنتے ہی لڑکوں کی جان میں جان آگئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ اور ایک ایک کرکے باہر جانے لگے۔ عزیز دو چار مرتبہ رسّی کھینچ کر سمجھا کہ بس اب چھٹی ہو گئی۔ رسّی چھوڑ دینی چاہیے۔ اس نے ہاتھ روک لیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ رُکا گھنٹی کی آواز بھی رُک گئی۔ گھنٹی کی آواز کا رُکنا تھا کہ سب لڑکے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے حکم دے دیا تھا کہ گھنٹی کی ٹنا ٹن کے ساتھ لڑکے باہر نکلیں اور جب آواز بند ہو جائے تو لڑکے بھی رُک جائیں اس لئے جب عزیز کا ہاتھ رُکا تو گھنٹی کی آواز کے رُکنے کے ساتھ ساتھ لڑکے بھی رُک گئے۔ اور کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر بھی کھڑے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ تاؤ میں آگے بڑھے اور عزیز کے ہاتھ سے رسّی کھینچ کر زور زور سے بجانے لگے اور کہنے لگے کہ "گھنٹی بجانا بھی نہیں آتی۔ دیکھو ایسے گھنٹی بجتی ہے۔ اور یہ کہہ کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے رسّی کھینچنا شروع کی۔ گھنٹی میں سے تیزی سے ٹنا ٹن کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس کی تیزی سے لڑکے باہر نکل رہے تھے۔ تقریباً آدھے لڑکے باہر جا چکے ہوں گے کہ ایک دم سے باہر سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ بے چارے ہیڈ ماسٹر صاحب ہاتھ میں رسّی لئے ہوئے زمین پر پڑے تھے، جو لڑکے کمرے میں رہ گئے تھے وہ بھی رک گئے۔ گھنٹی کی آواز کے ساتھ جو لڑکے رُکے تو انھوں نے مُڑ مُڑ کر عزیز کی طرف دیکھا، عزیز تو اپنی جگہ پر تھا لیکن لڑکوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب نظر نہ آ رہے تھے، دو ایک نے اُچک کر جو دیکھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب ٹانگیں اوپر کئے اور ہاتھ اُٹھائے پڑے تھے۔ لڑکے کتابیں چھوڑ کر ان کی طرف پلٹے۔ اور دو ایک نے سہارا دے کر

انھیں اُٹھایا۔ عزیز نے بھی اُن کے کپڑے جھاڑے گھنٹی رُک چکی تھی۔ بقیہ لڑکے کیسے باہر جاتے ہیڈ ماسٹر صاحب نے کھڑے ہو کر پہلے عزیز پر ڈانٹ بتائی اور کہا" بڑا بدتمیز لڑکا ہمارے اسکول میں آیا ہے جس کو یہ تک نہیں معلوم کہ گھنٹی کیسے بجتی ہے۔ نہ معلوم کس گدھے نے اس کو پڑھایا ہے۔ پھر کہنے لگے اچھی بات ہے۔ آج شام کو داروغہ جی کے سامنے تیری مرمت ہوگی۔ بقیہ لڑکے جانے کے لئے منتظر کھڑے تھے گھنٹی اب رُک چکی تھی اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحب کے زبانی حکم پر وہ باہر گئے اور اُن کے ساتھ ہی عزیز بھی اِسکول کا پہلا دن ختم کرکے گھر گیا۔

باغ کی سیر

فہیم جہاں بیگم۔ آگرہ

چلو چلو سب باغ کو جائیں
باغ کو جائیں دِل بہلائیں
باغ میں جاکر شور مچائیں
پھول بھی توڑیں پھل بھی کھائیں
پیڑ میں پھر اک جھولا ڈالیں
آپ بھی جھولیں سب کو جھلائیں
"ننھی منی بوندیاں" گائیں
گانے گائیں دِل بہلائیں
سب مل کر پینگیں جو بڑھائیں
پیڑ جو ٹوٹے سب گر جائیں
مامی آکر سب کو ڈانٹیں
روتے روتے گھر کو آئیں
ابا ڈانٹیں امی ڈانٹیں
گھر والے سب ڈانٹ پلائیں
ایسی شرارت اب مت کرنا
اماں اور ابا سمجھائیں
سیر ہوئی یہ خوب ہماری
نظم فہیم اپنی یہ چھپوائیں

اچھا شمّو

عبد القدیر۔ جبل پوری

میرا شمو دوڑا آیا
منّی کا ہاتھ میں گھوڑا لایا
میں نے پوچھا اس سے یہ جب
جاؤگے مکتب تم بھیا کب
سُن کر اتنا رونے لگا وہ
اسکول سے مُنہ دھونے لگا وہ
میں نے پھر اس کو سمجھایا
مکتب کا سب کام کرایا
بستہ لے بے حیلہ بہانہ
ہوگیا وہ اسکول روانہ
اب خود شوق سے پڑھتا ہے وہ
درجے میں اچھا لڑکا ہے وہ

ہندوستان

احمد۔ گیا

مُلک یہ کتنا اچھا ہے
آنکھوں کا یہ تارا ہے
دیتا سب کو کھانا ہے
دیتا سب کو کپڑا ہے

نام اِس کا ہندوستاں ہے
نام اس کا ہندوستاں ہے

یہ شمع ہے ہم پروانے ہیں — پروانے ہیں دیوانے ہیں
اس مُلک پہ ہم مِٹتے ہیں — جان اس پہ خوشی سے دیتے ہیں

نام اس کا ہندوستاں ہے
نام اس کا ہندوستاں ہے

ہیں سب ہی اس کے فدائی — مسلم، ہندو، عیسائی
ہیں سب ہی بھائی بھائی — سب کرتے ہیں اس کی بھلائی

نام اس کا ہندوستاں ہے
نام اس کا ہندوستاں ہے

ہمارا ہندوستان

حسن مجتبیٰ مسرت چتر پور

یہ ہندوستان ہمارا
ہے ہم کو کتنا پیارا

سورج اور چاند ہیں آتے
روشن اس کو کر جاتے
تارے چراغ دکھاتے

ساری دُنیا سے نیارا
یہ ہندوستان ہمارا

کیا اچھے پھول کھلے ہیں
رس پی کر بھیں پلے ہیں
شاخوں سے ملے جلے ہیں

اونچا ہو اس کا تارا
یہ ہندوستان ہمارا

ہے آب و ہوا بھی ایسی
ہوگی نہ کہیں کی ویسی
خوش سب کی طبیعت کیسی

اونچا ہوا اس کا تارا
آزاد ہو ہندوستان ہمارا

تین بے وقوف

بخش الٰہی۔ عمر ۱۴ سال

لو اک بیوقوں کا قصہ سُنو — عجب لطف کا ہے سُنو تو سُنو
کسی شہر کو دیکھنے کے لئے — فقرا و بدھو وجمن تھے چلے
وہاں ایک مینار آیا نظر — ہوئے سارے حیراں اُسے دیکھ کر
ہوا اس کی تعمیر پر تذکرا — تو اک اس طرح اُن میں کہنے لگا
غضب کیسا لمبا وہ معمار تھا — بلند ایسا مینار اس نے چنا
وہیں دوسرے نے دیا یہ جواب — اسی پر عقل مند بنتے ہیں آپ
یہ مینار جو دیکھتے ہو کھڑا — وہیں پر لِٹا کر بنایا گیا
خفا ہو کے بولا وہیں تیسرا — ارے بیوقوفو نہ سمجھے ذرا
کنواں تھا زمیں کے یہ اندر بنا — الٹ کر جسے پھر کھڑا کر دیا
بھلا یہ بھی کچھ بات میں بات تھی — سمجھ میں تمھارے نہ جو آسکی

غرض تینوں باہم جھگڑتے ہوئے
وہاں سے چھپا گئے کو وہ بڑھ گئے

ایک دن فیبوس کے دوستوں نے اس سے التجا کی کہ صرف ایک بار وہ کھلے میدان میں ہنی بال کا مقابلہ کرے تاکہ روم والوں کو کچھ تسلی ہو۔ وہ اچھی خبروں کے انتظار میں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ بد دل ہو جائیں لیکن فیبوس نے انکار کر دیا اور کہا۔

"میں بزدل کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنی پوری فوج کو خطرے میں ڈال دوں۔ پورے روم پر تباہی لے آؤں۔ میں جانتا ہوں کہ جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے وہ درست ہے اور میں اس وقت تک اپنی رائے پر قائم رہوں گا جب تک میں روم کا حاکم ہوں!"

اس کے بعد ایک ایسی بات ہوئی جس نے رومی فوج کو فیبوس سے اور زیادہ بدظن کر دیا۔ ہنی بال جو رومیوں سے کہیں زیادہ ہوشیار جنرل تھا، فیبوس کی چال کو سمجھ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ فیبوس کا سامنے نہ آنا صرف اس لئے ہے کہ ہنی بال کی فوجیں تھک جائیں اور پھر وہ آسانی سے ان کا قلع قمع کردے یہ سوچ کر ہنی بال نے تہیہ کر لیا کہ وہ فیبوس کی یہ چال کامیاب نہ ہونے دے گا اور اگرچہ اس کی فوج تعداد میں کم تھی لیکن اس کے سپاہی رومی سپاہیوں سے زیادہ پھرتیلے اور سدھے ہوئے تھے۔ خود ہنی بال فیبوس سے کہیں زیادہ ہوشیار سپہ سالار تھا۔ چنانچہ اس نے ایک اور ترکیب سوچی۔

وہ ترکیب یہ تھی کہ ہنی بال نے اپنی فوج کے ساتھ خوب صورت شہر "کپانیا" پر حملہ کر دیا اور اس حملے کا مقصد یہ تھا کہ جب فیبوس یہ دیکھے گا کہ اتنا خوب صورت شہر ہنی بال کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے تو وہ خود بھی جنگ کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ مگر بدقسمتی سے راستہ بتانے والوں نے ہنی بال اور اس کی فوج کو غلط راہ پر ڈال دیا اور وہ بجائے "کپانیا" پہنچنے کے ایک ایسی تنگ وادی میں پھنس گیا جس کے تین طرف اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں اور ایک طرف راستہ تھا جس سے وہ داخل ہوتا تھا۔ فیبوس کی فوج تو پیچھے

رہتی ہی تھی۔ اُس نے جو دیکھا کہ ہنی بال مع اپنی فوج کے اس وادی میں پھنس گیا ہے تو فوراً اس رستے کو روک لیا اور فیبوس کے حکم سے اس پہاڑی کے چاروں طرف فوجیں پھیل گئیں۔ ہنی بال گویا ایک طرح سے قید ہو گیا لیکن ہنی بال کا جسم بظاہر فوج میں گھر گیا تھا، اس کا دماغ آزاد تھا۔ اُس نے اپنی فوج کو تسلی دی کہ گھبرانا بیکار ہے۔ ذرا تاریکی ہونے دو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اس کی فوج کے لئے اتنی تسلی کافی تھی کیونکہ ہنی بال کے سپاہی اس کی بات بات پر یقین رکھتے تھے

جب رات کی تاریکی اچھی طرح پھیل گئی تو اُس نے حُکم دیا کہ فوج میں جتنے بیل ہیں اُن کے سینگوں میں شمعیں باندھ دی جائیں۔ اِس حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھر ہنی بال کے حُکم سے انھیں روشن کیا گیا اور بیلوں کو پہاڑیوں پر ہنکا دیا۔

فیبوس کے سپاہیوں نے جو پہاڑیوں پر دوڑتی ہوئی روشنیاں دیکھیں تو سمجھے کہ ہنی بال کی فوج بھاگ رہی ہے۔ لگے اس کا پیچھا کرنے۔ اِدھر ہنی بال کو جو راستہ ملا تو اپنی پوری فوج کو صاف نکال لے گیا اور ایک جان بھی ضائع نہ ہوئی۔

اس واقعہ نے فیبوس کو عام رومی باشندوں کی نظروں سے گرا دیا اور وہ سوچنے لگے کہ انھوں نے فیبوس کو ڈکٹیٹر بنانے میں غلطی کی۔ آخر ایک دن رومیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ فیبوس نے اب تک کچھ نہیں کیا نہ آئندہ اس سے کچھ اُمید ہے۔ فیبوس نے یہ ناانصافی اور اپنی بے قدری دیکھی لیکن خاموش رہا کیوں کہ اُسے اپنے آپ پر بھروسہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگرچہ وہ ہنی بال کو شکست نہ دے سکا۔ لیکن اسے روکے ضرور رہا ہے۔

اسی زمانے میں فیبوس کو روم واپس آنا پڑا کیونکہ خداؤں کے سامنے قربانیاں دینے کا وقت آ گیا تھا۔ اور فیبوس اپنے اعتقاد کا پکّا تھا۔ اُدھر فوج میں مینی کوس کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنی فوج کے ایک دستے سے ہنی بال کی اس چھوٹی سی فوج پر حملہ کر دیا جو غلّہ اور رسد کا سامان لینے آئی تھی۔ ان تھوڑے سے سپاہیوں کی مینی کوس کی پوری فوج کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا تھی۔ ذرا دیر میں میدان صاف ہو گیا اور مینی کوس کو فتح ہوئی۔

اس واقعہ نے رومیوں کی نظروں میں مینی کوس کو بہت بڑھا چڑھا دیا۔ اگر اُن کا بس چلتا تو فوراً فیبوس کی جگہ مینی کوس کو حاکم بنا دیتے۔

جب فیبوس نے یہ سُنا تو اُسے بہت رنج ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ مینی کوس کی یہ اوچھی حرکت ہنی بال کو اور زیادہ آگ بگولا کر دے گی اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ مینی کوس کو ضرور سزا دے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے سپہ سالار کا حکم ٹال دیا تھا۔

لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ فیبوس مینی کوس کو سزا

دینے پر تُلا ہوا ہے تو اُسے بھی رُوم کا حاکم بنا دیا اور فیبؤس کے برابر اختیار دے دئے۔ گویا اب رُومی فوج میں بجائے ایک سپہ سالار کے دو سپہ سالار ہوگئے جن کے رُتبے برابر تھے۔ اور جو جی چاہے کرسکتے تھے۔

اب تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ جب مِنی کوس جیسے آدمی کو اختیار ملا ہوگا تو اس نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مِنی کوس نے یہ کیا کہ اختیار ملتے ہی اپنے خیمے پر سُرخ جھنڈا گاڑ دیا۔ جو اس بات کی نشانی تھا کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہے۔ ہنی بال تو چاہتا ہی تھا کہ کھُلے مَیدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہو جائے۔ مِنی کوس کو جنگ کے لئے آمادہ دیکھ کر اس نے اپنی پوری فوج سے حملہ کر دیا۔ جنگ ہوئی۔ مِنی کوس جو عقلمند کم لیکن بہادر زیادہ تھا اپنی جلد بازی کی وجہ سے شکست کھا گیا۔

شام کے قریب فیبؤس نے جو ایک پہاڑی پر کھڑا جنگ کی تمام کیفیت دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ ذرا دیر میں مِنی کوس تباہ ہونے والا ہے۔ اپنی فوج کو للکارا اور کہا:۔

"بہادر سپاہیو! اگر تمھیں اپنے وطن سے محبت ہو تو اس نازک وقت میں مِنی کوس کا ساتھ دو۔ آؤ میرے پیچھے آؤ۔ میں بہادر مِنی کوس کی مدد کو جا رہا ہوں۔ کیوں کہ اس کو اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔ یاد رکھو کہ یہی موقع ہے فتح کا۔ اور دیکھو ہنی بال کی فوج تھک چکی ہے۔"

یہ کہہ کر فیبؤس نے مِنی کوس کو بچانے کے لئے ہنی بال کی فوج پر حملہ کر دیا۔ فیبؤس کی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ جدھر رُخ کرتا تھا دشمن کے سپاہی پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ ایک عظیم سپہ سالار تھا فیبؤس! ذرا دیر میں ہنی بال کی فوج پیچھے ہٹ گئی اور اگرچہ فتح اس بار ہنی بال کو ہوئی لیکن مِنی کوس اور اس کے سپاہی تباہی سے بچ گئے۔

اور اگرچہ یہ مِنی کوس کی دوسری بڑی غلطی تھی لیکن فیبؤس نے معاف کر دیا۔ مِنی کوس کی رگوں میں بھی شرافت کا خون تھا۔ اُس نے اس واقعہ کے بعد فیبؤس کے آگے سر جھکا دیا۔ اور افسری سے اِستعفٰے دے دیا۔

روم والوں کی بھی اب آنکھیں کھل گئی تھیں اور اُن کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہنی بال سے مقابلہ کرنے کے لئے فیبؤس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

کہانی

محمد اسلم

ایک دفعہ ایک آدمی شکار کو نکلا۔ لیکن شام ہونے پر بھی کوئی شکار نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خرگوش دکھائی دیا۔ اس نے مارنے کو بندوق اٹھائی ہی تھی کہ خرگوش غائب ہو گیا۔ آخرش ایک ہرن دکھائی دیا۔ اس نے گولی ماری ہرن بھاگتا ہوا ایک شیر کی کچھار میں گھس گیا۔ شیر نے باہر نکل کر دیکھا ہی تھا کہ گولی الٹے پاؤں بھاگنے لگی اور ایک جھاڑی پر چڑھ گئی۔ شیر بھی ہمت کرکے اوپر چڑھ گیا۔ گولی نیچے اُتر کر بولی "آیندہ سے میرا پیچھا نہ کرنا"

لکڑی چلنے لگی

محمد احسن تعلیمی مرکز جامعہ

ایک لڑکا تھا۔ ایک دن وہ دریا پر گیا۔ اُس نے کچھوا دیکھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے اور کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ سمجھا کوئی لکڑی پڑی ہے۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ اور مچھلی کا شکار کھیلنے لگا۔

اس نے دیکھا اور بہت سے لوگ کنارے پر مچھلی کا شکار کھیل رہے ہیں۔ کچھوا جب اندر جانے لگا تو وہ لڑکا چلّایا۔ لوگو دوڑ دیں ڈوبا۔ لوگ سُنتے ہی دریا میں کود پڑے اور اُسے پکڑ لائے اور قصہ سُن کر ہنسنے لگے۔

تاج محل

علاؤالدین رحمٰن۔ عمر ۱۰ سال

دریائے جمنا کے کنارے وہ عالی شان عمارت جو دُنیا کے عجائبات میں گنی جاتی ہے۔ تاج محل کہلاتی ہے۔ یہ عمارت شاہ جہاں نے بنوائی ہے۔ اس عمارت میں شاہ جہاں اور اس کی بیوی کی قبر ہے۔ شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل نے مرتے وقت شاہ جہاں سے کہا کہ میری قبر کے اوپر ایسی عمارت بنوانا کہ دنیا بھر میں اُس کی شہرت ہو۔ جب اُس کی بیوی مر گئی تو شاہ جہاں نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص ایک خوب صورت عمارت کا نقشہ لائے گا اُس کو بہت سا انعام دیا جائے گا۔ ہزاروں آدمی خوب صورت سے خوب صورت مکانات کے نقشے لائے لیکن شاہ جہاں کو پسند نہ آئے ایک

شخص تاج محل کا نقشہ بنا کر لایا اور شاہ جہاں کو دکھایا۔ شاہ جہاں کو تاج محل کا نقشہ بہت پسند آیا اور اس نے اس نقشے کے مطابق یہ عالی شان عمارت تیار کرائی۔ جب شاہ جہاں مرگیا تب اس کے بیٹے اورنگ زیب نے ممتاز محل کے مقبرے میں اُسے بھی دفن کردا دیا۔ تاج محل کے اس پاس نہایت عمدہ باغ ہے۔ تاج محل سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے کے واسطے لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں۔

ایک رحم دِل پیامی

سلطان احمد متعلم درجہ سوم۔ کان پور

ایک مرتبہ ایک پیامی شکار کھیلنے گیا۔ اس نے ایک چڑیا بہت پیاسی دیکھی۔ پیامی کو اس پر رحم آگیا۔ اُس نے پانی رکھا چڑیا نے پی لیا اور اُڑ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پیامی چلتے چلتے تھک گیا۔ اس نے ایک پیڑ کے سایے میں بیٹھ کر اپنے جھولے سے روٹی نکالی اور کھانے لگا۔ کھاپی کر پیڑ کے نیچے سو گیا۔ اتنے میں ایک کالا سانپ ایک سوراخ سے نکلا اور اس کی طرف بڑھا چڑیا یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً اُڑکر آئی اور پیامی کے مُنہ پر اپنے پر پھڑپھڑانے لگی۔ پیامی جاگ اُٹھا۔ اُس نے سانپ کو دیکھ لیا اور مار ڈالا۔

ایک لڑکی

ممتاز صدیق درجہ سوم تعلیمی مرکز جامعہ، دلی

ایک لڑکی تھی۔ یہ لوگوں کے گھروں میں جب لوگ سو رہا کرتے اُس وقت آتی اور کوئی چیز چرا کر بھاگ جاتی تھی ایک دن ایک افسر کے گھر گئی اور گملے لے جانے لگی۔ ایک گملے پر چڑیا بیٹھی تھی وہ لڑکی کو دیکھ کر اُڑ گئی۔ گملا گر گیا۔ لوگ جاگ اُٹھے اور کہنے لگے "چور، چور، پکڑو، پکڑو۔" وہ لڑکی پکڑی گئی۔

اِتفاق

خلیق الزماں۔ اندور

ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جب وہ مرنے لگا۔ تو اس نے اپنے تینوں لڑکوں کو بلایا اور ایک لکڑیوں کا گٹھا دے کر سب سے بڑے لڑکے کو توڑنے کا حکم دیا۔ بڑے لڑکے نے جب بہت کوشش کرلی تو دوسرے سے کہا۔ اسی طرح تینوں کوشش کر چکے اور وہ نہ ٹوٹا تو باپ نے ایک ایک لکڑی توڑنے کو کہا۔ ہر لڑکے نے اپنی اپنی لکڑی کے جلد ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تب باپ نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"پیارے بیٹو! اتفاق بہت بڑی طاقت ہے۔"

عزیز بچیو اور بچو۔ آج کل گرمی اپنے بہار پر ہے۔ پچھلے دنوں مئی میں کچھ بوندا باندی ہوئی تھی اور موسم کچھ خوش گوار ہوگیا تھا مگر اب پھر گرمی آہستہ آہستہ پھر اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ دلی میں برسات کا موسم ۱۵ جون سے شروع ہوجاتا ہے خدا کرے ۱۵ دن کے بعد ہی برسات گرمی کو رخصت کردیں اور لوگوں کی جان میں جان آئے۔

پچھلے مہینے یونان کی فتح کے بعد لڑائی کا زور افریقہ کی طرف پھر زیادہ ہوگیا ہے۔ جرمنی اور اٹلی مصر میں گھس کر نہر سویز پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ بنغازی اور بنغازی سے طبروق تک بڑھ آئے تھے مگر اب انگریزی فوجوں نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ بلکہ تازہ خبریں یہ ہیں کہ سولم بھی ان سے چھین لیا ہے۔ ادھر ابے سینیا میں تو انگریزوں کی فتح ہی فتح ہے۔ حبشہ کے بادشاہ ہیل سلاسی ۵ برس بعد پھر اپنے ملک میں واپس آگئے ہیں حبشہ کی رعایا بہت خوش ہے کہ اس کا بادشاہ واپس آگیا اور اس کا ملک اٹلی کی غلامی سے آزاد ہوگیا۔

پچھلے مہینے کا اہم واقعہ عراق کے وزیر اعظم راشد علی گیلانی کی انگریزوں سے لڑائی ہے۔ اس شخص کا نازیوں سے ساز باز تھا اس نے وزیر اعظم ہوتے ہی پہلے تو نو عمر بادشاہ کے چچا امیر عبد اللہ کو نکالا یہ بادشاہ کی طرف سے حکومت کرتے تھے اور انگریزوں کے خیر خواہ تھے اس کے بعد اس نے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ وہ کہتا ہے کہ اتنی زیادہ انگریزی فوج کا یہاں رکھنا معاہدے کے خلاف ہے یا تو زائد فوج یہاں سے گذر جائے اور نئی فوج آئے یا پھر ہم سے باقاعدہ بات چیت کی جائے۔ انگریز اس وقت دوسری طرف تیاریوں میں مصروف تھے اس لئے اس طرف زیادہ توجہ نہ کرسکے پھر بھی عراقی فوج کو انھوں نے قریب قریب ٹھیک کر دیا تھا کہ ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فرانس کی حکومت نے ہٹلر کے دباؤ سے مجبور ہوکر جرمن فوجوں کو شام سے گذرنے اور شام کے ہوائی اڈوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اب لڑائی کا سامان جرمنی سے شام کے راستے سے راشد علی کے پاس پہنچ رہا ہے اور راشد علی جرمنی کی شہ پر انگریزوں سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ انگریزی ہوائی جہاز بھی عراق اور شام دونوں جگہ اچھی طرح مقابلہ کر رہے ہیں اور غالباً ہٹلر کے منصوبے کو پورا نہ ہونے دیں گے۔

ہاں پچھلے مہینے ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا یعنی رڈولف ہس صاحب اچانک ولایت کے ایک شہر گلاسکو کے قریب

دیہات میں ایک دیہاتی کے مکان کے پاس ٹپک پڑے۔ اُن کے جہاز میں آگ لگ گئی تھی اس لئے ہوائی چھتری کے ذریعے اُترے۔ یہ اُن کے لئے پہلا اتفاق تھا۔ ٹخنے میں چوٹ آگئی۔ یہ حضرت ہٹلر کے نائب ہیں اور ہٹلر نے اپنے ایک اور ساتھی گوئرنگ کے بعد اپنا جانشین بنایا تھا۔ غرض یہ جرمنی کے خاص لوگوں میں سے تھے۔ اسی لئے اس واقعے کی صبح کو یہ خبر مشہور ہوئی تو یوں سمجھو کہ تمام دُنیا میں ہل چل مچ گئی اور تھا بھی یہ ایسا ہی عجیب واقعہ۔ جانے یہ چارے جرمنی سے کیوں بھاگ آئے۔ آپس میں لڑائی ہوگئی ہوگی۔ جرمنی والے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ پہلے ہی کچھ خراب ہے۔ کچھ بھی ہو اب تو یہ انگریزوں کے مہمان ہیں۔ ہمیں تو افسوس ہے کہ یہ پیامِ تعلیم کے دفتر کے پاس کیوں نہ اُتر پڑے۔ پیامِ تعلیم کا تمام دُنیا میں اشتہار ہو جاتا۔ اچھا ایک بات بتاؤ اگر یہ کہیں تمھارے گھر کے پاس اُترتے تو .... ؟ ہے تو سوچنے کی بات! ضرور سوچنا اور اگر اس کا جواب تم ۱۲ر جون تک ہمیں بھیج دو تو اچھے جواب پر ہم انعام دیں گے۔ جواب مضمون کی صورت میں ہو اور مضمون کاپی کے زیادہ سے زیادہ دو صفحوں پر۔ یاد رکھنا۔

اِدھر یورپ کی طرح جاپان نے افت ڈھا رکھی ہے۔ ابھی جاپانیوں کے ذریعے آئی خبر یہ ہے کہ ایک لڑائی میں کوئی تیس ہزار چینی مارے گئے اور دس ہزار قید ہوئے۔ دیکھو چین اپنے وطن کی آزادی کی خاطر کتنے سپوت قربان کر چکا ہے اور اب تک اس کا وہی دم خم ہے۔ اب ذرا اپنے ملک کا بھی تھوڑا سا حال سن لو۔ عراق کے فتنے کی وجہ سے یوں سمجھو کہ لڑائی ہندوستان کے دروازے پر آگئی ہے مگر ہمارے ہندوستانی بزرگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں اُنھوں نے تو اپنا پُرانا شغل پھر تلاش کر لیا ہے۔ وہی آپس کی لڑائی۔ پچھلے دو مہینوں میں بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، بمبئی کے کسی نہ کسی شہر میں لڑائی ضرور ہوئی ہے

انعام اوّل — فی کس ایک روپیہ

معمّا نمبر ۱۰ کے حل ان بچّوں کے صحیح ہیں

(۱) محمد خلیق الزماں۔ اندور (۲) سید یونس احمد رضوی۔ نینی تال (۳) رحیم الدین۔ دہلی
(۴) محمد رفیق۔ دہلی (۵) سُلطان احمد۔ دہلی (۶) ماجد علی۔ دہلی

انعام فی کس ۸ آنہ

ان بچّوں کے حلوں میں حلوں میں ایک غلطی ہے۔

(۱) محمود علی خاں دہلی (۲) زبیدہ بیگم، حیدرآباد دکن۔ (۳) محمد ظفر، لاہور (۴) اسد احمد، حیدرآباد دکن (۵) عبدالحق صدیقی، بنارس (۶) مبارک حسین خان انٹھرو، بدر النسا بیگم، شو لا پور (۷) رفیق داد خاں، بھوپال (۸) شمیم آرا۔ حیدرآباد دکن (۱۰) محمود علی ریواڑی (۱۱) سید ضیاء الرحمٰن دہلی (۱۲) جمیل اختر، لائل پور (۱۳) عبدالقادر حیدرآباد دکن (۱۴) جمال عبدالواحد الہ آباد (۱۵) علی حسین، ہردہ (۱۶) اقبال مرزا، دہلی (۱۷) منصور حسین اصدر، دہلی (۱۸) منظور عبدالرحمٰن، دہلی (۱۹) عمر کامل، دہلی (۲۰) محمد ظفر الہدیٰ، دہلی (۲۱) افتخار اللہ، دہلی (۲۲) عطاء الرحمٰن بہاری۔ دہلی (۲۳) جمشید اختر، بمبئی (۲۴) مقصود طالب، لاہور ؎

معمّا نمبر ۱۹

پہلا انعام - ۶ ؍
دوسرا انعام - للعہ ؍

مشقی کوپن

دائیں سے بائیں

(۱) اگر برطانیہ نے جلد سخت کارروائی نہ کی تو جرمن ... میں پاؤں جمالیں گے۔
(۴) برطانیہ والوں کی دعا "خدا کرے ہٹلر کا بیڑا ... ہوجائے"
(۷) اور ہماری دُعا "خدا کرے ہندوستان کے .. پھر جائیں"
(۸) آج کل فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ..... ہی اچھا ہے۔
(۹) صرف ... پوشاک ہی شرافت کی دلیل نہیں۔
(۱۱) لفظ محبوب کے بے ترتیب حروف۔
(۱۳) زندگی سے ... اگر خودکشی کرنا انتہائی بزدلی ہے۔
(۱۸) اس میں طول تو ہوتا ہے عرض نہیں ہوتا۔
(۱۹) اونچی ..... پھیکا پکوان (بے ترتیب)
(۲۱) چھچھوری باتیں بڑے بڑے آدمیوں کے ... کو صدمہ پہنچا سکتی ہیں۔
(۲۲) شادی ... نسب دیکھ کر ہی کرنا چاہیے۔ (الٹا)

اوپر سے نیچے

(۱) ہر شخص کو اس سے بچتے رہنا ہی اچھا ہے۔
(۲) ... سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
(۳) انگلستان کی کئی .... عمارتیں اس جنگ میں تباہ ہوگئیں۔
(۴) اس معمّے میں جو شعر لکھا ہے وہ ... کا ہے۔
(۵) میدانِ جنگ۔
(۶) اکثر ... صرف چہرے سے پہچان لئے جاتے ہیں۔
(۱۰) جس دن ... مسلمانوں کی واحد جماعت ہوگئی اسی دن ہندوستان میں ایک انقلاب رونما ہوگا۔
(۱۲) ایک کانگریسی اور ایک مسلم لیگی لیڈر کے نام کے پہلے حروف۔
(۱۴) ہم سب حیوانِ .... ہیں۔
(۱۵) پریشانی میں زیادہ ... سے کوئی فائدہ نہیں۔
(۱۶) الٹا پڑھ لو یا سیدھا پڑھ لو۔ لفظ وہی رہے گا۔
(۱۷) بے جا ... خواہ کسی کی کی جائے۔ مناسب نہیں۔
(۱۸) عادت
(۲۰) معمولی سی .. کٹنے پر بھی خون بہتا ہے۔

(۱) معمّا ۱۸ جون تک بھیج سکتے ہو۔
(۲) ایک ہی لفافے میں کئی معمّے بھیجے جا سکتے ہیں۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ اُستاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ آٹھ حلوں کی ۶ر ہے

(۴) دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

(۵) تمام حل ۱۸ جون تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں

(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۷) پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔

(۸) کوپن کے چاروں طرف جو نقطے دار لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو

(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

(۱۰) ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمّے آنے چاہئیں۔

(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہئے۔

(۱۲) معمّا حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔

(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

(۱۴) دال اور واؤ کا فرق نمایاں ہو (دٗ ۔ وٗ)

(۱۵) چھوٹی ی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ۔ ے)

(۱۶) جہاں جہاں نُقطے کا استعمال ہو وہاں نُقطہ ضرور ہونا چاہئے۔

(۱۷) املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں۔

(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔

(۲۰) پتہ: سب ایڈیٹر "پیام تعلیم"
مکتبہ جامعہ، قرول باغ
نئی دہلی

معمّا نمبر ۱ کا صحیح حل

٥ ع		ل	٤ ی	٣ و	ت	٢ ا	١ س
ق	٦ ت		ت	٧ ا		خ	پ
ل	ا		ی	ر	٩ ت	١٠ ب	
	ت	١٣ و	١٢ م		ن	ا	١١ ن
١٧ ن	م	١٦ ا		١٥ م	ا	ر	١٤ ا
ا		ح	١٩ ر	١٨ ش			٢٠ د
س		د	و	٢١ ع		ح	ا
ح			ش	و	٢٢ ہ		ر

معما نمبر ۱۹
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۱۹
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۱۹
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۱۹
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

معما نمبر ۱۹ کوپن نمبر

نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

معما نمبر ۱۹ کوپن نمبر

نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

معما نمبر ۱۹ کوپن نمبر

نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

معما نمبر ۱۹ کوپن نمبر

نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

سوج بحار
مرسلہ عبدالحمید بمبئی

نہر ساردا کا ایک منظر
مرسلہ ایس خاتون بارہ بنکی

محمد صادق کلکتہ

Regd. L. No. 1961

بچوں کے لئے یہ دونوں مزے دار کہانیاں ابھی ابھی چھپی ہیں ہر ایک کی قیمت ۱؎

پرندوں کا ایکا

ننھا ٹٹو

مکتبہ جامعہ دہلی

پیام تعلیم
جولائی ۴۱
مکتبہ جامعہ دہلی

کشتیوں کا پل
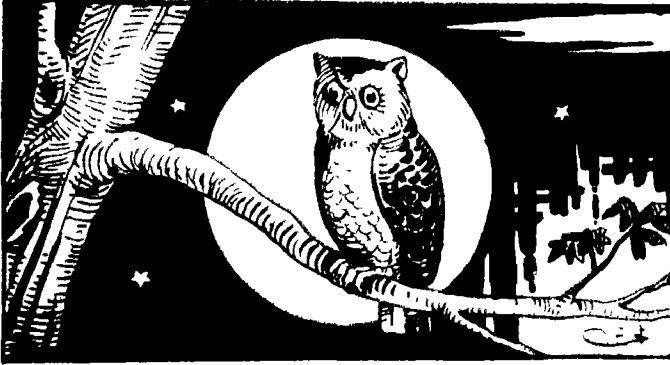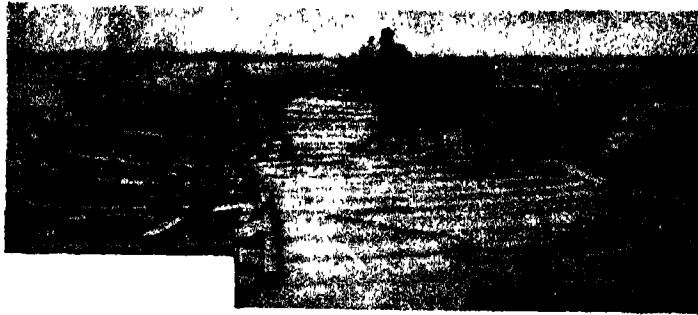
فوجی راستہ بنانے کے لئے انجن کام کر رہا ہے۔
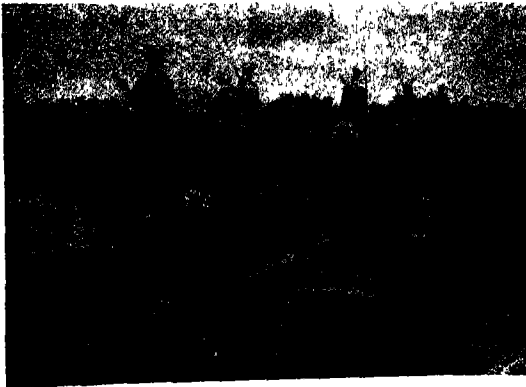
لدر کی وادی (کشمیر)

کمان دار پل

پیام تعلیم
پیام تعلیم
دھلی
دلی، یو پی، سی پی، برار، میسور، حیدرآباد اور پنجاب
کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے
ایڈیٹر۔ محمد حسین حسان
قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۳
جلد ۲۴
نمبر ۷
فہرست مضامین جولائی
۱ بچوں سے باتیں
۲ بچوں کی دعا
۳ صدر ذیدرڈ
۴ نرالی چوری
۵ فوجی راستہ
۶ سندر ڈھولچی
۷ ہوا کی کہانی
پیاسا کوا
۹ بچوں کی نظمیں
۱۰ بیج اور پھل کس طرح پھیلتے ہیں
۱۱ گاؤں کی سیر
۱۲ ایک اندھا لڑکا
۱۳ ادھلے سے غازی آباد
۱۴ بچوں کی کوشش
۱۵ پیام برادری
۱۶ معما
ایڈیٹر
قمر انصاری، سرائے میر
شفیع الدین صاحب نیر
نذیر جمیل
محمد عبدالطیب (حیدرآباد دکن)
شانتی سروپ شاستری
ح، م، اسلم۔ پٹنہ
کشن چندر سکسینہ
محمد ریاض الحسین
خلیل الرحمٰن
عبدالواسع چک منگلوری
یوسف اشتفاق
ایڈیٹر
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۷
۲۹۰
۲۹۵
۲۹۷
۲۹۹
۳۰۳
۳۰۵
۳۰۸
۳۱۱
۳۱۳
۳۱۷
پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
محبوب المطابع پریس، دہلی
FIROZE 41.

بچوں سے باتیں

ایڈیٹر

پچھلے مہینے کے بہت سے مضمون بچوں خاص طور پر پسند کئے۔ کانٹ، ننھی سمدھن، ہوائی بچاؤ اور کھلے سے غازی آباد" کی تعریف میں بچوں نے بہت سے خط بھیجے ہیں۔

اس مہینے کے پرچے میں بھی بعض مضمون بہت مفید اور دلچسپ ہیں۔ "نرالی چوری" والا قصہ نذیر مجمل صاحب نے بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔ ہوا کی کہانی بھی بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ "سندر ڈھولچی" ایک کشمیری کہانی ہے اور بہت دلچسپ۔ شاستری صاحب نے پیام تعلیم کے لئے اس قسم کی اور چیزیں بھی لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ "گاؤں کی سیر" خلیل صاحب کا دوسرا مضمون ہے۔ بچوں کو پسند آئے گا۔ اُمید ہے کہ خلیل صاحب آئندہ اس سے بھی آسان اور مختصر مضمون لکھنے کی کوشش کریں گے۔ "بیج اور پھل والے" علمی مضمون کو مضمون نگار صاحب نے بہت کامیابی کے ساتھ ہمارے پیامیوں کے لئے مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔

عبدالواسع عصری صاحب نے چند مشہور لوگوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ کہانیاں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ اب دوبارا نظر ثانی کے بعد مکتبے کی طرف سے چھپ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی ہم پیامیوں کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ اگر انھیں پسند آئی تو آئندہ بھی شائع کریں گے۔

اِدھر کچھ دنوں سے بچے اپنی نظمیں دیر میں بھیجتے ہیں اگر زیادہ سے زیادہ ہر مہینے کی ۱۰ تاریخ تک ہمیں بھیج دیا کریں تو ہم اسے اسی مہینے کے پرچے میں شائع کر سکیں۔

سال گرہ نمبر کی تیاری کا زمانہ قریب آرہا ہے۔ باوجود کاغذ اور چھپائی کے دوسرے سامان کی مہنگائی کے انشاءاللہ پرچہ بہت دلچسپ اور شاندار ہوگا سال گرہ نمبر کی اسکیم بنائی ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پیامی بھی اپنے مشوروں سے ہماری مدد کریں

بچّوں کی دُعا

قمرؔ انصاری
سرائے میر

یارب سُن لے دُعا ہماری — ہم سب ہوں بس تیرے پُجاری

حق پر گردن اپنی کٹائیں — حق کے لیے ہم جان لڑائیں

دِل کی لگن ہم تجھ سے لگائیں — حمد تیری ہردم گائیں

شاد رہیں اُستاد ہمارے — ماں باپ رہیں آباد ہمارے

ہم سب کی نظروں میں بھائیں — غیروں کو بھی اپنا بنائیں

ہند کے سارے جھگڑے مٹائیں — سچے دیں پہ سب کو لائیں

آخر میں ناچیز قمرؔ کو — ساتھ اُس کے مادر و پدر کو

آغوشِ رحمت میں رکھنا
گناہ اِن کے سب بخش دینا

صدرو - بدرو

محمد شفیع الدین صاحب نیر

صدرو بدرو تھے دو بھائی ‏ اُن میں تھی یہ ایک بُرائی
دیر میں اُٹھتے دیر میں سوتے ‏ پہروں وقت وہ اپنا کھوتے
بے مُنہ دھوئے کھانا کھاتے ‏ بے مُنہ دھوئے وہ پڑھنے جاتے
بال اور ناخن صاف نہ کرتے ‏ دو دو دِن اِس طرح گذرتے
دانت بھی اُن کے میلے میلے ‏ ہاتھ بھی اُن کے میلے کُچیلے
بستر گندا کپڑے گندے ‏ ٹوپی گندی جوتے گندے
جب اُن کو اِس حال میں پایا ‏ بیماری نے آن دبایا
جوڑ بدن کے ہوگئے ڈھیلے ‏ چہرے پڑگئے پیلے پیلے
کڑوی روز دوائیں پینا ‏ موت سے بدتر ہوگیا جینا
ہار کے اس عادت کو چھوڑا ‏ اور صحت سے ناتا جوڑا

پھر کیا تھا اُن کی بن آئی
رہنے لگے خوش دونوں بھائی

جناب نذیر تجمل صاحب
اُستاد تعلیمی مرکز جامعہ

چھاما:۔ امیّ۔

ماں:۔ ہاں بیٹی۔

چھاما:۔ یہ دیکھئے۔ ابھی ابّا جو نئی کتاب لائے ہیں، اُس میں کیسی اچھی کہانی لکھی ہے۔"

ماں:۔ بس تمھیں تو ہر وقت کہانی کی رٹ ہے۔

چھاما:۔ نہیں امّی۔ یہ لڑکا تو نرا اُلّو ہے دیکھو تو کیسا سیدھا ہے بے چارا

ماں:۔ ہوگا۔

چھاما:۔ اچھی امّی، بڑی ہنسی کی بات ہے۔

چھاما:۔ غور سے سنو امّی!

ساجد اپنے امّاں، ابّا کا ایک ہی بیٹا تھا، وہ اُسے بہت پیار کرتے تھے، جب وہ ذرا سیانا ہوا تو اُس کے ابّا اُس کے لئے طرح طرح کے کھلونے لانے لگے، تین پہیوں کی سائیکل، چھوٹی سی بگھی، جھوٹ موٹ کا پستول اور بندوق، اور جانے کیا کیا۔ ساجد کی دو بہنیں بھی تھیں ایک بڑی اور ایک چھوٹی۔ دونوں بہنیں ساجد کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔

ایک دن کیا ہوا، دوپہر کا وقت تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ مگر ساجد کو نیند نہ آتی تھی۔ اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سب

سو گئے۔ ساجد چپکے سے اُٹھا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ برآمدے میں میز پڑی تھی۔ میز پر کتابیں رکھی تھیں۔ ساجد کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پر اُن میں کوئی اچھی تصویر نہ تھی۔ ساجد کو کوئی تصویر پسند نہ آئی۔

ساجد نے ایک ایک کر کے ساری کتابیں دیکھ ڈالیں۔ سب سے نیچے ایک بڑی سی کتاب تھی۔ اس میں ابّا اپنا بٹوا بھول گئے تھے۔ ساجد نے وہ بٹوا نکالا اور اچھالنے لگا۔ پھر جانے اُسے کیا خیال آیا۔ اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ اُس نے بٹوے کو کھولا۔ اُس میں سے پیسے نکالے اور بازار کو بھاگ گیا۔

حلوائی کی دوکان تو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ سیدھا وہیں پہنچا۔ پیسے نکالے اور بہت سی قلاقند خریدی۔ اُس کی سب جیبیں بھر گئیں۔ پھر بھی تھوڑی سی بچ رہی۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ساجد نے ساری مٹھائی رستے ہی میں ختم کر دی۔ پر اُسے مٹھائی کھانے کا مزا بالکل نہ آیا۔ یہ بات وہ کر تو بیٹھا، پر رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اب ہو گا کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں آیا۔

اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ابّا کا بٹوا اُسی کتاب میں رکھ دیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ساجد اندر جانا چاہتا تھا پر اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ شرم بھی آ رہی تھی۔ اس کا جی یہی چاہتا تھا کہ آج ابّا سے ملاقات نہ ہو۔ اسی پریشانی میں دوپہر ڈھلنے لگی۔ ناشتے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کو جانے کیا خیال آیا، سِسک سِسک کر رونے لگا۔ اُس کے آنسو بے اختیار

بہے چلے جا رہے تھے۔ آخر نہ رہا گیا۔ دوڑا دوڑا اپنے ابا کے پاس گیا۔ اُن سے لپٹ کر رونے لگا۔ اور خود ہی بولا "ابا میاں! ہم نے تمھارے پیسے چُرائے ہیں۔"

ابا مُسکرائے، ساجد کو پیار کیا اور بولے:۔" بیٹا چوری کرنا سچ مُچ بُری بات ہے۔"

بلّو بولے:" اوں، اوں میں تو ساجد کی طرح نہیں ہوں۔ کیوں امّی میں نے کبھی چوری کی ہے؟"

ماں نے کہا" ہمارا بلّو تو سب سے اچھا ہے۔"

چھاما نے کہا:" نہیں امّی، میں تو کہتی ہوں ساجد بھی بلّو کی طرح بھولے بھالے تھے۔"

فوجی راستہ

محمد عبد الحسیب - حیدرآبادی

ٹینکوں (دبابوں) اور ہوائی جہازوں کو تو راستوں کی ضرورت نہیں۔ ہوائی جہاز جدھر چاہیں اڑتے ہیں اور اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ دبابے یا ٹینک ناہموار میدانوں چھوٹے ندی نالوں اور خندقوں سے گذر جاتے ہیں لیکن پیدل سپاہیوں معمولی موٹروں اور سامان رسد کی موٹروں کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لئے ہموار سڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے

اس کام کے لئے ہر فوج کے ساتھ ایک خاص دستہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیچھے کی فوج کے لئے جلد سے جلد سڑکیں بناتا ہے۔ ناہموار میدانوں کو ہموار کرتا ہے۔ دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کرکے سڑکیں خراب کردیتے ہیں تاکہ فوج اس پر گذر نہ سکے یا درخت اور پتھر ڈال دیتے ہیں۔ ان سڑکوں پر سے جلد سے جلد درخت اور پتھر ہٹا کر ان کی مرمت کرتا ہے۔

بہت سی اہم سڑکوں کو پکا بنایا جاتا ہے۔ پہاڑوں میں سے گذرنا ہوتا ہے تو پہاڑ توڑ کر سڑک بنائی جاتی ہے۔

دشمن کی فوجیں اکثر ریل کی پٹریاں اور پل تباہ کردیتی ہیں۔ تو پٹریوں کی مرمت کی جاتی ہے اور پل دوبارہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ کام بہت تیزی سے کیا جاتا ہے کہ فوجوں کے آنے جانے میں ذرا بھی رکاوٹ نہ ہو۔

پرانے زمانے میں پل بنانے کے لئے پاس کے جنگل سے لکڑی لاتے تھے۔ اس میں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ آج کل پل بنانے کا سامان فوج کے ساتھ ہوتا ہے۔ چھوٹی کشتیاں، شہتیر۔ رسیاں وغیرہ

پل بنانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ تختوں کو جوڑ کر پل بناتے ہیں یا کشتیوں کا پل بناتے ہیں پہلے ایک کشتی کنارے سے کچھ فاصلے پر ڈال دیتے ہیں پھر ایک شہتیر کنارے اور کشتی پر رکھ کر باندھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کشتیاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھی جاتی ہیں اور انھیں موٹے موٹے شہتیروں کے ذریعے ملا دیا جاتا ہے۔ ان شہتیروں پر لکڑی کے

تختے بچھا دئے جاتے ہیں۔ کشتیاں جس قدر پاس ہوں گی پُل اسی قدر مضبوط ہوگا۔ کشتیوں کے پُل میں یہ آسانی ہے کہ انھیں جلد اور آسانی سے جوڑا اور الگ کیا جاسکتا ہے۔ ندی یا دریا کی گہرائی کم ہو تو کمان کے پُل بنائے جاتے ہیں۔ جو لکڑیاں تھم کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اُن کے نیچے لوہا لگا ہوتا ہے کہ تہہ میں دھنس نہ جائیں۔ اگر یہ کیچڑ میں دھنس جائیں تو ان دھنسی ہوئی لکڑیوں کو چرخی کی مدد سے نکال لیتے ہیں اور تھوڑی دور ہٹا کر پُل بناتے ہیں۔ کشتیوں کے پُل ایک اور طریقے سے بھی بناتے ہیں۔ تختوں کو پہلے ہی ندی کے کنارے پر جوڑ دیتے ہیں۔ پھر کشتیاں دریا میں ڈال کر یہ تختے ان پر رکھ دیتے ہیں یا ندی کے دونوں کناروں پر رسیوں سے باندھ دیتے ہیں۔ تختوں کے بیچ والے حصّے پر وزن زیادہ پڑتا ہے۔ اس بیچ کے حصّے کو مضبوط بنانے کے لئے تختوں کے سرے پتلے کردئے جاتے ہیں۔ اس طرح تختوں کا وزن بھی ہلکا ہوجاتا ہے۔ کمان والے پُل موجوں یا پانی کے تیز بہنے سے ہل نہیں سکتے۔ کشتیوں کے پُل ہلتے ہیں اس عیب کو دور کرنے کے لئے دونوں طرف رسیوں سے باندھ دیتے ہیں۔

کشتی بنانے کا سامان فوج کے ساتھ نہ ہو تو جو سامان اس جگہ موجود ہو اس سے کسی نہ کسی طرح کام لیتے ہیں۔ پچھلی بڑی لڑائی میں ایک بار فوج کو دریا پار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ ساتھ کوئی سامان نہ تھا ہاں دریا میں لمبی لمبی کائی تھی۔ یہ بہت کم زور چیز سمجھی جاتی ہے۔ سپاہیوں نے اس کائی کے ایک ایک فٹ موٹے بنڈل بنالئے اور لمبی گھاس کو بیچ دے کران مٹھوں کو باندھ دیا۔ پھر یہ بنڈل رسّی کے ذریعے ایک دوسرے سے باندھ دئے گئے پیچھے پُل تیار ہوگیا اور چار چار فوجی ایک ساتھ اس پر سے گذرنے لگے۔ اس کے علاوہ کینوس لکڑیوں اور پتّوں سے کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان کشتیوں پر درختوں کے تنے اور شاخیں ڈال دی جاتی ہیں اور پُل تیار ہوجاتا ہے۔

ایک اور طرح کا پُل ہوتا ہے۔ دو دو بانس اس طرح بیچ میں باندھ کر پانی میں رکھ دئے جاتے ہیں اس پر سے ایک ایک سپاہی احتیاط سے گذر جاتا ہے۔ سہارے کے لئے اوپری سرے پر بانس باندھ دئے جاتے ہیں۔

ایک اور طرح کا پُل ہوتا ہے اس کا رواج ہندوستان میں زیادہ ہے۔ ندی کے دونوں کنارے لکڑیاں گاڑ کر تین مضبوط رسیاں باندھ دی جاتی ہیں۔ ایک رسّی نیچے چلنے کے لئے اور دو اوپر ہاتھ سے پکڑنے کے لئے۔ اگر دونوں کناروں پر درخت ہوں تو رسّیاں درخت سے باندھ دیتے ہیں۔

معمولی قسم کی توپوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے پچاس سے زیادہ تھیلیاں ہوتی ہیں ان تھیلیوں میں ہوا بھر کر ایک دوسرے سے باندھ دیا جاتا ہے اور توپوں کو ان پر رکھ کر پار لے جاتے ہیں پیپوں سے بھی کشتی کا کام لیتے ہیں۔ کئی تختوں کو جوڑ کر پُل کی کشتی کا کام لیتے ہیں ؎

سانتی سرُوپ۔ شاستری

آج ہم تُمھیں کشمیر کا ایک قِصّہ سُنا رہے ہیں۔ پہاڑی زندگی بڑی محنت مشقت کی ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ بہت اچھی بات ہے کہ لوگ بڑے بڑے کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔ جیسے مکان بنانے کے لئے جنگل سے شہتیر لانا، چھتوں پر مٹی ڈالنا، اپنے مویشیوں کے لئے گھاس کاٹ کر جمع کرنا۔ جاڑوں کے موسم میں چوپایوں کا گُذر اسی گھاس پر ہوتا ہے۔ ہر ایک کسان ایسی ضرورتوں کے موقع پر سب کو بلا بھیجتا ہے۔ ان سب کے کھانے کا انتظام بھی اس کی طرف سے ہوتا ہے۔ صبح کو نمک مرچ ملا ہوا چھاچھ، شام کو گیہوں کی روٹی اور گھی شکر۔

کشمیر میں گھاس کاٹنے کا کام سب سے دلچسپ ہوتا ہے، اسے یہاں "لیتری دیک" بھی کہتے ہیں۔ گھاس کاٹنے کے لئے تیس، چالیس اور کبھی کبھی زیادہ آدمی جمع ہوجاتے ہیں۔ ایک آدمی لکڑی لئے گویا ان سب کو ہانکتا ہے تاکہ کام ایک ہی دن میں ختم ہوجائے۔

اکثر کوئی ڈھولچی بھی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص انداز سے ڈھول بجاتا ہے اور گاؤں والے گھاس کاٹتے جاتے ہیں۔ ڈھولچی کبھی سُست پڑجاتا ہے تو لاکری (لاٹھی والا) کہتا ہے۔ کہ بھائی ذرا ہوشیار ہوجاؤ۔ جوان بھی ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔

سُندر ڈھولچی بھی ایسے موقعوں پر آس پاس کے گاؤں میں جاتا رہتا تھا۔ اس دن اسے اچھی سی دعوت کے علاوہ اناج بھی کافی مل جاتا تھا۔ اس کام کی بدولت سال بھر تک اس کی گذر اچھی طرح ہوجاتی تھی۔

اس کا گاؤں ایک پہاڑ کی اونچائی پر تھا۔ یہ پہاڑ سطح سمندر سے کوئی چار ہزار فٹ اونچا تھا کشمیر میں اتنی اونچائی پر چیل (ایک درخت) کے جنگل بہت عام ہیں۔

ایک بار اسے گاؤں کے سامنے والی پہاڑی پر لیتری کے لئے جانا تھا۔ اور اپنی پہاڑی سے دو میل نیچے اتر کر دوسری پہاڑی پر ڈیڑھ میل اوپر چڑھنا تھا راستے میں جنگل پڑتا تھا۔ وہ سورج نکلتے نکلتے اس پہاڑی پر پہنچ گیا اور دن بھر لیتری یعنی گھاس کاٹتے وقت

ڈھول بجاتا رہا۔ کام زیادہ تھا۔ جلدی کی گئی پھر بھی
شام ہوگئی۔ سندر میزبان جانتا تھا
کہ اُسے دور جانا ہے۔ اِس لئے اناج وغیرہ دے کر
اسے جلدی ہی رخصت کر دیا۔ سندر نے اناج چادر
کے کونے میں باندھا، ڈھول بغل میں دبایا اور چل کھڑا
ہوا اور جلدی جلدی پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔
اب اندھیرا ہو چلا تھا مگر چاندنی رات تھی اس لئے
اطمینان تھا۔ پھر پہاڑ کی تنگ وادی میں پہنچ کر اور
سنسان جنگل میں گھستے وقت اُسے ڈر سا لگا۔ وہ
دل بہلانے کے لئے ڈھول بجانے لگا۔ اچانک اُسے
سامنے دو چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ غور سے دیکھا
تو ایک چیتا تھا۔ اُسے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ چیتا اِدھر
اُدھر چکر کاٹ کر اس کا راستہ روکنا چاہتا ہے
سندر کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔ ڈر کے
مارے پسینے پسینے ہوگیا۔ مگر ڈھول برابر بجاتے گیا
اور اب تو اور بھی زور سے بجانے لگا۔ اس وقت ایک
عجیب بات ہوئی۔ چیتا ڈھول کی آواز پر ناچنے کودنے
لگا۔ سندر سمجھ گیا کہ یہ ڈھول کی آواز پر مست ہے
مگر سندر کے راستے سے وہ ہٹتا اب بھی نہیں۔ سندر
نے اپنے جی میں سوچا یہ ہمت ہارنے اور حوصلہ چھوڑنے
کا وقت نہیں ہے۔ نہ ڈھول بجانے کے علاوہ کوئی اور
تدبیر ہے۔ وہ برابر ڈھول بجائے گیا، یہاں تک کہ
ساری رات گذر گئی۔ سندر ڈھول بجاتا رہا اور جنگل
میں یہ خوفناک ناچ ہوتا رہا۔

سندر کے گاؤں کے لوگ رات بھر ڈھول
کی آواز سنتے رہے۔ اب صبح ہو گئی تھی مگر آواز بدستور
چلی آ رہی تھی۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ سندر ڈھولچی
کل سامنے والے گاؤں میں گیا تھا۔ اس کے گھر جاکر پوچھا
تو معلوم ہوا کہ سندر رات کو گھر نہیں پہنچا ہے۔ اب
انھیں یقین سا ہونے لگا کہ ہو نہ ہو یہ سندر ہی ڈھول
بجا رہا ہے مگر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے؟
اُنھوں نے سندر کو کئی بار زور زور سے پکارا
مگر جواب میں وہی ڈھول کی آواز۔ سندر کی بیوی
بہت پریشان تھی۔ گاؤں والوں نے اُسے دلاسا دیا
کہ ہم ابھی جاکر معلوم کرتے ہیں کہ سندر کس آفت
میں پھنس گیا ہے اور اُسی وقت گاؤں کے چار پانچ
مرد اپنی لاٹھیاں ہاتھ میں لے جنگل کی طرف چل دیئے
کوئی پندرہ، بیس منٹ میں اس مقام کے قریب پہنچ
گئے۔ جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ اب وہ ذرا زیادہ
ہوشیار ہوگئے اور چھپ چھپ کر آگے بڑھنے لگے
یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چیتا سندر کے سامنے
ناچ رہا ہے اور سندر ڈھول بجا رہا ہے۔ سندر
اس وقت کچھ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ سب نے
بڑے بڑے پتھر ہاتھ میں لئے اور ایک طرف سے چپ
چاپ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے چیتے کی طرف بڑھے
قریب آکر اُنھوں نے ہلو ہلو کا شور مچایا اور چیتے پر

پتھر برسانے لگے۔ چیتے کا ناچ بند ہوا۔ اس نے اُن
کی طرف گھور کر دیکھا اور راستہ چھوڑ کر پاس
کی جھاڑیوں میں چلا گیا۔ مگر سُندر اب بھی ڈھول بجا رہا تھا۔
نہ کسی کی طرف دیکھتا تھا نہ کسی کی سُنتا تھا۔ اِس کے
دوستوں نے اِسے بہت پکارا۔ سُندر! سُندر! مگر وہ
ڈھول بجاتے ہی گیا۔ بہت جھنجھوڑنے کے بعد اس کے
مُنہ سے "ہاں" نکلا۔ لوگوں نے اُسے پکڑ کر زمین
پر بٹھایا مگر وہ بالکل بے ہوش، بڑی دیر کے بعد وہ
ہوش میں آیا۔ دو آدمیوں کے سہارے سے
گاؤں تک لائے۔ گھر آتے ہی وہ تھکا ماندہ چارپائی
پر پڑ گیا اور بے خبر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اس کے سامنے
چیتا ناچ رہا تھا۔ چیتے کا ڈر اس کے دل سے بہت
دنوں کے بعد نکلا۔ اب وہ بالکل اچھا ہے۔ اب بھی
وہی کام کرتا ہے۔ مگر شام ہونے سے پہلے ہی گھر
واپس آ جاتا ہے۔ اب کبھی دو چار دوست
آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو اس واقعے کو یاد کر کے خوب
ہنستے ہیں۔

ہوا کی کہانی

ح، م، اسلم پٹنہ

ہوا یہی ہوا جس کے ذریعے ہم سانس لیتے ہیں بڑی ضروری چیز ہے۔ اگر یہ ذرا دیر کے لئے بند ہو جائے تو ہم تو ہم ساری دُنیا ختم ہو جائے

یہ تو تمھارے اُستادوں نے تمھیں بتا دیا ہوگا کہ ہماری دُنیا گیند یا نارنگی جیسی گول ہے اور ہم اس کی سطح پر چیونٹی کی طرح چپکے ہوئے ہیں۔ تصویر نمبرا
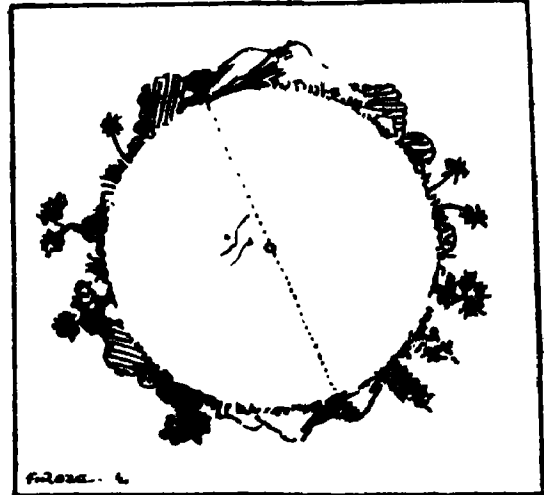
میں دیکھو زمین پر تمام چیزیں کس طرح قائم ہیں۔ اب حیرانی کی بات یہ ہے کہ انسان زمین کی سطح پر کیوں کر قائم رہتا ہے۔ نیچے گر کیوں نہیں جاتا تو بات یہ ہے کہ زمین میں ایک قسم کی طاقت ہے، اُسے کشش کہتے ہیں۔ اس کشش کی وجہ سے سطح زمین کی تمام چیزیں اس کے مرکز کی طرف کھنچی رہتی ہیں۔ تم چاہے جتنے زور سے کوئی پتھر اوپر پھینکو وہ کچھ دور اوپر جاکر پھر زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس کی وجہ وہی کشش ہے۔ اوہ ہو ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس وقت تو ہوا کی بات ہو رہی تھی۔ تو ہوا ہماری زمین سے کوئی دو سو میل اونچائی تک چھائی ہوئی ہے۔ کرہ ہوا اسی کا نام ہے جسے کہتے ہیں زمین کی کشش اس کرہ ہوا کو بھی اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔

اس کرہ ہوا میں ہوا کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں آخری تہہ زمین کی سطح پر ہوتی ہے۔ یہ تہہ بہت گھنی ہوتی ہے۔ اس کے اوپر کی تہیں رفتہ رفتہ ہلکی ہوتی جاتی ہیں۔ سب سے اوپر کی تہہ بالکل ہلکی ہوتی ہے سب سے نیچے کی تہہ پر ہوا کی اوپر کی تہوں کا دباؤ پڑتا ہے اسی لئے وہ وزنی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر

یوں سمجھو کہ تھوڑی سی دُھنکی ہوئی روئی صندوق میں رکھیں، اب اس روئی پر دُھنکی ہوئی روئی کی اور تہہ رکھتے چلے جائیں یہاں تک کہ سارا صندوق بھر جائے اب روئی کی ان تہوں کو نکالا جائے، نیچے کی تہہ اوپر کی تہہ سے خوب دبی ہوئی ہوگی۔ اس سے اوپر کی تہہ اس سے کچھ کم۔ اُس سے اوپر کی اور بھی کم، اور سب سے اوپر کی تہہ ویسی کی ویسی دُھنکی ہوئی۔ یہی حال ہوا کا ہے یہ بھی ہلکی پھلکی ہے۔ مگر اوپر کی ہوا کے دباؤ کا اس پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اس دباؤ کا پتہ ایک آلے سے لگایا جاتا ہے۔ اسے بادپیما کہتے ہیں۔ (تصویر نمبر۲) اس آلے سے پتہ لگایا گیا ہے کہ زمین
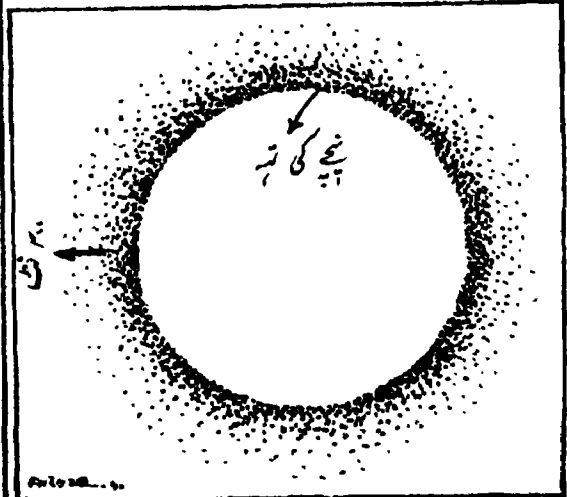
کی سطح پر ہوا کا دباؤ کوئی ۱۴ پونڈ فی مربع انچ ہے یعنی ہمارے جسم کے صرف ایک مربع انچ پر ہوا کا دباؤ ۱۴ پونڈ رہتا ہے

اب ایک اور حیرانی کی بات ہے۔ جب انسان کے جسم پر ہوا کا اتنا بوجھ رہتا ہے تو اسے اس بوجھ کی وجہ سے تکلیف کیوں نہیں ہوتی۔ یا یہ کہ اس کے بوجھ سے وہ پچک کیوں نہیں جاتا۔ تو بات یہ ہے کہ ہوا کا یہ دباؤ جس طرح ہمارے جسم کے اوپر رہتا ہے اسی طرح جسم کے اندر بھی موجود رہتا ہے۔ اگر یہ بوجھ جسم کے اوپر کے حصے کو دباتا ہے تو اندر کا بوجھ اُسے اُٹھائے رہتا ہے اور ہمیں نہ بوجھ کا احساس ہوتا ہے نہ ہم اس کے دباؤ سے پچکتے ہیں۔ ہاں کسی طرح جسم کے اندر کی ہوا یکایک باہر نکال دی جائے تو یہ فوراً پچک جائے اس کا تجربہ تم خود کیوں نہ کرلو۔ ایک چھوٹی پتلی سی شیشی میں پانی بھر دو (تصویر نمبر۳) اور اس

کے مُنہ پر ایک کاغذ لگاکر اُسے اُلٹ دو اس کے اندر کا پانی ذرا بھی نہ گرے گا۔ زمین کی کشش بھی اُسے اپنے مرکز کی طرف کھینچے رہتی ہے۔

جس ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ کئی چیزوں سے مِل کر بنی ہے۔ ان میں تین چیزیں بہت اہم ہیں (۱) گیس (۲) گرد و غبار کے ذرّے (۳) بھاپ۔

گیس۔ ہوا میں تین چار قسم کی گیسیں ہوتی ہیں۔ ان میں دو قسم کی گیسیں حیوانات و نباتات کے لئے بہت ضروری ہیں۔ آکسیجن گیس اور کاربن ڈائی آکسائڈ۔ آکسیجن گیس سے ہم سانس لیتے ہیں اور جو سانس ہم باہر نکالتے ہیں وہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہے یہ زہریلی گیس ہے اور صرف نباتات کے لئے مفید ہے۔ تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ درخت بھی سانس لیتے ہیں۔ یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ جو سانس ہم باہر نکالتے ہیں وہ درختوں کے لئے مفید ہے۔ اور جو سانس نباتات باہر پھینکتے یا نکالتے ہیں وہ ہمارے لئے مفید ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ صبح کے وقت باغوں اور پارکوں میں ٹہلنا تندرستی کے لئے بہت مفید ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ کاربن ڈائی آکسائڈ کو درخت تمام رات سانس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور صبح کو جب ہلکی ہلکی خوش گوار ہوا چلتی ہے یہ اس زہریلے گیس کو آکسیجن بنا کر اگلتے ہیں۔ اس طرح صبح ہی صبح ہم کو تازہ تازہ ہوا سانس لینے کو ملتی ہے۔

گرد۔ ہوا میں دوسری چیز گرد و غبار کے ذرّے ہیں۔ شہروں، ریگستانوں اور گرد و غبار کی جگہوں سے جب ہوا گذرتی ہے تو اپنے ساتھ یہ ننھے ننھے ذرّے بھی اُڑا لاتی ہے۔ یہ ہوا میں اتنے گھل مل جاتے ہیں کہ آسانی سے نظر نہیں آسکتے۔ تم انھیں دیکھنا چاہو تو یوں کرو کہ دھوپ کی جگہ کوئی موٹی چیز یا تختہ اس طرح رکھ دو کہ سورج کی کرنیں رُک جائیں۔ اب تختے میں باریک سا سوراخ کردو، اتنا کہ سورج کی کرنیں اُس سے گذر سکیں اب تم سوراخ میں سے گذرنے والی کرنوں کو غور سے دیکھو۔ تمھیں بہت سے مہین مہین ذرے اِدھر اُدھر گھومتے نظر آئیں گے۔ یہ ذرے ہوا میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں (تصویر نمبر ۴) یہ عموماً کارخانوں کے
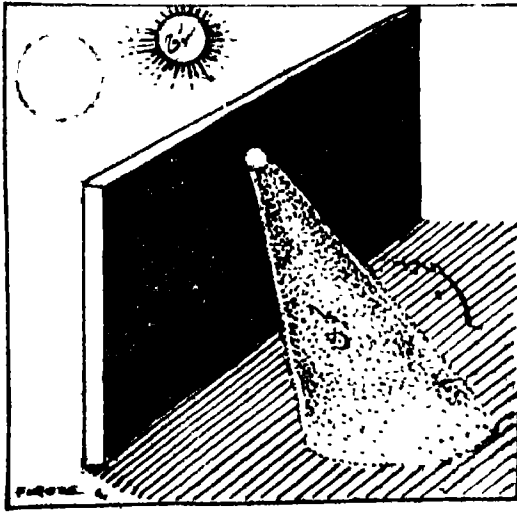
اُس پاس یا بڑے بڑے شہروں کی ہوا میں زیادہ ہوتے ہیں۔ پہاڑوں یا سمندر کی سطح کی ہوا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اِسی لئے لوگ پہاڑی جگھوں پر رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہاں انھیں تازہ اور صاف ہوا ملتی ہے۔

کرۂ ہوا میں تیسری چیز بھاپ ہے۔ سورج کی تیز کرنوں سے پانی، بھاپ بن کر اوپر اڑ جاتا ہے۔ بھاپ بننے والے پانی کے قطرے اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتے۔ گرمیوں میں کسی شیشے کے برتن میں تھوڑا سا پانی بھر کر دھوپ میں رکھ دو، شام تک برتن خالی ہو جائے گا۔ یہ پانی کیا ہوا؟ بھاپ کی شکل میں غائب ہو گیا اور فضا میں مل گیا۔ اگر تم اس بھاپ کو دیکھنا چاہو تو شیشے کے گلاس میں پانی لو اور پھر برف ڈال دو۔ کچھ دیر بعد گلاس کے باہر کی سطح پر بہت سے ننھے ننھے قطرے نظر آئیں گے (تصویر نمبر ۵) یہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگیں گے اور ایک دوسرے سے مل کر نیچے گرنے شروع ہو جائیں گے۔
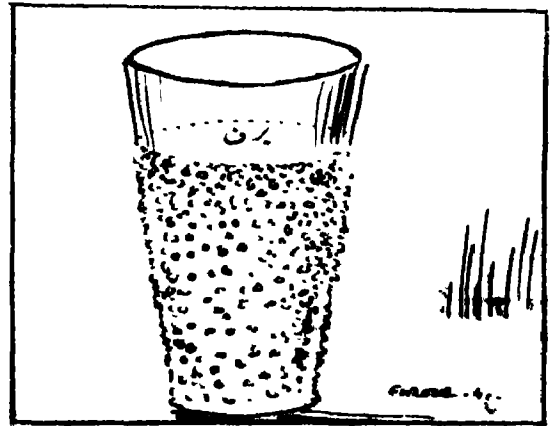
برسات کے موسم میں آسمان پر روئی جیسے سفید سفید گالے اصل میں یہی جمع ہوئے بخارات ہیں۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ ہوا جیسے جیسے اوپر ہوتی جاتی ہے ہلکی سرد ہوتی جاتی ہے۔ اب یہ بھاپ یا بخارات ہوا میں خوب اوپر اٹھ جاتے ہیں تو اوپر کی سردی سے جم کر بادل کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جب یہ چھوٹے چھوٹے قطرے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو اتنے بھاری ہو جاتے ہیں کہ ہوا میں ٹھہر نہیں سکتے اور مینہ کی صورت میں ٹپک پڑتے ہیں۔

اگر بارش کے یہ قطرے اتنی اونچائی سے آتے ہیں جہاں بہت ٹھنڈک ہو تو یہ جم کر سخت ہو جاتے ہیں اور اولے یا برف کی شکل میں گرنے لگتے ہیں۔

اچھا اب سردی کے موسم میں اوس یا شبنم کہاں سے آتی ہے اور زمین پر کیوں گرتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین تمام دن سورج کی گرمی سے گرم اور رات کو آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ زمین کی ہوا بھی ٹھنڈی اور اتنی ٹھنڈی ہو جاتی ہے کہ بخارات کے قطرے ایک دوسرے سے مل مل کر زمین پر گرنے لگتے ہیں اور اس طرح رات کو یہ بخارات شبنم کی شکل میں گھاس اور درختوں کے پتوں پر جم جاتے ہیں۔

نقشے میں دیکھو سورج کی تیز شعاعیں پانی کو بھاپ بنا کر اڑائے جاتی ہیں۔ کچھ بلندی پر جا کر یہ وہاں کی سردی سے جم کر بادل بن جاتے ہیں اور پھر بارش کی شکل میں گر جاتے ہیں۔

ہوا کی کہانی اب ختم ہوئی۔ اگر تم نے اسے

پسند کیا تو آئندہ کوئی ایسی ہی دلچسپ کہانی سنائیں گے۔ تمھیں کچھ یاد بھی ہے ہم نے کیا بتایا تھا۔

دیکھو ایک تو یہ بات بتائی تھی کہ ہوا سطح زمین سے دو سو میل کی اونچائی تک پائی جاتی ہے۔ اور اسے کرۂ ہوا کہتے ہیں۔

۲۔ ہوا میں ایک قسم کا وزن ہوتا ہے اسے دباؤ کہتے ہیں۔ یہ دباؤ سطح زمین پر بہت زیادہ اور اونچائی پر کم ہوتا ہے۔

۳۔ اوپر کی ہوا بہت ٹھنڈی ہوتی ہے اس لئے زیادہ اونچائی پر بخارات جم جاتے ہیں۔ ہر دو سو فٹ کی اونچائی پر درجۂ حرارت ایک ڈگری کم ہوتی جاتی ہے۔

۴۔ کرۂ ہوا میں تین خاص چیزیں شامل ہیں گیس، گرد و غبار کے ذرّے اور بھاپ۔
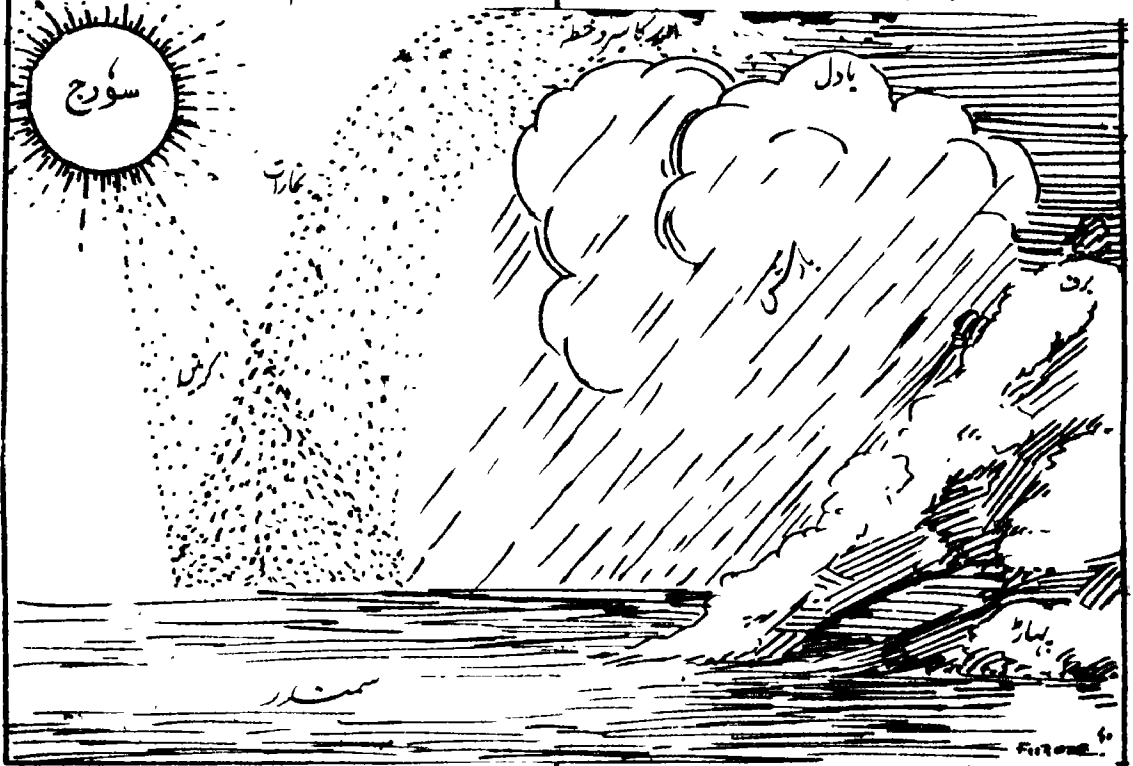
۵۔ گیس سے ہم سانس لیتے ہیں۔ شہروں کی ہوا میں پہاڑوں اور سطح سمندر کی ہوا کے مقابلے میں گرد و غبار کے ذرّے زیادہ ہوتے ہیں بھاپ سے بادل، شبنم، اولا وغیرہ بنتا ہے۔

پیاسا کوّا

گنیش چندر سکسینہ، فتح گڑھ

گرمی کے دِن لُو تھی چلتی
پیاس سے سب کی زبان نکلتی
ایک تھا کوّا بہت پیاسا
پانی اس نے کہیں نہ پایا
اس نے ایک جو مٹکا دیکھا
سوچا اُس میں پانی ہوگا
اُڑکر اس کے پاس جو آیا
تِہہ میں تھوڑا پانی پایا
اُس نے یہ گُر سوچ نکالا
پاس سے اُڑ کر کنکڑ لایا
جوُں ہی گھڑے میں کنکڑ ڈالا
پانی کچھ اوپر اُٹھ آیا
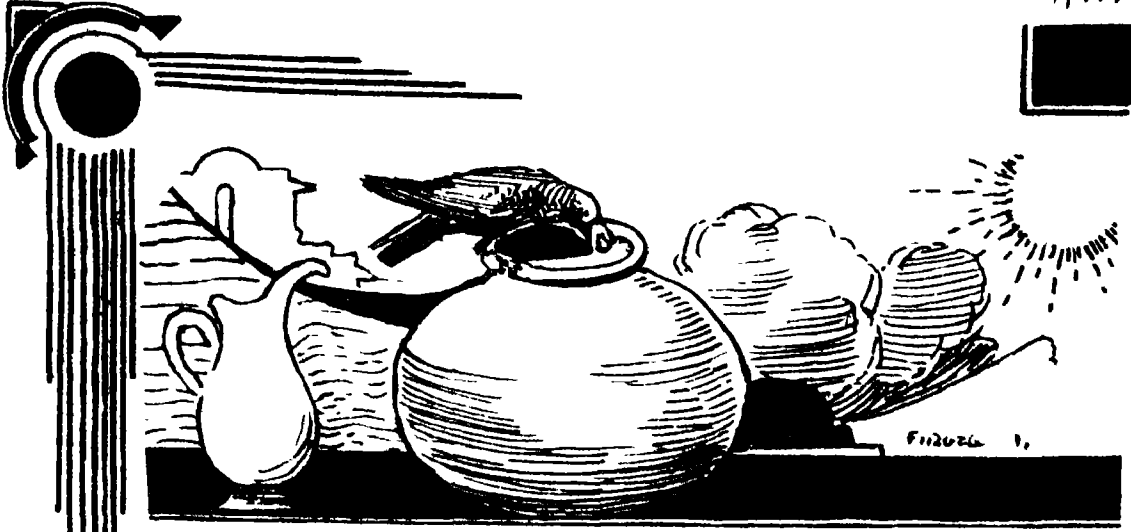
پھر تو اُس نے بہت سی کنکر
ڈالے لاکر گھڑے کے اندر

پانی اُوپر جب چڑھ آیا
پیاسا کوّا تب پی پایا

الحاصل گر غور سے دیکھیں
اس سے نتیجہ ہم یہ نکالیں

وقت مُصیبت کا جب آوے
عقل لڑاوے کام بناوے

مُشکل میں جو گھبراتا ہے
بنتا کام بگڑ جاتا ہے

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی اصلاح کے بعد

خدا

محمد صالح درجہ دوم متعلم جامعہ عمر ۹ سال ۱۰ ماہ

سب کا مالک تو ہے آقا
تو ہے ہمارا پیارا داتا
تو سب کو ہے علم سکھاتا
تو ہے ہمارا اچھا داتا
تو دیتا ہے ہم کو کھانا
کھا لیتے ہیں ہم سب کھانا
اچھا اچھا پھل بھی دیتا
ہم کو کپڑا لتا دیتا
ہم ہیں تیرے اچھے بندے
ہم ہیں تیرے پیارے بندے

کاہی ڈنڈا

محمد احمد عظیم ابتدائی چہارم جامعہ عمر ۱۰ سال

ہم سب باغ میں جائیں گے | غل اور شور مچائیں گے
ایک لکڑی لے جائیں گے | کھیلیں اور کھلائیں گے
آتی پاتی کر کے ہم | ایک کو چور بنائیں گے

کاہی ڈنڈا کھیلیں گے

پھینک کے لکڑی دور بہت | پیڑوں پر چڑھ جائیں گے
چور پکڑنے آئے گا | اس کے ہاتھ نہ آئیں گے
پھر ہم نیچے کو دیں گے | ڈنڈے کو جھٹ چومیں گے

کاہی ڈنڈا کھیلیں گے

ڈنڈا چوم نہ پائیں گے | وہ جو پکڑے جائیں گے
اُن کو چور بنا کر ہم | ویسے ہی دوڑائیں گے
برق اگر آ جائیں گے | اُن کو کھیل کھلائیں گے

کاہی ڈنڈا کھیلیں گے

رات

اصغر پھلوری

رات نے اپنے پاؤں پسارے
سویا سورج جاگے تارے
چھانے لگا دنیا پہ اندھیرا
تاریکی نے سب کو گھیرا
بند ہوئے سب کام ہمارے
ہم سب اپنے گھر کو سدھارے

چھوٹے کوئی کوئی بڑے ہیں
تارے ہیں یا ہیرے جڑے ہیں
نیند کے ماتے چھوٹے بچے
گود میں ماں کی تھک کر سوئے
رات بڑھی سنّاٹا چھایا
نیند نے آکر آن دبایا
تاروں بھرے آکاش کے نیچے
ہندو مسلم سب ہی سوئے
شکر کرو سب پیاری بھائی
اُس کا جس نے رات بنائی

بلّی

اقبال، حیدر آبادی

میں نے ہے اک پالی بلّی
رنگت اس کی کالی کالی
اُس کے گلے میں پٹا ڈالا
نام رکھا ہے اس کا مالا
تھم سے لگ کر بیٹھی رہتی
سارے دن وہ کودتی رہتی
شام کو بھی وہ پھرتی رہتی
چوہوں کو وہ کھاتی رہتی
دوسری بلیوں سے بھی لڑتی
سارے دن وہ جھگڑتی رہتی
کھانے کا جب وقت آتا ہے حیدر کھانا اس کو کھلاتا

ہماری مُرغی

رضیہ سلطانہ از خان

ہم نے ہے اک مُرغی پالی — اچھی اچھی پیاری پیاری
پر ہیں اُس کے سفید اور کالے — جیسے رات میں نکلے تارے
اک مُرغی نے دیا اک انڈا — ہم نے وہ بھیّا کو دکھایا
دوسرے دن بھی انڈا دیکھا — بکس میں ہم نے اس کو رکھا
ہوگئے پورے بارہ انڈے — ہم نے مُرغی کے نیچے رکھے
اکیس دن میں ہم نے دیکھا — مُرغی کے چوزوں کو پایا
ہم نے چوزے سب کو دکھائے
یہ چوزے سب ہی کو بھائے

محمد ریاض الحسین صاحب قریشی
ایم، ایس، سی عثمانیہ

انور اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا۔ کوئی ایسی ہی دلچسپ کتاب انور کی ہوگی جبھی تو وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ سنہا کے آنے کی اُسے خبر تک نہ ہوئی۔ سنہا کمرے میں آیا۔ کرسی پر بیٹھا، تھوڑی دیر تک انور کو دیکھتا رہا پھر جانے کیا جی میں آئی کہ پیچھے سے جاکر انور کی آنکھیں بند کردیں۔ انور چونک پڑا۔ سنہا نے ایک قہقہہ لگایا۔

سنہا:۔ بھائی زیادہ نہ پڑھا کرو، دماغ خراب ہوجائے گا۔

انور:۔ (بہت تعجب سے) ارے تم کب آئے۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔

سنہا:۔ خیر میں کسی وقت آیا۔ اب آپ تیار ہوجائیے ساڑھے چار بج چکے ہیں۔ والی بال کا نٹ لگ چکا ہے۔ کھیل بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس کتاب کو رکھئے میز پر۔ (چھیننے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے)

انور:۔ ارے یار بڑا دلچسپ بیان ہے۔ تھوڑا رہ گیا ہے۔ ختم کرلینے دو۔

سنہا:۔ جی پھر ختم کرلیجئے گا۔ ساری رات پڑی ہے اس وقت تو ذرا اُٹھ بیٹھئے اور کتاب میرے حوالے کیجئے۔

انور:۔ میرا بھائی! بس تین چار صفحے ہیں۔ پندرہ منٹ میں ختم ہوجائیں گے

سنہا:۔ ایسی کیا دلچسپ کتاب ہے۔ کوئی ناول ہوگا۔

انور:۔ جی نہیں۔ نباتات پر ہے۔

سنہا:۔ (مُنہ بناکر) اونہہ ہونہہ کیسا خشک مضمون ہے۔ تم پڑھ کیسے لیتے ہو

انور:۔ خشک! یہ بھی ایک ہی کہی۔ تم نے نباتات کے بارے میں اب تک کوئی کتاب پڑھی نہیں۔ ورنہ ایسی جہالت کی بات نہ کہتے۔

سنہا: جی بالکل صحیح فرمایا۔ اچھا اس وقت آپ کیا پڑھ رہے تھے۔ ذرا معلوم تو ہو کہ کونسی ایسی دلچسپ بات تھی مگر جلدی بتائیے [illegible] شرما انتظار کررہے ہوں گے۔

انور:- ابھی بتاتا ہوں۔ مگر آپ ذرا تشریف آدمیوں کی طرح کرسی پر تشریف رکھئے۔ دیکھئے میں اس وقت پڑھ رہا تھا "بیج اور پھل کس طرح پھیلتے ہیں"۔

سنہا:- یعنی؟

انور:- یعنی یہ تو آپ جانتے ہیں کہ انسان کو اپنی نسل پھیلانے کی خواہش کس قدر ہوتی ہے۔ یہ چیز انسانوں ہی میں نہیں۔ حیوانوں، یہاں تک کہ نباتات میں بھی ہوتی ہے۔

سنہا:- جی نہیں جانتا تھا تو اب جان گیا۔ آگے چلئے۔

انور:- اصل میں اللہ میاں کا منشا یہ ہے کہ دنیا پھلتی پھولتی رہے اور ترقی کرے۔ اس نے انسان اور حیوان کے دل میں اپنی نسل کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی خواہش پیدا کی ہے اور یہی انتظام اس نے نباتات کے لئے کیا ہے۔

سنہا:- (بات کاٹ کر) لوٹ پھیر کے وہی بات۔

انور:- بات تو پوری کرنے دو۔ دیکھو اکثر پودے بیج پیدا کرتے ہیں۔ یہ بیج مختلف ذریعوں سے دور دور پھیل جاتے ہیں۔ ان بیجوں سے مناسب وقت میں پھر پودے اُگتے ہیں اور رفتہ رفتہ تناور درخت ہو جاتے ہیں۔ بعض درختوں کی قلمیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ قلمیں بھی جڑ پکڑ کر درخت بن جاتی ہیں۔ بعض درختوں کی شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ان سے پھر نئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ بعض پودے بچے بھی پیدا کرتے ہیں مثلاً کیلا، اروی، پودینہ۔

سنہا:- بہت خوب! مگر ذرا یہ تو فرمائیے کہ بیجوں کو دور دور پھیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ درخت کے نیچے گر کر نہیں اُگ سکتے۔

انور:- یہ سوال بہت معقول ہے۔ دیکھو اگر ہم تم یعنی انسان جگہ بدلتے رہیں اور ہماری آب و ہوا تبدیل ہوتی رہے تو ہماری تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہے اور نسل بھی بڑھتی ہے۔ یہی حال پودوں کا ہے۔ اگر کسی درخت کے تمام بیج ایک ہی جگہ گر جائیں تو ان میں سے نوے فی صدی ضائع ہو جائیں گے۔

سنہا:- وہ کیسے؟

انور:- پھر بیچ میں بولے۔ بالکل سیدھی سی بات ہے۔ جہاں آدمیوں کی گھنی آبادی ہوتی ہے۔ وہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں رہتی۔ ان میں مختلف مرض پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی نسل کم زور کر دیتے ہیں۔ بس اسی طرح ایک ہی جگہ بیجوں کی کثرت انھیں اُگنے پھیلنے اور بڑھنے سے روکے گی۔ انھیں نہ تو کافی غذا ملے گی۔ نہ کافی روشنی۔ نہ پانی۔ یہاں تک کہ اس طرح ایک جگہ جمع ہونے کی وجہ سے انھیں اچھی طرح

سائنس لینے کا بھی موقع نہ ملے گا۔ خصوصاً کم زرخیز زمین میں بس وہی پودے زندہ رہیں گے جو ذرا طاقت ور ہیں۔ کم زور پودے مرجھا جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔ اسی لئے بیجوں کو دور دور پھیلانے سے قدرت کا منشا یہ ہے کہ یہ اچھی طرح پھیلیں اور بڑھیں اور روشنی اور ہوا اچھی طرح حاصل کر سکیں۔ اچھا اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ پھل تم کسے کہتے ہو

سنہا:۔ پھل! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جن کا مزا میٹھا، رسیلا اور خوش گوار ہو وہی پھل ہیں جیسے سیب، امرود، سنترہ وغیرہ

انور:۔ جی ہاں، عام طور پر یہی خیال ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ خشک پھلیاں بھی جو کھانے میں ناگوار اور بدمزا ہوتی ہیں، پھلوں میں شامل ہیں۔ مثلاً کیکر، ترڈوڑا اور ینکسر کی پھلیاں وغیرہ۔ اب ان میں سے بعض پھلیوں میں ایک ہی بیج ہوتا ہے۔ بعض میں بہت سے لیکن یہ بیج پھیلتے کیسے ہیں اور ہوا انھیں کس طرح اِدھر سے اُدھر اڑا کرلے جاتی ہے۔ تو ان کے بتانے کے لئے ذرا تفصیل کی ضرورت ہے۔ کہئے تو بتاؤں۔

سنہا (کچھ سوچ کر) اچھا بتائیے دیر تو ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر اور سہی۔

انور:۔ ہوا کے ذریعے صرف انھی درختوں کے بیج پھیلتے ہیں جن کے پھل ہلکے اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایسے بیج ذرا ہلنے جلنے پر بہت دور پہنچ جاتے ہیں۔ گاجر کے بیج چھوٹے اور خرفے کے تو بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ باآسانی اڑ سکتے ہیں۔ لیکن بڑے اور وزنی بیجوں کے لئے تیز ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض بیجوں میں یہ ہوتا ہے کہ پھل اوپر سے پھٹ جاتا ہے مگر نچلا حصہ اسی طرح لگا رہتا ہے اور پھل ایک جھنجھنے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ کیسہ اور تھیلیا ہلتی ہے اور بیج تھوڑی تھوڑی تعداد میں خارج ہو کر پھیلتے رہتے ہیں لطخ کی بیل اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ اس کا کیسہ اوپر کی طرف لگا رہتا ہے اور نچلا حصہ پھٹتا ہے۔ بیج ہوا کے جھونکوں سے ہل ہل کر تھوڑی تھوڑی تعداد میں کیسے میں سے نکلتے رہتے ہیں۔ تم نے کبھی بالوں والے بیج بھی اڑتے ہوئے دیکھے ہیں۔

سنہا:۔ نہیں۔ اہا کہیں آگ کے بیج تو نہیں جنھیں "بڑھیا بڑھیا" کہتے تھے۔

انور:۔ ہاں، ہاں۔ وہی مطلب ہے۔ بعض پھلوں اور بیجوں کے خاص قسم کے پر ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت یہ ہلکے ہو جاتے ہیں اور ہوا میں آسانی سے اڑ کر اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہیں آگ کے

بیج کے سروں پر بالوں کا گچھا ہوتا ہے - یہ بیج پھل کے پھٹنے سے باہر نکل آتے ہیں - بیج پکنے کے موسم میں سینکڑوں بیج ہوا میں اُڑتے دکھائی دیتے ہیں - ہوا کا تیز جھونکا انھیں منٹوں میں کہیں سے کہیں لے جاتا ہے - کبھی کبھی تو ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پھلنے پھولنے لگتے ہیں -

سنہا: پچھلے سال گرمیوں میں قلعہ گولکنڈہ کے آس پاس میں نے ایک خاص قسم کے پردار پھل اُڑتے دیکھے تھے - ان کے دو لانبے لانبے پر تھے میں نے وہاں کے لوگوں سے اس پھل کا نام پوچھا مگر کسی نے ٹھیک جواب نہ دیا

انور: اس پھل کو انگریزی میں گاٹروکارپس کہتے ہیں - سوزنی کا بیج بھی ایسا ہی ہوتا ہے - اس کی پھلی پک کر پھٹتی ہے تو بیج نکل آتے ہیں - یہ بیج پردار ہوتے ہیں - اس لئے ہوا انھیں ادھر اُدھر اُڑائے جاتی ہے - سرس کے پیڑ کی پھلیاں ہلکی پھلکی ہیں اور اُڑ سکتی ہیں - بارش سے پہلے تیز ہوائیں ہزاروں پھلیاں زمین پر پڑی دکھائی دیتی ہیں -

سنہا: تو گویا ہوا کا ان بیجوں پر بہت احسان ہے -

انور: کیوں نہیں - مگر اس قدر نہیں جتنا تم سمجھتے ہو - اس لئے کہ ہوا ان بیجوں کی خاطر کسی خاص سمت تو چلتی نہیں وہ تو ہر طرف چلتی ہے - اور بہت سے بیج بنجر زمین یا دریا اور سمندر وغیرہ میں گر کر ضائع ہو جاتے ہیں - البتہ جو بیج اچھی زمین میں گرتے ہیں وہ بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور اس نقصان کو پورا کر دیتے ہیں

(باقی ہے)

ذرا میری اُنگلی کی سیدھ میں دیکھنا۔ وہ دوُر ...... کیسے ہرے بھرے میدان نظر آتے ہیں۔ اُن کے قریب کچھ چھوٹے چھوٹے مکان بھی ہیں۔ دیواریں مٹی کی اور چھت گھاس پھوس کی۔ یہی تو گاؤں ہے۔ یہاں اللہ میاں کے بڑے بھولے بھالے بندے رہتے ہیں۔ محنتی دُھن کے پکے، خوش اخلاق۔ شہری دلچسپیوں سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ تو بس اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ کام کام صبح سے شام تک کام۔

تم کسی شہر میں رہتے ہو خصوصاً دلی جیسے اچھے شہر میں تو وہاں بجلی کی روشنی بھی ہوگی۔ اچھی اچھی سڑکیں بھی، یکّا، تانگا، موٹر، ٹرام، گراموفون ریڈیو، سینما، ہوٹل۔ غرض عیش و آرام کی سبھی چیزیں ہوں گی۔ بھلا بے چارے کسانوں یا گاؤں کے رہنے والوں کو یہ چیزیں کہاں نصیب۔

مگر صبح صبح کی ٹھنڈی ہوائیں۔ چڑیوں کے سُریلے گیت۔ سورج کی اوپر چڑھتی ہوئی کرنیں۔ لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت، شام کے دل لبھانے والے اُودے اُودے بادل، چاند اور ستاروں کی پھلجڑیاں، پھر ان سب سے زیادہ تازہ اور کھُلی ہوا شہر والوں کے نصیب میں نہیں۔ کسان ان سب سے خوب جی بھر کے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اللہ میاں کے احسان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

تمھیں کبھی موقع ملے تو کسی گاؤں کی سیر ضرور کرو۔ ان دیہاتیوں کے گھر تو کچے اور پھوس کے ہوتے ہیں مگر اندر سے خوب صاف ستھرے۔ کوٹھریاں لپی ہوئیں۔ ان میں سب چیزیں قرینے سے رکھی ہوئیں۔ کھانے کا اناج الگ کوٹھریوں میں۔ بونے کا بیج، الگ ایک کوٹھری میں بھوسے سے چھپا ہوا کہ گھن نہ لگ جائے۔ ایک طرف کچھ مٹی کے برتن قرینے سے رکھے ہوئے۔ باورچی خانہ یا چوکا۔ لپا پُتا۔ کسان عورتیں اسے صبح شام لیپتی ہیں۔

ہمارے یہاں شہر میں تو عام طور پر خاندان کا ایک آدمی محنت کرتا ہے اور سب کھاتے ہیں

گر کسان کے گھر میں گنبے کے ایک ایک آدمی کو کچھ نہ
کچھ کرنا ہوتا ہے۔ بڑے کھیت بونے، جوتنے، سینچنے
اور کاٹنے کا کام کرتے ہیں۔ عورتیں گھر بھر کے لئے کھانا
پکاتی ہیں، دوپہر کو کھیتوں پر اپنے شوہروں کے لئے
کھانا لے جاتی ہیں، مویشیوں کے لئے گھاس کاٹ کر
لاتی ہیں، گوبر سے اُپلے تھاپتی ہیں یا کھاد بنانے
کے لئے گڑھوں میں حفاظت سے رکھتی ہیں۔ روزانہ گھر
کی صفائی کرتی ہیں، کوڑا کرکٹ گاؤں سے باہر پھینکتی
ہیں، گھر کی چکی میں آٹا پیستی ہیں اور کپڑے سیتی ہیں۔

کسانوں کی لڑکیاں صبح صبح پنگھٹ پر پانی بھرنے
جاتی ہیں۔ جب وہ سہیلیوں کے ساتھ مل کر گیت گاتی
ہیں تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے یہی جی چاہتا ہے کہ سنتے
جاؤ۔ یہ لڑکیاں اپنی ماؤں کے کام میں بھی مدد کرتی
ہیں۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بہلاتی ہیں، جانوروں
کو تالاب میں نہلانے لے جاتی ہیں اور بہت سے چھوٹے
موٹے کام کرتی ہیں۔

اب رہے کسانوں کے لڑکے۔ یہ صبح سویرے
اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھوتے ہیں اور رات کا بچا کھچا کھا
اپنی گایوں، بھینسوں کو لے چراگاہ کی طرف چل
دیتے ہیں۔ سورج نکلتے نکلتے وہاں پہنچ جاتے ہیں
دل بہلانے کے لئے چھوٹی سی بانسری اور گلی
ڈنڈا ساتھ لے جاتے ہیں۔ میدانوں میں جب وہ
بانسری کی تان اُڑاتے ہیں تو جنگل اور کھیت مست
ہو جاتے ہیں، جیٹھ کی کڑی دھوپ میں پیڑوں کے
نیچے بیٹھ کر سستاتے ہیں۔ پوس، ماگھ کے کڑاکے
جاڑے میں ٹیلوں کی آڑ میں بیٹھ کر دھوپ کھاتے
ہیں اور جب ساون بھادوں کے بادل گھر کر آتے
ہیں اور ڈرا دینے والی بجلی چمکتی ہے تو برگد کی گھنیری
چھاؤں میں چھپ جاتے ہیں۔

جھٹپٹے کے وقت سب اپنے اپنے کاموں سے
چھٹی پا کر گھر لوٹتے ہیں۔ کسان کاندھوں پر ہل
پھاوڑا اور کدال لئے اور چرواہے اپنے گلوں کو
ہنکاتے ہوئے گھر کا رخ کرتے ہیں سورج ڈوبتے
ڈوبتے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ عورتیں کھانا پکا کر تیار
رکھتی ہیں۔ جھونپڑوں میں چھوٹے چھوٹے مٹی
کے دئے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ بچے، جوان بوڑھے
مرد عورتیں سب ایک ٹاٹ پر بیٹھ کر روکھا سوکھا
کھا لیتے ہیں۔ اس روکھے سوکھے میں جو مزا
آتا ہے وہ ہمیں تمھیں پلاؤ زردے میں بھی نہیں
آتا۔ اس کے بعد خدا کا شکر ادا کر کے اپنی ٹوٹی
پھوٹی چارپائیوں پر لمبی تان کر سو جاتے ہیں
اُن کی اس میٹھی نیند پر بادشاہوں کو بھی رشک
آتا ہے۔

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کوئی سو برس پہلے کی۔ ولایت کے ایک شہر (گلاسگو) میں ایک لڑکا پیدا ہوا (۱۸۴۲ء) جارج میتھن۔ ابھی وہ اٹھارہ مہینے کا تھا کہ اس کی آنکھیں خراب ہونے لگیں۔ اس کی ماں کو بہت فکر ہوا۔ ڈاکٹروں نے بہت علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ماں باپ کو جارج میتھن کی آنکھوں کی طرف سے برابر پریشانی رہی۔

رفتہ رفتہ اُسے کم دکھائی دینے لگا۔ وہ عینک کی مدد سے پڑھ لیتا تھا۔ لیکن زیادہ دیر تک کوئی چیز اچھی طرح نہ دیکھ سکتا۔ اسکول میں اس کے اُستاد نے اُس کو کھڑکی کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی تاکہ روشنی میں اچھی طرح لکھ پڑھ سکے۔

آنکھوں کی تکلیف کوئی ایسی تکلیف تو ہوتی نہیں مگر جارج بہت شوقین لڑکا تھا۔ اس تکلیف کے باوجود خوب جی لگاکر پڑھتا اور اپنے درجے میں ہمیشہ اول آتا۔ انگریزی تو اس کی مادری زبان تھی اس کے علاوہ اُس نے جرمن، فرینچ، لیٹن اور یونانی زبانیں بھی سیکھ لیں۔

جارج کے خاندان کے لوگ گرمیوں کی چھٹیاں سمندر کے کنارے گذارتے تھے۔ یہاں جارج جہازوں کے آنے جانے کا تماشا دیکھ کر خوش ہوتا۔ اُن پر لکھے ہوئے حرف بہت غور سے پڑھتا۔ اس طرح وہ اپنی آنکھوں کی بینائی کا اندازہ لگاتا رہتا۔ کبھی کبھی اُسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ اُس کی آنکھوں کی روشنی بڑھ رہی ہے۔

اس کے پڑھنے لکھنے کا زمانہ زیادہ تر دوسروں کے رحم و کرم پر گذرا۔ اسکول اور کالج کے سبق اس کے سامنے دہرائے جاتے۔ حافظہ ایسا اچھا تھا کہ تھوڑی دیر میں اپنے تمام سبق حرف بہ حرف دہرا دیتا۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ گلاسگو کالج میں داخل ہوا۔ کالج کی چار سال کی مدت میں اس نے انگریزی جغرافیہ اور تاریخ میں بہت سے انعام حاصل کیے اور پندرہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرلیا۔

اس زمانے میں اس کی آنکھوں کی روشنی برابر کم ہی ہوتی رہی۔ آخر ۱۸ سال کی عمر میں وہ بالکل اندھا ہوگیا۔ یہ زمانہ اس کے لئے بہت رنج اور تکلیف کا تھا۔ مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور پڑھنے لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ وہ ہر درجے میں اوّل آتا تھا کالج کے ڈراموں اور تقریروں میں اُس نے غیر معمولی شہرت حاصل کرلی۔ بی اے میں اس کا خاص مضمون فلسفہ تھا۔ امتحان میں وہ اول نمبر کامیاب ہوا۔ پھر ام اے بھی کرلیا ۱۸۶۲ء میں اُسے مذہبی علم پڑھنے کا شوق ہوا اور ۹ سال کے بعد اُس نے "ڈاکٹر آف دی وی، نی، ٹی" کی ڈگری لی۔ اور اب اُسے اپنا مذہب پھیلانے کی بھی اجازت مل گئی۔

گلاسگو میں برنارڈ ایک مشہور پادری تھا جارج اس کا مددگار پادری بنا دیا گیا۔ وہ ہمیشہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرتا۔ اس کے وعظ کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ لوگ اس کے اندھے پن کو مشکل ہی سے تاڑ سکتے تھے۔

ایک سال کے بعد وہ انی لن کے گرجا کا پادری بنا دیا گیا۔ انی لن بہت خوب صورت جگہ ہے۔ گرمی کے موسم میں لوگ یہاں دور دور سے آتے تھے جارج کی وجہ سے یہاں کی رونق اور چہل پہل میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔ لوگ جوق جوق اس کا وعظ سننے آتے اور اپنے دل پر بہت اچھا اثر لے جاتے۔ اس کا بیان مُردہ دِلوں میں زندگی کی روح پھونک دیتا تھا۔ خصوصاً جوانوں میں ایک خاص جوش اور ولولہ پیدا کردیتا تھا۔ وہ ناامیدی اور شکوہ شکایت کو اپنے قریب نہ آنے دیتا تھا۔

۱۸۸۶ء میں وہ اڈنبرا کے گرجا کا بڑا پادری بنایا گیا۔ وہاں وہ ۱۳ سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے بے شمار وعظ کہے۔ اس کے ہر وعظ میں پندرہ پندرہ ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ مذہبی وعظ بھی ایک خدمت ہے مگر جارج کی بلند ہمتی کچھ اور آگے بڑھنے کے لئے بے چین تھی۔ اُس نے سوچا وعظ کے ذریعے مذہب پھیلانا ہی کافی نہیں۔ لوگوں کے گھر پہنچ کر اُن کے دُکھ درد معلوم کرنا اور اُن کی مدد کرنا چاہیئے۔ اڈنبرا کے قیام کے زمانے میں اس نے ۶۰۰ خاندانوں کی دیکھ بھال اور مدد کی۔ وہ ہمیشہ مریضوں، بوڑھوں، اپاہجوں، غریبوں اور دُکھیاروں کی خدمت اپنی زندگی کا اہم فرض سمجھتا تھا۔ وہ ایسا اچھا اور سچا ہمدرد تھا کہ لوگ پہلی ہی ملاقات میں اس کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اس کے حافظے کی تعریف تم پڑھ چکے ہو۔ اکثر تقریر کے بعد لوگ اس سے ملنے آتے۔ جارج انھیں صرف اُن کی آواز سے پہچان لیتا اور ان کا نام لے کر اُن سے بات چیت کرتا۔ ایک روز ایک

ص اس کے پاس آیا۔ اُسے وہ اپنی بینائی کے
نے میں دیکھ چکا تھا۔ وہ کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب
اید آپ مجھے بھول چکے ہوں گے۔" جارج فوراً
ں اُٹھا "میں آپ کو جانتا ہوں، آپ میکن تاشں
ں" اور یہ واقعی میکن تاشں ہی تھا۔
جارج نے بہت اچھی اچھی کتابیں بھی لکھی ہیں۔
شلنہء میں اس نے ایک کتاب "میری آرزو"
ی۔ اس کی شہرت اور مانگ اِس قدر ہوئی کہ تمام
ریں تھوڑے دنوں میں ختم ہوگئیں۔ یہ کتاب کئی
ھپی اور بک گئی۔ اِس کتاب کے علاوہ اس نے
ر بھی کئی اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔ اس کی تقریروں
طرح یہ کتابیں بھی لوگوں کے لئے امرت کا کام دیتی
یں اور دُنیا کے تمام حِصّوں سے اُس کے پاس
ارک باد کے خط آتے تھے۔ جارج انسانوں کا
ا خادم تھا۔ وہ ہر کام لوگوں کی بھلائی کی نیت
ے کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ اُس کی تقریریں اور اُس
کتابیں خلوص، ہمدردی اور جوش کا نمونہ تھیں
ت سے نامُراد اور مصیبت زدہ لوگوں کی زندگی
اِن کتابوں کے پڑھنے سے سنبھل گئی۔

جارج ۶۴ سال زندہ رہا۔ اس کی زِندگی کا
ہر لمحہ لوگوں کی خدمت میں گذرا۔ وہ روزانہ صُبح کو
ناشتے کے بعد خط لکھواتا۔ اس کے بعد جرمن اور فرنچ
کتابیں پڑھوا کر سُنتا۔ پھر اپنے سکرٹری سے کچھ مضمون
لکھوا کر اخباروں بھجواتا۔ اُس نے اپنی زندگی میں کوئی
کام ادھورا نہ چھوڑا۔ اسی لئے زِندگی کے ہر حِصّے میں
کامیاب اور سُرخرو رہا۔

۲۸ اگست سنہ ۱۹۰۶ء میں جارج اس دنیا سے
رخصت ہوا۔ اس کی قبر گلاسگو میں ہے۔ اس کے رشتہ
داروں کے پاس دُنیا کے چپّے چپّے سے تعزیت اور
ہمدردی کے خط آئے۔ سب اس کی تعریف سے
بھرے ہوئے تھے۔ وہ اس تعریف کا مستحق بھی
تھا۔ اس نے دُنیا کو دکھا دیا کہ چاہے کیسی ہی رُکاوٹ
ہو چاہے کتنی ہی مشکلیں ہوں انسان کا اِرادہ
مضبوط اور نیت پاک ہو تو سب رکاوٹیں دور
اور ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

ایڈیٹر کو خط لکھتے وقت پورا پتہ لکھو کاروباری
خط کے لئے خریداری نمبر کافی ہے۔ "منیجر"

یوسف اشفاق متعلم جامعہ

ئیں! اس وقت تو آپ کے سامنے ہوں، اس سے پہلے ہل چلا رہا تھا جہاں سے آپ گذرے تھے۔ اور قریب ناچے بھی تھے۔ آپ لوگوں کو آوازیں بھی دیں لیکن کسی نے سنا ہی نہیں۔

ہمیں بڑا افسوس ہوا، اب بہت ہوشیاری سے آگے روانہ ہوئے۔ جہاں کہیں کچھ آدمی دکھائی دیتے ہم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور کہتا کہ "کہیں ان میں بھی کوئی نہ چھپا ہو۔" اسی طرح ہمارا سفر کٹ رہا تھا سامنے ایک گاؤں نظر آیا۔ ہم چوکنّا ہو گئے، کوئی نہ کوئی سازش ضرور ہوگی۔

"ارے دیکھو یہ نشان کوئی پرچہ ہے"، ایک صاحب .... اپنی ہاکی اسٹک سے نشان دکھاتے ہوئے بولے۔" جلدی سے پرچہ تلاش کیا گیا لکھا تھا:"

"ہمارا ایک ساتھی زخموں سے چور یہاں پڑا ہے۔ ڈریسنگ کر کے ساتھ لیتے آئیے۔"

ہم نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی دیہاتی ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ "ان میں سے کوئی نہیں"، ہم نے دل میں کہا۔

پاس کے گیہوں کے کھیت میں جو نظر گئی تو معلوم ہوا کہ کھیت میں ایک جگہ ایک گز کے قریب پودے دبے ہوئے ہیں۔ ہمیں شک ہوا۔ قریب گئے تو ایک سفید سی چیز نظر آئی اور آگے بڑھے تو ٹانگ اور آگے ہاتھ پھر منہ اور ہم سب کے سب اس کے اوپر۔ پکڑ لیا، پکڑ لیا۔ خوشی کا نعرہ لگایا گیا۔ ساتھ لے کر آگے روانہ ہوئے۔

گاؤں کی گلیوں میں نشان دیکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

"پرچہ" ایک صاحب چیخے۔ سب کے سب نشان کی مدد سے تلاش کرنے لگے۔ مل گیا۔ ایک صاحب نے نکالا۔

"ہمارا گروپ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے۔ تلاش

کرکے مدد کیجیے۔"

"ارے سُنو کسی لڑکے کی آواز آرہی ہے۔ یہ لوگ قریب ہی ہیں۔"

ہم آواز کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک مکان کے اندر سے آواز آرہی تھی۔ ہم دندناتے ہوئے اندر گھُس گئے۔ سب بیٹھے ہوئے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ ہم قہقہہ لگا کر مونگ پھلیوں پر ٹوٹ پڑے وہاں معلوم ہوا کہ ہم ان کے نشانوں سے بھٹک کر آرہے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ہمیں بہت دور تک نشان کیوں نہیں ملے تھے۔ یہ ایک دکان تھی یہاں مونگ پھلیاں اور گڑ کھا کر پانی پیا اور آگے روانہ ہوئے اب سب کے سب ساتھ تھے۔ دو میل کے بعد ایک اور گاؤں میں داخل ہوئے۔ ایک جگہ رس نکالا جارہا تھا۔ یہاں خوب گنّے کھائے۔ رس پیا۔ گاؤں والوں نے ہماری خوب خاطر کی۔ ہم نے اُن کو گنّوں کی قیمت دینا چاہی۔ لیکن اُنھوں نے انکار کردیا۔

گاؤں میں ایک اسکول تھا۔ بچوں کی دست کاری کے نمونے دیکھے۔ بچّوں کے اُستادوں سے ملے چند بچّوں سے باتیں بھی کیں۔ ان بچّوں سے ایک ترانہ سُننے کے بعد آگے روانہ ہوئے۔

کچھ دور کے بعد نہر مل گئی۔ یہ نہر اوکھلا سے نکلتی ہے۔ اور غازی آباد تک جاتی ہے۔ سامنے ہی فرلانگ کا پتھر تھا۔ تین میل لکھا تھا۔ یعنی غازی آباد تین میل ہے۔

یہ تین میل بڑی مشکل سے کٹے۔ سامنے ہی ڈاک بنگلہ تھا، یہیں ہمیں ٹھہرنا تھا۔ کمرے کھلوائے گئے اور بستر بِچھا کر لیٹ گئے۔

اب تین بجے تھے۔ ہم ۷½ بجے صُبح روانہ ہوئے تھے۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ہم ۱۶ میل چلے ہیں۔

ذرا سستا کر نہر میں نہائے۔ پھر شہر روانہ ہوئے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا۔ تجارتی شہر ہے کوئی چیز قابلِ دید نہیں۔ شہر سے مغرب کے بعد واپس آئے۔ روشنی کے لئے ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی لالٹین بورڈنگ میں بھول آئے تھے۔ موم بتیاں جلائی گئیں، شہر سے چائے بنانے کا سامان لائے تھے چائے بنائی گئی اور دور چلنے لگا۔ "موم بتی ختم ہونے والی ہے"۔ ایک صاحب چلائے۔

اتفاق ایسا کہ ساری موم بتیاں ختم ہوگئیں یکایک اندھیرا چھا گیا اور ساتھ ہی لڑکوں نے ایک چیخ ماری۔

"ارے بھائیو"۔ ایک صاحب بولے۔

"جی فرمائیے"۔

"ارے بھائیو" وہی حضرت پھر بولے۔

"جی فرمائیے"۔ اُنھوں نے جواب دیا۔

"ارے بھائیو"۔ پھر اُنھوں نے کہا۔

"بھائیو کے بچّے کچھ کہے گا بھی"۔ جواب دینے والے

حضرت غصّے سے بولے۔

"میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات جلئے ذرا دیکھ بھال کر پیجئے گا۔ اندھیرا ہے۔ کہیں گرم گرم پیالی مُنہ کے بجائے ناک میں نہ لگالیں"۔ وہ بہت متانت سے بولے۔

ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس دئے۔

معلوم ہوا کہ ایک صاحب کے پاس شمع ہے اُن سے لے کر روشنی کی گئی۔ ۱۱ بجے سب تھکے ہارے سوگئے۔

صبح سویرے اُٹھے۔ نماز پڑھی۔ پھر باہر نکل ڈاک بنگلے کے درمیان کی زمین پر ہاکی کھیلنے لگے۔

پھر ناشتہ کرکے دریا میں خوب نہائے۔ غسل کے بعد شہر گئے۔ وہاں سے دو بجے واپس آئے۔ فوراً ہی کھانا کھایا اور کھانے کے بعد واپسی کی تیاریاں شروع کردیں۔

واپسی میں سب سامان ملازم کے ذریعے موٹر سے روانہ کردیا گیا اور ۳½ بجے نہر کے کنارے کنارے ادکھلے کی طرف چل پڑے۔ کھیلتے کودتے آئے۔ پھر بھی یہ سفر غیر دلچسپ رہا۔

واپسی میں کہیں کہیں نہر میں تیرے بھی۔

رات کے ۸ بجے ہم بورڈنگ میں داخل ہوئے "اللہ اکبر" بورڈنگ کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے ایک نعرہ لگایا اور لڑکے گھبرا کر اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے۔

ایک لڑکی

ایک لڑکی تھی جو لوگوں کے گھروں سے جب دوپہر میں سونے کا وقت ہوتا، کوئی چیز چرا کر بھاگ جاتی۔ ایک دن ایک امیر آدمی کے گھر گئی اور گملے لے جانے لگی۔ ایک گملے پر چڑیا بیٹھی تھی وہ چڑیا اس کو دیکھ کر اڑ گئی اور گملا گر گیا سب لوگ اُٹھ گئے اور کہنے لگے "چور چور پکڑو۔ وہ پکڑی گئی

گدھے اور مینڈک کی کہانی

محمد محب الرحمٰن خاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گدھے کے اوپر کچھ بوجھ لدا ہوا تھا۔ وہ ایک دلدل کے پاس سے گذرا، اتفاق سے وہ اس میں گر پڑا۔ اس نے اس طریقے سے دلدل کے اندر چیخنا چلانا شروع کیا کہ ایک لمحے کے اندر مر جائے گا۔ ایک مینڈک نے کہا "کیوں میرے دوست تم اس طرح کیوں چیختے ہو۔ ہم کو نہیں دیکھتے کہ اس میں ہمیشہ رہتے ہیں۔ اگر تم اس میں ہماری طرح رہو تو تمھارا کیا حال ہو"

بھوت

از ذکیہ خاتون۔

ہماری ایک سہیلی تھیں قمر۔ بھوت سے بہت ڈرتی تھیں۔ بھوت کا اُن کے سامنے کوئی نام لے دے، بس کانپنے لگتی تھیں۔ سب سہیلیوں نے ارادہ کیا کہ اُن کا ڈر نکالنا چاہیے۔ میں، اختر، ثریا اور صدیقہ نے ایک ترکیب سوچی، اور وہ یہ کہ ایک دن ثریا کے ہاں رات کے کھانے کی دعوت ٹھہرائی گئی۔ اور طے پایا کہ سب سہیلیاں رات کو وہیں رہیں اور صبح اسکول چلی جائیں۔ دعوت کے دن -------- ہم سب

مغرب کے بعد ثریا کے ہاں پہنچ گئے۔ ۸ بجے کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر تک تو ہنستے کھیلتے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ملائیں اور پھر سونے کی ٹھانی اور تھوڑی دیر میں سب غافل سو گئے۔

کوئی گیارہ بجے۔ ثریا نے مجھے جگایا۔ ہم چپ چپکے اُٹھے۔ قمر کا پلنگ ہمارے پلنگ کے پاس تھا۔ ثریا نے اپنے پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور ہم پھر لیٹ کر سوتے بن گئے۔ دو تین منٹ کے بعد ایک دم قمر چلائی " بھوت، بھوت بچاؤ، بھوت بھوت " ہم سب ایک دم اُٹھ بیٹھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ قمر کا لحاف نیچے پڑا ہے اور وہ تکیے میں مُنہ چھپائے بھوت بھوت چلا رہی ہے۔ سرہانے ثریا کی سفید لمبے بالوں والی بلی کے دو بچے بڑے اطمینان سے لڑ رہے ہیں۔ بلی کے بچوں کو علیحدہ کیا گیا اور قمر صاحبہ کو اُن کے بھوت سامنے دکھلائے گئے۔ اب بڑی شرمندہ ہوئیں اور اپنے دل سے بھوت کا خیال دل سے نکال دیا۔ دوسرے روز صبح اسکول میں مشہور ہو گیا کہ قمر صاحبہ نے بھوت سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔

چھوٹا بھائی

میر محمد

ایک روز حامد فرش پر بیٹھا اپنے لکڑی کے ٹکڑوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ ایک مینار بنا رہا تھا۔ مینار اتنا اونچا تھا کہ اس سے پہلے حامد نے کبھی نہیں بنایا تھا۔ حامد کو اس کے بنانے میں بہت دیر لگی۔ جب بنا چکا تو بہت خوش ہوا۔ اور اُٹھ کر اُسے چاروں طرف سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں اس کی امّی محمود کو لئے آئیں اور حامد سے کہنے لگیں۔" حامد کیا تم ذرا محمود کو دیکھتے رہوگے ؟ حامد نے کہا " بہت اچھی بات ہے " حامد اپنے بھائی محمود کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے کھیلنے کے لئے اس نے تھوڑے سے لکڑی کے ٹکڑے اور چند کھلونے دئے۔ محمود بھی ٹکڑے ایک دوسرے پر جمانے لگا حامد یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اتنے میں ایکا ایکی کُتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔ حامد کہنے لگا " معلوم ہوتا ہے کہ میرا کُتا اسپاٹ واپس آگیا ہے " حامد کو بار بار اپنے چہیتے کُتے کا خیال آتا تھا۔ حامد اُسے دیکھنے کھڑکی کے پاس گیا۔ بس اسی وقت محمود اُس مینار پر گر پڑا اور مینار ٹوٹ گیا۔ مینار کے گرنے کی آواز سُن کر حامد نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور چلا اُٹھا " شریر! یہ کیا کیا۔ میرا مینار گرا دیا۔ میں نے تو بڑی محنت سے اپنے دوست رشید کو دکھانے کے لئے تیار کیا تھا " حامد بہت دیر تک اپنے بھائی اور گرے ہوئے مینار کو غُصّے سے دیکھتا رہا۔ اُس وقت اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے بھائی کو کیا سزا دے۔ محمود کہنے لگا " حامد کے ٹکڑے محمود کھیلا " اور لگا اپنے بڑے بھائی پر ہنسنے۔ یہ دنیا میں سب سے پیاری ہنسی تھی۔ محمود کو دیکھ کر حامد بھی ہنس پڑا۔ اور بھائی کو گود میں اُٹھا کر کھڑکی کے پاس لے گیا۔

عزیز بچیو اور بچو!

ہم اس وقت کشمیر میں ہیں اور گاندھربل سے تمھارے لئے یہ مضمون لکھ رہے ہیں۔ ۲۰ تاریخ کی شام کو میں اور جناب حامد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ (بال بچوں سمیت) دہلی سے روانہ ہوئے۔ صبح لاہور پہنچے۔ دو دن وہاں ٹھہرے۔ یہاں ایک اور قافلہ ساتھ جانے کو تیار تھا۔ تیسرے دن کرائے کی بس پر سب سری نگر روانہ ہوئے۔ دوپہر کو جموں ٹھہرے، کھانا کھایا، کچھ دیر آرام کیا اور ڈھائی بجے پھر روانہ ہوگئے۔ رات ایک پہاڑی قصبے (بٹوٹ) میں گذاری۔ صبح کو پھر چلے۔ کوئی دس بجے بانہال پہنچے۔ یہاں سے پیر پنجال کی چڑھائی شروع ہوئی۔ پیر پنجال کی چوٹی کوئی ۹ ہزار فٹ اونچی ہے۔ چڑھائی بہت سخت ہے۔ لوگوں کو متلی شروع ہوجاتی ہے۔ ہم لوگوں کو شکر ہے کہ یہ شکایت نہیں ہوئی۔ بہت اوپر جاکر ایک لمبی سی سُرنگ سے گذرے۔ سُرنگ سے نکلتے ہی ایک نیا منظر تھا۔ سامنے کشمیر کی وادی تھی، بہت سبز و شاداب۔ یہاں سے اُتار شروع ہوگیا تھا۔ تھوڑی دور نیچے اُتر کر لاری خاص سڑک کو چھوڑ کر ایک اور سڑک کی طرف مُڑ گئی۔ ہم ویری ناگ کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں ایک چشمہ ہے۔ کشمیر کا مشہور دریا جہلم یہیں سے نکلتا ہے۔ مغل بادشاہوں نے اِس چشمے کے چاروں طرف عمارت بنوادی ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ یہاں ایک گلاب کا باغ ہے۔ ہر طرف گلاب کے درخت لگے ہیں۔ چشمے اور باغ کے بیچ میں سڑک ہے۔ چشمے کے پیچھے پہاڑ کی بہت اونچی چوٹی ہے۔ نیچے سے اوپر تک چیڑ کے گھنے پیڑ ہیں۔ ہم نے ایسا اچھا منظر آج تک نہیں دیکھا تھا۔ راستے کی ساری تھکن جاتی رہی۔ یہاں سے دیکھ بھال کر پھر واپس ہوئے اور تھوڑی دیر میں خاص سڑک پر آگئے۔ اب ہم سیدھے سری نگر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ کھانا کھایا اور پھر چل پڑے۔ کوئی چار بجے سری نگر پہنچے۔ یہ کشمیر کا دارالخلافہ ہے۔ مہاراجہ صاحب کشمیر اور ان کی حکومت کے دفتر گرمیوں گرمیوں یہیں رہتے ہیں۔ سردیوں میں جموں چلے جاتے ہیں۔ یہاں لاری اپنے اڈے پر ٹھہری۔ یہاں سے قلیوں پر اسباب لدواکر ایک ہوٹل میں

گئے۔ دوسرے دن صبح کو دو کشتیاں کرائے پر لیں اور شالامار، نشاط باغ، شاہی چشمے کی سیر کی۔ شاہی چشمے کا پانی خوب پیا۔ تین دن کشتیوں میں رہے۔ بہت لطف آیا۔ تیسرے دن شام کو پھر ہوٹل واپس آئے۔ اب یہ طے کیا گیا کہ گاندھربل چلیں۔ یہ سری نگر سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ یہاں پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اس کا پانی بہت ہاضم ہے۔ پاس ہی سندھ دریا کی ایک شاخ بہتی ہے۔ اس کا پانی بھی بہت اچھا ہے۔ یہاں دو مکان کرائے پر لئے ہیں اور مزے سے رہتے ہیں۔ یہاں ایک مڈل اسکول بھی ہے۔ اسکول کے تین اُستادوں، غلام حسین صاحب قریشی، عبدالقدوس صاحب، مولوی محمد امین صاحب کی وجہ سے گھر کا سا آرام مل رہا ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی پہلگام اور گلمرگ کی سیر کے لئے پہلے جا چکے ہیں۔ ہم انشاءاللہ کل روانہ ہوں گے۔ کشمیر کی سیر کی یہ بہت مختصر سی سرگذشت ہے۔ مفصل حال انشاءاللہ سیر ختم کر چکنے کے بعد لکھیں گے اور وہ بہت دلچسپ ہوگا[1]

پچھلے مہینے لڑائی نے زیادہ شدت اختیار کر لی تھی۔ موجودہ لڑائی کا حال کچھ عجیب ہے کہیں تو انگریزوں کو کامیابی پر کامیابی ہو رہی ہے کہیں جرمن کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ ابی سینیا میں انگریزی فوجوں کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اٹلی نے اس ملک کو جس طرح ظلم و زیادتی سے لیا تھا اسی طرح وہ اسے کھو بھی بیٹھا۔ اِدھر طبروق اور لیبیا میں انگریزی فوجیں اٹلی اور جرمنی کی فوج سے بہت کامیابی سے مقابلہ کر رہی ہیں اور انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ عراق کی لڑائی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ رشید علی جیلانی ایران اور اُس کے دوسرے ساتھی دوسرے مقامات پر چلے گئے۔

یونان کی لڑائی کے بعد یونان کی حکومت اور بادشاہ کریٹ کے جزیرے میں چلے گئے۔ جرمنی اس جزیرے پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے جزیرے میں اُتارنی شروع کر دیں انگریزوں اور یونانیوں نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن انگریزوں کے پاس ہوائی جہازوں کی کمی تھی، اس لئے مصلحت اسی میں تھی کہ جرمنی کے سپاہیوں اور لڑائی کے سامان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر وہاں سے ہٹ آئیں۔ جرمنی نے برطانیہ کو پریشان کرنے کے لئے چاروں طرف جال پھیلا رکھا ہے۔ سُنا ہے کہ اُس نے دباؤ ڈال کر سمجھوتہ کر کے فرانس سے شام اور افریقہ کے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت لے لی ہے۔ یہ بھی سُنا گیا ہے کہ شام میں اُس کی فوجیں تھوڑی تعداد میں پہنچنا بھی شروع ہو گئی ہیں۔ دوسری طرف اس نے اسپین سے ایک عہد نامے کے ذریعے اپنی فوجیں اس ملک سے گذارنے کی اجازت لے لی ہے۔ یہاں سے وہ جبرالٹر پر حملہ

---

[1] (۳۱) پرچے کے ٹائٹل پر کشمیر کے ایک بہت اچھے منظر کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔

کرے گا ۔ لیکن جرمنی کی ان باتوں سے انگریزوں کے دم خم اور استقلال میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اُن کا نعرہ یہی ہے کہ آخری فتح ہماری ہوگی ۔ اِدھر امریکہ سے بھی اُنھیں مدد ملنے لگی ہے ۔ لڑائی کا سامان اور رسد کے جہاز آنے شروع ہوگئے ہیں ۔ امریکہ کے بنے ہوئے بہت سے ہوائی جہاز لڑائی میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔

پچھلے مہینے انگلینڈ پر جرمن ہوائی جہازوں کے حملے کم ہوئے ۔ البتہ آئرلینڈ کے دارالسلطنت ڈبلن پر جرمنی نے بہت سخت ہوائی حملہ کیا ۔ بہت سے لوگ مرے ، بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سی عمارتوں کو نقصان پہنچا ۔ آئرلینڈ اپنے کو غیر جانبدار سمجھتا تھا ۔ اس لئے اس نے جرمنی کی اس حرکت پر سخت احتجاج کیا ہے۔

جرمنی کے سابق شہنشاہ کا پچھلے مہینے انتقال ہوگیا ۔ اُسے دل کی بیماری تھی ۔ انگریزی یا اتحادیوں کے خلاف پچھلی بڑی لڑائی اسی نے چھیڑی تھی ۔ جرمنی کے ہارنے کے بعد یہ تخت سے اُتار دیا گیا تھا اور تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا ۔ موجودہ لڑائی کا نتیجہ دیکھنا بے چارے کی قسمت میں نہ تھا ۔

چین اور جاپان کی لڑائی کی خبریں بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں ۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے چینی فوجوں کو نقصان پہنچایا ہے ۔ چینی حکومت کی طرف سے بھی جاپانی فوجوں کے نقصان کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ اتنے دن تو ہوگئے ۔ دیکھئے یہ لڑائی کب تک جاری رہتی ہے

ہندوستان کی حالت میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا ۔ بمبئی میں ہندو مسلم فساد کا سلسلہ پچھلے مہینے بھی جاری رہا ۔ بہار شریف (پٹنہ بہار) میں پھر فساد ہوگیا ۔ ستیہ گرہ بھی جاری ہے ۔ حکومتِ ہند نے ایک اعلان کے ذریعے خاکساروں کی انجمن کو غیر قانونی قرار دیا ہے ۔ صوبوں کی حکومتوں سے بھی اسی طرح کے اعلان شائع ہو رہے ہیں ۔ بہت سے خاکسار گرفتار بھی کئے گئے ہیں۔

پچھلے مہینے مالابار میں سخت طوفان آیا ۔ بہت سی کشتیاں ڈوب گئیں ۔ جان اور مال کا بھی بہت نقصان ہوا ۔ بنگال کے بعض علاقوں سے بھی اسی طرح کی خبریں آئی ہیں ۔

معما نمبر ۹ کے حل ان بچوں کے صحیح ہیں ۔ (تین پیسے کے ٹکٹ بھیجنے کے بعد اگلے معمّے کے ۳ کوپن بھیج سکتے ہو)

صحیح حل   **اوّل انعام**   **فی کس ۱؎**

محمد عبد الباری ۔ بلند شہر	میر نعیم اللہ ۔ ایبٹ آباد	مظہر الحق ۔ کانپور
محمد عبد الباری اورنگ آباد	علی احمد ۔ کلکتہ	ذو الفقار علی خاں ۔ رامپور
سید اطہر علی ۔ دہلی	سید ریاض احمد ۔ جالندھر	احمد نور ۔ اُجین

محمد ادریس اسد دالے - دہلی	بدر النساء بیگم - ملکاپور	خواجہ بشر حسین - دہلی	خورشید الحق بیگ مرزا - بریلی
حسن اصغر - انبالہ	کوثر بانو - امروہہ	نزاکت حسین - شکوہ آباد	سید احتشام احمد - مرادآباد
محمد احمد - بمبئی	محمد نقی - دہلی	فصیح الدین - آگرہ	سید مقصود حسن رضوی - دہلی
عربیہ خاتون - حیدر آباد	سید مہاجر حسن - لکھنؤ	منور حسین شاکر - ناگپور	نفیس جہاں - میرٹھ
بہادر خاں - اتمان زئی	سید مسعود حسن - امروہہ	ط، ب - بربھنی	حافظ محمد یوسف - کلکتہ
علی حسین - ہردہ	سید محمد احمد عظیم - دہلی	محمود علی - ریواڑی	سید عزیز احسن مارہروی - علیگڑھ
حامد صادق - گورداسپور	سید محمد یحییٰ - پٹنہ	خلیل الرحمٰن - ٹونک	سید انعام احمد " "
اقبال مرزا - دہلی	عابد حسین - کراچی	ردی ٹھکرال - سیتاپور	تہمینہ خاتون "
	اکمل حسین - شملہ		

ان بچوں کے حلوں میں ایک غلطی ہے (۱ر کا ٹکٹ بھیج کر اگلے مہینے کے دو کوپن بھیج سکتے ہو) **انعام فی کس ۱ر**

سید عطاء الرحمٰن ہاشمی - دہلی	افتخار اللہ - دہلی	احمد ابراہیم صدیقی - حیدر آباد	ہارون الرشید - کلکتہ
احمد عرفان غازی - "	جمیل اختر " "	محمد حکیم اللہ خاں - "	منور زماں خاں - فیض آباد
مرزا وراثت علی بیگ - اورنگ آباد	عارفہ خاتون " "	شیخ انوار گل - کراچی	حامد حسن - دہلی
محمد عبد اللہ الیاس - شملہ	نجم الدین احمد رضوی "	سید محمد کاظم - پٹنہ	معین الدین اشرف - پٹنہ
سرجیت سنگھ دہار - ٹاٹانگر	نعیم کامل "	خلیل الرحمٰن قدوائی - بڑاگاؤں	عائشہ بیگم - حیدر آباد
فاطمہ بیگم - اناؤ	جمیل اختر - لائل پور	امیر احمد خاں - پونہ	محمود احمد انصاری - مغلسرائے
سید شرافت حسین - شکوہ آباد	حامد حسین - انبالہ شہر	ضیاء الحسن - ناگپور	زیب الدین - میرٹھ
سید ریاض حیدر - جالندھر	محمد یعقوب - کانپور	محمد عرفت اللہ انصاری - لکھنؤ	طالب الحق - حیدر آباد
عنایت احمد خاں شروانی - اجین	محمد عماد الدین - حیدر آباد	عقیل الرحمٰن محسن - مظفر نگر	قمر الرحمٰن خاں نیازی - مظفر گڑھ
محمد اختر رشید - راولپنڈی	محمد حنیف "	دختر سید شوکت علی - رامپور	سید جلال حیدر زیدی - شاہ آباد
محمد عمر مجددی - رامپور	سید نعیم احمد - میرٹھ	جعفر حسین جعفری - سونی پت	

معمہ نمبر ۲۰

پہلا انعام ۔ عـہ

دوسرا انعام ۔ ۵ـہ

دائیں سے بائیں

۱۔ مشرقی بحیرۂ روم کا یہ اہم جزیرہ جرمنوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔

۴۔ اکثر ... روٹی پسند کی جاتی ہے۔

۶۔ سید انشاء اللہ خاں کا تخلص۔

۷۔ اچھا ... ڈھونڈنے سے نہیں بلکہ اتفاق سے ملتا ہے۔

۸۔ ایک بہت بڑا گناہ

۱۰۔ ریل کے سفر میں نئے ... کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۳۔ پہلے سارا معما حل کر لو پھر ... سے اس لفظ کو سوچنا۔

۱۵۔ تاجر کی جمع۔

۱۶۔ پینے کی ہے۔ لیکن پینا بُرا ہے۔

۱۷۔ کی جاننے والے کو دیکھ کر .... کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۸۔ جامعہ میں طلباء کی نشست عام طور .... پر ہوتی ہے۔

اوپر سے نیچے

۱۔ رات دن گردش میں ہے سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ ... گھبرائیں کیا — غالب

۲۔ ذہین بچے اپنا سبق جلد ہی ... کر لیتے ہیں۔

۳۔ ایک گھنٹے میں ساٹھ ہوتے ہیں۔ (الٹا)

۴۔ گندی .. سب ہی کو بُری معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ اچھا پھل تو اسی کا ملتا ہے جو دل سے کی جائے۔

۸۔ آج کل گرد .... کی وجہ سے موسم بڑا خراب رہتا ہے۔

۹۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب کوئی ملک ہٹلر کے پنجے سے .. نہیں سکتا۔

۱۰۔ جو اپنے سے بڑا ہو اُسے .. ہی سے مخاطب کرنا چاہیے

۱۱۔ کہتے ہیں ستار مکمل ترین .... ہے

۱۲۔ دیکھو اشارہ نمبر ۱۳ (دائیں سے بائیں)

۱۴۔ انتہائی ... کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔

۱۵۔ کیا جانتے ہو کہ اس قدر مجمع تھا کہ ... دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔

۱۶۔ مکرر لکھ دیں تو پتھر بن جائے۔

آج کل چھٹیوں کا زمانہ ہے۔ معمّا بھیجنے والوں کو خوب فُرصت ہوگی۔ ہم نے اِس مرتبہ معمّے کے اِنعام کی رقم بھی زیادہ کر دی اور معمّا بھی پہلے سے ذرا مشکل کر دیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ معمّا بھیجنے والے اِشاروں کو خوب غور سے پڑھ کر اور سمجھ کر معمّا حل کریں گے۔

قواعد

۱۔ تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ استاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں

۲۔ ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا "ٹکٹ" آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ ر آٹھ حلوں کی ۶ ر ہے۔

۴۔ دونوں انعام تقسیم کردئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۵۔ تمام حل ۱۸ جولائی تک دفتر پیامِ تعلیم جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔

۶۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا

۷۔ پیامِ تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کوپن کے چاروں طرف جو نُقطے والی لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔

۹۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے لکھا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۱۰۔ ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمّے آنے چاہئیں۔

۱۱۔ علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہیے۔

۱۲۔ معمّا حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔

۱۳۔ ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

۱۴۔ دال۱ اور واؤ۲ کا فرق نمایاں ہو۔ (د۱ ۔ و۲)

۱۵۔ چھوٹی۱ اور بڑی ے۲ کا فرق لازمی ہے (ی۱ ، ے۲)

۱۶۔ جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو۔ وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے

۱۷۔ اِملا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

۱۸۔ تمام حل ڈاک کے لفافے پر بھیجے جائیں۔

۱۹۔ نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔

۲۰۔ پتہ :- سب ایڈیٹر، پیامِ تعلیم، مکتبہ جامعہ قرول باغ - نئی دہلی

معمّا نمبر ۱۹ کا صحیح حل

۱ ع	۲ ر	ا	۳ ق	■	۴ غ	۵ ر	۶ ق
۷ د	ن	■	۸ د	ب	ا	ن	ا
۹ ا	ج	۱۰ ل	ی	■	ل	■	ٹ
و	■	۱۱ ی	م	۱۲ ج	ب	■	ل
۱۳ ٹ	۱۴ ن	گ	■	ج	■	■	■
■	ا	■	۱۵ ق	■	۱۶ ب	■	۱۷ م
۱۸ خ	ط	■	۱۹ گ	و	ا	۲۰ ن	د
۲۱ و	ق	ا	ر	■	۲۲ ب	س	ج

کلکتہ کا ایڈن گارڈن شام کا وقت

مرسلہ بخش الٰہی کلکتہ

غورو خوض

مرسلہ عبدالودود بمبئی

امان اللہ آرہ

سائیکل کی سواری

مرسلہ محمد دین صاحب جرنلسٹ

ڈیرہ اسماعیل خاں

ایک گرے ہوئے درخت سے پل کا کام لیا جا رہا ہے

Regd, L. No 1961

قیمت ۱

اگست ۸۱
پیام تعلیم
NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI.
مکتبہ جامعہ دہلی

مسلح موٹر گاڑی

موٹریں سفر سامان سے

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی - محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پچھلا پیام تعلیم خوشی کی بات ہے کہ بچوں نے بہت پسند کیا۔ رسالے کی ترتیب اور لکھائی چھپائی کے زمانے میں میں دلی سے باہر تھا پریشانی تھی کہ جانے پرچہ کیسے نکلے، مگر برادرم مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر اور برادرم سید عروج الحسن صاحب کا دلی شکریہ کہ انھوں نے اپنے پرچے کی ہر طرح مدد کی۔

ان کے علاوہ برادرم ملک محمد یوسف صاحب بی۔اے جامعہ (مہتمم شعبہ اشتہارات مکتبہ جامعہ) اور اشفاق حسین صاحب جامعی نے رسالے کی ترتیب اور لکھائی چھپائی میں بہت دلچسپی سے کام لیا۔ انھی کوششوں کی وجہ سے رسالہ وقت پر شائع ہوگیا۔

جو پیامی معمّا حل کر کے بھیجتے ہیں انھیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ معمّا یہاں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو ضرور پہنچ جایا کرے۔ اس مرتبہ حل دیر سے آئے ہیں آیندہ سے جو حل ۱۹ کی صبح کی ڈاک سے آیا کرے گا شامل نہ کیا جائے گا

رسالے کی کہانیاں اور مضامین جیسے موٹر بمبر الرکا، بچوں کی قیمت وغیرہ پیامیوں کے لئے بہت دلچسپ ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ اپرایل کی سیر۔ ماسٹر غلام حسین قریشی صاحب سے خاص طور سے لکھوائی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ ماسٹر صاحب کے پاس کیمرا نہیں تھا نہ باوجود تلاش کے سری نگر میں اپرایل کی تصویر مل سکی ورنہ مضمون اور بھی دلچسپ ہو جاتا۔

عزیزی محمد عظیم قادری کو اپنے پرچے سے بے انتہا محبت ہے۔ اس محبت کا وہ ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں کسی پچھلے پرچے میں اُن کا ایک خط بھی چھپ چکا ہے وہ اپنی اس محبت کا اکثر عملی ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں اب تک وہ اپنے پرچے کے کئی خریدار بنا چکے ہیں اس کے علاوہ اکثر مضمون بھی بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک کہانی اس پرچے میں چھپ رہی ہے ؎

شرارت کا پتلا

محمد شفیع الدین صاحب نیّر

شرارت کے پتلے ہیں ننھے میاں
بھری بوٹی بوٹی میں ہیں شوخیاں

شرارت سے اُٹھوں پہر کام ہے
شرارت میں اُن کا بڑا نام ہے

وہ نچلے نہیں بیٹھتے اک گھڑی
مچاتے ہیں دن بھر دھما چوکڑی

کسی کو وہ گردانتے ہی نہیں
کسی کا کہا مانتے ہی نہیں

کسی کا کبھی مُنہ چڑاتے ہیں وہ
کسی کے کبھی دھپ جماتے ہیں وہ

مٹھائی کسی کی کبھی کھا گئے
کہا کچھ کسی نے تو بھنّا گئے

جو دن میں کبھی کوئی سویا ذرا
اُنھوں نے لیا گھر کو سر پر اُٹھا

بلا سے جو ہو نیند سب کی حرام
اُنھیں اپنے ڈنکا مچانے سے کام

بہن سے اُنھیں گھر میں لڑنا سدا
محلّے میں سب سے جھگڑنا سدا

اسی دُھن میں رہنا گوارا اُنھیں
یہی شغل ہے دل سے پیارا اُنھیں

کہاں تک بیاں اُن کی ہوں شوخیاں
شرارت کے پتلے ہیں ننھے میاں

سہرا

رشیدہ بیگم

جناب امتیاز حسین صاحب بی اے ایم (لندن) کی شادی خانہ آبادی پر جو سہرا موصوف کی بہن رشیدہ بیگم (عمر ۱۱ سال) نے لکھا ہے وہ پیامی بہنوں کی دلچسپی کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ پیامی بہن بھائی اس خوشی میں شریک ہو کر اسے پسند فرمائیں گے۔ جناب امتیاز حسین صاحب جامعہ ملیہ کے پرانے طالب علم ہیں اور بہت پرانے پیامی۔ آپ کو پیام تعلیم سے بہت دلچسپی ہے اور اس کے لئے مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔

خوشی سے آج اتراتی ہیں پیاری نرگسی کلیاں ۔ ترانہ عیش کا گاتی ہیں پیاری نرگسی کلیاں
بہت ارمان تھا، اللہ نے یہ دن دکھایا ہے ۔ مرے ماموں کا سہرا دیکھ کر اک مسکرایا ہے
نظر اوپر نہیں اٹھتی یہ بنے سہرے کی رعنائی ۔ عجب دل کش ہے اس کا حسن اور ہے خوب زیبائی
محبت سے خدیجہ بی بلائیں جب لگیں لینے ۔ تو بس سہرے کی کلیاں بھی دعائیں تب لگیں دینے
رشیدہ اور سعیدہ راشدہ مسرور ہیں سب ہی ۔ بلائیں لے رہی ہیں ہو کے خوش دولھا کی دلھن کی
الٰہی حشر تک پھولیں پھلیں دولھا دلھن دونوں ۔ خزاں کے تند جھونکوں سے بچیں دولھا دلھن دونوں

مبارک ہو عزیزوں کو یہ جشن خانہ آبادی
دعا یہ ہے مبارک ہو خدایا سب کو یہ شادی

رڈولف
ہس
اگر ہمارے گھر اُتر آتے ؟
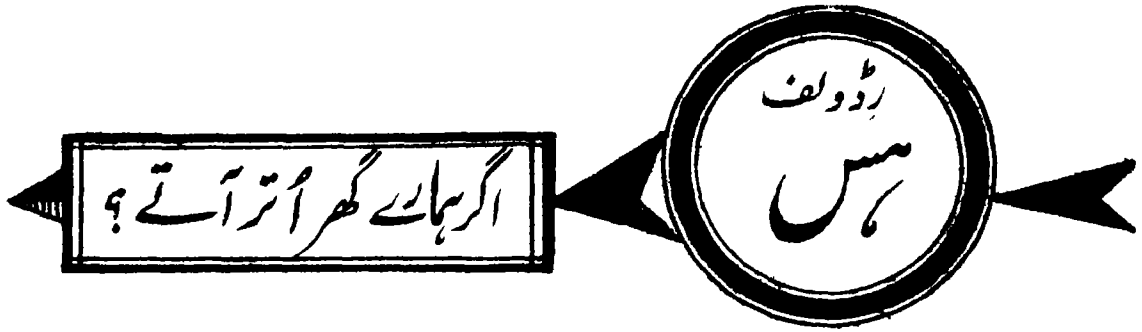
پیام تعلیم کے کسی پرچے میں ہم نے ہٹلر کے جانشین رڈولف ہس کے واقعے کا ذکر کیا تھا اور پیامیوں سے پوچھا تھا کہ رڈولف ہس اگر تمھارے گھر اُتر آتے تو تم کیا کرتے۔ بہت سے پیامیوں نے اپنے خطوں میں اس کا جواب دیا ہے بعض جواب بہت دلچسپ ہیں۔ اُن کا خلاصہ ہم نیچے لکھتے ہیں:

عزیزی سُلطان احمد اللہ والا (درجہ ہفتم) تعلیمی مرکز جامعہ لکھتے ہیں۔

"......... میرا سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ ہٹلر سے ملنے کے لئے میں ہس سے اجازت لیتا۔ .... پھر ہمارا خاص ہوائی جہاز برلن پہنچتا ہٹلر کے خاص محل میں اُن سے ملاقات ہوتی ۔ میں پیام تعلیم کا نمونہ پیش کرتا (مفت نہیں) اور کہتا کہ اسے جرمنی کے محکمۂ تعلیم میں منظور کرا دیجئے اور ہر اسکول میں لازمی قرار دے دیجئے .... پیام تعلیم کی اشاعت کئی ہزار بڑھ جاتی اور ایڈیٹر صاحب خوش ہو کر ہمارے نام پیام تعلیم مفت جاری کر دیتے "

عزیزہ ثریا منصور (ضلع الہ آباد) لکھتی ہیں:-

"......... میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میری بُوا نصیبن سب سے پہلے اُن کے پاس پہنچتیں اور وہیں سے چلاتیں کہ اے بی بی میں کہوں آم پکا ہے اور یہاں ایک مُوا مردوا بیٹھا ہے۔ پھر وہ اُن کا نام پوچھتیں۔ اُن کی خیریت اور اُن کے بال بچوں کا حال ضرور دریافت کرتیں۔ مگر وہ جرمنی کا رنگروٹ ان کی بولی کیا سمجھتا۔ بس چپ رہتا اور بُوا نصیبن اُسے چور سمجھتیں اور نوکروں کو بلوا کر پکڑوا دیتیں ...."

عزیزی سید محمد احمد عظیم (درجہ پنجم جامعہ ملیہ، دہلی۔) لکھتے ہیں:۔

"......... میں ان کی ہر طریقے سے خدمت کرتا، اگر انھیں مطالعے کی ضرورت ہوتی تو پیام تعلیم پیش کرتا۔ اگر اُن کے جسم میں چوٹ لگی ہوئی

تو میں ان کو اسپتال پہنچاتا۔ دفتر پیام تعلیم میں اس بات کی خبر کرتا۔ سب پیامی بھائی اور میں مل کر اُن کے جلد سے جلد اچھے ہو جانے کی کوشش کرتے۔ انھیں پیام تعلیم کے اچھے اچھے پرچے پڑھنے کو دے جاتے اور پیام تعلیم کے آئندہ پرچے میں اُن کے مضمون بھی ہوتے ...... "

عزیزی ابرار قدوائی بارہ بنکی سے لکھتے ہیں:

" ...... سُنیے صاحب سب سے پہلے تو میں بے انتہا ڈر جاتا۔ کیوں کہ وہ ایک نازی تھا اور پھر پیرا شوٹ کے ذریعے اُترا ہوا نازی مگر جب بعد میں غلط فہمی دور ہو جاتی تب میں ہی اُن سے درشن کرتا اور انھیں مجبور کرتا کہ میرے مہمان بنیں۔ پھر میں اُن کی زندگی کے مکمل حالات بڑے شوق سے سنتا۔"

محمد یحیٰی صاحب سچے لاج کا خیال ہے کہ ہس اگر اُن کے گھر اُترتا تو وہ تمام دُنیا میں مشہور ہو جاتے سینکڑوں اخباروں میں اُن کی تصویریں چھپتیں مضمون چھپتے اور جانے کیا کیا ہوتا۔ وہ ہس کی مرہم پٹی بھی اور اُسے ناشتے اور کھانے میں خالص ہندوستانی بلکہ بہاری کھانے کھلاتے۔

محمد سلیم الدین فاروقی نے خواب کے ذریعے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر جاسوس ہے۔ چنانچہ ہس اُن کے گھر میں اُترا۔ کہیں پولیس کو خبر ہو گئی۔ اس نے ہس کو گرفتار کرلیا۔ ساتھ ہی انھیں ایک سال کی سزا بھی ہو گئی۔ جب جیل خانے کا دروازہ بند ہوا تو اُن کی آنکھ کھُل گئی اور بس۔

عزیزی جگ جیت سنگھ ۱ جگ سلائی (ٹاٹا نگر) لکھتے ہیں۔

...... اگر ہس ہمارے مکان میں اُترتا تو جس طرح ہٹلر نے گوئرنگ کے بعد میں ہس کو اپنا جانشین بنایا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ میرے گھر نہیں اُترا۔ اگر پیام تعلیم کے دفتر میں اُتر آتے تو مہربانی کرکے اُنھیں یہاں بھیج دیجیے۔ میں اور میرے دوست بھی اس کے درشن کرلیں گے ✽

ڈراموں کی یہ کہانی اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے جب تُم یہ جان جاؤ گے کہ ان کا اثر نہ صرف مدرسے کے لڑکوں تک رہا بلکہ کُلّیہ (کالج) کے طلباء کو بھی شوق ہوا۔ اور تو اور اُستادوں نے بھی ایک ڈراما کھیلا۔ میں اس وقت تک کلّیہ کے لڑکوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ساتھی بھی ایسے تھے جنھیں جامعہ سے سخت لگاؤ تھا۔ ان میں محمد حسین حیدرآبادی تھا عبدالجلیل صاحب ندوی۔ امتیاز حسین خاں صاحب (جو اب یورپ سے فارغ ہو کر آئے ہیں) پیام تعلیم کے مدیر حسین حسّان صاحب، عبدالواحد صاحب سندھی، عبدالکریم صاحب (پشاوری) عبدالوہاب صاحب (سی، پی) ذکر کے قابل ہیں۔ ایک دن کی بات ہے کہ سارے لڑکے ایک کمرے میں جمع تھے امتیاز صاحب نے کہا:۔

"ماسٹر جی ہو جائے ایک ڈراما" مطلب یہ تھا کہ کالج کے لڑکوں سے بھی ڈراما کروائے۔ میں نے کہا

"بڑے لڑکوں کے لئے ایسا ڈرامہ نہیں ہے جس میں عورتوں کا پارٹ نہ ہو"

"تو کیا ہوا موجودہ ڈراموں میں سے کسی میں ایسی ردّوبدل کیجیے جس سے ہمارا کام بن جائے" عبدالکریم صاحب پشاوری نے کہا

"اس وقت تک کالج کے لڑکوں کے لئے خاص طور پر ڈرامے لکھے نہیں گئے تھے۔ بعد میں حیدرآباد دکن کے اساتذہ اور ہماری جامعہ کے خازن محمد مجیب صاحب نے کئی ڈرامے اس مطلب کے لئے لکھے ہیں جن میں عورتوں کا پارٹ نہیں ہے۔ میں اس وقت کیا کرتا آغا حشر کے ایک ڈرامے میں تبدیلی کرکے لڑکوں کے سامنے رکھ دیا۔

پارٹ تقسیم ہوئے۔ ان کو سکھلانے میں معمول سے زیادہ دشواری پیش آئی۔ کوئی تو شرماتا۔ کوئی کہتا آپ بتلاتے جائیے۔ اس وقت تو سنائے دیتا ہوں۔ اصل کام اسٹیج پر دکھاؤں گا" ایک صاحب فرماتے میرا کام ہی کتنا ہے۔ اوروں سے مشق کروائیے

کوئی تھیٹر کی نقل میں زور زور سے بولتا۔ تو کوئی ایسے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے یہ لوگ قابو میں آئے۔ ڈراما تو جیسا کچھ ہوا اُس وقت بڑا مزا آیا جب پیام تعلیم کے مدیر حسین حسان صاحب معمولی عینک لگائے بغل میں اخباروں کا پلندہ لئے عینک میں سے گھورتے ہوئے عدالت میں داخل ہوئے۔ یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہ پیسے والے اخبار کے مدیر ہیں اور ایک مقدمہ میں انھیں گواہی دینی ہے۔ انھیں سکھانے کی ضرورت اس لئے نہ پڑی کہ حضرت سچ مچ میں جیسے تھے ویسا ہی کام دیا گیا تھا کام تقسیم کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہت سہولت رہتی ہے اور نقل مطابق اصل ہو جاتی ہے۔

لوگوں نے کہا " اب تو اُستادوں کو بھی خاموش نہ رہنا چاہیے۔ ایک سال ہوا پروفیسر رواج الدین صاحب نے اُستادوں کے لئے ایک اچھا سا ڈراما لکھا تھا " نکاح بالجبر " پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اُستادوں کو راضی کر لیا۔ خود بھی اس ڈرامے میں کام کیا اوروں کو بھی سکھلایا۔ خود تو " جوتشی " بنے تھے۔ مجھے " مرزا نوشہ " بنایا۔ نیازی صاحب میرے داماد بنے تھے اور کریم اللہ صاحب برادر نسبتی۔ علیم صاحب ارسطو کے شاگرد خجندی بنے تھے۔ کالج سے بھی دو لڑکے لئے تھے۔ انور خاں صاحب کو حکیم جلپی اور نصیر صاحب کو جعفر کا کام دیا گیا تھا۔ پوری شرع سے آخر تک پردے میں رہی اس لئے عورت کی نقل کا جھگڑا نہ رہا۔ مجیب صاحب اداکاروں کے سجانے (میک اپ) میں کمال رکھتے ہیں۔ انتخاب اچھا تھا۔ لوگ دیکھتے ہی رہے علیم صاحب نے عربی میں بی اے کیا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق لفظوں کو ٹھیک ٹھیک بولنے کا ملکہ تھا۔ پارٹ خاصا طویل تھا۔ خوب یاد کیا تھا۔ نقل اس بات کی تھی کہ کوئی شخص بحث میں غلط لفظ بولے تو یہ اس کی خبر لیتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے گفتگو میں " ٹوپی کی شکل " کی بجائے " ٹوپی کی صورت " کہہ دیا۔ یعنی " شکل کی بجائے صورت " کا استعمال کیا۔ اس پر زور سے کہنے لگے۔

" عاصی کا دعویٰ ہے کہ ہم کو ٹوپی کے لئے " شکل " کا لفظ استعمال کرنا چاہیے نہ کہ " صورت " کا " صورت " اور " شکل " میں فرق یہ ہے کہ " صورت " کا لفظ ذوالحیات کے اجسام کے لئے یعنی (جان والوں کے لئے) اور " شکل " کا لفظ غیر ذی روح اشیاء کی ہئیت خارجی کے لئے یعنی بے جان کے لئے) استعمال ہوتا ہے اور چونکہ ٹوپی جوہر حیات سے معرّیٰ ہے یعنی بے جان۔ لہٰذا واجب آیا کہ ہم ٹوپی کی شکل کہیں نہ کہ ٹوپی کی صورت .... " اتنے میں وہ شخص بھاگ گیا۔ دروازے کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا

"اے جاہل مطلق شخص۔ یاد رکھ کہ تجھے یہ لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا یہ لفظ خود ارسطاطالیس کے الفاظ ہیں۔ ارسطاطالیس کے ....

تو اگر چاہے تو اس کی تصنیف کبیر "المقالات فی الصفات الاشیا" میں بعینہٖ یہی الفاظ تبلا سکتا ہوں"۔ غرض کہ اس دن کے ہیرو دراصل یہی تھے

کریم اللہ صاحب کے ذمے ایک جگہ مجھے سزا دینے کا کام تھا۔ یہ چھوٹا سا اور آسان پارٹ انھوں نے اس لئے لیا تھا کہ وہ مجھے تنگ کریں۔ تھے بھی پہلوان میں نے مجیب صاحب سے کہا کہ کریم اللہ صاحب مجھے سچ مچ سزا دیتے ہیں۔ اس حصے کی مشق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں سیکھنے سکھانے کی کون سی بات ہے۔ کریم اللہ صاحب کہتے تھے "یہ پارٹ میں اسی صورت میں کروں گا جبکہ اس کی مشق بھی ہوا کرے"۔ ڈرامے کے دن تو غضب ہو گیا۔ سچ مچ مجھے مارنے لگے۔ میں چپکے سے کہتا بھی کہ چوٹ لگ رہی ہے مگر یہ مانتے نہیں تھے۔ تماشائی تھے کہ لوٹ پوٹ کر ہنس رہے تھے۔ میں اسٹیج سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجیب صاحب اندر سے آواز دے رہے تھے "اگلا کام جاری رکھئے۔ اگلا کام"

.... یہ حضرت بڑی مشکل سے آگے بڑھے کچھ اور بیان کروں تو بات لمبی ہو جاتی ہے۔ اس سال تمھارے ساتھیوں نے جو ڈرامے کھیلے ان کا تو ابھی ذکر ہی نہیں آیا ہے۔

پچھلے سال یہ کام جو ہوا تو پہلے سے کسی سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق نہ تھا اور ہوتا ہی کیسے۔ جب ایک چیز چل پڑے تو اس کے لئے قاعدے قانون بنانے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور کاموں کا ہرج نہ ہونے کے لئے اتالیق صاحبان سے مل کر یہ طے کیا کہ ڈرامے سال بھر میں صرف دو ہوں گے ایک تو "یوم تاسیس" پر دوسرے "عید" پر۔ چنانچہ اس سال بچوں نے ان ہی دو موقعوں پر صرف دو ڈرامے کھیلے یہ سچ ہے کلیہ کے طلبا اور استادوں کے ڈرامے کا ذکر نکل آیا۔ آؤ اب ساتھیوں کے ڈراموں کو دیکھیں (باقی)

بیج اور پھل کس طرح پھیلتے ہیں

محمد ریاض الحسن صاحب قریشی ایم۔ ایس، سی۔ عثمانیہ

۲

سنہا:۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے میرے ایک دوست مغربی ملکوں کے سفر سے واپس آئے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جزائر غرب الہند میں ایک درخت ہوتا ہے سینڈ باکس۔ اس کے پھل بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ان پھلوں میں بیج بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ پھل پک جاتا ہے تو پھٹ جاتا ہے۔ پھٹنے کی آواز پستول کے فیر سے کم نہیں ہوتی۔ کوئی آدمی یا جانور ان پھلوں کے پھٹنے میں رکاوٹ ڈالے تو زخمی ہو جاتا ہے۔

انور:۔ عجیب درخت ہے! مگر تم نے دیکھا! بیجوں کو ادھر ادھر پھیلانے کے لئے قدرت نے کیسے کیسے انتظام کئے ہیں۔ دور کیوں جاؤ گل مہندی کو دیکھ لو۔ اس کی پکی ہوئی پھلی کو چھوتے ہی بیج دور جا کر گرتے ہیں۔

اچھا دیکھو چند سال پہلے جب ہم تم سٹی کالج (حیدرآباد) میں پڑھتے تھے تو کالج کے چمن میں حوض کے پاس ایک قسم کی پھلی کے پودے تھے تمھیں یاد ہوگا اس پودے کی خشک پھلیاں جمع کر کے ان پر پانی ڈالا کرتے تھے اور پھلیاں چٹخ جاتی تھیں اس وقت تو یہ محض ایک تماشا اور دلچسپی تھی مگر اب معلوم ہوا کہ بیجوں کے پھیلنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی پھلیاں ہیں جنھیں چٹخنے کے لئے نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سنہا:۔ اچھا انور ایک بات بتاؤ۔ یہ سنگھاڑے کنول اور دوسرے پانی کے پودوں کے بیج کس طرح پھیلتے ہیں۔

انور:۔ سنگھاڑے اور کنول کے بیج پانی کے اندر ہی پھیلتے ہیں۔ سنگھاڑے کے دونوں طرف نوکیں سی ہوتی ہیں۔ جب اس پودے کے بیج پک جاتے ہیں تو یہ اس نوک دار سرے کے رخ زمین پر گرتا ہے اور زمین پر گر کر پیدا ہوتا ہے۔

ساحلی درختوں کے بعض بیج ریشے دار پوست سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ان میں ہوا بھی بھری ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ ہلکے ہو جاتے ہیں اور پانی میں گرنے کے بعد ڈوبتے نہیں مثلاً ناریل کے پھل کا اوپر کا حصہ ریشے دار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے پھل ہلکا ہو جاتا ہے اور پانی پر تیرتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ جا پہنچتا ہے۔ پھل کا اوپر کا خول بالکل بند ہوتا ہے۔ پانی کو اندر نہیں پہنچنے دیتا چنانچہ ناریل جب درخت سے سمندر میں گرتا ہے تو ہفتوں پانی پر تیرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں جا پہنچتا ہے۔ وہاں یہ کنارے جا لگتا ہے اور درخت پیدا کرتا ہے۔ ساحلوں پر ناریل کے درختوں کے جو جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے ہیں تو یہ انھی بیجوں کے پانی کے ذریعے پھیلنے کا نتیجہ ہیں۔

سنہا:۔ اس وقت ایک چیز یاد آگئی۔ ہمارے محلے میں جو ایک مندر ہے، پرانا سا، اس کی دیوار پر پرسوں میں نے پیپل کا ایک چھوٹا سا درخت دیکھا مجھے تو حیرت ہوگئی کہ یہاں پیپل کا بیج کیسے پہنچ گیا۔

انور:۔ بھئی خوب سوال کیا۔ یہی بات میں ابھی تمھیں بتانے والا تھا۔ بات یہ ہے کہ بعض بیج جانوروں کے ذریعے بھی پھیلتے ہیں۔ مثلاً بعض درختوں کے پھل پرند بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ان پھلوں کے بیج سخت ہوتے ہیں۔ پرندے جب بیٹ کرتے ہیں تو یہ بیج ویسے کے ویسے ہی نکل آتے ہیں۔ اور کھاد اور پانی ملتے ہی اُگنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیپل کا بیج بھی انھی پرندوں کی بدولت مندروں اور پرانی عمارتوں پر پہنچ جاتا ہے اور اسی طریقے سے اُگ آتا ہے۔

اچھا بھائی سنہا ذرا ادھر آؤ کھڑکی میں سے دیکھو۔ وہ سامنے نیم کا درخت نظر آ رہا ہے۔ اس پر ایک بیل بھی چڑھی ہے۔

سنہا:۔ اسے شاید قرض دار کی جل بیل کہتے ہیں۔

انور:۔ ہاں یہ قرض دار کی بیل ہے۔ اس کے بیج پرندوں کی چونچ سے چمٹ جاتے ہیں۔ پرند ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے چونچ کو کسی درخت سے رگڑتے ہیں۔ اب یہ بیج درخت سے چمٹ جاتے ہیں اور مناسب حالات میں اُگ آتے ہیں۔

پرند تو ان بیجوں کے لئے صحیح رحمت ہیں۔ پانی کے بعض بیج اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ پانی پر اُن کے چھوٹے چھوٹے گچھے بن جاتے ہیں جب آبی پرندے غذا کی تلاش میں پانی پر تیرتے ہیں تو یہ اُن کے پروں کو چمٹ جاتے ہیں۔ یہی پرند جب دوسرے تالاب میں جاتے ہیں تو بیج پانی

میں بہ جاتے ہیں تو گویا یہ اُن پرندوں کی بدولت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔

سنیہا:۔ اور یہ آبادی سے کوسوں دور شریفے (سیتاپھل) نیم اور املتاس کے جنگل کے جنگل کھڑے ہیں تو ان کے بیج وہاں کیسے پہنچ گئے۔

انور:۔ یہ کوؤں اور بندروں کی کارگزاری ہے۔ جانور بعض پھلوں کو بیج سمیت کھا جاتے ہیں سخت بیج پوست سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہضم نہیں ہوتے۔ پاخانے میں جوں کے توں نکل جاتے ہیں اور پھیل جاتے ہیں۔ کیکر یا ببول کا بیج بکری کے پیٹ میں سے ویسے کا ویسا ہی نکل آتا ہے۔ ڈارون اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

"اُفوہ! ایک بیج ۲۲ گھنٹوں تک چڑیا کے معدے میں رہنے کے بعد اُگ سکتا ہے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس قدر فاصلہ طے کر سکتا ہے" (باقی)

قیصر جرمنی کا نام تم نے سُنا ہوگا۔ کہتے ہیں پچھلی بڑی لڑائی انگریزوں کے خلاف اسی نے شروع کی تھی پچھلے مہینے ۴ جون کو یہ اس دنیا سے چل بسا۔ پچھلی بڑی لڑائی کے بعد اسے تخت وتاج سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔

سابق قیصر جرمنی ہوہن زولرن خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اسے ولیم ثانی بھی کہتے تھے۔ اُس نے جرمنی پر تیس سال حکومت کی۔ اِن تیس سالوں میں پچھلی بڑی لڑائی کے ۴ سال بھی شامل ہیں۔

قیصر جرمنی ۲۷ جنوری ۱۸۵۹ء کو برلن میں پیدا ہوا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پیدائش کے دن سے خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی ماں وکٹوریہ پرنس رائل آف انگلینڈ ملکہ وکٹوریہ کی لڑکی تھی۔ فریڈرک شاہ جرمنی کی اولاد میں یہی سب سے بڑا لڑکا تھا۔

قیصر کی تعلیم وتربیت بچپن ہی سے بہت عمدہ پیمانے پر ہوئی۔ فوجی تعلیم بھی بہت اہتمام کے ساتھ دی گئی ہاں سیاست اور خارجی یعنی دوسرے ملکوں کے معاملات سمجھنے کی تعلیم اُسے اچھی طرح نہ ملی۔ اسی لئے وہ ایک کامیاب سیاست داں نہ بن سکا۔

۱۸۸۸ء میں فریڈرک شاہ جرمنی کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ قیصر ۲۹ سال کی عمر میں بادشاہ بنا ۲۷ فروری ۱۸۸۱ء میں اس کی شادی پرنسس آگسٹس وکٹوریہ آف شلیوش ہول اسٹائن سے ہوئی اس سے سات اولادیں ہوئیں۔ چھ لڑکے ایک لڑکی۔ انتقال کے وقت اُن میں سے اکثر موجود تھے۔ پوتوں کی ایک بڑی تعداد اُن کے علاوہ ہے۔ ان میں سے ۲۲ تو اس وقت جرمن فوجوں کے ساتھ فوجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے تو بسمارک سے اس کی ان بن ہوئی۔ چنانچہ دو ہی سال بعد بسمارک نے چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ بسمارک کی علیحدگی کے بعد اسے اپنے اختیارات کو اور بڑھانے کا موقع ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ یورپ میں جرمنی سب سے بڑی سلطنت ہوجائے اور خوب

طاقت ور بن جائے۔ ترکی کا سفر اُس نے اسی مقصد سے کیا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ جرمنی سے عراق تک ریلوے کا سلسلہ قائم ہوجائے۔ مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

انگریزوں سے قیصر کے تعلقات کبھی اچھے نہ رہ سکے۔ پچھلی بڑی لڑائی کا ذمے دار بہت سے لوگ قیصر ہی کو بتاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس میں شک ہے۔ مگر یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ موجودہ بڑی لڑائی پچھلی بڑی لڑائی کا نتیجہ ہے۔

پچھلی بڑی لڑائی میں فوجوں کی سرداری وہ خود کرتا تھا بعد میں یہ اہم عہدہ اس نے ہنڈن برگ کے سپرد کردیا تھا۔ ۱۹۱۸ء قیصر کے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال جرمنی میں ایک بے چینی سی پھیلنے لگی اور قیصر کی عزت لوگوں کی نظروں میں کم ہونے لگی اسی سال اکتوبر میں اس نے اپنے لڑکے شہزادہ ماکس کو امپیریل چانسلر مقرر کیا جس وقت ولسن (صدر جمہوریہ امریکہ) نے قیصر کو صلح کے معاملے میں انگوٹھا بتایا تو شہزادہ ماکس نے ایشتاغ (جرمن پارلیمنٹ) کی مدد سے قیصر سے تخت و تاج سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کیا۔ نومبر تک قیصر دست بردار نہ ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات بہت تیزی سے خراب ہونے لگے۔ آخر ۹ نومبر کو شہزادہ ماکس نے اعلان کیا کہ قیصر تخت و تاج سے دست بردار ہوجائیں گے اور ولی عہد اُن کا جانشین نہ ہوگا۔ اس طرح بے چارا قیصر بجائے بادشاہ کے جرمنی کا معمولی شہری بن گیا۔ وہ ہالینڈ چلا گیا اور وہاں اس نے ۲۰ سال تک آرام سے زندگی بسر کی۔ اس نے تخت و تاج کو دوبارا حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ہاں اس کے گھر میں شاہی آداب کا اب تک لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ ہر وقت اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تھا باغبانی، اخبار بینی، خط کتابت وغیرہ اب یہی اس کے مشغلے تھے۔ موجودہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے وہ وہاں منتقل ہوگیا تھا۔ اب اس کی عمر ۸۰ سال ہوگئی تھی۔ اُسے دل کا کوئی مرض ہوگیا تھا۔ یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور بے چارا موجودہ لڑائی کا نتیجہ دیکھنے کی حسرت دل میں لے گیا۔

پہیلیاں

۱۔ چاند سا چکلا پان سا پتلا۔ پوچھو تو پوچھو نہیں تو آنکھ میں تنکا۔ (پاپڑ)

۲۔ ایک ڈبیہ میں دو رنگ۔ (انڈا)

جناب ایڈیٹر صاحب! اس روز آپ نے تو گلمرگ کا رُخ کیا اور ہم نے بھی کشمیر کی ایک بہت ہی اچھی جگہ کی سیر کر ڈالی سُنیے وہ کیسے۔ آپ سے رخصت ہونے کے بعد سیدھا اپنے گھر کی طرف چلا۔ راستے میں تھوڑی ہی دُور پر ایک بے تکلف دوست مل گئے۔ کہنے لگے چلو شوپیاں چلیں۔ وہ اتنی جلدی میں تھے کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ یوں سمجھئے کہ گھسیٹتے ہوئے لاری تک لائے ٹکٹ خریدے اور بس لاری کے اندر۔

سری نگر سے شوپیاں کا لاری کا کرایہ عموماً ۱۲؍ ہے۔ سواریاں کم ہوں تو کم بھی ہو جاتا ہے مگر آج میلا تھا اس لئے ایک ایک روپیہ دینا پڑا۔ شوپیاں سری نگر سے ۴۳ میل ہے۔ ہم لاری میں بیٹھ کر پان پور کاکا پورا وغیرہ ہوتے ہوئے شوپیاں پہنچے کشمیر کا یہ بہت بڑا قصبہ ہے۔ یہاں کے ڈاک خانہ پولس اسٹیشن کے علاوہ ایک مڈل اسکول بھی ہے شوپیاں کا تمام علاقہ آباد ہے۔ یہاں کے لوگوں کی حالت بھی کشمیر کے دُوسرے علاقوں سے بہتر ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی زمین دُوسری جگہوں سے زیادہ زرخیز ہے۔ پھلوں کے باغات بھی بہت ہیں یہاں کا سیب ہندوستان بلکہ دُوسرے مُلکوں میں بھی مشہور ہے۔ گھی بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

رات کو ہم یہیں شوپیان میں ٹھہرے، صبح کو اہرابل جانا تھا۔ میں تو پیدل جانا چاہتا تھا۔ ایسی جگہوں پر پیدل ہی چلنے میں لُطف ہے۔ مگر ہمارے ساتھی سمجھے کہ میں تکلف کر رہا ہوں اور دو گھوڑے کرائے پر لے لئے۔ اہرابل شوپیان سے سات میل ہے۔ تانگے یا موٹر کا راستہ نہیں ہے بس پیدل یا گھوڑوں پہ جانا پڑتا ہے۔

خیر صاحب ہم شوپیان سے روانہ ہوئے۔ شروع میں ایک میل تک سڑک ایک دریا کے کنارے کنارے گئی ہے، پھر ایک پُل پار کرنے کے بعد راستہ جنگل میں سے ہو کر گیا ہے۔ گھنے درختوں میں سے نکلتے ہی دائیں طرف ایک چوڑی پتھریلی زمین ملی یہ اصل میں ایک نالا ہے۔ برسات میں خصوصاً طوفان

آجاتا ہے تو یہ نالا کوئی نوے فٹ چوڑا ہوجاتا ہے۔ اور بڑے بڑے درخت، مکان، بڑی بڑی چٹانیں غرض جو چیز بھی راستے میں آجاتی ہے بہالے جاتا ہے یہاں سے ایک میل آگے ہمیں ایک گاؤں ملا۔ ساؤن یہاں کی خوب صورتی مشہور ہے۔ بھولے بھالے چہرے، بادامی آنکھیں، خوب صورت اور سُبک ناک نقشہ۔ یہاں سے کوئی ایک میل آگے جانے کے بعد ایک اور پہاڑی ملی۔ اس پر بہت گھنے درخت ہیں۔ جنگلات کے محکمے نے اس جنگل کے درمیان سڑک نکالی ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی ہے۔ اس سڑک کے بعد کوئی ایک میل تک چڑھائی اور پھر اتنا ہی اُتار تھا۔ یہاں اتار پر ہمیں ایک پُل ملا، یہ کوئی ۴۰ فٹ لمبا تھا۔ نیچے ایک نالا بہتا تھا۔ یہ وہی نالا ہے جو اور آگے آبشار کی صورت میں گرتا ہے۔ اسی کو دیکھنے تو ہم آئے ہیں۔

جس پہاڑی سے ہم ابھی ہوکر آئے تھے اور اس کے سامنے کی پہاڑی دونوں غیر معمولی طور پر سرسبز و شاداب تھیں۔ ان کے بیچ میں نالا اتنے زور سے بہتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ذرا آگے گئے تو اس نالے کے پانی کی وجہ سے یا جانے کیا بات تھی کہ ہمیں ٹھنڈ سی لگنے لگی۔ یہاں ایک اور بات دیکھنے کی ہے۔ کوئی ۲۰ فٹ نیچے اس نالے نے دونوں پہاڑیوں کو کچھ اس طرح کاٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہزاروں سنگ تراشوں نے برسہا برس کی محنت کے بعد اس دہاڑتے شیر کے گذرنے کے لئے آمنے سامنے دو فصیلیں بنائی ہیں۔

ہم نے پُل پار کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ داہنی طرف ایک راستہ دکھائی دیا۔ یہ راستہ نالے کی طرف جاتا تھا۔ شاید اس لئے بنایا گیا ہے کہ لوگ آسانی سے نالے کا پانی لاسکیں۔ اس راستے سے ہم ذرا نیچے کی طرف گئے تو ایک بڑا سا گول پتھر نظر آیا کوئی ۵۰ فٹ گولائی کا ہوگا۔ کہتے ہیں یہ پانڈوں کے زمانے کی یادگار ہے۔ اسے وہ کسی خاص موقع پر استعمال کرتے تھے۔

اب ہم واپس پُل کی طرف گئے۔ پُل کو پار کرکے گھوڑوں کو ایک طرف چھوڑا اور ایک راستے پر ہولئے۔ راستہ کیا تھا۔ ہموار پتھر بچھے تھے۔ کوئی ۶۰، ۷۰ گز اوپر جاکر پھر ایک سڑک ملی، یہ آبشار تک جاتی تھی۔ وہاں بیٹھنے کے لئے دو ہموار پتھر رکھے تھے کوئی ۹۰ یا ۱۰۰ فٹ مُربع ہوں گے۔ ہم ان پتھروں پر بیٹھ گئے۔ کھانے پینے کا کچھ سامان لائے تھے، ذرا سستانے کے بعد کھایا پیا۔ اس وقت دھوپ کافی تیز تھی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مینھ کی ننھی ننھی پھوار سی آنے لگتی تھی۔ یہاں سے ذرا اور آگے بڑھے تو وہی نالا جسے ہم کوئی ۳۰۰ گز پیچھے

چھوڑ آئے تھے اور بھی زور شور سے بہہ رہا تھا۔
یہاں سے یہ نالا دو چھوٹی آبشاروں کی صورت میں
نیچے گر رہا تھا۔ دونوں آبشاروں کا پانی کوئی ۵۰ فٹ
تک ایک ساتھ بہہ رہا تھا اور پھر جن پتھروں پر ہم
بیٹھے تھے اُن کی داہنی طرف ایک بڑے آبشار کی شکل
میں بہت نیچے گر رہا تھا۔ یہی اہربل ہے۔ کشمیر میں سب
سے بڑا آبشار۔ یہاں آکر اور آبشار دیکھ کر جو لطف
آیا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اتنی کڑی
محنت اُٹھا کر منزل تک پہنچے ہوں۔ ہم تو سچ مچ بالکل
مست ہو گئے تھے، آنکھوں کے سامنے سوائے دُھند
کے کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ نیچے جہاں یہ آبشار گرتا ہے
ایک بڑا چوڑا نالا بہتا ہے۔ ہم نے نیچے کی طرف دیکھا
تو سوائے بادلوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نالے کے دونوں
کناروں پر دھنک سی پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔
آبشار کا پانی اتنی اونچائی سے گرتا ہے کہ پانی کی چھینٹیں
بڑی اونچی اُڑتی ہیں۔ اتنی اونچی کہ ہم جس وقت پتھر
پر بیٹھے تھے انہیں مینھ کی پھوار سمجھ رہے تھے۔

ابھی ہم اس نظارے میں محو تھے کہ آبشار کے
پانی کے ساتھ ایک شہتیر گرتا ہوا نظر آیا۔ یہ کوئی
۳۰ فٹ لمبا اور ۵ فٹ گولائی کا ہوگا۔ یہاں جنگلوں
سے لکڑی کاٹ کر اسی طرح اوپر پہاڑوں سے میدان
میں لاتے ہیں۔ یہ شہتیر نیچے گرتے ہی فوراً غائب ہو گیا
ہم دونوں حیران کہ یا اللہ اتنا بڑا شہتیر کہاں چلا گیا۔
ہم برابر ٹکٹکی لگائے نیچے کی طرف دیکھتے رہے۔ کوئی
۲۰، ۲۵ منٹ کے بعد شہتیر پانی میں سے اُبھرا
ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُفوہ! اتنا گہرا پانی
پانی کے اتنی اونچائی سے گرنے کی وجہ سے نیچے بہت
گہرے غار ہو گئے ہیں۔

یہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر دیر بہت
ہو گئی تھی۔ مجبوراً واپس آگئے اور دوسرے دن شام
کو سری نگر پہنچ گئے۔ آپ کے پیامیوں کو یہ سیر پسند آگئی تو
آیندہ اور کسی سیر کا حال لکھنے کی کوشش کروں گا۔

دلچسپ کھیل

تمھارے بھائی بہن صابن کے بلبلے ہوا میں اُڑاتے ہوں گے۔ صابن کے پانی میں کھانڈ یا گلیسرین ملا دو
تو بلبلے بہت بڑے بنیں گے۔ کبھی کبھی تو یہ غبارے جیسے بڑے بن جاتے ہیں۔

اب سے کوئی دو مہینے پہلے اخباروں میں کریٹ کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ آتی تھیں۔ جرمنی یہاں اپنی فوجیں ہوائی جہاز پر لایا اور ہالیمی کے ہوائی اڈے میں اور آس پاس انھیں پیراشوٹ کے ذریعے اُتار دیا۔ یونانی اور انگریزی فوجوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر جرمنی کے مقابلے میں اُن کے پاس ہوائی جہاز کم تھے۔ فوج بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے انگریزوں نے یہ جزیرہ خالی کر دیا۔

کریٹ بحیرۂ روم میں یونان کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے۔ اس کی شکل چھری کے دندانے دار پھل جیسی ہے۔ ایک بہت پرانی تاریخ میں لکھا ہے کہ کریٹ کی شکل بچھو کی طرح ہے۔ بچھو کو عربی میں عقرب کہتے ہیں۔ اسی لئے عربوں نے اس کا نام عقربطیش رکھا تھا، جو بعد میں اقریطش ہو گیا۔

بحیرۂ روم کے جزیروں میں رقبے کے اعتبار سے کریٹ کا نمبر پانچواں ہے۔ یہ ایک سو ساٹھ میل لمبا ہے۔ چوڑائی کم سے کم سات اور زیادہ سے زیادہ ۵۴ میل ہے۔ رقبہ ۳۱۹۹ مربع میل ہے۔ جزیرہ تقریباً کل کا کل پہاڑی ہے۔ سب سے اونچا پہاڑ کوہ ایڈا ہے۔ یہ سب پہاڑیاں سردیوں میں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کوہ ایڈا کا برف گرمیوں میں بھی مشکل سے پگھلتا ہے۔

کریٹ کا ساحل بہت ٹوٹا ہوتا ہے۔ لیکن سوائے سودا بے کے یہاں کوئی اچھی بندرگاہ نہیں۔ اور اگر بہار کے موسم میں ٹھنڈی ہوا چلنے لگے تو تمام شمالی بندرگاہیں، سودا بے اور کریٹ کا پایہ تخت کینیا بھی بے کار ہو جاتے ہیں۔

کریٹ کا شمار دُنیا کے خوب صورت جزیروں میں ہے۔ بعض وادیاں اور پہاڑیاں تو اس قدر خوب صورت ہیں کہ یورپ بھر میں کوئی جگہ اتنی خوب صورت نہیں۔ جنوبی ساحل کے منظر خصوصاً بہت خوب صورت اور دل کش ہیں۔

کریٹ یونان کے مقابلے میں بہت زرخیز ہے۔ خاص پیداوار زیتون اور گیہوں ہے۔ زمین اٹلی کی زمین

سے ملتی جلتی ہے۔ پیداوار بھی ایک جیسی ہے مگر یہاں کے لوگ اٹلی والوں سے بہت مختلف ہیں۔

یہ جزیرہ کچھ ایسی جگہ واقع ہے کہ ہمیشہ سے اسے بہت اہمیت حاصل رہی ہے، پرانے زمانے میں رومی سلطنتیں مشرقی بحیرہ روم پر حکومت کرنے کے لیے اس

علاقوں کے ساتھ یہ جزیرہ بھی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا ۱۹۱۳ء میں جزیرے والوں نے اپنی خوشی سے اسے یونان کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

کریٹ کی اہمیت آج کل لڑائی میں بھی اتنی ہی ہے جب جرمنی نے کریٹ پر قبضہ کر لیا تو انگریزوں کے ایک

پر قبضہ کرنا بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ اسلام کے شروع زمانے میں اسے عربوں نے یونانیوں سے چھین لیا پھر یہ بازنطینیوں کے ہاتھ میں آیا۔ بازنطینیوں کے بعد وینس کی حکومت کا اس پر قبضہ رہا۔ پھر ترکوں کی اس پر حکومت رہی۔ ترکی حکومت کم زور ہوئی تو دوسرے

پچھلے لڑائی کے وزیر نے کہا کہ "کریٹ انگریزوں کے قبضے میں ہوتا تو مغربی صحرا کی انگریزی فوجوں کی اچھی طرح حفاظت ہو سکتی تھی اور اب دشمن کے قبضے میں چلے جانے سے مغربی صحرا خصوصاً سوئز خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس طرح کے خیالات ایک اور ممبر پارلیمنٹ نے بھی ظاہر کیے

میرے پاس امریکہ سیلون، جرمنی کے ٹکٹوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مبادلہ کرنے والے بھائی ہندوستانی دیسی، بڑی قیمتوں اور دیسی ریاستوں خصوصاً بھوپال، جے پور، حیدرآباد دکن کوچین، میسور اور اندور وغیرہ کا ٹکٹ بھیجیں۔ نئے جمع کرنے والے شوقینوں کی بھی مدد کر سکتا ہوں خط جوابی ہو۔

نقی احمد سید متعلم درجہ نہم
گورنمنٹ انٹر جوبلی کالج۔ لکھنؤ

بچوں کی نظمیں

پیارا طوطا

ثریا بانو، عمر ۹ سال ۔ ردولی

ہم نے پنجرا ایک خریدا | اچھا اچھا پیارا پیارا
اس میں لا کر طوطا رکھا | تھا طوطا وہ بہت ہی اچھا
سارا دن وہ رٹتا رہتا | آتا آتا ۔ آتا آتا
ہر دم کہتا ثریا بانو | جلدی ہمارا کھانا دے دو
آؤ ہم تم مل کر کھائیں | کھائیں اور پھر جی بہلائیں
اچھے اچھے قصے سناتا | بات بات پر ہمیں ہنساتا
اک دن بلی نے جو دبوچا | میں چلائی پیارا طوطا

کوئل

ایس۔ اے۔ بشر، گورکھپوری

کوئل کوکو کرتی آئی | شور مچاتی گاتی آئی
آم کی ڈال پہ بیٹھ گئی وہ | اچھے گانے سنانے لگی وہ
احمد، انور، ذاکر دوڑے | عصمت اور مظاہر دوڑے
پنجرا احمد گھر سے لائے | تھوڑا پانی بھر کر لائے
پنجرا پیڑ کے نیچے رکھا | سانس کو اپنے روکے رکھا
لیکن کوئل آئی کیوں کر | خود پہ مصیبت لائی کیوں کر
احمد، ذاکر گھات سے نکلے | بدر، مظاہر ساتھ ہی نکلے
مل کے لگے سب آگے بڑھنے | یعنی لگے سب پیڑ پہ چڑھنے
لیکن کوئل پھر سے بھاگی | اڑ کر جان بچا کر بھاگی
اڑتے اڑتے کوئل بولی | اس نے زباں یوں اپنی کھولی
کام سمجھ کر خوب کرو تم | اور بڑوں کی رائے بھی لو تم

جاگ ذرا او سونے والے

سلیم الدین شمیم جالنوی

چین کی نیند میں سونے والے | اپنی دنیا کھونے والے
تیرے دل میں جوش نہیں | تجھ کو اپنا ہوش نہیں
جاگ ذرا او سونے والے
تیرے ساتھی سارے جاگے | اپنے اپنے کام پہ بھاگے
کام ہے تیرا آگے بڑھنا | کام ہے تیرا لکھنا پڑھنا
جاگ ذرا او سونے والے
اٹھ کر تو ایک باغ لگا دے | حب وطن کے پودے اگا دے
تن من دھن سب اس میں کھپا دے | قوم کا جھنڈا اونچا اڑا دے
جاگ ذرا او سونے والے
نغمہ آزادی کا سنا دے | سوتے ہوں جو ان کو جگا دے

غفلت کے پردے کو ہٹا دے | حق کی راہ پر جان مٹا دے

جاگ ذرا او سونے والے

کاکا[1] رانی

سید محمد یحییٰ۔ پٹنہ

ننھی سی میری بیٹی۔ منّا سا لعل میرا
تو دور مجھ سے کیوں ہے؟ آ، دیکھ حال میرا

کونے میں تیرا چھپنا۔ آنگن میں تیرا چلنا
زینے پہ تیرا گرنا۔ آنکھوں میں سب ہی پھرنا

مٹی اٹھا کے منہ میں چپکے سے تیرا رکھنا
پھر کنکھیوں سے تک کر اخفائے راز کرنا

ہنیا جو پک گیا گر جھٹ بھوک یاد آئی
ابّو[2] کو پہلے دعوت دے کر پکار لائی

منّا سا ہاتھ اٹھ اٹھ کر منہ تلک جو آیا
روٹی ہو یا کہ چاول گالوں پہ خوب چپٹا

سالن میں بھیگے دانے کچھ گرد میں گرے ہیں
کچھ گود سے ڈھلک کر آگے بکھر گئے ہیں

کھانا یہ اک مہم تھا امّی بھی دوڑی آئیں
منہ ہاتھ خوب دھویا پانی پہ پانی لائیں

دودھو کا وقت آیا بوتل کی کھوج ڈالی
چسنی لگائی منہ میں کر دی وہ جلد خالی

گاڑی پہ منّا بابو[3] کو ساتھ لے کے جانا
گدی تمام بھیگی اور بچیہ بولی چھی یا

ننھا سا میرا سورج منّا سا چاند میرا
دونوں نے دور رہ کر گھر کر دیا اندھیرا

امّی کی دونوں آنکھیں دونوں سے ہیں منوّر
اور ان کی یاد میں ہیں آنکھیں میری ہوئیں تر

دونوں کے فوٹو گرچہ آنکھوں کے فریم میں ہیں
جذبات قلب لیکن مضطر پریم میں ہیں

آؤں گا جلد بیٹی گڑیا سی کاکا رانی
ابّو کی خاطر اس دن ایک کام کرنا یعنی

امّی سے مانگ کر تو بھر پیٹ دودھ پینا
موہن کو ساتھ لے کر پٹنہ اسٹیشن آنا

ہوائی جہاز

علی احمد [illegible] دری۔ کلکتہ

بتاؤ تو ہم کو یہ بندہ نواز | کہ دیکھا ہے تم نے ہوائی جہاز
وہ اڑتا ہے لیکن پرندہ نہیں | کسی پیڑ کا کوئی پتہ نہیں
پتنگا ہے وہ اور نہ ہی وہ پتنگ | نہیں اس کو اڑنے میں لیکن درنگ
نہ وہ بھوت ہے اور نہ شیطان ہے | نہ اس میں ہماری طرح جان ہے
جو نزدیک ہو چیل جیسا بنا | جو اڑ جائے اونچا پرندہ بنا
زمانے میں ہے اس کی تیزی کی دھاک | وہ جاتا ہے کر ولایت کی ڈاک
نہیں عام ہر چند اس پر سفر | یہ کرنے لگے ہیں مسافر سفر
لڑائی میں بھی خوب آتا ہے کام | یہ دشمن پہ کرتا ہے جینا حرام
یہ عالی دماغوں کی ایجاد ہے | اس ایجاد سے ان کا دل شاد ہے
ہوا پر بھی ہے ان کے قبضے کا شور | یہ سب کچھ ہے علم اور حکمت کا زور
ترقی کا ہے اہل یورپ کا راز | جسے کہتے ہیں سب ہوائی جہاز
خدا نے دیا ہے تمہیں بھی دماغ | لگاؤ کوئی تم بھی حکمت کا باغ

[1] میری بھتیجی کا نام ہے [2] کاکا سانی مجھے کہتی ہے [3] میرا بھتیجا

ثریا کا خواب

ح۔ م۔ اسلم۔ سکریٹری اُردو سوسائٹی پٹنہ

رات کا وقت تھا۔ تمام صحن چاند کی روشنی سے دودھ جیسا سفید نظر آ رہا تھا۔ ثریا صحن میں ایک کرسی پر لیٹی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس اس کا سفید جما بیٹھا خر خر کر رہا تھا۔ پاس ہی بجلی کی روشنی میں اس کی بڑی آپا بلقیس ایک چھوٹی سی جلد والی خوب صورت کتاب پڑھ رہی تھیں۔ آج مدرسہ بند تھا اور ثریا تمام دن اپنے آپ کو کچھ...... بے کار سا محسوس کر رہی تھی۔ شام کو اس نے اپنا گڑیوں کا کمرہ صاف کیا تھا ہفتوں سے گرد میں پڑے پڑے گڑیوں کے کپڑے میلے ہوگئے تھے اور کمروں میں خاک اڑ رہی تھی۔ صفائی کرتے وقت بی ثریا گڑیوں گڈوں کو کچھ ملامت اور کچھ نصیحت بھی کرتی جاتی تھیں۔ اپنے سب سے بوڑھے گڈے سے بولیں: "بس لیٹے رہتے ہو۔ ذرا اپنے گھر کی صفائی کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔ میں کہاں تک تم لوگوں کا خیال رکھوں۔ اپنا پڑھنا، لکھنا ہے۔ کل اُستانی جی نے زبر زیر والے حرفوں کو خوب یاد کرنے کی تاکید کی ہے۔ پھر یہ کم بخت جما بھی یوں ہی دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ اگر اس کے کھانے پینے کا خیال نہ رکھوں، تو آپا اُسے فاقوں سے مار دیں اور پھر تم لوگوں کی دیکھ بھال۔"

کھانا کھانے کے بعد ثریا صحن میں آ لیٹی تھی۔ آج اُسے اپنے بدن میں کچھ درد سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جما کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک چپ چاپ پڑا تھا ثریا نے اُسے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر گود میں لے لیا اور جما کا منہ اپنی طرف کرکے بولی۔ "جما! تیرا بدن بھی دکھتا ہے؟"

"خر خر...... خر...... خر" جما نے اپنی آنکھوں کو بند کرکے جواب دیا۔

"کیا کریں بھائی! ہم سے تو اب یہ سارا کام نہ ہوگا۔" پھر اُس نے بلقیس آپا کو دیکھ کر کہا "آپا! تمھاری وہ نئی کتاب ابھی تک نہیں آئی؟"

"کیوں خیر تو ہے؟" بلقیس آپا نے کتاب میں نشان لگا کر بند کرتے ہوئے کہا "تمھیں اس وقت یہ خادم کی بات کیا سوجھی؟"

ثریّا:- ایک خوب موٹی ماما ہمارے لئے منگوا دو۔ دیکھو نا گھر کا تمام کام کرتے کرتے میرے بدن میں درد ہوگیا ہے اور ان گڈّوں کو تو دیکھو تمام دن یوں ہی پڑے رہتے ہیں۔ ذرا اپنے گھر کی صفائی کا خیال نہیں رکھتے میں نے آج ان کا سارا مکان صاف کیا ہے۔ پھر آج جمّا کے پیر بھی صابن سے دھوئے ہیں۔ یہ بالکل میلے ہوگئے تھے۔"

آپا:- (مسکرا کر) تمھاری گڑیاں تو سچ مچ بڑی کاہل ہیں۔ تم اُن کا سارا کام کرتی رہتی ہو اور وہ کبھی تمھارے سر میں تیل ڈالنے کو بھی نہیں پوچھتیں بلقیس!

ثریّا:- تم کیسی باتیں کرتی ہو آپا! جب اللہ میاں اُن کو زندہ کرتے ہیں اس وقت تو میں سوتی رہتی ہوں، پھر وہ بیچارے مجھے اُٹھا کر یہ پوچھ کیسے سکتے ہیں؟ ثریّا نے جمّا کے بدن کو سہلاتے ہوئے کہا۔

آپا:- مگر تمھارا جمّا بھی تو کوئی کام نہیں کرتا؟

ثریّا:- یہ غریب تو سارا دن ان چوہوں کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ کیسے چور ہیں۔ کم بخت بغیر پوچھے گچھے جس چیز کو چاہا کھا لیا۔ ذرا شرم نہیں آتی ثریّا کسی دوسرے سوچ میں پڑ گئی۔

آپا:- اُن کی خدمت کے لئے ایک نوکرانی منگانا چاہتی ہو؟

ثریّا:- تو اور کیا! مجھے آخر اپنا پڑھنا لکھنا بھی تو ہے۔

آپا:- مگر موٹی سی ماما کا تُم کیا کرو گی؟

ثریّا:- امّی، آپا سب لوگ کہتے ہیں کہ شبراتن بُوا گھر کا سب سے زیادہ کام کرتی ہیں اور دیکھو کتنی موٹی ہیں۔ یہ .... موٹا موٹا کام کرنے میں بھی اُن کو ذرا تکلیف نہیں ہوتی۔ ثریّا کی آنکھیں گھر کی ملازمہ شبراتن کو تلاش کرنے لگیں اور بلقیس آپا ہنس پڑیں۔ اُنھوں نے کتاب کو پلنگ پر رکھ دیا اور بجلی کے لیمپ کو گُل کر کے ثریّا کے پاس کرسی پر آ بیٹھیں۔

"تمھارا بدن دکھ رہا ہے۔ ثریّا۔ لاؤ تمھارا سر دبا دوں۔ نیند آجائے گی تو درد بھی غائب ہوجائے گا۔" انھوں نے ثریّا کا سر دباتے ہوئے کہا۔

ثریّا:- ہاں آپا جمّا کو بھی شاید درد معلوم ہو رہا ہے تم میرا سر دبا دو، میں اُس کا سر دبا دیتی ہوں۔ اور اس نے جُمّا کے سر کو آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے دبانا شروع کیا۔

صحن میں ہوا چل رہی تھی۔ آپا نے جو آہستہ آہستہ اس کے سر کو دبانا شروع کیا اُسے نیند سی آنے لگی۔ جُمّا نے بھی تھوڑی دیر بعد اپنی خرخراہٹ بند کر دی جیسے وہ بھی سو رہا ہو۔ یکایک گھڑی نے ٹن ٹن نو بجائے اور جمّا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ثریّا کو

پکارا۔ "ننھی بی! ننھی بی! دعوت میں نہیں چلوگی کیا ارے نو بج گئے۔ ساڑھے نو بجے دعوت شروع ہو جائے گی" ثریا کو حیرت ہوئی۔ اس کا جمّا آج انسان کی طرح اس سے باتیں کر رہا تھا۔ "جمّا!" تعجب سے اس کے منہ سے نکل گیا۔

جمّا:۔ ہاں ہاں میں جمّا ہی ہوں۔ چلو چلو، دیر ہو رہی ہے۔ اُس نے ثریا کی اُنگلی اپنے ہاتھ سے پکڑ لی اور اس کو لے جانے لگا۔ ثریا کہاں جا رہی تھی، کیوں جا رہی تھی۔ اُس کو معلوم نہ تھا۔ جمّا زبردستی اُسے پکڑے۔ لئے جا رہا تھا۔ راستے میں جمّا نے ثریا سے کہا "ثریا بی! تمہاری آپا بڑی خراب ہیں۔ کل جب تم اسکول میں تھیں میں تمام دن بھوکا رہا۔ وہ تو خیر سے ایک موٹی سی چوہیا ہاتھ لگ گئی۔ ورنہ نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا اور بلقیس آپا نے مجھے کھانے کو پوچھا بھی نہیں"۔

ثریا:۔ جمّا تم آج بول کیسے رہے ہو۔

جمّا:۔ ارے میں کچھ آج ہی تھوڑا بول رہا ہوں مجھے تو زبان ملے آج اتوار اتوار گیارہ دن ہو گئے۔

ثریا:۔ تو پھر اتنے دنوں سے چُپ کیوں تھے؟

جمّا:۔ تم نہیں جانتیں؟ -------- آج پورے چاند کی رات ہے۔ ہم لوگوں کو جب زبان ملتی ہے تو بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے اگر کوئی چاند رات کے پہلے یا بعد بات چیت شروع کر دیتا ہے تو اس کی زبان چھین لی جاتی ہے۔ اس لئے ہماری عمر کے تمام جانور آج کی رات سے بات بات چیت کرنا شروع کریں گے۔

ثریا:۔ (تعجب سے) تو اب آج سے برابر بولا کروگے؟

جمّا:۔ (جلدی سے) نہیں نہیں، صرف رات کو اور وہ بھی جب بولنے کی ضرورت ہوگی۔

ثریا:۔ "سچ" ثریا خوشی کے مارے یکایک اُچھل پڑی جمّا ڈر گیا اور اُچھل کر دور جا گرا۔ ثریا کو جمّا کے اس طرح سے چونک جانے پر بہت ہنسی آئی اور اُس نے پھر جمّا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر اس وقت ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے آپا سے پوچھا بھی نہیں؟

جمّا:۔ تمہاری آپا کو دعوت کا رقعہ تھوڑا ہی آیا ہے ہم لوگ تو فوراً ہی آ جائیں گے۔ اُن کو بے کار اس وقت جگا کر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ثریا:۔ مگر جاؤ گے کہاں، کم از کم غلالو کو تو ساتھ لے لیتے۔ رات کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں۔

جمّا:۔ توبہ ارے اس باغ ہی میں تو جائیں گے جہاں تم ہر صبح پھول توڑنے جاتی ہو۔ وہاں۔ وہ۔ وہ فوارے کے پاس ایک بڑا سا گڑھا ہے، تا اسی میں تو جانا ہے۔

(باقی)

جنگی موٹر

عبدالحسیب ۔ حیدرآبادی

ہندوستان میں موٹر کا رواج اب عام ہوگیا ہے۔ پرانی سواریاں لینڈو، ٹمٹم، فٹن وغیرہ جو امیر آدمیوں کے لئے عزت کی نشانی سمجھی جاتی تھیں اب مشکل ہی سے نظر آتی ہیں۔ ان کی جگہ موٹر نے لی ہے۔ ہر سال موٹروں کے نئے نئے نمونے نکلتے ہیں۔ اور دولت مند انھیں بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ موٹر کے علاوہ کرائے کی لاریاں اور بسیں دن رات ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتی پھرتی ہیں۔ خصوصاً جہاں جہاں ریل نہیں پہنچتی ہے وہاں تو سواری اور تجارتی سامان لانے لے جانے کا تنہا ذریعہ یہی موٹریں، موٹر بسیں اور لاریاں ہیں۔

موٹر لڑائی کے زمانے میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی ہے اور اب تو گھوڑوں کی جگہ زیادہ تر موٹر اور موٹر سائیکل ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ فوج ان پر بیٹھ کر ذرا سے دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ زخمیوں کے شفاخانے پہنچانے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پیام پہنچانے کے لئے بھی انھیں سے کام لیا جاتا ہے۔

بڑی توپوں کو کھینچنے اور لڑائی کے میدان سے پیام پہنچانے کے لئے خاص موٹریں ہوتی ہیں۔ ان میں ریڈیو کے آلے لگے ہوتے ہیں، ایک اور موٹر ہوتی ہے۔ اس میں ٹنکوں (دبابوں) اور موٹروں کی مرمت کا سامان ہوتا ہے۔ جنگی موٹروں پر فولاد منڈھا ہوتا ہے اندر دو تین بندوقیں یا چھوٹی توپیں لگا دی جاتی ہیں یہ مسلح گاڑیاں سڑکوں، ہموار میدانوں اور ریگستان کی لڑائیوں میں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان میں کل دار بندوق اور دبابے والی توپیں بھی ہوتی ہیں ان کا کام فوجوں اور سامان رسد کی حفاظت بھی ہے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے یہ گشت بھی لگاتی رہتی ہیں ہر مسلح موٹر میں پانچ آدمی ہوتے ہیں۔

رسد کی گاڑیاں رات کو چلتی ہیں۔ دن میں ہوائی جہازوں سے مقابلے کا خطرہ ہوتا ہے۔ رات میں بھی اُن کے لیمپ روشن نہیں کئے جاتے۔ محض اندازے اور اٹکل سے انھیں چلانا پڑتا ہے۔

سپاہیوں، رسد اور لڑائی کا سامان اور زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے ریل گاڑیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ پچھلی بڑی لڑائی ۱۹۱۴ء میں بڑی بڑی توپیں بھی لگائی گئی تھیں۔ مگر بمبار ہوائی جہازوں کی وجہ سے یہ توپیں بے کار ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ریل میدانِ جنگ تک تو پہنچ نہیں سکتی نہ موٹر کی طرح لڑائی کے وقت کام آسکتی ہے۔ اس لئے موٹر ریل سے زیادہ کار آمد ہے اور اسی لئے لڑائی کے کاموں میں روز بروز اس کا استعمال زیادہ ہو رہا ہے ۞

ترقی

از ام طاہر صدیقی "ترقی"

چلتا رہے گا یوں ہی دنیا کا کارخانا
جو آج کا ہے چھوٹا کل ہو گیا وہ سیانا

ایک ایک تنکا لاکر چڑیوں نے ہے جمایا
بن کر ہوا مکمل تب اُن کا آشیانا۔

کرتی ہے رفتہ رفتہ ہر ایک شئے ترقی
پربت بنا ہے اونچا رائی کا چھوٹا دانا

تعلیم ہی ہے مشعل دنیا کی تیرگی میں
دل اپنا پیارے بچو تعلیم میں لگانا

ہے مخزنِ ترقی یہ علم ہی تمہارا
دوست نہ اپنے ہاتھوں تم علم کی گنوانا

باہم غرور کرنا اخلاق کی ہے پستی
مذہب نے سب کو بخشا درجہ مساویانا

ماں باپ اور معلم سب کا ادب ہے لازم
ہر دل عزیز ہوگا جس نے بڑوں کا مانا

بھائی ہوں یا بہن ہو اپنے سے جو ہو چھوٹا
سب سے سلوک کرنا اُلفت سے پیش آنا

مشکل ہے اور کٹھن ہے ہر راہ زندگی کی
پاؤں سنبھل کے رکھنا دیکھو نہ ڈگمگانا

ہو دوستی انہیں سے جن کے چلن ہوں اچھے
تم بدچلن سے ہرگز رکھو نہ دوستانا

عزت ملے گی اس کو ہر ایک کی نظر میں
جس نے کہ جان و دل سے سچ کو عزیز جانا

ہو نخل آرزو تم اس مادرِ وطن کے
کچھ نام اس کا روشن دنیا میں کر دکھانا

ننھے پیامیوں سے ترقی کا ہے یہ کہنا
یہ نظم یاد رکھنا پڑھ کر نہ بھول جانا

بہرا لڑکا

عبدالواسع عصری
جک منگلوری

اس لڑکے کا نام جان کیٹو تھا۔ یہ ۴ دسمبر ۱۸۰۴ء کو پلائی متھ میں پیدا ہوا۔ پلائی متھ ہندوستان کے جنوب میں ایک شہر ہے۔ جان کا باپ راج تھا مزاج کا بہت اکھڑ۔ کسی سے نہیں بنتی تھی۔ کام بہت کم ملتا تھا اور گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا۔ جان جب بڑا ہوا تو پڑھنے بیٹھا دیا گیا۔ انگلستان کوئی ہمارے ملک کی طرح تو ہے نہیں، وہاں راج اور مزدور کے لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔ مگر جان کو باپ کی مفلسی کی وجہ سے کسی مدرسے میں لگاتار چند مہینے بھی پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ دس سال کی عمر میں تو پڑھائی کا سلسلہ بالکل ہی ختم کرنا پڑا اور وہ باپ کی مدد کے لئے محنت مزدوری کرنے لگا۔ دس برس کی عمر ہی کیا۔ بے چارا سر پر پتھر اٹھاکر سیڑھی پر چڑھتا تو اس کے ننھے ننھے پاؤں لڑکھڑانے لگتے۔ دو ہی برس میں وہ ایک آدمی کے پاس نوکر ہو گیا۔ ایک دن وہ بڑا سا پتھر سر پر اٹھائے سیڑھی پر چڑھ رہا تھا کہ پیر پھسل گیا اور کوئی ۳۵ فٹ نیچے گرا۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ تمام مزدور آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ حالت دیکھی تو اٹھاکر اس کے گھر لے گئے۔

دو ہفتے وہ چارپائی پر بے سُدھ پڑا رہا۔ ایک دن ہوش آیا تو اٹھنے کی کوشش کی مگر ناطاقتی اور کمزوری کے سبب نہ اٹھ سکا۔ ناچار چارپائی پر پڑے پڑے کتاب دیکھتا رہا۔ تھوڑے دنوں بعد اچھا ہو گیا مگر بے چارا بہرا ہو گیا تھا۔ کان بالکل پٹ گئے تھے۔ کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ جان کو اس کا جتنا بھی صدمہ ہوتا کم تھا۔ بہت کچھ دوا دارو کی گئی، کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جان سمجھتا تھا کہ اب وہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری کتابیں پڑھنے کا شوق اسے شروع سے تھا، اب اس نے اسے اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا۔ باپ کو مدد کرنے کی خاطر اس نے نقاشی بھی سیکھی، مگر اس سے آمدنی کچھ زیادہ نہیں بڑھی۔ آخر ماں باپ نے اسے محتاج خانے میں بھیج دیا۔ وہاں اسے جوتوں کی تجارت کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ ۱۵ سال کی عمر میں وہ

ایک شخص باڈون کا شاگرد ہوگیا۔ باڈون بہت سخت آدمی تھا، اس سے صبح ۶ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک کام کرواتا تھا۔ اس زمانے میں بھی جان نے مطالعے کا شغل کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ حالانکہ صبح سے شام تک سولہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔

باڈون کی سختی برابر بڑھتی گئی۔ آخر مجبور ہوکر اس نے کارخانے کے مالکوں سے باڈون کی شکایت کردی۔ اُنھوں نے جان کو دوسری جگہ بھیج دیا۔ وہاں بھی وہ چار سال رہا۔ اس ساری مدت میں کتابیں پڑھنے کا شغل برابر جاری رہا۔

کتابیں پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں مضمون کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے بلائی متھ نامی رسالے میں ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا لوگوں کو اب جان کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اُنھوں نے سوچا کہ اگر اس کی ہمت بڑھائی گئی اور اس کی مدد کی گئی تو یہ بہت ترقی کرے گا۔ اُنھوں نے چندہ کرکے اُسے ایک مدرسے میں داخل کردیا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات ایک دنداں ساز مسٹر گروز سے ہوگئی۔ اس نے جان کو اپنے بچوں کے پڑھانے پر نوکر رکھ لیا۔ اس زمانے میں جان نے انگریزی کے علاوہ کئی اور زبانیں بھی سیکھ لی تھیں۔

تھوڑے دنوں بعد مسٹر گروز کے دل میں روس ایران، کوہ قاف اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی سیر کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اپنے ساتھ جان کو بھی لے گیا۔ بس یہیں سے جان کی زندگی میں ایک خاص تبدیلی یا انقلاب شروع ہوتا ہے۔ کوئی چار سال تک ان دونوں نے ملکوں ملکوں کی سیر کی۔ جان بھی جاتا وہاں کی ہر ہر چیز اور ہر ہر بات کو غور سے دیکھتا۔ ۱۸۳۳ء میں یہ دونوں انگلستان واپس آئے۔ جان نے یہاں کے ایک رسالے "پنی میگزین" میں "مسافر کا حصہ" کے عنوان سے مسلسل مضامین لکھے۔ اُن میں اُس نے یورپ یا ایشیا کے ملکوں کے رہنے سہنے کے طریقوں، رسم و رواج، مذہب اور تہذیب پر پوری روشنی ڈالی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ فلسطین پر دلچسپ مضمون لکھے گا تاکہ لوگوں میں انجیل پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ اُس نے انجیل بھی چھپوائی اور تصویروں کے ساتھ۔ یہ ایک نئی بات تھی اور اُس سے لوگوں میں انجیل سے دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ اس کی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

۱۸۴۵ء میں اُس نے بائبل کی تفسیر یا شرح لکھی اُسے وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم مقصد سمجھتا تھا۔ اُس کی یہ کتاب اُمید سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اور لوگ جان کو اپنے ملک کا بہت بڑا عالم سمجھنے لگے۔ جان کی شہرت دور دور ملکوں تک پہنچ گئی۔ لوگ اُسے بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے اور انگلستان کا بہت بڑا عالم سمجھنے لگے۔

جان اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ چار بجے اُٹھتا تھا۔ تھوڑی دیر باغبانی کرتا تھا۔ پھر سارا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ لوگ اُس سے ملنے اور اُس سے باتیں کرنے کے بہت خواہش مند رہتے تھے مگر اس کام کے لئے اُس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔

جان نے شادی بھی کرلی تھی۔ کئی بچے بھی ہوئے ان بچوں کو وہ بہت چاہتا تھا۔ کتابوں سے اُسے کافی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس کے گھر کی زندگی آرام سے گذرتی تھی۔ پھر بھی روپے پیسے کی طرف سے کبھی کبھی کافی پریشانی اُٹھانا پڑتی تھی۔ آخر اس کے وطن کے لوگوں نے پان سو پونڈ سالانہ اس کی پنشن مقرر کردی۔ یہ اس زمانے میں بہت سمجھی جاتی تھی۔

سنہ ۱۸۵۱ء میں اس کی تندرستی خراب ہو گئی وہ علاج کے لئے جرمنی گیا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر تین سال بیمار رہنے کے بعد اس دُنیا سے رُخصت ہوگیا اور لوگوں کے لئے ایک بہترین مثال قائم کرگیا جو لوگ اپنے خیالات بلند رکھتے ہیں مشکلوں کی پرواہ نہیں کرتے، مصیبتوں کے وقت ہمت نہیں ہارتے۔ اور مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ آخرکار جان کی طرح کامیاب ہوتے ہیں اور دُنیا میں کوئی چیز اُنھیں ترقی سے نہیں روک سکتی ۔

دلچسپ مشغلہ

تُمھارے یہاں کوئی مہمان آئیں تو اُنھیں سگرٹ اور برف دو۔ وہ حیران ہوں گے کہ دیا سلائی کا [illegible] سگرٹ کیسے جل جائے گا تم اُن سے کہو کہ آپ سلگائیے تو۔ وہ جوں ہی برف کو سگرٹ کے سامنے کریں گے [illegible] میں فوراً آگ لگ جائے گی اس کی ترکیب یہ ہے کہ گھر میں سے سگرٹ لانے سے پہلے سگرٹ کے ایک سرے پر تمباکو میں مٹر سے بھی چھوٹا پوٹاشیم کا ٹکڑا چھپا دو۔ پوٹاشیم پانی سے ذرا بھی چھو جائے تو اُس میں آگ لگ جاتی ہے مگر اس بات کی احتیاط رکھنا کہ کہیں وہ پوٹاشیم والا سرا منہ میں نہ رکھ لیں۔ یہ شعبدہ بے تکلف دوستوں کے ساتھ کرنا چاہئے۔

بچّوں کی فتح

ریاض الاسلام صاحب
بی اے (علیگ)

امان میاں کو جامعہ نگر سے آئے ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ان کے چھوٹے بھائی نعمان کی بسم اللہ کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ سچ پوچھو امان میاں کو اماں جان نے انھی کے انتظار میں اس تقریب کو روک رکھا تھا۔ امان میاں کو وہ اپنے بچوں میں سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ ایک انھی پر نہیں امان میاں کو گھر بھر پیار کرتا ہے۔ امان میاں آدمی بھی بڑے زور کے ہیں۔ اپنے ہم جماعت بچوں کے لیڈر ہیں اور گھر کے بچوں میں بھی ان کی حیثیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ کیا جامعہ نگر اور کیا گھر میں بچوں کی جتنی مسکوٹیں ہوتی ہیں ان سب میں آخری فیصلہ انھی کا ہوتا ہے۔ کیا مجال جو ان کی منشا کے خلاف کوئی بات ہو جائے۔ سب کو خوش اور راضی رکھنے کا گر بھی انھیں خوب آتا ہے۔ اور کام کرنے کی صلاحیت تو اس بلا کی ہے کہ خود اُن کے قول کے مطابق اگر انھیں ایک دفعہ کوچر چل کی جگہ مل جائے تو ہٹلر کے چھکے چھڑا دیں۔

امان میاں کے گھر پہنچتے ہی تقریب کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ انتظام کا کچھ حصہ مثلاً صفائی، آرائش وغیرہ اُن کے ذمے تھا اور بہت سی چیزوں میں بھی اُن کی رائے لی گئی۔ جمعہ کے دن شام کو بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کا جمگھٹ ہوا۔ امان میاں کا خاندان کافی بڑا تھا۔ گھر میں اللہ رکھے تایا زاد اور چچا زاد بھائی، بہنوں کی تعداد ایک درجن سے کم نہ تھی۔ خاندان کے اور بہت سے بچے بھی جمع تھے۔ غرض بچوں کی ایک پوری ٹولی موجود تھی۔

شام کا وقت اور گرمیوں کا زمانہ۔ چھت چاندنی بچھی تھی اور اس پر سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے، بڑے ایک طرف اور بچے ایک طرف۔ شربت کا دَور چل رہا تھا۔ اتنے میں محلے کے مولوی صاحب تشریف لے آئے اور انھوں نے کچھ باتیں خود کہیں اور کچھ نعمان سے کہلوائیں جن میں سے ایک بھی بچوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد امان میاں کے چھوٹے چچا نے کھڑے ہوکر اعلان کیا

کہ سب حضرات مٹھائی تقسیم ہونے تک تشریف رکھیں۔ مٹھائی بٹنا شروع ہوئی۔ پہلے بڑوں کو ٹی مٹھائی سے بھری ہوئی شیشے کی ایک ایک خوب صورت طشتری ایک عمدہ چھوٹے سے رومال سے بندھی ہوئی ہر ایک کو ملی۔ بچے یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مٹھائی تو بندھی ہوئی تھی۔ اس لیے کسے معلوم کہ کیا مٹھائی ہوگی لیکن مٹھائی سے اچھی شیشے کی خوب صورت طشتری اور طشتری سے اچھا عمدہ چھوٹا سا رومال تھا۔ خدا خدا کرکے بڑوں کی باری ختم ہوئی اور چھوٹوں کا نمبر آیا لیکن اب دیکھتے ہیں تو نہ وہ خوب صورت سی طشتری اور نہ وہ عمدہ چھوٹا سا رومال ہے۔ بس کاغذ کی تھیلیوں میں مٹھائی بھری ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر بچوں کی ٹولی میں کھلبلی تو مچ گئی۔ چچا جان سے تو کبھی بھی یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اس طرح بچوں کے ساتھ ناانصافی کریں گے سب بچے امان میاں کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور پوچھنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ دو ایک بچوں نے شور بھی مچایا۔ لیکن امان میاں نے فوراً ان کی روک تھام کی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ آخر امان میاں چچا جان کے پاس دوڑے ہوئے گئے اور اُن سے کہا کہ آپ نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، آپ کی اس بات پر تمام بچوں میں ہیجان پھیلا ہوا ہے۔ چچا جان نے کہا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب نہ تو طشتریاں ہیں اور نہ رومال۔ امان میاں نے کچھ سوچ کر کہا کہ اچھا آپ کچھ دیر کے لئے بچوں میں مٹھائی کی تقسیم روک دیجئے۔ چنانچہ مٹھائی بٹنا بند ہوگئی۔

امان میاں نے چار، پانچ بڑے اور ہوشیار بچوں کو چُنا۔ اپنے ساتھ برابر والے گول کمرے میں لے گئے اور سب کی رائے پوچھی کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے بڑے جوش سے کہا "کہ ہم لوگوں کو فوراً ستیاگرہ کر دینا چاہیے" ایک صاحب نے جنھیں مٹھائی کا شوق نہ تھا، مٹھائی ہڑتال کی تجویز پیش کی۔ ایک صاحب جو بچوں میں مسخرے مشہور تھے، بڑی سنجیدگی سے بولے، "کہ میرے علاوہ ہم میں سے کسی ایک کو چھت پر چڑھ کر اور چھتری ہاتھ میں لے کر ان بزرگوں کے بیچوں بیچ کود پڑنا چاہیے یہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ جرمن پیراشوٹ آ پہنچے ہیں بھاگ نکلیں گے، پھر مال غنیمت یاروں کا ہوگا۔ دو ایک اور اسی قسم کی تجویزیں پیش ہوئیں۔

اب آخری باری امان میاں کی تھی۔ وہ اطمینان اور سنجیدگی سے کھڑے ہو کر بولے کہ "ستیاگرہ تو ہم اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہمارے بزرگ بیٹھے ہیں، وہ کوئی بدیشی حکومت تو ہیں نہیں۔ ہڑتال اس لئے مناسب نہیں کہ سچ پوچھو تو ہم لوگ سرمایہ دار ہیں اور یہ لوگ مزدور، یہ محنت کرکے کماتے ہیں اور ہم خرچ کرتے ہیں، اور پھر اپنے بزرگوں کے خلاف اس قسم کی حرکت کرنا بڑی بدتمیزی ہے۔ رہا

پیراشوٹ کا طریقہ تو میں اپنی طرف سے ان صاحب
کو جن کی تجویز یہ ہے اجازت دیتا ہوں کہ وہ
خود اس پہ عمل کریں۔ اس پر کچھ قہقہہ پڑا۔ اس کے
بعد اماں میاں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا
کہ ہم سے دو تین بچے مل کر تائے جان کے پاس جائیں
کیوں کہ گھر میں سب سے بڑے وہی ہیں اور انھیں
معقول طریقے سے سمجھانے کی کوشش کریں کہ ہم
لوگوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ طشتری
اور رومال کے حق دار تو دراصل ہم لوگ ہیں۔
اماں میاں کی تجویز سب نے پسند کی ۔۔۔۔
تائے جان کے سامنے شکایت پیش کرنے کے لئے
فوراً ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اماں میاں صدر اور سب
کی طرف سے بولنے والے چنے گئے۔ اماں میاں
کے کہنے سے اُن کی چھوٹی چچی زاد بہن کو بھی شریک
کر لیا گیا تاکہ بچیوں کی طرف سے بھی ایک ممبر موجود
ہو۔ ایک صاحب اور، جو سارے گھر میں تائے جان
کو سب سے زیادہ محبوب تھے لئے گئے، تاکہ اگر
بحث سے کام نہ چل سکے تو اُن کے مچلنے سے کام
چلانے کی کوشش کی جائے۔ آخر یہ تین چھوٹے
چھوٹے انسان تائے جان کی خدمت میں روانہ
ہو گئے۔

اس عرصے میں یہ خبر آناً فاناً پھیل گئی تھی کہ
بچوں نے مٹھائی لینے سے انکار کر دیا ہے اور اس
بات پر سوچ بچار کر رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ بزرگوں
میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ تائے جان بار بار
داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتے کہ "ارے بتاؤ تو قصہ کیا ہے"
اتنے میں بچوں کا وفد آ پہنچا۔ اماں میاں آگے اور
دونوں ساتھی پیچھے پیچھے۔ سب نے آکر ادب کے
ساتھ تائے جان کو سلام کیا۔ انھوں نے کہا کہ "کہو
بیٹا کیا بات ہے"۔ تب اماں میاں نے بڑے سلجھے
ہوئے انداز میں سارا واقعہ بتایا اور آخر میں کہا۔
"تائے جان کیا آپ کے خیال میں ہم لوگوں کے ساتھ
ناانصافی نہیں ہوئی ہے"۔ انھوں نے فرمایا کہ "بیٹا
اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ تم لوگ اس قدر ناخوش ہوگے
تو تم سب کے لئے بھی طشتری اور رومال کا انتظام
کر دیا جاتا۔ پر اب تم ہی بتلاؤ کہ کیا ہو سکتا ہے"۔ اماں
میاں بولے کہ "بڑوں کو چاہیے کہ اپنے رومال اور
طشتریاں بچوں کو دے دیں اور اُن کے مٹھائی
کے تھیلے خود لے لیں"۔ تھوڑی دیر سوچ کر تائے جان
بولے کہ "دیکھو بھئی ایک ترکیب کرو، تم لوگ بڑوں
سے سمجھوتہ کر لو، رومال تم لے لو طشتریاں اُن
کے پاس رہنے دو۔ اس پر اماں میاں کے ننھے
ساتھی مچلنے لگے کہ "نہیں بڑے ابا ہم تو دونوں چیزیں
لیں گے"۔ لیکن اماں میاں نے بڑی مشکل سے دونوں
کو سمجھا کر چپ کیا اور تائے جان سے عرض کیا کہ میں
اور بچوں سے بھی مشورہ کر لوں۔ اِدھر اماں میاں

بچّوں کو سمجھانے اور اُن کی رائے لینے گئے اور اُدھر
تائے جان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھئے ان
بچّوں نے کتنا اچھا طریقہ اختیار کیا ہے ۔ مناسب
یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ رومال اُن کے حوالے
کردیں ۔ سب لوگ خوشی سے راضی ہوگئے ۔ امان میاں
نے بھی بچّوں کو سمجھا بجھا کے صرف رومال پر راضی کرلیا ۔
فوراً بچے گنے گئے اور بڑوں سے اتنے ہی رومال
لے کر مٹھائی کی تھیلیاں ان میں لپیٹ کر تقسیم
کردی گئیں ۔ بڑوں میں سے ہر ایک رومال دینے
کے لئے پہل کر رہا تھا ۔

نہر پاناما

نہر پاناما کا نام ہر پیامی بھائی نے سنا ہوگا ۔ یہ
نہر شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کو ایک دوسرے سے
جدا کرتی ہے ۔ اس کی گہرائی ۴۰ فٹ لمبائی ۵۰ میل اور
چوڑائی ۵۰۰ فٹ ہے اور یہ سمندر کی سطح سے ۸۵ فٹ
اونچی ہے ۔ اس کی اونچائی کی وجہ سے نہر کے راستے
گذرنے کے لئے جہازوں کو قفلوں کے ذریعے اوپر
چڑھایا جاتا ہے ۔ ۱۸۸۱ء میں اس نہر کے کھودنے کا ٹھیکہ
فرانسیسی کمپنی نے لیا تھا جس کا افسر اعلیٰ وہی شخص تھا جس نے
نہر سویز کھدوائی تھی ۔ اس کے خرچ کا اندازہ لگایا گیا تو
بارہ کروڑ ستر لاکھ ڈالر کافی سمجھے گئے مگر بعد میں یہ رقم ناکافی
نظر آئی اور ۴۰ کروڑ ڈالر کا اعلان کیا گیا مقام گیٹن کے پاس
ایک عظیم الشان پشتہ باندھا جو اتنا اونچا ہے کہ اچھی خاصی
پہاڑی معلوم ہوتی ہے اس کا دل اس قدر ہے کہ اندازہ نہیں
لگایا جا سکتا کہ کتنے من مٹی اور پتھر یہاں اکٹھے کئے گئے ہیں ۔
نہر کھودنے میں ایک مشکل کام یہ تھا کہ مقام کیوریرا
کے پاس پہاڑ کاٹ کر نہر لے جانی تھی اس غرض کے لئے
بڑے بڑے پتھر انجنوں اور مشینوں کے زور سے اٹھا کر پھینکے
جاتے تھے ۔ مزدوروں کو اچھی خاصی مزدوریاں دی
جاتی تھیں ۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام بہت عمدہ
تھا ۔ ایک مشین برف کی چلتی تھی جس میں ۹۰ ٹن برف
بنتی تھی ۔ اس طرح ۲۵۰ گیلن آئس کریم ۱۴ ہزار
روٹیاں مزدوروں کو بہم پہنچائی جاتی تھیں ۔ ان کے لئے روزانہ
ایک ہزار من کافی اُبالی جاتی تھی ۔ اور کوئی ۷ ہزار کپڑے
دھوئے جاتے تھے سطح سمندر سے ۸۵ فٹ اونچائی پر جہازوں
کو چڑھانے کے لئے تین بندوں کے ذریعے پانی کی سطح کو
اونچا کیا گیا ہے ۔ اس نہر سے امریکا کی تجارت بہت بڑھ
گئی ہے ۔ نیویارک سے سان فرانسسکو جاتے میں
۹ ہزار میل کی بچت ہوگئی ہے ۔ چین اور جاپان کے
سفر میں بھی چار ہزار میل کی کمی ہو گئی ہے ۔

(عبدالواحد خاں ۔ سرسہ)

جھوٹ اور سچ میں فرق

محمد صالح۔ درجہ سوم۔ پہلی تعلیمی مرکز جامعہ۔ عمر ۶ سال

ایک آدمی تھا وہ بہت جھوٹا تھا۔ اسی شہر میں ایک اور آدمی رہتا تھا وہ بہت سچا تھا اور ایمان دار تھا وہ نہ کسی سے لڑتا تھا اور نہ کسی سے جھگڑتا تھا۔ اس آدمی کو سب اچھا سمجھتے تھے، جو نہ لڑتا تھا اور نہ جھگڑتا تھا ایک دن اس کے گھر مہمان آئے۔ انھوں نے پوچھا بھئی جھوٹ کیسے بولتے ہیں؟ اس نے کہا اگر میں کسی کے گھر کھانا کھا آؤں اور میری اماں پوچھیں تم نے کس کے گھر کھانا کھایا اور میں کہوں کہ میں نے نہیں کھایا تو اسے جھوٹ بولنا کہتے ہیں۔

تیسرے درجے میں سفر

عماد عبدالواحد، بریلی

لوگ چاہے کچھ کہیں مگر میرے خیال میں تو تیسرے درجے خصوصاً چھوٹی لائن کے تیسرے درجے میں سفر بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ مجھے پہلے، دوسرے بلکہ درمیانے درجے کا سفر بھی پسند نہیں بھلا جو گھما گھمی بھیڑ کا شور و غل تیسرے درجے میں ہے وہ ان درجوں میں کہاں۔ ایک دن مجھے بھی چھوٹی لائن پر تیسرے درجے میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لائن ایک طرف بریلی سے لکھنؤ اور دوسری طرف بریلی سے آگرے تک جاتی ہے۔

صبح ہی صبح اسٹیشن پہنچا تو پلیٹ فارم اچھا خاصا مال گودام بنا ہوا تھا، دو چار نقلی صاحب بہادر جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک خاص انداز سے سر کو ہلاتے پلیٹ فارم پر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ گاؤں والوں کا تو کچھ نہ پوچھئے۔ جدھر دیکھئے انھی کی بھیڑ، لاٹھی میں گٹھری لٹکی ہوئی بالکل تیار کھڑے ہیں جیسے کوئی پہرا دیتا ہو حقے کا شغل اب بھی جاری ہے۔ بس ایک چلم ہے جو چاروں طرف گھوم رہی ہے

یہ بھیڑ دیکھ کر دل میں کہا خدا خیر کرے دیکھیے جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ ہم جلدی سے غسل خانے میں گھس گئے اور سوٹ پہن، ہیٹ لگا پورے بابو جی بن باہر نکل آئے کہ شاید جگہ ملنے میں آسانی ہو۔ آگے بڑھ کے ایک ریل بابو سے گاڑی کا وقت پوچھا تو معلوم ہوا ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ جلدی میں گھر سے ناشتہ بھی کر کے نہیں چلے تھے۔ ریل میں تو کھانے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ بس وہیں پلیٹ فارم پر بستر کھول ناشتہ کرنے بیٹھ گئے ابھی پانی بھی نہ پینے پائے تھے کہ پیچھے سے چھک چھک کی آواز آئی اور ایک شور بلند ہوا۔ گاڑی آگئی، گاڑی آگئی ہم نے جلدی جلدی سامان باندھا اور آگے کی طرف بھاگے۔ اک ذرا سی جگہ خالی دیکھی اور گھسنا چاہا مگر قلی دوسرے کنارے پر کھڑا چلا رہا تھا۔ "بابو جی، بابو جی" دوڑتے ہوئے اودھر پہنچے۔ یہاں بھی بس اتنی جگہ تھی کہ اپنے بکس پر بیٹھنا پڑا۔ جب ذرا اطمینان ہوا تو اِدھر اُدھر نظر دوڑائی دو چار اپنی عمر کے لوگ نظر آئے۔ اُن سے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے دوستی پیدا کی۔ دوپہر کو ایک چھوٹی سی دعوت رچائی گئی۔ جس کے پاس جو کچھ تھا دسترخوان پر رکھا گیا۔ کھانے کے بعد ذرا آرام کرنے اور سونے کو جی چاہا تو باری باری ت ایک شخص جاگتا رہا کیوں کہ تیسرے درجے میں سفر کرنے والوں کا حافظہ ذرا کم زور ہوتا ہے۔ انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ ان کے ساتھ سامان کے کتنے عدد ہیں۔ عموماً زیادہ ہی کا خیال رہتا ہے۔ اور سوتے ہوئے مسافروں کے سامان سے کمی پوری کی جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ نئے دوستوں کے ساتھ بس تھوڑی ہی دیر رہا۔ جن جن کی منزل قریب آتی گئی وہ رخصت ہوتے گئے اور تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی رخصت ہونا پڑا۔ بہت مزے کا سفر تھا۔

کوئل

فہیم جہاں بیگم۔ قزلباش

کسی زمانے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں بڑی "لوکو" چھوٹی "کوکو" کہلاتی تھی۔ ایک دفعہ دونوں جنگل میں لکڑیاں چن رہی تھیں۔ لکڑیاں چنتے چنتے دونوں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہوگئیں۔ کوکو کو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ چلتے وقت لوکو نے کوکو کو بہت تلاش کیا مگر نہ ملی۔ آخر جار و نا چار گھر واپس آئی اور ماں کو لوکو کے گم جانے کا حال سنایا۔ ماں غصّے سے آگ بگولا ہوگئی اور کہا خبردار جب تک کوکو کو تلاش نہ کر لیتا گھر میں قدم نہ رکھنا۔ لوکو روتی ہوئی کوکو کی تلاش میں نکلی۔ راستے میں ایک جادوگرنی ملی اس نے پوچھا "تم کیوں رو رہی ہو؟" اُس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جادوگرنی نے اُسے بتایا کہ میں ایسا منتر جانتی ہوں کہ تمھیں چڑیا بنا سکتی ہوں اور تم آسانی سے اپنی بہن کو تلاش کر سکتی ہو۔ لوکو اس پر رضامند ہوگئی۔

جادوگرنی نے اُسے کالے رنگ کی چڑیا بنا دیا۔ اب وہ چاروں طرف پکارتی پھرتی ہے۔ "کوکو آ او۔ کوکو آ او" اور ہم لوگ اُسے اور اس کی نسل کو کوئل کہتے ہیں۔

موجودہ لڑائی

سید اطہر علی

ساری دنیا کو معلوم ہے کہ اس وقت براعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ میں زبردست لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ ایشیا میں تو چین اور جاپان کی لڑائی برسوں سے ہو رہی ہے یورپ میں انگلینڈ اور جرمنی میں دو سال سے جنگ ہو رہی ہے۔ شمالی افریقہ میں اٹلی اور انگریزوں کے درمیان ہٹلر جو جرمنی کا ڈکٹیٹر ہے روس اور انگلینڈ کے سوا باقی ماندہ ملکوں کو خون کی ندیاں بہا کر مغلوب کر چکا ہے۔ جنوبی افریقہ میں لڑائی اصل میں اٹلی اور انگریزوں کے درمیان ہے۔ لیکن ہٹلر مسولینی کا دوست ہے اس لئے مسولینی نے اپنی ٹانگ جنوبی افریقہ میں بھی اڑائی۔ اس طرح انگریزوں کو دو طرفہ لڑائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس طرح انگریزوں کی فوجیں ادھر تو یورپ میں جرمنی کا مقابلہ کر رہی ہیں اور اُدھر جنوبی افریقہ میں ہٹلر اور مسولینی کی متحدہ فوجوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اسی دوران میں مسولینی نے یونان پر حملہ کر کے ایک کش مکش اور یورپ میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن بہادر یونانیوں نے مسولینی کی فوجوں کو مار بھگایا۔ لیکن اس کے دوست ہٹلر نے یونان پر دوبارہ حملہ کر کے تقریباً اسے بھی مغلوب کر لیا۔ اور اب روس اور جرمنی میں بہت سخت لڑائی ہو رہی ہے اسباب کچھ بھی ہوں اور یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جان و مال کا جو نقصان ہو رہا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے بے شمار بچے یتیم اور بے شمار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ سمندر بے شمار دولت کو اپنے پیٹ میں ہضم کر گیا اور زمین اور آسمان نے کبھی ایسے خطرناک مناظر کا نقشہ نہ دیکھا تھا۔

موجودہ لڑائی پرانے زمانے کی لڑائی سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے زمانے میں لڑائی تیر و کمان، نیزہ و برچھی، تلوار اور بندوق سے ہوتی تھی مگر اب سائنس کی لڑائی ہے۔ ایک طرف تو ہوائی جہاز اوپر سے گولا باری کر کے مکانوں ہسپتالوں، کارخانوں، سینما گھروں، مدرسوں اور پلوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں، دوسری طرف سمندر میں یو۔ بوٹ کشتیاں (U. BOAT) یا پانی کے اندر تیرنے والے جہاز (SUBMARINE) اور تباہ کن جہاز تجارتی جہازوں کو نقصان پہنچانے میں بڑی سرگرمی سے مصروف ہیں جرمنی تو ان تجارتی جہازوں کو بھی تباہ کرتا ہے جن کے مالک لڑائی میں حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ آج کل لڑائی میں ہر روز ایک نئی ایجاد ہو رہی ہے اور ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ ایسی ایجاد کرے کہ اپنے دشمن کو شکست دے تاکہ وہ پھر اپنی طاقت نہ بڑھا سکے۔

عزیز بچیو اور بچو، خوش رہو اور تندرست۔

لو صاحب ہم کشمیر گھوم گھام کر واپس بھی آ گئے۔ پچھلے پرچے میں ہم نے گاندھربل سے جانے کا ذکر کیا تھا۔ ایک دن میں گاندھربل میں بیٹھا تمھارے پیام تعلیم کا کام کر رہا تھا کہ معلوم ہوا جناب عبدالغفور صاحب (لکچرر ٹریننگ کالج علی گڑھ) تشریف لائے ہیں۔ ملاقات ہوئی۔ آٹھ دن سے سری نگر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تنہائی کی وجہ سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ سچ بھی یہ کہ سیر و سفر میں جب تک دو ایک ساتھی نہ ہوں کچھ مزا نہیں آتا۔ میں نے ان سے کہا "پیام تعلیم کا کام ختم ہو گیا ہے۔ حامد صاحب کل صبح گل مرگ جا رہے ہیں شام کو میں یہاں سے چل دوں گا، آپ کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہروں گا اور صبح کو ہم اور آپ دونوں گل مرگ روانہ ہو جائیں گے۔ وہ راضی ہو گئے دوسرے دن شام کو میں گاندھربل سے سری نگر روانہ ہو گیا۔ ماسٹر غلام حسن صاحب قریشی بھی ساتھ تھے۔ ہوٹل پہنچے تو غفور صاحب کہیں گئے ہوئے تھے ماسٹر صاحب نے اصرار کیا کہ آج رات کو ہمارے گھر چلیے۔ میں کشمیر کی گھریلو زندگی بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اسباب ہوٹل میں ڈالا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ ماسٹر صاحب کا گھر سڑک پر ہی ہے۔ تین منزلیں ہیں۔ اچھا خاصا بنا ہوا ہے۔ البتہ نیچے کا صحن صاف نہیں تھا، اوپر کے کمروں میں بھی ہوا کے آنے جانے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ ماسٹر صاحب نے بڑی مزے دار چار پلائی۔ کشمیر میں عموماً نمکین چائے پی جاتی ہے ماسٹر صاحب نے مہمان کی خاطر سے میٹھی چائے بنائی تھی۔ رات کو کھانا کھایا۔ اچھا خاصا تھا مگر کشمیری کھانے خصوصاً یوپی والوں کے منہ کو نہیں لگتے۔ صبح کو اٹھے تو ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ چلیے ذرا باہر تشریف لے چلیے۔ تھوڑی دور چل کر کچھ بدبو سی آنی شروع ہوئی۔ ذرا اور آگے بڑھ کر میونسپلٹی کے پاخانے نظر آئے۔ ماسٹر صاحب نے ادھر اشارہ کیا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے ان میں جانے کی عادت نہیں۔ اصل میں اچھے خاصے اوسط درجے کے کشمیریوں میں بھی گھر میں پاخانے بنانے کا رواج نہیں ہے۔ خیر صاحب دریائے جہلم کے کنارے منہ دھویا۔ ماسٹر صاحب کے یہاں جاکر

ناشتہ کیا اور ہوٹل میں جاکر غفور صاحب سے ملاقات کی ساڑھے گیارہ بجے لاری میں بیٹھ کر گل مرگ روانہ ہوگئے سری نگر سے کوئی ۲۱ میل تنگ مرگ ایک مقام ہے۔ لاری بس وہیں تک جاتی ہے آگے پیدل جائیے یا گھوڑوں پر۔ گھوڑوں کے لئے باقاعدہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ پیدل چلنے کے لئے پگ ڈنڈی ہے۔ قلی وغیرہ اسباب لے کر پگ ڈنڈی سے جاتے ہیں۔ ہم نے سامان قلیوں پر لدوایا اور پیدل روانہ ہوگئے۔ اتنی دور پہاڑ کی چڑھائی کا یہ پہلا اتفاق تھا پھر بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں گل مرگ پہنچ ہی گئے۔ حامد علی خاں صاحب، ظہیر صاحب اور احمد خاں صاحب پہلے سے موجود تھے۔ حامد صاحب سے راستے ہی میں ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ دوسرے دن صبح کو الاپتر جانا ہے، شام ہوگئی تھی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ صبح کو ہم چھ آدمی گھوڑوں پر روانہ ہوگئے۔ پہلے کھلن مرگ پہنچے یہ گل مرگ سے دو ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ یہاں سے اصل چڑھائی شروع ہوئی۔ بڑی سیدھی چڑھائی تھی۔ گھوڑے بھی تھک جاتے تھے۔ آخر کوئی ایک میل تک تو سبھی کو پیدل چلنا پڑا۔ راستے میں دو تین جگہ برف پر سے گزرنا پڑا۔ آخر بڑی بڑی چالوں پر سے ہوتے ہوئے الاپتر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ تین طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جھیل کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور بہت میٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھے رہے اور پھر واپس آگئے۔ واپسی میں برف پر پھسلنے پڑا مزا آیا۔ غفور صاحب اور احمد خاں صاحب کا تو بڑی دیر تک یہی شغل رہا۔ کھلن مرگ پہنچ کر سب نے چاء پی اور گھوڑوں پر سوار ہوکر واپس لوٹے۔ دوسرے دن صبح کو کوئی ۹ بجے ٹہلنے نکلے سرکلر روڈ کا چکر لگایا۔ اور ادھر اُدھر گھوم گھام کر وقت گذارا۔ تیسرے دن صبح کو سب لوگ گل مرگ سے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں نے اسباب قلیوں کے حوالے کیا اور پگ ڈنڈی سے نیچے اُترے جن لوگوں کے ساتھ عورتیں تھیں وہ گھوڑوں پر آئے۔ عورتیں بھی گھوڑوں پر آئیں۔ تنگ مرگ پہنچ کر لاری پر بیٹھے اور سری نگر پہنچ گئے۔ اب یہاں سے پہلگام جانے کا ذکر اگلے پرچے میں کریں گے۔

پچھلے مہینے لڑائی کا رنگ بہت بے ڈھب رہا۔ عراق کی لڑائی کے سلسلے میں کچھ جرمن ہوائی فوجیں شام میں آگئی تھیں۔ انگریزوں کے لئے یہ بہت خطرناک بات تھی۔ انگریزی فوجوں نے شام پر فوراً چڑھائی کردی فرانس کی فوجوں نے مقابلہ کیا۔ مگر انگریزی فوجوں کے آگے کچھ پیش نہ گئی اور ہار ماننا پڑی۔ اب صلح کی بات چیت ہورہی ہے۔

ادھر حبشہ میں انگریزوں کی فتح مکمل ہوگئی ہے۔ ہزاروں اطالوی سپاہی، سینکڑوں اطالوی افسر اور بیسیوں اطالوی جنرل انگریزوں نے قید کرلئے ہیں۔

امریکہ دن پر دن لڑائی کے قریب آرہا ہے۔ اُس نے جرمن اور اٹلی کے سفیروں کو اپنے ملک سے چلے جانے کا حکم دے دیا ہے۔ امریکہ کے سفیر بھی ان دونوں جگھوں سے چلے آئے ہیں۔ امریکہ نے آئس لینڈ میں بھی اپنی فوجیں بھیج دی ہیں۔ تاکہ جرمنی اِدھر کوئی کارروائی نہ کرنے پائے۔ آئس لینڈ کی حکومت نے چند شرطوں کے ساتھ اس بات پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

جرمنی نے اب رُوس کے خلاف لڑائی چھیڑ دی ہے۔ دونوں میں گھمسان آن پڑا ہے۔ ہر ہٹلر نے رُوس پر بہت سے الزام لگائے ہیں۔ مثلاً اُس نے بالٹک ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کی یہ حرکت جرمنی کے خلاف تھی۔ اُس نے درۂ دانیال میں بھی راستہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی اور بھی بہت سے الزام ہیں۔ جرمن فوجیں ڈیڑھ ہزار میل لمبے مورچے پر لڑائی لڑ رہی ہیں رُومانیہ اور فن لینڈ کی فوجیں بھی جرمنی کے ساتھ ہیں۔ جرمنی کا یہ حملہ بہت ہیبت ناک ہے۔ مگر رُوسی بھی پوری بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ انگریزوں کو اس لڑائی کی وجہ سے تیاری کا بہت موقع مل گیا ہے۔ انگریزوں کی ہمدردی رُوس کے ساتھ ہے۔ رُوس اور انگلستان میں دوستانہ معاہدہ بھی ہو گیا ہے۔ دونوں مُلکوں میں اس بات پر بہت خوشی ظاہر کی جارہی ہے۔

ہندوستان کی حالت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وائسرائے اپنی کونسل کے ممبروں کی تعداد بڑھانے والے ہیں۔ ڈھاکا۔ بہار شریف، احمد آباد اور بمبئی کے مسلمانوں میں عداوت اسی طرح باقی ہے۔ بنگال کے علاوہ بارش کا زور اِس مرتبہ بمبئی کے علاقے میں زیادہ رہا۔ اتنی سخت بارش ہوئی کہ ریل کی پٹریاں بہہ گئیں، تار اور ٹیلیفون کے کھمبے گر گئے۔ آنے، جانے، خط، تار، ٹیلیفون بھیجنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اب حالت رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہی ہے۔

معمّا نمبر ۲۰ کے حل اِن بچّوں کے صحیح ہیں۔

صحیح حل	انعام اوّل	فی کس ۱۲
خلیل الرحمٰن قدوائی۔ بارہ بنکی	رحیم الدین۔ دہلی	
عبدالجلیل۔ بہار شریف	محمد تقی۔ باڑہ ہندو راؤ۔ دہلی	

ان بچّوں کے حلوں میں ایک غلطی ہے

پریم پرکاش صرّاف ۔ جموں
فاطمہ بیگم اناؤ
زاہدہ خاتون ۔ دہلی
سید اطہر علی ۔ دہلی
محمد عمادالدین گلشنی ۔ حیدرآباد
سیّد مصوّر حسن ۔ دہلی
حافظ محمد یوسف ۔ کلکتہ

انعام فی کس ۲ / ر

کوثر بانو ۔ امروہہ
زکیہ بیگم ۔ باسودہ
احمد نور ۔ اُجین
قاضی محمد اشرف احمد ۔ جودھپور
محمد عبدالباری ۔ بلند شہر
محمد خلیق الزماں ۔ اندرسٹی

.. .. ..

۳۹ء کا تاسیس نمبر
مُفت

ہم کئی بار پیامیوں سے درخواست کر چکے ہیں کہ پیام تعلیم کے خریدار بنا کر ہماری ہمت بڑھائیے تاکہ ہم اچھے سے اچھا پیام تعلیم آپ کے لئے نکال سکیں۔ پیامیوں نے اِس طرف توجہ بھی کی۔ لیکن اس بار ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جو پیامی ایک خریدار بنائے گا اس کو ۸ر انعام بصورت پیام تعلیم تاسیس نمبر سنہ ۳۹ء دیا جائے گا۔

اُمید ہے کہ ہر پیامی اس نمبر کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کے پاس یہ نمبر ہوگا انھیں دُوسرا بھیج دیا جائے گا۔

منیجر "پیام تعلیم"

معمّا نمبر ۱۲

پہلا انعام ۔ ٦ ؍
دوسرا انعام ۔ للعہ ؍

۴	■	■	۳	■	۲ س	و	۱ ر
ی		۶ ا	۵ ر	■		■	
م	■		۹ د	■	ا	۸	۷ پ
■	۱۳ س	۱۲	■	۱۱ پ		و	۱۰
۱۶ ل		۱۵ ا	■		۱۴ ہ	■	ہ
گ		۱۸ س	■		■	۱۷ خ	■
	۲۲ ہ	■	۲۱ ا	ہ	۲۰ س		۱۹ م
■	ی		۲۴ س	■		ق	۲۳

دائیں سی بائیں

(۱) لوگوں کا خیال ہے کہ اس ملک کو فتح کرنے کے بعد ہٹلر ہندوستان کا رخ کرے گا۔
(۵) اگر جج .... ہوجائے تو ہوشیار وکیل اپنے موافق فیصلہ کرا سکتا ہے۔
(۷) کسی موٹے آدمی کو دیکھ کر مذاق میں کہا جاتا ہے کہ بھئی کس چکی کا ... ہوا آٹا کھاتے ہو۔
(۹) اس کی حرکت بند ہوتے ہی انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
(۱۰) عرب کا ملک ایشیا ... اور افریقہ کے ٹھیک وسط میں ہے
(۱۲) غیر شادی شدہ عورت کو انگریزی میں .. کہتے ہیں۔
(۱۴) یہ معمّا بہت آسان ..
(۱۵) ہندوستانیوں کا چارہ (بے ترتیب)
(۱۸) ایک ترکاری
(۱۹) قوت .... چھونے کی قوت (بے ترتیب)
(۲۲) .. ہٹلر تو دنیا پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔
(۲۳) خدا کو دیکھا نہیں ... سے پہچانا ہے۔
(۲۴) ہندوؤں کی اس رسم کو اکبر نے بند کیا تھا۔

اوپر سی نیچے

(۱) خیدر بدن، زخمی تن، پانوں زیادہ چلتا ہے
امیر خسرو یوں کہیں وہ ہوئے ہوئے چلتا ہے
(۲) زہرہ سب سے زیادہ چمک دار اور خوب صورت .... ہے
(۳) عام طور پر مردے کا جسم ... ہو جاتا ہے۔
(۴) ... حکیم خطرہ جان ... ملا خطرہ ایمان۔
(۶) ایک قیمتی پتھر
(۸) تین ہندسوں کا ایک ایسا عدد جس کے ہندسوں کا مجموعہ صرف ایک ہی
(۱۱) آج کل ... والا ہی اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔
(۱۳) جو مسلمان یہ نہیں وہ مسلمان نہیں (انونو کا قول)
(۱۶) جامعہ میں داخلے کے لئے دفتر شیخ الجامعہ .... دہلی سے خط کتابت کیجئے۔
(۱۷) بجلی جسے عالم نے بھی سمجھو بد زبان ... کو نقارہ خدا سمجھو (ذوق)
(۱۹) ساتھ
(۲۰) ایک بیماری
(۲۱) دادا مہ بچے کتاب کو .. طرح پھاڑا نہیں کرتے
بچہ :- تو کس طرح پھاڑ ڈلں - دادا -

(۱) معمّا ۱۰ / اگست تک بھیج سکتے ہو۔

(۲) ایک ہی لفافے میں کئی معمّے بھیجے جا سکتے ہیں۔

قواعد

۱۔ تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ استاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں۔ عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ جو رحلوں کی رعایتی فیس

۴۔ آٹھ حلوں کی حد ہے۔

۴۔ دونوں انعام تقسیم کر دئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۵۔ تمام حل ۱۰ / اگست تک دفتر پیامِ تعلیم جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں

۶۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا

۷۔ پیامِ تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کوپن کے چاروں طرف جو نقطے والی لائن ہے وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔

۹۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۱۰۔ ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمّے آنے چاہئیں

۱۱۔ علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہئے۔

۱۲۔ معمّا حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو۔

۱۳۔ ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں

۱۴۔ دال اور ڈال کا فرق نمایاں ہو۔ (د ۔ ڈ)

۱۵۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ۔ ے)

۱۶۔ جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو، وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہئے۔

۱۷۔ املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

۱۸۔ تمام حل ڈاک کے لفافے پر بھیجے جائیں۔

۱۹۔ نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط ہونا چاہئے۔

۲۰۔ پتہ:۔ سب ایڈیٹر، پیامِ تعلیم، مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ نئی دہلی

معمّا نمبر ۲۰ کا صحیح حل

۵ م	ر	ک		۳ ٹ	۲ ی	ر	۱ ک
ح		ا	ش	ن	۶ ا		چ
ن		ل		م	و	م	۷ ہ
ت	۹ پ	ی	۸ غ				
	چ		ب	۱۲ ا	۱۱ ب	ت	۱۰ ا
۱۴ ط		م	ا	ر	۱۳ ا		پ
ے	۱۶ م		ر	ا	ح	۱۵ ت	
ش	ر	۱۸ ن		م	ا	ل	۱۷ ک

معما نمبر ۲۱
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۲۱
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۲۱
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ
معما نمبر ۲۱
کوپن نمبر
نام
پتہ
تصدیق
ٹکٹ

فوج لے جانے والی موٹریں

دیم

طہ علی صدیقی متعلم ک

Regd. L. No. 1961

ایک اُستاد کی آپ بیتی

ایک اُستاد نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ یہ آپ بیتی کیا ہے جامعہ ملّیہ کی اکیس سال کی مکمل تاریخ ہے۔ جامعہ کے نئے اور پرانے طالب علم پیام تعلیم کے چھوٹے اور بڑے پڑھنے والے مولوی عبدالغفار صاحب مدھولی سے ضرور واقف ہوں گے۔ یہ تاریخ انھی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب دو جلدوں میں ہو گی۔ ہر جلد کی قیمت دو روپیہ ہے۔ اگر نئے اور پرانے جامعی اور پیام تعلیم پڑھنے والے عزیز ایک یا دونوں جلدوں کی قیمت پیشگی بھیج دیں تو کتاب کے چھپنے میں بہت سہولت ہو جائے۔ جامعی بھائیوں سے خاص طور پر درخواست ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے قیمتی ہو گی ماہرین تعلیم کے لئے اس میں اکیس سالہ جدید تعلیمی تجربے کا نچوڑ ہے۔

اس پتے پر خط کتابت کی جائے۔

عبدالغفار صاحب مدھولی۔ مدرس مدرسہ ابتدائی

جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ ڈاک خانہ جامعہ نگر، دہلی۔

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

ڈل جھیل کے چند خوبصورت مناظر

ڈل میں ہاؤس بوٹ ... کا منظر

جھیل ڈل میں ہاؤس بوٹ کا منظر

نشاط باغ سرینگر

جھیل ڈل کا ایک عام منظر

پیام تعلیم
دہلی

پیام تعلیم :- دہلی۔ یوپی۔ سی پی۔ قلات۔ بہار۔ میسور۔ حیدر آباد اور پنجاب کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔ منیجر

ایڈیٹر محمد حسین حسّان

قیمت سالانہ عہ۔ فی پرچہ ۳ر

جلد ۲۲ نمبر ۹

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی

ستمبر ۱۹۴۱ء

FIROZE 41

لڑائی کی وجہ سے کاغذ کی قیمت تین گنا بڑھ گئی ہے۔ لکھائی چھپائی کے اور سامان کی قیمت بھی اسی طرح زیادہ ہوگئی ہے۔ اخباروں اور رسالوں کے لئے یہ بڑا نازک زمانہ ہے۔ بہت سے رسالوں نے اپنے صفحے گھٹا دئے ہیں اور کاغذ معمولی لگانے لگے ہیں کیا کیا جائے مجبوری ہے۔

باوجود ان دقتوں کے پیام تعلیم کو ہم اسی اہتمام سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پیامیوں نے ہماری مدد کی تو انشاء اللہ اس کی ظاہری شان کو گھٹنے نہ دیں گے۔ سب پیامی رسالے کے ایک ایک دو دو خریدار بھی بنا دیں تو ہماری بہت مدد ہو جائے گی۔ اُمید ہے کہ ہماری یہ آواز بے اثر نہ رہے گی۔

اس مرتبہ گنجائش کی کمی کی وجہ سے بہت سے اچھے اچھے مضمون چھپنے سے رہ گئے۔ ان میں شہد کی مکھی، چراغ کی کہانی، روس، پک نک خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ اور بعض اور اچھے اچھے مضم[ون] اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

بچوں کی یہ نظمیں پیام تعلیم میں نہ چھپ سکیں
(۱) برسات (کلکتہ) (۲) پیام تعلیم (پٹنہ) (۳) تندر[ستی] (حیدرآباد دکن) (۴) طوطا (الہ آباد) - یہ بچے اگر چا[ہیں] تو ٹکٹ بھیج کر اپنی نظمیں منگا لیں۔ ۱۰ ستمبر [کو] ردّی کر دی جائیں گی۔ ایک نظم "ہمارے نگر میں" بہ[ت] اچھی ہے مگر پیام تعلیم کے معیار سے اونچی ہے ا[س] لئے نہیں چھپ سکتی۔

بہت سی بچیاں اور بچّے اب اچھی اچھی نظمیں لکھ[نے] لگے ہیں اور یہ بہت خوشی کی بات ہے مگر اکثر بچے بہ[ت] لاپرواہی سے کام لیتے ہیں غلط سلط جو جی میں آتا [ہے] لکھ کر بھیج دیتے ہیں ذرا توجہ اور محنت نہیں کرتے بعض بچ[ے] دوسروں کی نظمیں اپنے نام سے لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ یہ بہ[ت] بُری بات ہے۔ خصوصاً ہمارے عزیز پیامیوں کو تو

۴ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

ٹیگور کی جُدائی

(۱)

ٹیگور نے اِس جہاں کو چھوڑا افسوس
سب اہلِ جہاں سے مُنہ کو موڑا افسوس

جتنی بھی ہو یادُاُن کی زِیادہ ، کم ہے
جتنا بھی کریں اُن کا ہے تھوڑا افسوس

(۲)

ہر قوم کے ساتھ کی بھلائی اُس نے
خِدمت کی نئی شان نبھائی اُس نے

خِدمت ہی سے عظمت ہے یہ سب جانتے تھے
پر بات یہ سچ کرکے دِکھائی اُس نے

(۳)

کیوں آہ کرے کس لئے فریاد کرے
کیوں قلب کو اپنے کوئی ناشاد کرے

نیرؔ وہی کام کرکے ہر شخص دِکھائے
ٹیگور کی رُوح کو جو دِل شاد کرے

محمد شفیع الدین صاحب۔ نیرؔ

ٹیگور

ہمارے دیس میں صرف دو ہی شاعر تھے جن کی شاعری کی شہرت ہندوستان کی حدوں سے گذر کر دور دراز بلکہ یوں کہو کر ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ اقبال اور ٹیگور۔ اقبال تو کئی سال ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب ۷ اگست کو اچانک ٹیگور کی سناؤنی آئی۔ اور سارا ملک اپنے ایسے اچھے شاعر کے غم میں ڈوب گیا۔ کلکتہ کے کالج اور اسکول، بازار، بمبئی اور کلکتے کے کونسل اور اسمبلی کے اجلاس فوراً بند ہو گئے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی نے غم و افسوس کا اظہار کیا۔ اخباروں میں ہمدردی کے پیام چھپے۔ جگہ جگہ تعزیت کے جلسے ہوئے۔ دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں نے ہمدردی کے پیام بھیجے۔

ٹیگور کی تندرستی تین چار سال سے خراب تھی۔ کئی بار حالت نازک ہو ہو گئی پھر اچھے ہو گئے، مگر اس مرتبہ مرض ایسا بڑھا کہ دوا و علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مرنے کی خبر بجلی کی طرح تمام کلکتے میں پھیل گئی۔ ارتھی میں لاکھوں کی تعداد میں ہندو مسلمان شریک تھے۔ رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر ٹیگور آج سے کوئی اسّی سال پہلے بنگال کے ایک شریف اور امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے باپ دیندر ناتھ ٹیگور اس صوبے کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ٹیگور نے زیادہ تر تعلیم اپنے گھر پر ہی پائی۔ اسکول میں اُن کا جی نہ لگتا تھا۔ دریا، جنگل اور قدرتی مناظر سے اُنھیں بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ یوں سمجھو کہ قدرت نے اُنھیں شاعری کے لئے پیدا کیا۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ اچھے خاصے شعر کہنے لگے تھے۔ چودھویں سال میں تو اُن کی نظمیں اور مضمون بنگالی رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔ اُنھوں نے انگریزی زبان میں بھی بہت مہارت پیدا کر لی تھی۔ اور بنگالی کے ساتھ انگریزی میں بھی مضمون لکھنے لگے

تھے۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ تعلیم کی غرض سے انگلستان بھی گئے مگر کوئی ڈگری لے کر نہ آئے۔ آہستہ آہستہ اُن کی شاعری۔ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگی۔ اُن کی کئی اچھی اچھی کتابیں انگریزی میں نکلیں اور ہر جگہ قابلیت کی دھوم مچ گئی۔ انھوں نے کئی بار یورپ، امریکہ اور جاپان کا دورہ کیا اور اپنا پیام لوگوں کو زبانی سنایا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں اُنھیں نوبل پرائز ملا۔ علمی دُنیا میں یہ عزت سب سے بڑی سمجھی جاتی ہے۔ حکومت نے بھی اُنھیں سر کا خطاب دیا۔

وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ ایک سچے محب وطن بھی تھے۔ کئی بار ایسا موقع آیا کہ اُنھیں حکومت کی سختی سے سخت مخالفت کرنا پڑی ہے۔ جلیان والا باغ کے حادثے کے وقت تو اُنھوں نے سر کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ شاعر ہمیشہ خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکتے۔ مگر ٹیگور ان شاعروں میں سے نہ تھے اُنھوں نے اپنے اصولوں کے مطابق بول پور میں ایک مدرسہ کھول دیا۔ یہ مدرسہ کالج اور کالج سے یونیورسٹی بنا اور اب ملکوں ملکوں کے اُستاد اس میں پڑھاتے اور ملکوں ملکوں کے طالب علم اس میں پڑھتے ہیں۔ اپنے طرز کی یہ بالکل ایک نئی چیز ہے۔ ٹیگور نے اپنی ساری آمدنی اس پر وقف کر دی ہے اور جب کبھی ضرورت پڑی ہے خود بڑھاپے میں چندے کے لئے دور دور کا سفر کیا ہے۔

اس وقت ٹیگور کی جدائی میں پورا دیس سوگ وار ہے۔ اُن کی موت کوئی معمولی موت نہیں ہے۔ مگر سچ پوچھو تو وہ مرے نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری اُن کے افسانے اور ناول اُن کی مصوری یہ سب چیزیں اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور سب سے بڑھ کر اُن کو زندہ رکھنے والے تم ہو۔ وشوا بھارتی کے وہ طالب علم ہیں۔ جو ٹیگور کا پیام تمام دنیا کو پہنچائیں گے اور ٹیگور جس اونچائی پر پہنچے تھے اُس سے بھی آگے جانے کی کوشش کریں گے۔

ثریا :- ارے ارے اس میں تو پانی بھرا رہتا ہے۔

جما :- نہیں ! نہیں ! وہ نہیں - اسی کے پاس ہی ایک اور جو چھوٹا سا گڑھا ہے۔ اس میں

ثریا :- اچھا، یہ دعوت کیوں اور کس [illegible]

جما :- تمہارا ذہن اب بہت کم زور ہوتا جا رہا ہے ایک بار بتا چکا ہوں اور تم بھول گئیں۔ ثریا نے اس پر کچھ غصے سے جما کو دیکھا اور ذرا بگڑ کر بولی" تم نے کب مجھ سے اس کے بارے میں کہا تھا۔

جما :- ابھی ابھی میں نے نہیں کہا کہ میری عمر کے تمام جانوروں کی آج دعوت ہے۔ یہ دعوت ہمارے بڑے بھائی کر رہے ہیں۔

ثریا :- مگر جانوروں کی دعوت میں میں کیوں جا رہی ہوں۔ میری تو کچھ آج ہی زبان نہیں کھلی۔

جما :- یہ ہم لوگوں کے یہاں کی رسم ہے کہ ہر جانور چاندرات کی دعوت میں اپنے ساتھ ایک اور جانور کو لا سکتا ہے جس سے اس کو بہت دوستی ہے۔

ثریا :- تو گویا میں بھی ایک جانور ہوں ؟

جما :- مسکرا کر تو نہیں بلکہ تم جانور کی دوست ہونا

مسٹر جما ثریا کی [illegible] کو پکڑے چلے جا رہے تھے جب یہ ... ثریا کے ابا کے باغ کے اس حصے میں پہنچے جہاں صرف آموں کے درخت ہیں تو مسٹر جما نے ادھر ... کا راستہ پکڑا - باغ میں درخت ہی درخت تھے - ان کے نیچے باہر جیسی سفید چاندنی نہ تھی۔ کہیں کہیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر خوب صورت کٹے ہوئے پھولوں جیسی چاندنی زمین پر پڑ رہی تھی۔ یہ دونوں درختوں میں سے گذرتے اس فوارے کے نزدیک پہنچے جہاں سے گرمیوں میں درختوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس جگہ اندھیرا بہت تھا۔ اور کبھی کبھی جھینگروں کی آوازیں آنے لگتی تھیں یا مینڈکوں کی ٹر ٹرا۔ رات میں اس طرح اکیلے، ثریا کو کچھ ڈر

معلوم ہونے لگا اور اُس نے جمّا سے کہا "جمّا!
چلو بھاگ چلیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"
جمّا:۔ "ہش" تم لڑکی ہونا۔ ہم جیسے مردوں کا سا
دل تو تمھارے پاس ہے نہیں۔ چلو بھاگ
چلیں۔ (ثریا کا منہ چڑھاکر) شرم نہیں آتی
دروازے سے آکر واپس ہو جائیں؟
ثریا:۔ (باغ میں چاروں طرف دیکھ کر) مگر دعوت
ہو کہاں رہی ہے۔ سارا باغ تو سنسان ہے
نہ کوئی آدمی نہ انسان بھلا اس جگہ ڈر نہ معلوم
ہو تو اور کیا ہو۔

یکایک سامنے والے گڑھے سے مینڈک جیسا
چھوٹا سا انسان اچھے اچھے کپڑے پہنے۔ سر پہ ٹوپی
پاؤں میں اچھا سا جوتا۔ ہاتھ میں پتلی سی ایک چھڑی
لئے آکھڑا ہوا۔ ثریا اُس کو دیکھ کر کچھ ڈر گئی۔ اور جب
یقین ہو گیا کہ یہ حضرت مینڈک ہیں تو یہ انھیں حیرت
سے دیکھتی رہی۔ جمّا کو دیکھ کر مینڈک صاحب نے
اس طرح سے سلام کیا جس طرح ثریا کے ابا کو فوج
کے سپاہی آکر سلام کرتے ہیں۔ سلام کرنے کے بعد
جمّا نے اپنی واسکٹ سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا
اور مینڈک صاحب کو دکھا کر آگے بڑھنے لگے۔ مگر
جیسے ہی ثریا نے اُن کے پیچھے آگے بڑھنا چاہا مینڈک
صاحب نے چھڑی سے روک کر پوچھا "تم کہاں
جا رہی ہو؟"

ثریا کا تو جیسے خون خشک ہو گیا۔ اس نے جلدی
سے ڈرتے ہوئے کہا "مجھے جمّا اپنے ساتھ لائے
ہیں۔ جمّا نے یہ سن کر مینڈک صاحب سے کہا "جی
ہاں جناب ٹرٹر۔ یہ میری دوست ہیں اور ہمارے
ساتھ دعوت میں جا رہی ہیں۔"

"او ۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے۔" مسٹر ٹرٹر
نے ثریا کو اس طرح دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ معافی
مانگ رہے ہوں۔ جب یہ لوگ اس گڑھے کے پاس
پہنچے جہاں سے مسٹر ٹرٹر باہر نکلے تھے تو مسٹر جمّا نے
ثریا کا ہاتھ پکڑ کر گڑھے میں اُترنے کا اشارہ کیا ثریا
نے جو گڑھے کو دیکھا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا
گڑھا بہت گہرا تھا اور اس میں اندھیرا گھپ ہو رہا
تھا۔ اتنے میں مسٹر ٹرٹر نے یہ کہتے ہوئے ایک چھلانگ
لگائی "آیئے آپ لوگ تشریف لائیے" اور پھر کچھ
دیر بعد اندر سے چھپاک سے ایک آواز آئی جیسے کوئی
پانی میں کودا ہو۔ ثریا یہ دیکھ کر اور بھی ڈر گئی اس
نے جمّا کو یہ کہتے ہوئے سنا "چلو چلو ننھی بی! دیر
ہو رہی ہے" اور ثریا ابھی کچھ سوچ ہی رہی تھی
کہ جمّا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ ثریا کے منہ
سے زور سے ایک چیخ نکلی اور مسٹر جمّا کے ہاتھ سے
اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ ثریا ایک بار اور زور سے
چیخی اور وہ بہت تیزی سے نیچے گرنے لگی۔ گھپ اندھیرے
میں اُس نے آنکھ کھول کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی

مگر وہ صرف یہ جان سکی کہ وہ ایک بہت ہی گہرے کنوئیں میں جس کی دیواریں کچی تھیں گرتی جا رہی تھی۔ وہ نیچے چلی جا رہی تھی۔ اور سوچتی جاتی تھی "اب میں پانی میں گری اور اب پانی میں گری۔" اتنی اونچائی سے گرنے پر وہ ضرور پانی میں ڈوب جائے گی۔ اسے تیرنا بھی نہ آتا تھا جب وہ یہ باتیں سوچتی تو مارے ڈر کے اپنی آنکھوں کو خوب زور سے بند کر لیتی اور خوف کے مارے اس کا بدن کانپنے لگتا اس نے تین چار بار جما کو بھی زور سے پکارا مگر جب وہ پکارتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی دوسرا اس کے جواب میں سنیکڑوں ... تب اس کا منہ چڑھا رہا ہو اور پھر اس نے جما کو پکارنا بند کر دیا۔

ثریا کو نیچے گرے بہت دیر ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک اور نیچے اندھیرے میں گرتی چلی جا رہی تھی مگر جوں جوں وہ نیچے آتی جاتی ویسے ویسے اندھیرا کم ہوتا جاتا۔ "جانے یہ کم بخت کنواں کتنا گہرا ہے۔ اتنی دیر سے گر رہی ہوں اور ابھی تک گرنا ختم ہی نہیں ہوتا ہے۔" اس کا خوف اب کچھ کچھ دور ہو چلا تھا۔ گرتے گرتے ثریا نے دیکھا کہ کنوئیں کی دیوار میں ایک سوراخ کے اندر ایک شہد کی مکھی بیٹھی ہے۔ ثریا کو گرتے دیکھ کر شہد کی مکھی نے پکارا۔ "ذرا ٹھہرو بہن! میں بھی دعوت میں چل رہی ہوں۔ مکھی کی آواز سن کر ثریا کو زیادہ تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ مسٹر جما نے پہلے ہی اس کے بارے میں ثریا سے کہہ دیا تھا۔ مکھی کی آواز پر ثریا رک گئی اور تھوڑی دیر بعد مکھی بھی بھنبھناتی ہوئی آ گئی۔ اس کے بعد ثریا پھر نیچے گرنے لگی۔

"تم اکیلی کیسے جا رہی ہو بہن؟" مکھی نے پوچھا

"نہیں بی! جما نے بے کار مجھے اس مصیبت میں پھنسا دیا۔ کیا مزے میں گھر پر سو رہی تھی۔ جانے گھر واپس جا بھی سکوں گی یا نہیں:" ثریا نے منہ بناتے ہوئے مکھی سے کہا۔

"کیوں یہ مصیبت کیسی" مکھی بولی بھلا دعوت میں جا رہی ہو اور کہتی ہو گھر واپس جا بھی سکو گی یا نہیں ارے وہاں تم کو کوئی کھا تھوڑا ہی جائے گا۔"

"یہ دعوت میں جا رہی ہوں؟" ثریا ناراض ہو کر بولی۔ "کم بخت گڑھے میں گرے جانے کتنی دیر ہو چکی مگر گرنا ابھی تک ختم ہی نہیں ہوا۔ ایسی دعوت کو سات سلام۔"

"بس اب تھوڑی دیر اور گرنا ہے۔ وہ روشنی نہیں دیکھ رہی ہو اسی جگہ پر تو ہم لوگ گریں گے۔" مکھی نے اپنی انگلیوں سے ثریا کو نیچے دکھاتے ہوئے کہا۔

گڑھے کا اندھیرا اب بالکل دور ہو چکا تھا اور نیچے کنوئیں کا پانی شیشے جیسا چمک رہا تھا ہلکے ہلکے ثریا کے کانوں میں طرح طرح کے باجوں کی آوازیں آنے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد ثریا چھپ سے پانی پر آ گری۔ وہ سمجھتی تھی کہ گرتے ہی اسے چوٹ لگے گی

وہ ضرور پانی میں ڈوب جائے گی۔ مگر پانی پہ گرتے ہی نہ تو چوٹ آئی اور نہ وہ اس میں ڈوبی بلکہ پانی پر مزے میں کھڑی رہی۔ اس نے اپنے پاؤں سے زور زور سے پانی کو دبانے کی کوشش بھی کی۔ مگر اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پانی پر نہیں بلکہ کسی سفید چکنے پتھر کے فرش پر کھڑی ہے۔ باجے کی آواز بہت تیز آرہی تھی۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سی چڑیاں، مینڈک، جھینگر وغیرہ ایک ساتھ مل کر گا رہے ہوں۔ ثریا نے گھوم گھام کر ہر طرف دیکھا تو ہر جگہ بجائے کنوئیں کی کچی دیوار کے پتھر کا بہت لانبا چوڑا فرش تھا اور کچھ دور پر عجیب عجیب قسم کے لوگ عجیب عجیب طرح کے لباس پہنے آجا رہے تھے اتنے میں وہ شہد کی مکھی اس کے پاس آئی اور بولی۔

"چلو نا بہن! معلوم ہوتا ہے کہ دعوت شروع ہوگئی"۔ ثریا نے جو روشنی میں مکھی کو دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئی کیونکہ یہ ویسی مکھی نہ تھی جنھیں ثریا باغ میں پھولوں پہ بیٹھا دیکھا کرتی تھی۔ بلکہ یہ چھوٹا سا ریشمی فراک پہنے ہاتھوں میں مہندی لگائے بہت ہی خوب صورت معلوم ہو رہی تھی۔ ثریا نے تعجب سے اُس کے فراک کو دیکھا۔ ایسا اچھا کپڑا اُس نے آج تک نہ دیکھا تھا اس طرح اپنے فراک کو دیکھ کر مکھی نے ثریا سے کہا "کیا کروں بہن آج کل کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ نیا فراک بنوانے کی ہمت نہیں پڑتی اس فراک کو خریدے آج اٹھائیس روز کم ایک مہینہ ہو رہا ہے"۔

"اٹھائیس روز کم ایک مہینہ؟؟" ثریا بے اختیار ہنس پڑی۔ "اجی تب تو یہ فراک بالکل نیا ہے" یہ لوگ اس طرح باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ پیچھے سے مسٹر چھما "ننھی بی، ننھی بی" پکارتے دوڑے آئے۔ ثریا چھما کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ "کہاں چلے گئے تھے چھما؟ تم بڑے خراب آدمی ہو"۔

چھما: (مسکرا کر) نہیں نہیں میں آدمی نہیں ہوں ثریا بی! آتے وقت میرا ہاتھ تم سے چھوٹ گیا۔ اس لئے میں تم سے الگ ہو گیا۔

پھر انھوں نے مکھی بی کو دیکھ کر کہا "عمر دراز منی بیگم! آپ کو یہ کہاں مل گئی" "عمر دراز مسٹر چھما۔ راستے میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا چلئے میں بھی چلتی ہوں اور پھر ہم لوگ ساتھ ہو گئے"!

"اچھا! چلئے چلئے۔ دعوت شروع ہو چکی۔ بینڈ بھی بج رہا ہے"۔ مسٹر چھما اس طرف جانے لگے۔ جہاں پر بہت سے پرندے کیڑے اور مچھلیاں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دعوت شروع ہو چکی تھی کل مہمان کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سامنے میزیں لگی تھیں۔ ثریا ان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مسٹر چھما کنارے پر ایک خالی میز دیکھ کر جلدی سے کرسیوں کو گھسیٹ کر خود بھی بیٹھ گئے اور ثریا اور منی بیگم کو بھی بٹھا دیا۔

(باقی آیندہ)

برسات

قمر

کالی کالی گھٹائیں آئیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آئیں
اودے اودے، بادل آئے
بجلی دامن میں لے آئے
رم جھم رم جھم پانی برسا
دم کے دم میں زمانہ بدلا
ندی نالوں میں ہے ہل چل
جھیل اور تالاب ہوگئے جل تھل
چاروں طرف چھائی ہریالی
گہری سبزی، کالی کالی
گلشن میں جوہی جو پھولی
اس کی خوشبو ہے البیلی
یہ سب قدرت ہے اس رب کی
روزی ہے جس کے ہاتھ میں سب کی

کیوں نہ قمر حمد اس کی کریں ہم
اس کے آگے سر کو کریں خم

فضل الدین صاحب اثر ایم اے

بحر روم میں کورسکا نام کا ایک جزیرہ ہے۔ اگر ہم آج سے قریب ڈیڑھ سو برس پہلے اس جزیرے کے ایک شہر اجاکسیو میں صبح صبح سیر کے لئے نکلتے تو ہمیں سڑک پر ایک خوب تندرست اور توانا لڑکا ملتا اس لڑکے کی عمر اس وقت کوئی ۹ سال ہوگی یہ لڑکا اسی سڑک سے روز مدرسے جایا کرتا تھا ایک ہاتھ میں کتابیں ہوتی تھیں اور ایک میں کپڑے میں بندھی ہوئی کچھ روٹی۔ اس لڑکے کا نام نپولین تھا۔

اس سڑک پر نپولین کے راستے میں سپاہیوں کی ایک بیرک بھی پڑتی تھی۔ ایک دن نپولین نے ایک سپاہی کو بیرک کے دروازے پر جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا کھاتے دیکھا۔ نپولین نے اپنی گیہوں کی روٹی سپاہی کو دے کر جو کی روٹی کا ٹکڑا اس سے مانگا۔ سپاہی نے نپولین سے پوچھا "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟" نپولین نے جواب دیا "سپاہی جو کی روٹی کھاتے ہیں اور مجھے ایک دن سپاہی بننا ہے۔ اس لئے مجھے جو کی روٹی کھانے کی ابھی سے عادت ڈالنی چاہیئے"

بات اصل میں یہ تھی کہ فرانس اور کورسکا پر دولت مندوں کا راج تھا۔ غریب کسی گنتی میں نہ تھے۔ نپولین کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔ خود نپولین کی ماں کو حکومت کی سختیوں سے تنگ آکر اپنا گھر بار چھوڑ دینا پڑا تھا۔ نپولین کی ماں بہت خوب صورت عورت تھی۔ اور اس میں ایک ملکہ کی سی آن بان تھی۔ نپولین نے بڑے ہو کر جب اپنی ماں سے اس کی مصیبتوں کا حال سنا تو اس نے اسی وقت سے ارادہ کر لیا کہ وہ یا تو کورسکا کا سپاہی بنے گا یا اس کا مورخ۔

جب نپولین نو سال کا ہوا تو اسے فرانس کے ایک اسکول میں بھیجا گیا۔ لیکن یہاں وہ اپنے ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے دور ہی دور رہتا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی دولت مندوں کے لڑکے تھے جن کی حکومت

لہ یہ مضمون مسٹر فلس رگ کا ایک انگریزی مضمون پڑھ کر لکھا گیا ہے۔

نے نپولین کی ماں کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ نپولین نہ اُن سے بات چیت کرتا اور نہ اُن کے کھیلوں میں شریک ہوتا۔ گھر پر تو وہ شور بھی کرتا اور کبھی کبھی تیزی میں لوگوں سے لڑ جھگڑ بھی لیتا لیکن مدرسے میں بالکل چپ چاپ رہتا تھا۔ اپنا کام البتہ بڑی محنت سے کرتا۔ حساب سے اُسے خاص دلچسپی تھی۔

تھوڑے دن کے بعد نپولین پیرس کے ایک فوجی مدرسے میں بھیجا گیا اور ۱۶ سال کی عمر میں وہ نائب لفٹنٹ کی حیثیت سے فرانس کی فوج میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اسے قریب تیرہ روپئے ہفتہ تنخواہ ملتی تھی۔ نپولین تنہا رہتا تھا اور بہت ہی کم لوگوں سے اس کی رسم و راہ تھی۔ وہ فرصت کا سارا وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ کتابیں خود نہیں خرید سکتا تھا تو دوسروں سے مانگ لاتا تھا اسے وہ کوئی شرم کی بات نہیں سمجھتا تھا۔

اس وقت فرانس میں بعض بڑی اچھی اچھی کتابیں چھپ رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کتاب خاص طور سے نپولین کو پسند تھی۔ یہ کتاب فرانس کے ایک نوجوان روسو نے لکھی تھی۔ روسو کی کتاب کا پہلا ہی جملہ یہ تھا۔ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔" روسو نے اپنی اس کتاب میں تمام نوجوانوں کو اس بات پر اُبھارا تھا کہ انھیں یہ زنجیریں کاٹ کر انسان کو پھر آزاد کر دینا چاہیے

نپولین نے یہ کتاب پڑھ کر ایسا محسوس کیا کہ گویا وہ خود ہی اِن زنجیروں کو کاٹنے کے لئے پیدا ہوا ہے جنھوں نے انسان کو غلام بنا رکھا ہے۔

فرانس میں ان دنوں ایک بادشاہ لوئی ششم کی حکومت تھی۔ لوئی اور اس کی ملکہ عیش کے بندے تھے۔ یہ دونوں پیرس کے قریب وارسائی میں ایک بہت عالی شان محل میں رہتے تھے۔ ہر وقت بے شمار نوکر چاکر اور درباری بادشاہ اور ملکہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ صرف ایک شہزادی کے لئے اسّی خادم مقرر تھے لیکن اس تمام شان و شوکت کے لئے غریبوں کی رگوں کا خون نچوڑ کر روپیہ اکٹھا کیا جاتا تھا۔ کسانوں کے کھیت امیروں کے پالتو کبوتر چُگ جاتے تھے۔ پھر جب بادشاہ اور درباری شکار کے لئے نکلتے تو ہری بھری کھیتیوں کو جانوروں کی طرح روندتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ لیکن کسی کو ہونٹ ہلانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

آخر ایک دن صبر کا پیالا بھرتے بھرتے چھلکا۔ اس وقت تک بہت سے لوگ روسو کی کتاب پڑھ چکے تھے اور انھوں نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ظلم کی لہر کو اب آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ بعض جگہ کسان امیروں کے مقابلے پر آ گئے اور انھیں شکار سے روکا۔ فرانس کے کسانوں کی دیکھا دیکھی کورسکا میں بھی لوگوں نے ہمت سے کام لینا شروع کیا۔ نپولین

فوراً پیرس سے کورسکا پہنچا لیکن کورسکا والوں نے نپولین پر بھروسا نہیں کیا۔ نپولین کے پورے خاندان کو کورسکا چھوڑ کر فرانس میں پناہ لینی پڑی۔

پیرس میں بغاوت کی آگ اب پوری طرح بھڑک چکی تھی۔ اور سب سے پہلا کام جو باغیوں نے کیا وہ یہ تھا کہ لوئی، لوئی کی ملکہ اور لوئی کے بہت سے درباریوں کو قتل کر ڈالا۔ اس وقت حالات اس قدر نازک تھے کہ ہر شخص کو اپنی جان خطرے میں نظر آتی۔ نپولین کو لوگوں کی اس بے راہ روی سے رنج ضرور ہوا لیکن جب جرمنی، آسٹریا اور برطانیہ کے بادشاہوں نے فرانس کے امیروں کے لئے فوجیں بھیجنا شروع کردیں تو نپولین کو غصہ آیا اور وہ ایک سچے وطن پرست سپاہی کی طرح ان فوجوں کے مقابلے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ آخر نپولین کو کامیابی ہوئی اور اسے فوج کا جنرل بنادیا گیا۔ نپولین نے اب یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی خودغرض بادشاہوں کے چنگل سے چھڑانے کی سوچی۔ اٹلی اور بلجیم وغیرہ ملکوں میں غیر بادشاہوں کی حکومت تھی جب نپولین ان کی آزادی کا ذمہ دار بن کر کھڑا ہوا تو بچہ بچہ اسے دعائیں دیتے تھے تلوار چلتی تھی۔ کشت و خون ہوتا تھا لیکن لوگوں کو یہ اطمینان تھا کہ اگر وہ نہیں تو ان کے بچے آزاد لوگوں کی زندگی بسر کرسکیں گے۔ یہی جذبہ ہر شخص کو آگے بڑھاتے گیا۔ نپولین کا ارادہ تھا کہ وہ ایک قدم بڑھا کر رودبار انگلستان کے اس پار انگلستان میں بھی شہنشاہیت کا چراغ بجھادے۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ البتہ اس کی فوجوں کو اٹلی، بلجیم، پرشیا اور اسپین سب ہی جگہ فتح ہوتی رہی۔

۱۷۹۹ء میں نپولین کو فرانسیسی جمہوریت کا صدر بنادیا گیا۔ اب لوگ بہت خوش تھے۔ کسان جب صبح کھیت جوتنے نکلتے تو انھیں اطمینان ہوتا کہ جو زمین وہ جوت رہے ہیں وہ زمین اب ان کی ہے وہ نئے شوق کے ساتھ اپنی گایوں کے دودھ سے گھی اور مکھن نکالتے اور خود خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اسے بازار میں بیچ دیتے۔ اس لئے اب جاڑوں میں ان کے بدن پر گرم کپڑے بھی نظر آنے لگے اور ان کے چہروں اور کھیتوں کی شکل و صورت بھی بدلنے لگی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے جا بجا مدرسوں کا بھی انتظام تھا۔ نپولین کو اپنی ان خدمتوں کا صلہ یہ ملا کہ فرانس والوں نے اسے اپنا شہنشاہ بنالیا۔

نپولین اگر اپنا کام اسی طرح فرانس میں جاری رکھتا تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اس کے دماغ میں ایک بڑا عجیب خیال سماگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہے اور دوسرے ملکوں سے غلط حکومت مٹا کر صحیح حکومت قائم کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ اس نے پھر تلوار بے نیام کرلی اور یورپ کی سرزمین پر پھر

خون برسنے لگا۔ نپولین کی اس بات سے خود اس کے ہم وطن بھی خوش نہ تھے۔ فرانس کے لوگ چاہتے تھے کہ اب وہ اپنے اپنے گھروں میں آرام سے رہیں۔ دن بھر کھیتوں میں کام کریں اور شام کو آگ کے چاروں طرف بیٹھ کر خوشی کے گیت گائیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا نپولین نے بے شمار بیویں کو بے سہارا کر کے، لاتعداد ماؤں کی گودیں ویران کر کے اور بے انتہا بہنوں کا سکھ چھین کر نوجوانوں کی ایک بہت بڑی فوج بنائی فرانس ہی نہیں دوسرے ملکوں کے لوگوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ ان کی کھیتیاں بے ضرورت روندی جا رہی ہیں اور انھیں فرانسیسی سپاہیوں کو زبردستی رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان دینا پڑتا ہے تو وہ بھی بہت دکھی ہوئے۔ انگلستان نپولین کے خطرے سے پہلے ہی سے ہوشیار تھا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ نپولین رودبارِ انگلستان پار کر کے انگلستان میں قدم رکھ سکے نیلسن نامی ایک مشہور بحری افسر نے ٹرافلگر مقام پر نپولین کے سمندری بیڑے کو ختم کر دیا۔

نپولین سے ابھی ایک اور بڑی غلطی ہونی تھی۔ اس نے روس پر چڑھائی کر دی۔ روسیوں نے ہر چیز کو جس سے نپولین کے سپاہی فائدہ اٹھا سکتے تھے تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ پورے ماسکو کے شہر میں آگ لگا دی۔ نپولین اور نپولین کے سپاہیوں کی تکلیف کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نپولین نے بالآخر واپسی کا ارادہ کیا۔ لیکن سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ روز بروز برف شدت سے پڑنے لگی اور فرانس واپس پہنچتے پہنچتے اس کے پانچ لاکھ سپاہی سردی کی شدت اور بھوک سے ہلاک ہو گئے۔ اب نپولین بالکل بے دست و پا تھا۔ اس کے دشمنوں نے مل کر اسے بحرِ روم کے ایک جزیرے ایلبا میں قید کر دیا اور فرانس میں ایک نئے بادشاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

نپولین کو ایلبا گئے ہوئے دس ہی مہینے گذرے تھے کہ ایک رات فرانس کے ساحل پر ایک جگہ کچھ کشتیاں آ کر لگیں۔ فوراً ہی عوام میں خبر پھیل گئی کہ ان کا شہنشاہ واپس آ گیا ہے۔ اور واقعتاً نپولین فرانس واپس آ گیا تھا۔ فرانس کے لوگوں کے دلوں میں ایک بار پھر نپولین کی محبت لہریں مارنے لگی بہت سے پرانے سپاہی اپنی پچھلی مصیبتیں بھول کر اس کے پاس آ گئے۔ نپولین جہاں جاتا مردوں، عورتوں اور بچوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امنڈ آتے رفتہ رفتہ نپولین کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی گئی بالآخر ایک دن وہ وارسائی کی طرف بڑھا۔ بادشاہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اور ایک مرتبہ پھر نپولین کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن انگلستان، بلجیم اور جرمنی کی فوجیں مل کر نپولین کے مقابلے کو

اُٹھ کھڑی ہوئیں اور نپولین کو بلجیم میں واٹرلو مقام پر شکست ہوگئی۔ یہ واقعہ ۱۵؍ جون ۱۸۱۵ء کا ہے نپولین کو پھر قید کر لیا گیا اور اس مرتبہ بحر اٹلانٹک کے ایک جزیرے سینٹ ہیلینا میں اُسے رکھا گیا

نپولین یہاں آکر اکثر بیمار رہا کرتا تھا۔ اُس کے پیٹ میں خاص طور سے بہت سخت درد ہوتا تھا لیکن اُس نے مرتے دم تک کبھی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی بالآخر ۵؍ جولائی ۱۸۲۱ء کو اُسے اس زندگی سے نجات مل گئی

رائے عالی۔ عالی جناب ناظم تعلیمات سرکار عالی۔ حیدر آباد دکن

بسلسلہ مراسلہ دفتر ہذا نشان (۷۴۱۲) م ۲۷؍ تیر سنہ ۵۰ ف

ترقیم ہے کہ سال نامہ پیام تعلیم زیر بحث کے متعلق عالی جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے کنٹب منصرم ناظم تعلیمات نے حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

"کم سن طلبا و طالبات کے لئے یہ ایک دلچسپ مفید سبق آموز اور کامیاب سعی ہے۔ جو اس قبیل کے دیگر سالناموں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یقیناً مقبول ہوگی۔ فقط

کمال رضا
(مددگار ناظم تعلیمات)

چاند اور سورج کی کہانی

عظیم قادری صدف حیدرآبادی

گرمی کا موسم تھا۔ چاندنی رات۔ میں اور میری بہن سلمیٰ کھانا کھا کر صحن میں چارپائی پر لیٹ گئے۔ اتنے میں دادی ماں بھی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ نو بج چکے تھے۔ ہم نے سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی تھی۔ میں نے دادی ماں سے کہا "دادی ماں نیند نہیں آ رہی ہے کوئی اچھی سی کہانی سنائیے" سلمیٰ نے بھی میری تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں دادی ماں کل آپ نے کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا اب اسے پورا کیجئے" دادی ماں بگڑ کر بولیں "تم لوگوں کو بس یہی ایک چیز یاد ہے ہر وقت کہانی کہانی چلاتے رہتے ہو دن کو تو اپنی شرارتوں سے ناک میں دم کرتے ہو اور رات کو کہانیوں کے لئے ضد کرتے ہو بھئی میں تو تم لوگوں سے عاجز آ گئی ہوں" مگر ہم کہاں ماننے والے تھے دادی ماں کو کہانی کہنے پر مجبور کر ہی دیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں اور ہم اُن کے قریب ہو گئے اُنھوں نے ایک گلوری کھاتے ہوئے یوں کہنا شروع کیا:۔

بہت پرانے زمانے کا ذکر ہے کسی جنگل میں ایک لکڑہارا اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے مگر انھیں ایک بات کا بہت غم تھا۔ اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی وہ اولاد کے لئے خُدا سے ہر وقت دُعا مانگتے رہتے تھے۔ آخر اُن کی دُعا قبول ہوئی اور اُن کے ہاں دو خوب صورت لڑکے پیدا ہوئے بس پھر کیا تھا لکڑہارا اور اس کی بیوی دونوں مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ منہ مانگی مراد بر آئی اُنھوں نے بڑے لڑکے کا نام سورج رکھا اور چھوٹے کا چاند۔ چاند اور سورج کے ماں باپ نے انھیں بڑی محنت سے پالا اور ہر وقت اُن کے آرام کا خیال رکھا۔

ایک دن لکڑہارا یکایک بیمار ہو گیا اور ایسا بیمار ہوا کہ بے چارے کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے لکڑہارے کی بیوی اپنے شوہر کے یکایک مر جانے پر بہت رنجیدہ رہتی مگر دونوں بیٹوں کو دیکھ کر اس کی کچھ ڈھارس بندھ جاتی۔ اُس نے محنت مزدوری

کرکے چاند اور سورج کو پالا، پوسا اور پروان چڑھایا۔ سال پہ سال گذرے چاند اور سورج بڑے ہوگئے۔ ان میں سورج تو بہت ناکارہ اور شریر نکلا ہر وقت اپنی ماں کو ستاتا اور دق کرتا رہتا تھا۔ ماں بے چاری صبر کرتی اور چپ رہ جاتی مگر چاند بہت نیک اور فرماں بردار ثابت ہوا وہ ہر وقت اپنی ماں کی خدمت کیا کرتا اور ہمیشہ اُسے خوش رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ ماں بھی چاند کو بہت چاہتی تھی۔ سورج یہ دیکھ کر دل ہی دل میں جلا کرتا۔

لکڑہارے کی بیوی اب بوڑھی ہوگئی تھی آئے دن کچھ نہ کچھ بیمار رہتی۔ مگر اُس نے اُس کی کبھی پروا نہ کی اور ہر وقت محنت مزدوری میں لگی رہتی۔ آخر بیماری زیادہ بڑھ گئی اور اس کی طبیعت بہت ہی خراب ہوگئی۔ چاند ہر وقت اپنی ماں کے پاس رہتا اور اس کی تیمارداری کیا کرتا مگر سورج اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف رہتا۔ ایک دن لکڑہارے کی بیوی کی حالت بہت خراب ہوگئی اور آخری وقت قریب آگیا۔ چاند اور سورج اپنی ماں کی چارپائی کے پاس بیٹھے تھے۔ چاند زار و قطار رو رہا تھا مگر سورج پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ لکڑہارے کی بیوی نے کانپتی ہوئی آواز میں پانی مانگا۔ اُس کے دونوں بیٹے پانی کے لئے دوڑے۔ کچھ دیر کے بعد سورج ایک لوٹے میں گرم پانی لے آیا۔ اُس کی ماں نے پانی نہ پیا اور اُسے گھور کر کہا "خدا کرے تو ہمیشہ جلتا رہے۔"
اتنے میں چاند بھی ایک ستھرے پیالے میں ٹھنڈا پانی لے آیا اور اپنی ماں کو پلانے لگا اُس کی ماں نے اُس کو خوب دعائیں دیں اور کہا "میرے بچے تو ہمیشہ ٹھنڈا رہے گا۔" یہ کہہ کر لکڑہارے کی بیوی مرگئی۔ تو یہ چاند اور سورج جنھیں تم روز دیکھتے ہو اُسی لکڑہارے کی بیوی کے بیٹے ہیں ایک تو جل رہا ہے اور اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے دوسرا ٹھنڈا ہے اور دوسروں کو اپنی ٹھنڈک پہنچا رہا ہے۔" یہ کہہ کر دادی ماں خاموش ہوگئیں۔ سلمیٰ سو چکی تھی۔ مجھے بھی نیند آرہی تھی میں نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے نیند بھری آنکھوں سے چاند کو دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

پچھلے پرچے میں ایک مضمون چھپا تھا "ایک معلم کی زندگی" جس کا سرنہ پیر۔ پیامی پڑھ کر بہت حیران ہوئے ہوں گے اس مضمون کے ساتھ ایک تمہید بھی تھی۔ کاتب صاحب کی غلطی سے وہ تمہید لکھنے سے رہ گئی اب اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ماسٹر عبدالغفار صاحب مدھولی ہماری جامعہ میں بچوں کے بہت کامیاب اُستاد ہیں۔ اُنھیں بچوں کے لئے کتابیں لکھنے کا بھی خوب ملکہ ہے۔ اُن کے کئی ڈرامے (بچوں کے لئے) مکتبے سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ڈرامے بچوں نے اتنے پسند کئے کہ مکتبے کو بار بار چھاپنا پڑے۔ شاید تمھاری نظر سے بھی گذرے ہوں۔ اب ماسٹر صاحب نے ایک اور بڑا کام کیا ہے۔ بہت بڑا کام! اُنھوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ یہ حالات کچھ ایسے دلچسپ انداز میں ہیں کہ بس پڑھے جاؤ۔ ان کے پڑھنے سے ایک اور فائدہ ہے۔ جامعہ ملیہ کی ۱۲ سال کی تاریخ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ آپ بیتی کتاب کی شکل میں چھپے گی۔ ہماری درخواست پر ماسٹر صاحب نے اس داستان کا ایک حصہ پیام تعلیم میں چھپنے کے لئے مرحمت فرمایا ہے یہ پیام تعلیم کے دو تین نمبروں میں مسلسل چھپے گا۔"

(ایڈیٹر)

بہت چھوٹے بچے یعنی تیسری چوتھی جماعت والوں نے کہا کہ ایک ڈراما ایسا بھی کروایئے۔ جس میں ہم ہی ہم ہوں۔ اس مطلب کے لئے غلام عباس صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "ثریا کی گڑیا" بہت موزوں تھا۔ اس میں کام کرنے والے دو بچیاں اور ایک بچہ ہے۔ ایک بچی جس کی عمر ۷ سال کی ہوگی۔ اپنی سہیلیوں کو گڑیوں کا گھر دکھانے کے لئے چائے پر بلاتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی (عمر ۶ سال) دعوت کی چیزیں ہضم کرنے کے لئے طرح طرح سے پریشان کرتا ہے۔ اس دوران میں بہن کو ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ بھائی کو کل پرزوں کے ذریعے چلنے والی گڑیا بنا لیتی ہے۔ سہیلی کے آنے پر یہ زندہ گڑیا طرح

طرح کے کھیل تماشے دکھاتی ہے۔ چائے کا سامان گڑیوں کا پٹارہ۔ ایک پردہ اور صرف تین بچوں کے ذریعے یہ تمثیل نہ صرف مدرسے بلکہ گھروں میں آسانی سے کھیلی جاسکتی ہے۔ زبان میں مٹھاس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ اس عمر میں بچے جس طرح بولتے اور اپنی ادائیں دکھاتے ہیں۔ اسی انداز میں لکھا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ نری گفتگو ہی نہیں ہے۔ اداکار کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے بولتے ہیں۔ اس لئے اور بھی لطف آتا ہے۔ میں ہر سال کسی نہ کسی جماعت میں اسے سناتا ہوں۔ سننے اور سنانے والوں میں سے کوئی بھی نہیں اُکتاتا ہے (اگر تمھیں یاد ہو تو اس کتاب کی تمہید میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔) وہ بچے جو ڈرامے کا مطلب اور اس کے کھیلنے کے طریقے نہ جانتے ہوں اگر اس کو اُن کے سامنے کوئی ٹھیک سے پڑھ کر سنائے تو نہ صرف بات سمجھ میں آجائے گی۔ بلکہ جی چاہے گا کہ اسے کھیل ہی لیں۔ ہمارے مدرسے میں لڑکیاں نہ ہونے کی وجہ سے میں نے یہ ڈراما سہیلیوں کی جگہ دوست فرض کرکے تاسیس کے موقع پر کرایا تھا۔ گڑیوں کا کھیل چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں سب ہی کھیلتے ہیں۔ اس لئے اس تبدیلی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میاں مسعود (جو اس سال مسعود حسین خاں کے نام سے ایم اے کا امتحان دینے والے ہیں۔) زندہ گڑیا بنے تھے۔ نگینے کے شاہد (سنا ہے اب شادی ہوگئی ہے) مسعود کے بڑے بھائی اور قائم گنج کے شفیق شاہ کے دوست بنے تھے۔

اس ڈرامے میں اس وقت بڑا مزہ آیا۔ جب مسعود کے بھائی نے اُن کے چہرے پر رنگ کے نشان لگا کر گڑیا کا لباس پہنا کر پردے کے پیچھے چھپادیا تاکہ آنے والے دوست مہمان کے سامنے گڑیا کے طور پر پیش کرسکے۔ دوست نے دروازہ کھٹکھٹایا اس پر مسعود پردے کے پیچھے سے بولے "بھیا یہ نہیں میرے بس کی بات مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے"۔

مسعود کے بھائی نے کہا "ندیدے مہمان آرہے ہیں۔ ذرا دیر کے لئے چپ رہو۔ اچھا نکالو باہر اپنا ہاتھ"۔

مسعود نے اپنا ہاتھ باہر کیا۔ بھائی نے ہتیلی پر بتاشے رکھ دیے۔ تب جاکر یہ خاموش ہوئے۔

دوسرا ڈراما "اسکول کی زندگی" عید کے موقع پر کھیلا گیا تھا۔ میں جس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ (Aiqamathum ul School) نامی کتاب نصاب میں تھی اُس کے پلاٹ سے یہ ڈراما تیار کیا تھا بھولے ناگنا تھن کا پارٹ عرفان نے۔ دو شریر لڑکوں کا کام قائم گنج کے سراج اور سعد انصاری صاحب کے بھائی شعیب نے کیا تھا۔ طیب بھائی نے کیلاٹ صاحب کی۔ بی احمد نے ڈاکیے کی نقل خوب اُتاری

تھی۔

ڈراموں کا یہ کام پرانا ہوتا جارہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب کسی نئی چیز کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس دفعہ پڑھنے پڑھانے کے طریقوں کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ یہ چیز مجھے پسند نہ آئی۔ کہ ایک اُستاد مختلف جماعتوں کو پڑھا رہا ہے۔ کسی کی اُردو ہے تو کسی کا حساب کہیں تاریخ تو کہیں جغرافیہ۔ گھنٹہ بجتے ہی ایک صاحب سر پر سوار ہیں کیوں صاحب — اس لئے کہ گھنٹہ بج گیا ہے۔ جماعت خالی کر دیجئے۔ اب سوچو کہ ایک کام میں دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ لڑکے اور اُستاد دونوں چاہتے ہیں کہ یہی کام جاری رہے۔ مگر اس انتظام میں سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ میں نے شیخ الجامعہ صاحب کو درخواست دی کہ میرے ذمے صرف ایک جماعت کے سارے گھنٹے دے دیجئے۔ مجھے یہ جماعت مل گئی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اب گھنٹوں کا جھگڑا جاتا رہے گا کام کرتے کرتے تھک جائیں گے تو تھوڑی دیر سیر کر لیا کریں گے۔ ایک درخواست اس مطلب کی بھی دی کہ اُستادوں کی انجمن میں پڑھانے کے طریقوں پر بات چیت ہوا کرے اور باری باری سے ہر ایک اُستاد نمونے کے سبق پڑھا کر دکھائیں۔ ہمارے شیخ الجامعہ ذاکر صاحب ہیں بڑے سمجھ دار آدمی اُنھوں نے سوچا کہ اس کا شوق تو رُکے گا نہیں معلوم نہیں یہ اُستادوں کی انجمن میں کیا کیا "گڑ بڑ" کرے۔ اس کام کے لئے کچھ اور لائق ہونے کی ضرورت ہے۔ اُنھوں نے دو باتوں کا انتظام کر دیا۔ ایک تو فوراً ہی ایک اقامت گاہ دکان شوق منزل جس کے اتالیق پہلے سے اختر حسن صاحب تھے۔) اتالیق بنا دیا۔ دوسرے پڑھانے کے طریقوں کی نئی نئی باتیں معلوم کرنے کے لئے موگا بھیجنے کا انتظام کر دیا۔ لیکن موگا چلنے سے پہلے آؤ جامعہ کی کچھ اور سیر کرتے چلیں۔

یہ پہلا سال تھا کہ "یوم تاسیس" منانے کے سلسلے میں ہر ایک جماعت سے تعلیمی کام لیا گیا۔ ذاکر صاحب نے ایک مہینہ پہلے اُستادوں سے بات چیت کرکے اپنی تجویزیں اُن کے سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ یہ کہ:۔

(۱) ہر ایک جماعت لکھنے پڑھنے سے متعلق کوئی چیز تیار کرکے جامعہ کو تحفہ کے طور پر دے۔ ایک جماعت کئی چیزیں دے سکتی ہے۔

(۲) جلسے کے دن ان سب تحفوں کی نمائش کی جائے تاکہ ایک دوسرے کے کام سے لڑکے اور نوجوان واقف ہو جائیں۔

(۳) ایک طرف مکتبے والے بھی صرف جامعہ کی چھاپی ہوئی کتابیں سجائیں۔

(۴) اور لڑکوں کو مشغول رکھنے کے لئے ڈراما

کھیلا جائے۔

(۵) پیام تعلیم والے خاص نمبر نکالیں جس میں زیادہ تر جامعہ کے اُستادوں اور لڑکوں کے مضامین ہوں۔

(۶) اندھا کیا چاہے "دو آنکھیں" جب لڑکوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کچھ کرنے کی خوشی میں پہلے سے زیادہ پڑھا لکھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لکھنے پڑھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ جماعتوں میں بے رونقی نہ رہی۔ کھلنڈرے لڑکوں کی تو بن آئی دوڑ دوڑ کر کام کرتے تھے۔ شاید تم پوچھو گے کہ آخر وہ کون سے کام ہیں جو لکھنے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور مزہ یہ کہ کھلنڈرے لڑکے بھی پسند کرتے ہیں۔ تو اس کی تفصیل بھی سن لو۔ لیکن چھپانے کی بات نہیں۔ یہ کام زیادہ تر بڑے لڑکے یعنی ثانوی اور کالج والوں کا تھا۔ چلانے کو تو یہ کام ذاکر صاحب نے چلا دیا لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ کام اُس وقت پائدار رہے گا جب کہ اُس کی بنیادیں مضبوط ہوں۔ (باقی)

لنگڑا لڑکا

محمد عبدالواسع
چک منگلوری

انگلستان میں ایک جگہ ہے۔ اسٹافورڈشائر بہت دنوں کی بات ہے کوئی دوسو برس پہلے کی یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اپنے ماں باپ کی یہ تیرہویں اولاد تھی۔ ولایت کے لوگوں میں ایک خاص وہم ہے۔ تیرہ کے عدد کو بہت منحوس سمجھتے ہیں۔ لوگ اس بچے کو بھی منحوس سمجھتے تھے۔ ماں باپ نے اس کا نام جوشیا رکھا۔

جوشیا کچھ بڑا ہوا تو ماں نے بچوں کے مدرسے میں داخل کرایا۔ یہاں پڑھ چکا تو نیو کاسل کے مدرسے بھیج دیا گیا۔ یہ جگہ اس کے گھر سے کوئی ساڑھے تین میل دور تھی۔ جوشیا تعلیم کے شوق میں بلاناغہ اتنی دور آتا جاتا تھا۔

جوشیا کو ڈرائنگ سے قدرتی لگاؤ تھا۔ وہ کاغذ کے بہت عمدہ عمدہ پھول بنانے لگا۔ اس کے علاوہ جہازوں کی فوج اور لڑائی کے میدان کی بہت اچھی اچھی تصویریں بنا لیتا تھا۔ اس ہنر کی وجہ سے اپنے ساتھیوں بلکہ تمام مدرسے میں مشہور اور ہر دل عزیز ہو گیا مگر اُستاد اُس کے اس شوق کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے اور بھی کئی اچھے اچھے مشغلے تھے مثلاً پتھر، سیپیاں اور مورتیاں جمع کرتا۔ اس کا کمرہ گویا ایک چھوٹا موٹا عجائب خانہ تھا۔

جوشیا ابھی نو برس کا تھا کہ اس کا باپ مر گیا اب گھر کا خرچ چلنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً اس نو برس کی جان کو لکھنا پڑھنا چھوڑ ایک کارخانے میں نوکری کرنی پڑی۔ پھر وہ ووڈوِچ کے کارخانے میں چلا گیا یہاں اس کارخانے میں اس کا بھائی افسر تھا۔ یہ جگہ انگلستان میں چینی کے برتنوں کے لئے مشہور ہے جوشیا کو یہ خیال رہ رہ کر ستاتا تھا کہ وہ ان پڑھ رہ گیا۔ اس زمانے میں انگلستان میں آج کل کی طرح تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ اس کا گھر کا گھر ان پڑھ تھا خاندان میں کوئی بھی اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتا تھا

جب وہ گیارہ سال کا تھا تو انگلستان میں چیچک کی وبا پھیلی۔ جوشیا بھی اس مرض کا شکار ہوا خدا خدا کر کے اچھا تو ہو گیا مگر ایک پیر بے کار ہو گیا جس

بھی بڑا نام ہو گیا۔

چودہ سال کی عمر میں اسی کارخانے میں وہ اپنے بھائی سے کام سیکھنے لگا۔ اپنا کام وہ بہت محنت سے کرتا جوئے اور شراب سے اُسے بہت نفرت تھی۔ کارخانے میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی مگر یہ ان سب سے الگ تھلگ رہتا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ برتن بنانے کے ہنر میں جوشیا نے نئی نئی باتیں پیدا کیں۔ ان پر طرح طرح کے نئے نئے نقش و نگار بناتا۔ اس کے اس کام کی وجہ سے کارخانے کا مال بہت نکلنے لگا اور کارخانے والوں کی تجارت خوب چمک گئی مگر اس کے بڑے بھائی کو اس کی یہ جدتیں پسند نہ آئیں اور اُسے کارخانے سے الگ کر دیا۔ جوشیا اب دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ اُسے اپنے شوق کے مطابق چیزیں بنانے کی پوری آزادی تھی۔ آمدنی بھی خوب ہوتی تھی مگر اس کے ساتھی محنت کے اچھے نہیں تھے اور وہ بے چارا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا تھا۔ آخر وہ ان سے بھی الگ ہو گیا۔

۱۲ سال کی عمر میں اُس نے خود برتنوں کی تجارت شروع کی۔ روپیہ اُس کے پاس بہت کم تھا۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھا۔ خوشی اس بات کی کہ آزادی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق کاروبار کرے گا۔ اس زمانے میں پاؤں کے درد نے اُسے بہت پریشان کیا۔ کبھی کبھی تو اُسے میز پر پاؤں رکھ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار کسی اوزار سے پاؤں میں سخت چوٹ آ گئی اور زخم پڑ گیا۔ مہینوں بستر پر پڑا رہا۔ مگر یہ زمانہ بھی اُس نے بے کار نہیں کھویا۔ کتابیں پڑھتا رہتا یا اپنے کام کے بارے میں نئے نئے خیالوں پر غور کرتا رہتا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ برتن بنانے کے فن میں کمال حاصل کر کے رہے گا۔

اچھا ہونے کے بعد اس نے پہلے سے بھی زیادہ محنت اور شوق کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نقش و نگار کے ساتھ ساتھ اب وہ برتنوں پر رنگ بھی چڑھانے لگا۔ اس طرح کے رنگے ہوئے برتن دوسرے ملکوں سے آتے تھے اور بہت مہنگے پڑتے تھے۔ یہاں کے یہ برتن ظاہر ہے کہ باہر کے مال سے سستے پڑتے تھے۔ اس لئے اُن کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ تمام تاجر اس قسم کا مال اسی سے خریدنے لگے۔

جوشیا ایک لڑکی سارہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سارہ کا باپ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ مگر بہت دولت مند تھا۔ وہ اس رشتے پر رضامند نہ ہوا۔ جوشیا اس بات سے بہت اُداس رہتا۔ ایک دن سارہ کا خط اُسے ملا اس میں لکھا تھا کہ سوائے جوشیا کے اور کسی سے شادی نہ کرے گی۔ اس خط سے اس کی مُردہ اُمیدوں میں نئی جان پڑ گئی اور وہ پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے سے کام کرنے لگا۔

اب جوشیا کی تجارت دن پر دن ترقی کر رہی تھی۔ کارخانے میں کاری گر بھی بہت بڑھ گئے۔ وہ اپنے کاری گروں کو نئی نئی ایجادیں بتاتا تھا۔ کاری گر اکثر اس کے انوکھے خیالات سے اُکتا جاتے مگر جوشیا کا شوق اور اُمنگیں دیکھ کر اُن میں بھی تازہ جوش پیدا ہو جاتا اور اس کی ہدایتوں کے مُطابق کام کرنے لگتے آخر ایک دن ایسا آیا کہ وہ چینی کے برتن بنانے کے فن کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جانے لگا۔

۳۴ سال کی عُمر میں اس کی شادی سارہ سے ہوگئی۔ یوں سمجھو کہ مدّتوں کی آرزو پوری ہوئی شادی کے چار سال بعد پیر کا درد بہت بڑھ گیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ اُس زمانے میں بے ہوشی کی دوا تو ایجاد ہوئی نہ تھی اور ہوش و حواس کی حالت میں ٹانگ جیسی چیز کاٹنے میں جو تکلیف ہو سکتی ہے اُس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر جواں مرد جوشیا نے اُف تک نہ کی شہر کے بڑے بڑے لوگ یہاں تک کہ ملکہ اور بادشاہ بھی اس کی مزاج پُرسی کو آئے اور اُس کی جواں مردی پر اُسے مُبارک باد دی۔

آخری عُمر میں جوشیا نے اِٹری ٹوریا کے نام سے ایک گاؤں بسایا اور میاں بیوی وہیں اپنی بیٹی سینا کے ساتھ رہنے لگے۔ سائنس داں چارلس ڈاروِن کی ماں یہی سینا ہے

ساون

خلیل الرحمن مستقیمی

ساون آیا، ساون آیا ۔ کوئل نے یہ گیت سنایا
بادل آئے شور مچاتے ۔ ہنستے گاتے ڈھول بجاتے
پانی برسا چھم چھم چھم چھم ۔ کتنا اچھا ہے یہ موسم
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کیا ہیں ۔ گویا جنت کا تحفہ ہیں
دل کے پودے جاگ رہے ہیں ۔ رنج و الم سب بھاگ رہے ہیں
باغوں میں ہریالی چھائی ۔ ڈالی ڈالی ہے اترائی
آئیں پھر "پی پی" کی صدائیں ۔ کتنی ہیں رنگین فضائیں
جھینگر نے وہ شور مچایا ۔ اپنا دل کش نغمہ گایا
مینڈک ٹرٹر بول رہے ہیں ۔ بھونرے بھی رس گھول رہے ہیں
ناچ رہے ہیں مور بنوں میں ۔ گیتوں سے ہے شور بنوں میں
کیا اچھا جنگل کا سماں ہے ۔ جنگل میں منگل کا سماں ہے
ہرے بھرے پربت کے دامن ۔ بن گئے ہیں اب گویا گلشن

سیدہا سلطان پور

نظروں میں ہیں سمائے جاتے ۔ سب کا دل ہیں چرائے جاتے
کھیتوں کا ہے سہانا منظر ۔ دلکش ہے اور ہے جاں پرور
ننھے پودے جھوم رہے ہیں ۔ جھک کر دھرتی چوم رہے ہیں
تالابوں میں چڑیاں آئیں ۔ "قیں قیں" کرکے پھر چلائیں
ہلکی ہلکی سی ہیں پھواریں ۔ اور ان میں بگلوں کی قطاریں
گاؤں میں ہیں جھولے کی بہاریں ۔ سکھیاں سب گاتی ہیں ملہاریں
باغ میں میٹھے آم ہیں پکتے ۔ ان میں سے کچھ پیڑ سے ٹپکے
کوئی لال ہے، پیلا کوئی ۔ زرد ہے کوئی، سیندریا کوئی
کھانے میں ہو کیوں نہ یہ اچھا ۔ یہ تو ہے جنت کا میوا
ہاں اب بادل گھر کر آیا ۔ دیکھو خوب اندھیرا چھایا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی ہے ۔ دھیمے دھیمے کچھ گاتی ہے
آہا یہ برسات کا موسم ۔ جنت ہے اب سارا عالم

سکرٹری صاحب

سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی۔

مجھے صبح شام سیر کرنے کی عادت ہے۔ مگر اکیلا آدمی گھبراتا ہی رہتا ہے۔ سو چتا تھا کہ کوئی ساتھی مل جائے تو سیر کا لطف بڑھ جائے مگر کوئی اللہ کا بندا دو میل پیدل چلنے کی حامی ہی نہ بھرتا تھا۔

میں نے عبید خاں کو گانٹھا۔ یہ بڑے مستعد ہیں۔ اور بے چارے سارے دن کولھو کے بیل کی طرح کتابیں ہی لادے پھرتے ہیں ایک گھنٹہ بھی نہیں کھیلتے۔ ان سے میں نے کہا " مسٹر عبید آپ پاگل ہو جائیں گے " انھوں نے پوچھا جی کیسے ؟ میں نے کہا " ایسے کہ آپ پڑھتے تو ہیں بیس گھنٹے اور کھیلتے نہیں بیس منٹ کو بھی۔ بس یہ پاگل بن جانے کی نشانی ہے۔" انھوں نے جواب دیا " بجا بجا فرمایا۔ بجا جان کیا کریں۔ ہمیں کوئی اپنے ساتھ کھلاتا ہی نہیں۔ ہمارے جو ساتھی کھیلنے میں استاد ہیں وہ پڑھنے میں صفر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عبید تم ہمارے ساتھ نہیں کھیل سکتے۔ جاؤ اپنے مہربان استادوں کے ساتھ کھیلو۔ جو تمھاری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اب بتائیے میں کیا کروں۔ کس استاد سے کہوں کہ آپ میرے ساتھ کھیلیے "

میں نے کہا " تم میرے ساتھ کھیلا کرو۔ بس آج سے میرے ساتھ سیر کو چلا کرو۔ میں تم کو بڑی عمدہ قسم کی ورزشیں بھی بتا دوں گا "

عبید صاحب تیار ہو گئے اور ہماری سیر مزے دار ہو گئی۔

روزانہ وہ اندھیرے منہ چلے آتے اور مجھے لے جاتے۔ راستے میں میری اُن کی باتیں ہوتیں۔ آخر وہ گھنے تھے نہیں۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ اُن کے بڑے اور چھوٹے دونوں بھائی اس بات سے خفا ہیں کہ عبید کیوں سیر کو جاتا ہے میں نے عبید صاحب سے کہا کہ اُن کی یہ بات بہت بے موقع ہے۔ اُن کا جی چاہے تو وہ بھی تمھارے ساتھ آ جایا کریں مگر وہ ایسے جل ککڑے تھے کہ نہ تو ساتھ سیر کو آتے نہ عبید کا سیر کرنا گوارا کرتے۔

دو ہی ہفتے بعد میں نے اُن کو سکرٹری صاحب کا خطاب دے دیا۔ علاوہ سیر کے وقت کے وہ اکثر میرے پاس بیٹھے رہتے اور اسکول کا کام کرتے رہتے۔ میرے بھی بہت سے کام بچا سے کر دیا کرتے تھے۔ میں اُن کے مشکل سوالوں میں مدد دے دیا کرتا تھا۔

سکرٹری صاحب کا خطاب ملنے سے اُن کے بھائی بہت جلے اور اُنھوں نے ترکیب ستانے کی یہ نکالی کہ ہمارے واپس آنے سے پہلے اپنی اماں کو ڈرا ڈرا کر اور شور مچا کر ناشتہ کرنے کو کہتے اور بچا سے سکرٹری صاحب کا حصّہ بھی چھین جھپٹ کر کھا لیا کرتے۔ دو چار دن تک تو سکرٹری صاحب کچھ مجھ سے بولے نہیں آخر یہ راز بچا نے بھرائی ہوئی آواز میں بتا دیا۔ میں نے یہ ترکیب کی کہ اُن کو ناشتہ اپنے ساتھ کروانے لگا۔ اور اُن کے جل ککڑے بھائیوں سے کہا کہ اب عنقریب میرا سکرٹری گاما پہلوان بن جائے گا۔ وہ سیر کرتا ہے، دوڑتا ہے ورزش کرتا ہے اور واپس آن کر دودھ، مکھن اور انڈا کھاتا ہے اور مٹھائی بھی۔ ہاں جناب۔"

سکرٹری صاحب کے چھوٹے بھائی میرے فقرے میں آگئے۔ اُن کا مُنہ ذرا سا نکل آیا۔ بڑی دیر بعد بولے کہ ہم کو بھی سیر کو لے جایا کیجئے۔ میں نے کہا بے شک سیر کو چل سکتے ہو۔ مگر ناشتہ تم اپنے گھر ہی کیا کرنا۔"

اُن کو ناشتے سے مطلب تھا۔ یہ جواب سُن کر خفا ہوتے چلے گئے اور اماں سے شکایت کی کہ دیکھئے وہ عُبید خاں بڑا بدنیت ہے۔ ناشتے کے مارے سیر کو جاتا ہے۔ مجھ سے بہتیرا اچھا جان نے کہا کہ ناشتہ کر لو مگر میں کیا بدنیت تھا غرض اس طرح اُنھوں نے اپنے بڑے بھائی کو بھی بھڑکا دیا اور اپنی آپا خفیہ کو بھی بھڑکا دیا۔

اب جو سکرٹری صاحب گھر میں گھسے تو سب طرف سے لعن طعن شروع ہوئی۔ بڑا ندیدا ہے۔ بڑا بدنیت ہے۔ سیر کے بہانے ناشتے کو جاتا ہے۔ ڈوب مرے کیا بے غیرت بچہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ سکرٹری صاحب ناشتہ نہیں کرتے ہیں۔ بہتیرا بلاتا ہوں مگر وہ انکار ہی کئے جاتے ہیں۔ آخر کار بھاگ ہی گئے۔ کئی دن تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ ایک دن میں بھی سکرٹری صاحب کے جانے کے بعد چپکے چپکے اُن کے گھر پہنچا۔ وہاں ناشتہ تیار تھا۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا سب بچے گھیرا باندھے بیٹھے تھے کسی طرف سے ان کی اماں کی آواز آرہی تھی کہ خبردار جب تک عُبید نہ آجائے ناشتہ مت کرنا۔

اتنے میں وہ بھی پہنچ گئیں اور سکرٹری صاحب بھی۔ چھوٹتے ہی چھوٹے بھائی نے کہا

ماں نے پوچھا "کیسے جانا" - جواب دیا ان کی باچھوں
پر مکھن لگ رہا ہے۔ بڑے بھائی نے کہا اور ان کی صورت
سے معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ بھر رہا ہے۔" آپا خفیہ نے کہا -
"کوئی بھی نہیں چیپڑ لگ رہی ہے۔"

بڑے بھائی نے قہقہہ مار کر کہا "ارے بی دیوانی آپا
چیپڑ باچھوں میں لگتے ہیں یا آنکھوں میں۔" آپا خفیہ کا نام
اسی واسطے خفیہ ہے کہ وہ فوراً خفا ہو جاتی ہیں۔ انھوں
نے بگڑ کر کہا "بڑے بدتمیز ہو - میں نے باچھیں کب کہا
تھا؟ بھائی بولے " تو اس میں میری بدتمیزی کی کیا
بات ہے - بدتمیز تو تم ہوئیں - میں تم سے بڑا ہوں۔"

آپا نے کہا "آئے بڑے بچارے کہیں سے نانا
جان بن کر۔"

بھائی نے کہا " بس زیادہ زبان مت چلاؤ۔"

آپا نے منہ پھلا کر دسترخوان چھوڑ دیا اور پلنگ
پر جا لیٹیں۔

اماں نے عبید کو غور سے دیکھا اور کہا "کوئی مکھن
وکھن نہیں لگ رہا - چلو چپ چاپ سب ناشتہ کر کے
جاؤ مدرسے۔"

میں نے سب کے قریب پہنچ کر کہا "میاں
سکرٹری صاحب غضب کرتے ہو - دو توس، تین
کچوریاں، ایک انڈا اور دودھ اور حصے کے
دو لڈو کھا کر آئے - اور پھر یہاں جم کر بیٹھ گئے - یار
تمھارا پیٹ نہ پھٹ جائے۔"

سب بچوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے -
سکرٹری صاحب مطلب سمجھ گئے - مگر بولے "صاحب
اپنا حق میں کیوں چھوڑوں - وہ ناشتہ تو میرے
سکرٹری ہونے کا تھا۔" بچوں کے چہرے زرد سے
ہو گئے -

"نہیں اب تم کو یہاں ناشتہ نہیں ملے گا۔"

"استاد جی بڑے وہ ہو ...."

"دیکھو اماں ان کی باتیں - نہیں - بس کل
سے میں سیر کو جایا کروں گا - کیوں ؟ کتنے دن
ہو گئے ان کو جاتے ہوئے - کل ماسٹر صاحب مجھ
سے کہہ رہے تھے کہ صبح اٹھتے ہی سیر کو جایا کرو۔"

میں نے پوچھا "تو کیا یہ حضرت سکرٹری صاحب
روزانہ یہاں ہی ناشتہ کرتے ہیں ؟"

سب نے مل کر جواب دیا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا اف فو - سنو سکرٹری صاحب
ہم تم پر چار آنے جرمانہ کرتے ہیں۔"

کوئی بولا "چچا جان چھ آنے کیجیے۔"

کوئی اور بولا " ایمان سے آٹھ آنے - مزا
آئے گا۔"

میں نے کہا " اچھا آٹھ آنے - بچوں کو منظور
ہے؟"

سب نے ہنس ہنس کر اور کلکاریاں مار کر
یہ جرمانہ منظور کیا - اس کے بعد میں نے آٹھ آنے

جیب سے نکال کر سکرٹری صاحب کو دے دئے اور کہا "لو جاؤ آئندہ سے خبردار جو تم نے ہمارے علاوہ کسی اور کے ساتھ ناشتہ کیا۔ جاؤ یہ آٹھ آنے تمھارے ہیں۔ بچّوں کے چہروں پر غم کی گھٹا چھا گئی سکرٹری صاحب کا سب سے چھوٹا بھائی تو ایسا جلا کہ اُٹھ کر میرے کاٹ ہی کھایا۔ اور کہا کہ میرے اوپر بھی کچھ جرمانہ کرو۔

میں نے جان بچانے کو ایک آنہ اُن پر جرمانہ کیا۔ ادا کیا اور واپس آگیا۔

بعد میں اطلاع ملی کہ بڑے بھائی صاحب نے کہا کہ آٹھ آنے کرنے والی یہ آیا جان تھیں۔ رُوٹھے رُوٹھے بھی بیچ میں بول پڑیں نہیں تو چار آنے ہی میں بات ٹل رہی تھی ٭

بیج اور پھل کس طرح پھیلتے ہیں

(۳)

محمد ریاض الحسن صاحب قریشی ایم۔ایس سی عثمانیہ

سنہا:۔ اچھا اور یہ آپ نے کیا کہا تھا کہ پھلوں کی خوب صورتی دیکھ کر پرندے للچانے لگتے ہیں۔ اور انھیں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

انور:۔ تو میرے بھائی اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یوں سمجھو کہ دنیا ایک بازار ہے۔ اس کا کاروبار لین دین پر چلتا ہے۔ اور یہ انتظام ہماری تمھاری طرف سے نہیں قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھلوں، پھولوں اور بیجوں سے حیوانوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور حیوانوں کی بدولت پرندوں کی نسل بڑھتی ہے ایک اور دلچسپ بات سنو۔ بعض بیجوں کی شکل کیڑوں جیسی ہوتی ہے۔ پرندے انھیں کیڑے سمجھ کر اٹھالے جاتے ہیں مگر جب اپنی غلطی معلوم ہو جاتی ہے تو پھینک دیتے ہیں۔ ارنڈی اور کھچی کے بیج اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ارنڈی کے بیجوں پر کچھ ایسے نشان ہوتے ہیں کہ کیڑوں کا شبہ ہوتا ہے۔

سنہا:۔ مگر پرندے پودوں کو نقصان بھی تو پہنچاتے ہیں۔

انور:۔ مگر قدرت نے اس کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ اس قسم کے پھل زمین پر گرتے وقت مٹی کے رنگ کی طرح بھورے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بادام اور اخروٹ وغیرہ علاوہ اس کے ان کے بیج سخت غلاف میں محفوظ رہتے ہیں۔ جنوبی یورپ میں ایک پودا ہوتا ہے۔ اس کا پھل چھوتے ہی ڈالی سے گر جاتا ہے۔ مگر اس کا بیج گودا اور عرق بہت بودار ہوتا ہے۔ اگر جسم کو لگ جائے تو بہت ناگوار ہوتا ہے۔ آنکھ میں لگ جائے تو مرچیں سی لگنے لگتی ہیں۔ کانچ کوری کے پھلوں پر رؤئیں ہوتے ہیں انھیں چھوتے ہی خارش ہونے لگتی ہے اور بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

ارے یہ تمھاری شروانی کے دامن پر کیا لگا ہے

اوہ ہو یہ تو اکھاڑے یا کتے کے بیج ہیں۔
اِس کا بتانا تو میں بھی بھول گیا تھا۔ بعض بیج اَور پھل قدرت کی طرف سے پھیلنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ کُتّے کے پھولوں کا رُخ نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بھیڑوں بکریوں کے بالوں یا آدمیوں کے کپڑوں سے چمٹ جاتے ہیں۔ گوکھرو ننگے پیر چلنے والوں کے پیروں میں چُبھ جاتے ہیں اَور انھیں وہ نکال کر دُور پھینک دیتے ہیں۔

سنہا:۔ ہاں مگر بھئی ایک بات تو بتاوٗ۔ اکثر چھتوں کے نیچے، یا گھونسلوں کے قریب اَور گلہریوں، چیونٹیوں اَور چوہوں کے بلوں میں پودے کیوں کر اُگ آتے ہیں۔

انور:۔ ابھی بتاتا ہوں۔ بعض پرند پھل کھا کر بیج گھونسلوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ بیج دیوار کی مٹی میں رل جاتے ہیں اَور مینہہ برستے ہی اُگ آتے ہیں۔ گلہری اکثر اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرکے بھول جاتی ہے۔ برسات کے پانی سے یہ بھی اُگ آتے ہیں اَور پودے بن جاتے ہیں۔ چیونٹی برسات کے لئے غذا جمع کرتی ہے۔ اگر یہی بیج یوں ہی پڑے رہیں تو اُگ آتے ہیں۔ علاوہ اس کے ہریالی کے بیجوں پر مٹھاس ہوتی ہے۔ چیونٹیاں انھیں اپنے سوراخوں میں لے جاکر جمع کر لیتی ہیں۔ مٹھاس چوسنے کے بعد یہ سخت چھلکے اَور چیونٹیوں کے لئے بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہ انھیں پھینک دیتی ہیں۔ اِس طرح یہ بیج بہت دُور جاکر اُگ آتے ہیں۔ بعض بیج روغنی ہوتے ہیں۔ چیونٹیاں تیل چوس کر بیج پھینک دیتی ہیں۔ اِس بات کا تجربہ کرنا ہو تو ایسے بیج چیونٹیوں کے راستے میں ڈال کر دیکھ لو۔

سنہا:۔ اچھا۔ اِن بیجوں اَور پھلوں کے پھیلانے میں اِنسان بھی کچھ حصّہ لیتا ہے۔

انور:۔ بہت کچھ، دُور دُور کے مُلکوں سے پھل اَور بیج منگواتا ہے۔ ایک تمباکو، آلو اَور مکئی کو لیجئے یہ تینوں دُوسرے مُلکوں سے آئے ہیں۔ مگر اب ہندوستان میں اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ یہیں کے پودے ہیں۔ آم پہلے صرف ہندوستان میں پیدا ہوتا تھا اب دُوسرے مُلکوں میں بھی پہنچ گیا ہے۔
تمباکو امریکہ کی پیداوار ہے۔ پرتگالی اسے سنہ [illegible]ء میں ہندوستان لائے۔ اِسی طرح مکئی بھی۔ اب سے کوئی تین سو برس پہلے امریکہ سے لائے کینن کا پودا جنوبی امریکہ سے آیا اَور سرکاری طور پر اس کی کاشت سنہ [illegible]ء میں دارجلنگ اَور نیل گری میں شروع ہوئی۔

انور:۔ ارے بھئی ذرا کھڑکی تو دیکھو کیا بجانے والے وہ ظفر اَور اخلاق کھیل کر آرہے ہیں۔ (دیکھ کر) میں تو چھپ جاتا ہوں۔ نہیں تو میری گت بنا ئیں گے۔

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب کی اصلاح کے بعد

نعت رسول کریم

ازجمال الدین مونس بدایونی

مسلم ہے کہ اُن سے کوئی برتر ہو نہیں سکتا ❁ محمد مصطفےٰ کا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا
تمنا ہے کہ ہو جاؤں نثارِ گنبدِ خضرا ❁ عاشقِ دردِ الفت اس سے بہتر ہو نہیں سکتا
گناہگاروں کو حضرت بخشوائیں گے قیامت میں ❁ مجھے دوزخ کی آتش کا کوئی ڈر ہو نہیں سکتا
غزل میری ہے یا نعتِ نبی کا یہ ترانہ ہے ❁ کسی شاعر کا نغمہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا
پڑی ہے چاٹ فنِ شاعری کی اسکو بچپن میں ❁ وہ کہتے ہیں کہ مونس سا سخنور ہو نہیں سکتا

آنکھ مچولی کھیلیں گے

محمد اکرام لاہور

مل جل ہم سب ہمجولی ❁ اک میدان میں جائیں گے
ہاتھ پکڑ کر آپس میں سب ❁ گھیرا ایک بنائیں گے
اک ہمجولی کی آنکھوں پر ❁ پٹی ہم بندھوائیں گے
بیچ میں اس کو کر کے کھڑا ❁ تالی ایک بجائیں گے
ہم کو پکڑنے دوڑے گا وہ ❁ اور ہم ہاتھ نہ آئیں گے
جس جانب وہ لپکے گا ❁ ہم فوراً ہٹ جائیں گے
جب وہ کسی کو پکڑے گا ❁ ہم سب شور مچائیں گے
کھیل کے آنکھ مچولی یوں ❁ چھٹی اپنی منائیں گے

اک بچے کی مرغی

محمد طاہر عثمانی گیاوی

اک بچے نے مرغی پالی ❁ مرغی تھی وہ انڈوں والی
ان انڈوں سے بچے نکلے ❁ ننھے منے نیلے پیلے
دانا کھا کر بچے دوڑے ❁ یہ بھی ان کے پیچھے لپکے
جب اُس نے بچوں کو پکڑا ❁ مُرغی نے بھی جھپٹا مارا
بھاگے ڈر کر یہ بے چارے ❁ چوں چوں کرتے بچے بھاگے

ہماری زبان

ادم پرکاش جماعت پنجم

کیسی اچھی پیاری پیاری
اردو پیاری زبان ہماری

بھائی جان پڑھتے ہیں یہی ❁ اماں جی کہتی ہیں یہ ہی
بیٹا ہندو مسلم سب ہی ❁ اور تمھارے ابا جی بھی

کہتے ہیں یہ باری باری
اُردو پیاری زبان ہماری

کیسے میٹھے بول ہیں اس میں ❁ ہندی ترکی میل ہے اس میں
ماہر ہیں پڑھنے میں اسکے ❁ ہندو مسلم سب قوموں کے

نوٹ:- یہ نظم عزیز ادم پرکاش نے اپنے اسکول میں یوم اردو کے موقع پر پڑھی تھی اور انعام حاصل کیا تھا

سب کہتے ہیں یاری یاری
اُردو پیاری زبان ہماری

ہندو مسلم، سکھ، عیسائی — ہیں آپس میں بھائی بھائی
سب نے مل کر ہے یہ بنائی — سب خلقت دیتی ہے یہ گواہی

کہتی ہے یہ یاری یاری
اُردو پیاری زبان ہماری

آؤ مل کر خوشی منائیں — ہم سب مل کر گانا گائیں
سب کو اس کے ترانے سنائیں — ہم اُردو کا روز منائیں

اور کہیں سب یاری یاری
اُردو پیاری زبان ہماری

ننھا شاعر
عونی آفندی۔ مونگیر

سات برس کا ننھا شاعر — دھوم ہے جس کی اندر باہر
انجم اس کا نام ہے پیارا — صورت جیسے ماہ کا پارا
شام ہے اور جمنا کا کنارا — پانی جس کا دودھ کی دھارا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہر سو ہوائیں — شاخ پہ بلبل کی وہ نوائیں!
نرم نرم سی گھاس پہ بیٹھا — دِل ہی دل میں ہے کچھ کہتا!
اُلجھے اُلجھے بال ہیں اس کے — فکر سے پیلے گال ہیں اس کے
نظریں اس کی نیچی نیچی — فکر میں ڈوبے جیسے کوئی
کاغذ پنسل ہاتھ میں اس کے — اس دھن میں کچھ شعر وہ کہہ دے
آخر اٹھا، گھر کو آیا — کچھ سوچا پھر سو کر اُٹھا

صبح کو اپنی نظم سنائی
دنیا یوں خوشیوں میں نہائی

رات
اصغر ہلوری

رات نے اپنے پاؤں پسارے — سویا سورج جاگے تارے
چھانے لگا دنیا پہ اندھیرا — لینے لگیں چڑیائیں بسیرا
بند ہوئے سب کام ہمارے — کامی اپنے گھر کو سدھارے
کچھ چھوٹے کچھ اُن میں بڑے ہیں — تارے ہیں یا ہیرے جڑے ہیں
نیند کے ماتے چھوٹے بچے — گود میں ماں کی تھک کر سوئے
ایسے ٹوٹا ہے اک اک تارا — ٹوٹ گئی ہو جیسے مالا
رات بڑھی سناٹا چھایا — نیند نے آکر سب کو گھیرا
تاروں بھرے آکاش کے نیچے — ہندو مسلم سب ہی سوئے

شکر کرو سب پیارے بھائی
اس کا جس نے رات بنائی

میرا کتا
خلیل الرحمٰن چمن۔

کتا میں نے ایک ہے پالا — سب سے اچھا بھولا بھالا
رنگ ہے اس کا کالا کالا — کان پہ دھبہ اس کے کالا
بال ہیں اس کے ایسے ملائم — جیسے ہو کوئی روئی کا گالا
پنجے اس کے شیر سے ملتے — نام ہے اس کا سب سے نرالا
سب کہتے ہیں اس کو ٹائیگر[1] — سب کا ہے وہ دیکھا بھالا

روز نہاتے ہیں یہ حضرت
چمن نے ہے اس کو پالا

---

[1] کتے کا نام

مسٹر چرچل انگلستان کے بہت بڑے لوگوں میں سے ہیں۔ اُن کا پورا نام ونسٹن لیونارڈ سپنسر چرچل ہے۔ آج کل یہ انگلستان کے وزیرِ اعظم ہیں اور موجودہ بڑی لڑائی کو بہت عقل مندی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

چرچل ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ماں امریکن تھی۔ بہت لائق اور سمجھ دار۔ اس نے ان کی بہت اچھی طرح تربیت کی۔ چرچل نے ابتدائی تعلیم ہیرو میں پائی۔ پھر سینڈھرسٹ یونیورسٹی میں پڑھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں نوکر ہو گئے۔ اور نوآبادیات کی لڑائیوں میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا۔

جب جنوبی افریقہ میں بوئروں اور انگریزوں میں لڑائی چھڑی تو یہ انگلستان کے مشہور اخبار مارننگ پوسٹ کے نامہ نگار بن کر جنوبی افریقہ پہنچے۔ وہاں بوئروں کے ہاتھ قید ہو گئے۔ مگر اپنی عقل اور تدبیر کی بدولت اس مصیبت سے نجات پائی۔

جنوبی افریقہ سے واپس آ کر پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے۔ پارلیمنٹ میں ممبروں کی کئی ٹولیاں ہیں ایک تو مزدوروں اور عام غریب لوگوں کی بھلائی اور فائدے کو اپنے سامنے رکھتی ہے اُسے لیبر پارٹی یا مزدور پارٹی کہتے ہیں۔ ایک سرمایہ داروں اور امیر لوگوں کے فائدے کا خیال رکھتی ہے۔ یہ قدامت پسند پارٹی کہلاتی ہے۔ ایک ان دونوں کے بیچ میں ہے اور لبرل یا درمیانی پارٹی کہلاتی ہے تو مسٹر چرچل پہلے درمیانی پارٹی کے حامی تھے۔ مگر جب پارلیمنٹ کے ممبر بنے تو قدامت پسند پارٹی میں شامل ہو گئے۔

کچھ عرصے کے بعد نوآبادیات کے انڈر سکریٹری مقرر ہوئے۔ پھر تجارتی محکمے کے صدر چنے گئے ۱۹۱۲ء میں محکمہ امیرالبحری کے لارڈ مقرر ہوئے۔ ان کی نگرانی میں یہ محکمہ بہت ترقی کر رہا تھا کہ اچانک پہلی (۱۹۱۴ء) بڑی لڑائی چھڑ گئی۔ لڑائی کے زمانے میں بڑی وزارت میں ان کے اور وزارت میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا اور یہ استعفےٰ دے کر فرانس چلے گئے۔

۱۹۱۷ء میں اس زمانے کے وزیرِ اعظم لارڈ جارج

تے پھر انھیں بلایا۔ اور انھیں جنگ کا سکرٹری اور پھر
ہوائی محکمے کا وزیر بنایا۔ اب کے کسی بات پر مزدور
پارٹی سے اُن کی اَن بن ہوگئی اور اُنھوں نے پھر
علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے ایک
کتاب "دی ورلڈ کرائسس" چھ جلدوں میں لکھی۔ یہ
کتاب بہت مقبول ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ ایسے
وزیر مالیات بنائے گئے اور چھ سال تک یہ کام خوش
اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کی
زندگی پھر گویا خاموشی کی زندگی ہے اور موجودہ لڑائی
سے پہلے اُنھوں نے قومی سیاست میں کوئی خاص حصہ
نہیں لیا۔ اس زمانے میں وہ دوسرے ملکوں کے
سیاسی حالات کو بہت گہری نظروں سے دیکھتے
رہے۔ ان حالات سے اُنھوں نے اندازہ لگایا تھا
کہ یورپ میں پھر لڑائی ہوگی اور بہت زوردار ہوگی
وہ اس خطرے سے اور دوسرے ملکوں کی طاقت
اور لڑائیوں کی تیاریوں سے اپنے ملک کو برابر خبردار
کرتے رہتے تھے۔ انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ آنے والی
لڑائی میں ہوائی طاقت کی اہمیت سب سے زیادہ
ہوگی۔ اس لئے انگریزی حکومت کو برابر ہوائی طاقت
بڑھانے کی طرف توجہ دلاتے رہے۔

چرچل پہلے فرانس کے مقابلے میں جرمنی کے
حامی تھے۔ مگر ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں نازیوں کا زور
ہوا تو انھیں بہت سے اندیشے پیدا ہوگئے۔ نازی
پارٹی کی سرگرمیاں انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ ڈکٹیٹر
کے وہ سخت مخالف تھے اور ان کی یہ رائے تھی کہ
ڈکٹیٹروں کی نہایت سرگرمی کے ساتھ مخالفت کی جائے
اور ان کے مقابلے کے لئے پوری جدوجہد کی جائے
انھیں جرمنی کی نیت اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی۔ اور
وہ حکومت کو بھی آگاہ کرتے رہتے تھے کہ ہٹلر ساری
دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

چرچل سے پہلے انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر
چیمبرلین تھے۔ یہ امن و امان کے بہت حامی تھے اور
کسی قیمت پر لڑائی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ انھی
کے زمانے میں جرمنی نے چکوسلواکیا، آسٹریا وغیرہ
پر قبضہ کیا تو چرچل نے اس کی بہت سخت مخالفت کی
اور میونخ کے معاہدے کو جو انگلستان اور جرمنی
کے درمیان ہوا تھا بالکل ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔

موجودہ لڑائی میں ان کی خدمات کی پھر ضرورت
ہوئی۔ اب کے وہ امیر البحر بنائے گئے۔ اُن کے
زمانے میں مقناطیسی سرنگوں اور یو بوٹ کے خطرے
کی کامیابی کے ساتھ روک تھام کی گئی۔

مسٹر چیمبرلین اپنی امن کی پالیسی میں ناکام رہے
تھے۔ پھر لڑائی کے زمانے میں ملک کی ساری طاقتوں
کو جمع کرنے اور اس سے کام لینے میں اور لڑائی کا
سامان پوری سرگرمی سے تیار کرانے میں انھیں کامیابی

نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے لوگ ان کی وزارت کے مخالف ہوگئے اور انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔ اب ملک میں اس عہدے کے لئے قوم کی نظر میں مسٹر چرچل سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں تھا۔ اسی لئے انھی کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ انھوں نے اس عہدے کو قبول کرتے ہی اپنی سرگرمی سے انگریز قوم کے حوصلوں میں ایک تازہ روح پھونک دی اور اب تک وہ بڑے جوش اور سرگرمی اور استقلال سے جرمنی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ آخری فتح انگلستان کی ہوگی۔ مسٹر چرچل بہت بڑے ادیب اور مقرر بھی ہیں۔ اس زمانے میں جو ان کی تقریریں ہوئیں وہ وقت اور موقع کے لحاظ سے بہت مناسب تھیں اور بہت پسند کی گئیں۔ انھوں نے کئی اچھی اچھی کتابیں بھی لکھی ہیں ان کتابوں کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

پہیلیاں

خزانہ ایسا جادو کا نظر آیا مجھے گوہر
بڑھے گا کم نہیں ہوگا نکالو ٹوکرے بھر بھر
(گڑھا یا سوراخ)

اس کی سب کو ہے خواہش اور وہ آتی ہے جب
ہوش کھو دیتے ہیں اور مدہوش ہو جاتے ہیں سب
(نیند)

ایک جانور ایسا ہے جو رات کو دن بتلائے
دن بھر سوئے خوب مزے میں شام کو ہوش میں آئے
جس کے سارے کام ہیں الٹے کیا جانوں کیا ہے وہ
تم ہی بتاؤ مجھ کو گوہر خاک سمجھ میں آئے
(چمگادڑ)

(معشوق احمد۔ گوہر)

لطیفے

مہمان:۔ آج ترکاری میں نمک بہت زیادہ ہے۔

میزبان:۔ کیا بتاؤں میری بیوی صاحبہ اس قدر فیاض واقع ہوئی ہیں کہ ہر چیز نہایت بیدردی سے خرچ کرتی ہیں۔

معشوق علی گوہر

ماں:۔ جعفر! تم نے اب تک منہ نہیں دھویا، جاؤ تمھیں کھانا نہیں ملے گا۔

جعفر:۔ دھو تو لیا امی۔

ماں:۔ ہیں یہ منہ دھویا ہے؟ آنکھوں میں کیچڑ بھرے ہوئے ہیں۔

جعفر:۔ تو آپ نے تو بس منہ دھونے کو کہا تھا امی وہ میں نے دھو لیا۔

بچّوں کی کوشش

شکاری

احمد منظور الحق درجہ ہفتم

شہر بغداد میں حاجی حسن نامی ایک شخص رہتا تھا اس کی دلی تمنا تھی کہ وہ ایک مشہور اور تجربہ کار شکاری بن جائے اس ارادے سے اُس نے ایک اونٹ خریدا اور سفر کو روانہ ہوا - ابھی کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک شتر مرغ نظر آیا اس نے تین انڈے دے رکھے تھے۔ حاجی بہت دیر تک منتظر رہا کہ کسی طرح پرندہ اپنا مقام چھوڑ دے۔ وہ اس کے انڈوں
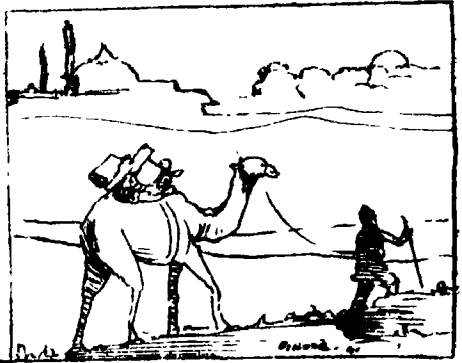
سے اپنی بھوک کو بجھا کر شتر مرغ کو بھی حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ آخر کار شتر مرغ غذا کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ حاجی نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ ایک انڈا کھا کر بھوک کی آگ بجھائی۔ اس کے بعد اُس نے پھاوڑے سے ریت میں باقی دونوں انڈوں کے درمیان ایک گڑھا کیا۔ اور اس میں اُتر گیا۔ اپنے آپ کو ریت سے چھپا لیا بس اپنی چکنی چندیا باہر

رہنے دی اور شتر مرغ کے انتظار میں لیٹا رہا۔ جب شتر مرغ واپس آیا تو پہلے تینوں انڈوں کو صحیح سالم پاکر خوش ہوا اور انڈے سینے کے لئے بیٹھ گیا۔ تھکا ہوا تھا جلد ہی نیند آگئی۔ کچھ دیر حاجی بے حس و حرکت پڑا رہا، اس کی چندیا آہستہ آہستہ گرم ہونے لگی جب گرمی ناقابل برداشت ہوگئی تو اس نے بہت احتیاط سے اپنے ہاتھوں کو ریت سے باہر
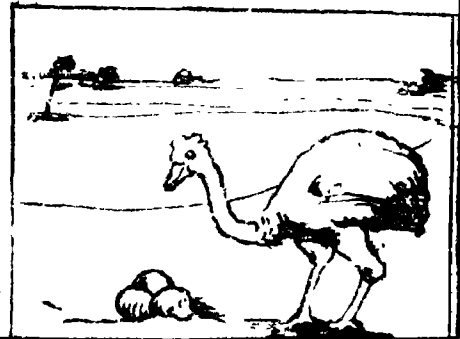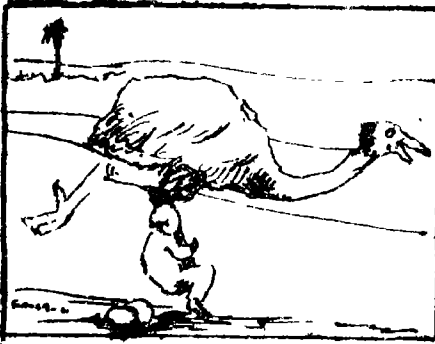
نکالا۔ اور شتر مرغ کا پاؤں مضبوطی سے تھام کر لٹک گیا۔ شتر مرغ اس اچانک حادثے سے بہت گھبرایا اور اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے بہت دیر تک کھینچ تان ہوتی رہی۔ آخر کسی طرح اپنا پیر چھڑا کر بری طرح بھاگا۔ حاجی صاحب مُنہ تکتے رہ گئے۔

(ترجمہ)

بچے کی چہچہاہٹ

زاہدہ خان، سونی پت

چاند پور ضلع جلوال میں چچا چھکن رہا کرتے تھے۔ چچا چھکن کی چوک میں چاولوں کی دکان تھی۔ چچا چھکن کے چار چھوٹے بچے تھے۔ چاروں اسکول میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ چچا چھکن کی بیوی بہت چڑچڑے مزاج کی واقع ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے چپ چپ رہا کرتے تھے۔ چوک والی چاولوں کی دکان میں زیادہ آمدنی نہ تھی ایک روز چچی چچا چھکن پر خوب چلائیں۔ چچا چھکن کو غصہ آیا اور گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے چودہ میل چلے گئے تو ایک گاؤں نظر آیا اس کے چاروں طرف ہرے بھرے باغ تھے۔ چچا نے سوچا اس میں چلنا چاہیئے ایک لخت باغ میں گھس گئے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کوئی چوکیدار نظر نہ آیا۔ چچا خوشی سے پھولے نہیں سمائے پیٹ بھر کر پھل کھائے۔ جب خوب سیر ہوگئے تو چچی کی یاد آئی اور جی للچایا کہ چچی کے لئے بھی چار چار ہر قسم کے پھل لے چلنے چاہئیں اور پھل توڑنے لگے۔ مگر اس اثنا میں چوکیدار بھی آگیا اور چچا کی وہ مرمت کی کہ چچا چچی کا کھایا پیا سب بھول گئے۔ چچا کی جب مرمت ہوچکی تو چپکے سے چاند پور جانے کی ٹھانی۔ چار ہی میل چلے ہوں گے کہ چار چور ملے۔ چوروں نے چچا چھکن سے کہا کہ کہاں جاتے ہو۔ چچا چوروں کو دیکھ کر گھبرائے اور کہا چاند پور جا رہا ہوں چاند پور۔ چور چلائے اور کہا وہاں مت جاؤ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا اتنا سُن کر چچا چلا چلا کر رونے لگے وہ چور چچا کو ایک نامعلوم جگہ لے گئے اور چچا کو چار دیواری میں بند کر دیا۔

جب چاروں چور چوری کرنے چلے گئے تو چچا نے چاروں کونے جھانکے۔ ہر طرف چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر چچا کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ چچا کو ایک چھوٹا سا راستہ بھی نظر آیا۔ جھٹ پٹ چار گھوڑے کس کر اور ان پر سونا چاندی لاد کر خود بھی چڑھ گئے اور سب کے چابک رسید کئے آناً فاناً میں گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ آخر کار چچا خیریت سے چاند پور پہنچ گئے۔ ایک عرصے کے بعد چچی چچا چھکن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ چچا نے پھر اپنی چاولوں کی دکان کھول دی اور وہ خوب چلنے لگی۔ چچا چھکن اب بہت امیر ہوگئے اور خوشی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

عزیز بچیو اور بچو، خوش رہو اور تندرست۔ شکر ہے کہ پچھلے مہینے تھوڑی بہت بارش ہوگئی اور موسم کچھ خوش گوار ہوگیا ورنہ ساون تو سوکھا ہی گزر گیا۔ اِدھر یوپی میں تو فصلیں بھی خراب ہوگئیں۔ بعض علاقوں میں تو جوتنے بونے کی نوبت ہی نہ آئی موجودہ بارش سے فصلیں تو خیر کیا ہوں گی جانوروں کے لئے چارہ ہو جائے گا

اگست کے پرچے میں گلمرگ کی سیر کا حال لکھا گیا تھا وہاں سے واپسی پر سری نگر میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ سب کی رائے ہوئی کہ پہلگام بھی ہو آئیں۔ پہلگام سری نگر سے کوئی ۶۰ ۶۱ میل ہے۔ کوئی دو بجے لاری بس بیٹھے راستہ سیدھا اور ہموار تھا۔ پہلگام سے تھوڑی دور پہلے کچھ چڑھائی تھی۔ مشہور قصبہ پان پور اسی راستے پر ملتا ہے یہاں زعفران پیدا ہوتا ہے۔ اننت ناگ یا اسلام آباد بھی اسی راستے پر ہے۔ یہ بہت بڑا قصبہ ہے۔ سری نگر سے ۳۲ میل دور ہے۔ یہاں کی صنعت و حرفت مشہور ہے۔ گندک کا ایک چشمہ بھی ہے۔ ہم لوگوں کو اس چشمے کے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اتفاق سے ظہیر صاحب کو ہلکی ہلکی خارش بھی تھی۔ جونہی ڈرائیور نے بس روکی ہم لوگ اتر پڑے اور سیدھے حوض تک پہنچے۔ بس سے یہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ہوگا ایک مندر ہے اس کے سامنے ایک حوض ہے اور پھر ایک اور حوض ہے ایک چشمے کا پانی اِن حوضوں میں آتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔ مگر گندک کا چشمہ یہ نہیں تھا۔ وہ مندر کے داہنی طرف تھا۔ بس ایک چھوٹا سا حوض۔ ظہیر صاحب نے اور پھر میں نے اور حامد صاحب نے اس حوض میں غوطہ لگایا۔ دوسرے لوگوں کی ہمت نہیں پڑی۔ خیر صاحب نہا کر پھر لاری پر بیٹھے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد پہلگام پہنچ گئے۔ یہاں تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی۔ اس لئے خوب سردی تھی۔ ہم لوگ سری نگر سے آئے تھے وہاں اچھی خاصی گرمی تھی۔ اس غیر متوقع سردی سے ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ اتنے لاری سے اترے اتنے ظہیر صاحب ایک ہوٹل والے سے بات چیت کر آئے۔ اُن کا اصرار تھا کہ ہم بھی انھی کے ساتھ ٹھہریں مگر شیخ اور پروفیسر عبدالغفور صاحب ایک الگ ہوٹل میں ٹھہرے

پہلگام سطح سمندر سے کوئی، ہزار فٹ کی اونچائی پر ایک وادی میں ہے۔ ہندوستانی بجائے گلمرگ کے یہیں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ خیموں میں رہتے ہیں۔ ہوٹل بھی ہر طرح کے موجود ہیں۔ ایک چھوٹا سا بازار بھی ہے۔ ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ وادی میں تین نالے بھی پہاڑوں پر سے شور مچاتے ہوئے آتے ہیں اور آبادی سے ذرا آگے جا کر تینوں مل جاتے ہیں۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور کچھ عجیب لطف پیدا کرتا ہے۔ ان پر جگہ جگہ لکڑی کے بہت خوب صورت پل ہیں۔ سیاحوں کے خیمے یا تو دونوں طرف پہاڑ کی ڈھلانوں پر ہیں یا پھر نالوں کے کنارے۔ کہیں کہیں نالے کے کنارے جگہ جگہ سبزے پر بنچیں بھی ہیں۔ ابھی جگہ کم رہ گئی، پہلگام کا باقی دلچسپ حال آئندہ لکھیں گے۔

روس اور جرمنی کی لڑائی اس مہینے بھی بڑی شدت سے جاری رہی۔ جرمنی کو اتنے سخت مقابلے کی ہرگز اُمید نہ تھی۔ وہ آگے ضرور بڑھ رہا ہے مگر آہستہ آہستہ اور اپنے لاکھوں سپاہیوں کو قربان کرکے۔ روس نے ایک عقل کی بات یہ کی کہ پولینڈ کے جس حصے پر اس کا قبضہ تھا وہ اس نے پولینڈ والوں کو واپس کر دیا۔ پولینڈ کے قیدی بھی چھوڑ دیے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پولینڈ والے بھی روس کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہیں۔ روس کو امریکہ اور انگلستان سے بھی ہتھیاروں کی مدد پہنچ رہی ہے۔ پورب میں جاپان، سیام یا تھائی لینڈ کی سرحدوں تک پہنچ گیا ہے۔ انگریزی اور امریکی حکومت نے بھی پوری تیاری کر لی ہے۔ سیام پر جاپانی حملہ ہوا تو یہ دونوں قومیں سیام کی مدد کریں گی۔ کیا عجب کہ اسی ڈر سے جاپان نے اپنا حملہ ابھی روک دیا ہو۔

ہندوستان کے لئے اس مہینے کا سب سے اہم حادثہ ڈاکٹر ٹیگور کی موت ہے۔ اس پرچے میں ان کی زندگی کا مختصر سا خاکہ چھپ رہا ہے۔ مفصل حالات آئندہ پرچے میں چھپیں گے۔ مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر نے ہماری درخواست پر چند رباعیاں لکھ دی ہیں۔ اُمید ہے کہ پیامیوں کو پسند آئیں گی۔ ٹیگور پر تین پیامیوں نے حیدرآباد اور بہار سے مضمون لکھ کر بھیجے تھے افسوس ہے کہ ان کے لئے گنجائش نہ نکل سکی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ معمے کی مقبولیت اب دن پر دن بڑھتی جاتی ہے۔ معما بنانے والے صاحب نے اس مرتبہ قاعدوں میں کچھ ادل بدل کر دیا ہے پیامی انھیں غور سے پڑھیں۔ انھوں نے پیام تعلیم کی طرف سے لفافے بھی تیار کرائے ہیں۔ ان پر پیام تعلیم کا پتہ چھپا ہوگا۔ یہ لفافے پیسے میں دو پڑیں گے۔ بعض پیامی پتہ غلط لکھ دیتے ہیں۔ اُن کا حل ہم تک نہیں پہنچتا۔ ان لفافوں کی وجہ سے اس غلطی کا امکان جاتا رہے گا جو بچے یہ لفافے منگانا چاہیں ٹکٹوں کی صورت میں قیمت بھیج دیں۔ ویسے چھوٹے موٹے انعاموں میں ہم خود یہ لفافے بھیج دیا کریں گے

(محمد حسین حسان)

معمہ نمبر ۲۲

پہلا انعام - ۶ روپے

دوسرا انعام - للعہ

دائیں سے بائیں

(۱) ڈاکٹر ..... ۸ اگست کو ۸۰ سال ۲ ماہ کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔

(۵) پنجابی جی ہاں کو ہاں... کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں غلط کہتے ہیں۔

(۷) ہرن

(۸) اگر برطانیہ کو چند ماہ اور ... مل گئی تو وہ جنگ کے لیے کافی تیاریاں کرے گا۔ (بے ترتیب)

(۹) اس لفظ کا الٹا اور سیدھا ایک ہے۔

(۱۰) ایک نا ... کا ... جا ... دیا۔

(۱۲) اس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔

(۱۴) بزرگوں سے ... سے بات کرنا خلاف تہذیب ہے۔

(۱۶) کھلا ہوا۔

(۱۸) .. لقا نہ تیرہ اُدھار۔

(۲۰) اس مہینے کی ۱۳ تاریخ کو حضرت علیؓ پیدا ہوئے تھے۔

(۲۲) غائب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

(۲۴) کہتے ہیں کہ .... کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے

(۲۵) اپنے آدمی کو ہم ... نہیں کہہ سکتے جو تاریک ایام میں سائے کی طرح غائب ہو جائے۔

اوپر سے نیچے

(۱) آج کا کام کل پر ... دینا اچھا نہیں۔

(۲) یہودی کی جمع

(۳) کہتے ہیں لوکریں کے علاقے میں جرمن فوجوں نے روسیوں کا ڈبہ ... کر دیا

(۴) کالج میں دھوم ہے اس ہے پاس پاس کی
عہدوں سے ... ہے صدا دُور دُور کی (اکبر)

(۵) ایسی ہر بات کو جس سے پورا مطلب سمجھ میں آئے .... کہتے ہیں۔

(۱۰) غریب نوجوان کے لئے .... بڑی مصیبت ہے۔

(۱۱) مچھلیوں کا مہینہ

(۱۳) اپنے اہم راز کا کسی ..... سے اظہار نہ کرو۔

(۱۵) جرمنوں سے بہت پہلے ہوائی چھتریاں ... میں استعمال کی جاتی تھیں

(۱۷) سب کو آتی ہے

(۱۹) اپنے بچے کو ... کا بچہ کہنا کس قدر شرم کی بات ہے۔

(۲۱) بہت سے بچے آبا کو با... کہتے ہیں

(۲۳) نرس (بے ترتیب)

معمہ نمبر ۲۱ کا صحیح حل

۱ ر	و	۲ ش		۳ س			۴ ن
و		ی		۵ ر	۶ ا	ش	ی
۸ پ	ش	ا		۹ و	ل		م
۱۰ ی	و	ر	۱۱ پ		۱۲ م	۱۳ س	
ہ		۱۴ ہ	ے		۱۵ ا	پ	۱۶ ن
	۱۷ خ		ش		۱۸ س	ا	گ
۱۹ م	ل	۲۰ س	ہ	۲۱ ا		۲۲ ہ	ر
۲۳ ع	ق	ل		۲۴ س	ت	ی	

صحیح حل — انعام اول — فی کس ۳؍

۱۔ سید عطاء الرحمٰن بہاری ۔ دہلی

۲۔ کوثر بانو

ایک غلطی — فی کس [illegible]

۱۔ فرخ بیگم ۔ رامپور

۲۔ عباس میاں انصاری ۔ سہارنپور

۳۔ محمد حسین فاروقی ۔ آگرہ

۴۔ ریاض احمد جائسی ۔ رائے بریلی

۵۔ غنی الرحمٰن غنی ۔ پشاور

۶۔ محمد اختر ۔ مظفر گڑھ

۷۔ محمد احمد ۔ حیدرآباد دکن

۸۔ سید عطاء الرحمٰن ہاشمی ۔ دہلی

۹۔ عمر کامل ″

۱۰۔ سید منصور حسن ۔ دہلی

۱۱۔ تنویر الدین ضیا ″

قواعد

۱۔ تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔

۲۔ ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳؍ آٹھ حلوں کی ۶؍ ہے۔

۴۔ دونوں انعام تقسیم کردیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۵۔ تمام حل ۱۸ ستمبر تک دفتر پیام تعلیم جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔

۶۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۷۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۹۔ ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

۱۰۔ دال اور ڈال کا فرق نمایاں ہو (د ۔ ڈ)

۱۱۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ۔ ے)

۱۲۔ جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہئے۔

۱۳۔ املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

۱۴۔ **پتہ** :- معمہ ایڈیٹر ۔ پیام تعلیم ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ ۔ نئی دہلی۔

معمانمبر ۲۲ — **کوپن نمبر**

۶ ی	۵	■	۴ ر	و	۳ گ	۲ ے	۱ ٹ
	م	ل	۸	■		ہ	۷ ا
ی	۱۰	■	ی	■	ل		۹
	ہ	۱۲	■	۱۱	■	د	■
ی	■	■	۱۵ ر	و	۱۴	■	۱۳
■	۱۹	■		۱۸ ا	■	۱۷	۱۶ و
۲۳	۲۲ و	■	س	■	۲۱	ج	۲۰ ر
د	ر	۲۵	■		ا		۲۴ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمانمبر ۲۲ — **کوپن نمبر**

۶ ی	۵	■	۴ ر	و	۳ گ	۲ ے	۱ ٹ
	م	ل	۸	■		ہ	۷ ا
ی	۱۰	■	ی	■	ل		۹
	ہ	۱۲	■	۱۱	■	د	■
ی	■	■	۱۵ ر	و	۱۴	■	۱۳
■	۱۹	■		۱۸ ن	■	۱۷	۱۶ و
۲۳	۲۲ و	■	س	■	۲۱	ج	۲۰ ر
د	ر	۲۵	■		ا		۲۴ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمانمبر ۲۲ — **کوپن نمبر**

۶ ی	۵	■	ر	۴ و	۳ گ	۲ ے	۱ ٹ
	م	ل	۸	■		ہ	۷ ا
ی	۱۰	■	ی	■	ل		۹
	ہ	۱۲	■	۱۱	■	د	■
ی	■	■	۱۵ ر	و	۱۴	■	۱۳
■	۱۹	■		۱۸ ن	■	۱۷	۱۶ و
۲۳	۲۲ و	■	س	■	۲۱	ج	۲۰ ر
و	ر	۲۵	■		ا		۲۴ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمانمبر ۲۲ — **کوپن نمبر**

۶ ی	۵	■	ر	۴ و	۳ گ	۲ ے	۱ ٹ
	م	ل	۸	■		ہ	۷ ا
ی	۱۰	■	ی	■	ل		۹
	ہ	۱۲	■	۱۱	■	د	■
ی	■	■	۱۵ ر	و	۱۴	■	۱۳
■	۱۹	■		۱۸ ن	■	۱۷	۱۶ و
۲۳	۲۲ و	■	س	■	۲۱	ج	۲۰ ر
د	ر	۲۵	■		ا		۲۴ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

... عمر و حمص

مرسلہ افضل محمد ...

محمد سعید صدیقی

(... لاہور)

شالامار باغ لاہور

(مرسلہ محمد طارق صدیقی)

آئس لینڈ میں ایک دریا کا اوپری حصہ

(مرسلہ محمد ... چوہدری ...)

Regd. L. No. 1961

ایک مُعلّم کی زِندگی

(نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہو جائے گی)

ایک اُستاد نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ یہ آپ بیتی کیا ہے جامعہ ملیہ کی اِکیس سال کی مکمل تاریخ ہے۔ جامعہ کے نئے اور پُرانے طالب علم۔ پیام تعلیم کے چھوٹے اور بڑے پڑھنے والے مولوی عبدالغفار صاحب مدھولی سے ضرور واقف ہوں گے۔ یہ تاریخ اِنھی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب دو جلدوں یعنی ۸۰۰ صفحوں کی ہے۔ قیمت مکمل سٹ کا ۴/ چار روپیے ہے۔ اگر نئے اور پُرانے جامعی اور پیام تعلیم پڑھنے والے عزیز ایک یا دونوں جلدوں کی قیمت پیشگی بھیج دیں تو کتاب کے چھپنے میں بہت سہولت ہو جائے۔ جامعی بھائیوں سے خاص طور پر درخواست ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے قیمتی ہوگی۔ ماہرینِ تعلیم کے لئے اس میں اکیس سالہ جدید تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔
اِس پتے پر خط کتابت کی جائے۔

عبدالغفار صاحب مدھولی۔ مُدرس مدرسہ اِبتدائی
جامعہ ملیہ اِسلامیہ۔ ڈاک خانہ جامعہ نگر، دہلی

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

شالا مار باغ کشمیر

(مرسلہ محمد ظفر صدیقی)
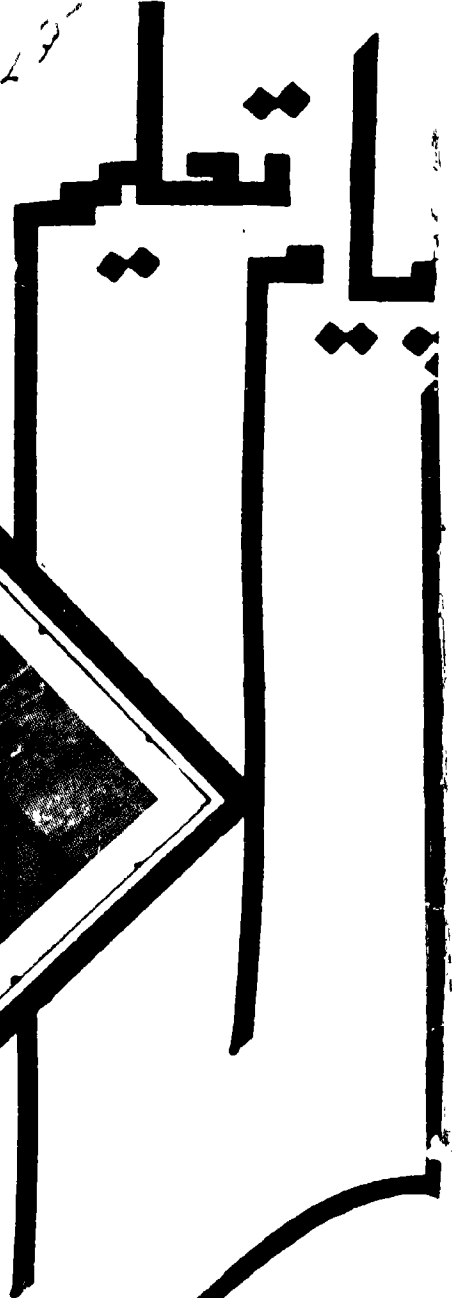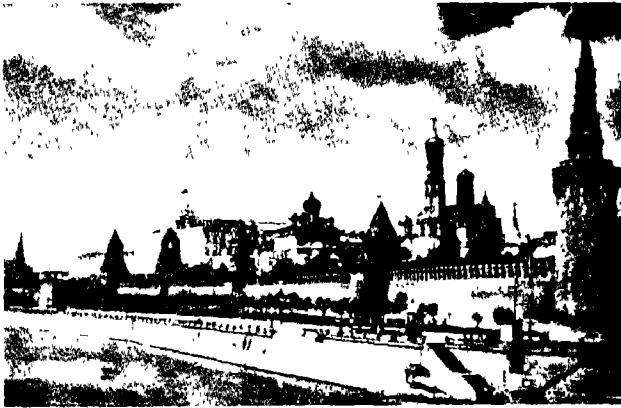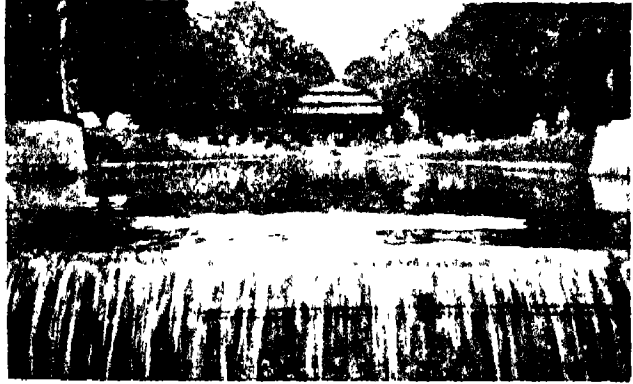
کریملن:- پچھلے زار روس کا شاہی محل ماسکو میں دریائے مسکوا کے کنارے۔ آج کل اسٹالن اسی میں رہتا ہے

لینن گراڈ میں عورتوں کی جسمانی ورزش

پیام تعلیم
دہلی

دہلی، یوپی، سی پی، قلات، بنگال، برار، میسور
حیدرآباد اور پنجاب کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے
سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔ "منیجر"

قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۳ر

ایڈیٹر
محمد حسین حسان

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی۔

پیام تعلیم کے سالنامے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ پچھلے سال کی طرح اب کے بھی بجائے اکتوبر کے جنوری میں نکلے گا۔ اب کے اس میں جغرافیے پر مضمون زیادہ ہوں گے مثلاً سیر و سفر، مہمیں، نئے نئے ملکوں کی دریافت وغیرہ

آج کل کے ناموافق حالات نے ہمارے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ پھر بھی ہم اپنی سی کوشش کریں گے کہ رسالے کا معیار کسی طرح گھٹنے نہ پائے۔ اس دفعہ بھی مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی ایک بہت ہی اچھی نظم اور ایک بہت اچھی کہانی چھپے گی۔

منیجر صاحب پیام تعلیم سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ پچھلے مہینے کی باتوں کو پیامیوں نے بہت توجہ سے پڑھا بہت سے بچوں نے خود پرچہ خریدا اور بہت سے بچوں اور بڑوں نے خریدار بنائے۔ ان میں عزیزی خلیق الزماں (اندور) عزیزی خلیل الرحمٰن (ابانکی پور) عزیزہ عائشہ خاتون (حیدر آباد دکن) جناب عبد الرحمٰن صاحب اُستاد (اتمان زئی) جناب ام۔ اے سیدات صاحب (کلکتہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُمید ہے کہ پیامی اگلے سالنامے تک اپنے رسالے کے بہت سے خریدار بنا دیں گے۔ خریداروں کی تعداد جتنی زیادہ ہو گی سالنامہ اتنا ہی دلچسپ اور شاندار نکلے گا۔

بچوں کی نظموں میں یہ نظمیں اصلاح کے قابل نہیں سمجھی گئیں۔ تین بے وقوف (عثمان آباد) پیام تعلیم (آگرہ) بندر کی کارگذاری (جالنہ) دوسرے شاعروں کی چند رباعیاں اور نظمیں بچوں نے اپنے نام سے بھیج دی ہیں۔ یہ بھی نہ چھپ سکیں گی۔ یہ بچے اکتوبر تک ۱/ کے ٹکٹ بھیج کر اپنی نظمیں منگالیں۔ اس کے بعد یہ ردی کر دی جائیں گی۔

معما بنانے والے صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ معموں کے حلوں کے لفافے ہر مہینے کی آخری یعنی ۱۸ تاریخ کو ایک ساتھ کھولے جائیں۔ اِس لئے پیامیوں کو چاہیئے

کہ حلوں کے علاوہ کوئی شکایتی یا کتابیں منگانے کا خط لفافے میں نہ رکھیں ورنہ یا تو اُن کی تعمیل نہ ہو گی یا بہت دیر میں ہو گی۔

شرافت کا پُتلا

محمد شفیع الدین صاحب نیّر

شرافت کے پُتلے ہیں ننھے میاں
شرافت ہے اُن کے چلن سے عیاں

بہت نیک ہیں اور بہت باتمیز
سبھی اُن کو رکھتے ہیں دل سے عزیز

چھُٹائی بڑائی کو ہیں مانتے
بڑوں کو بڑا ہیں وہ گردانتے

وہ رہتے ہیں سُتھرے وہ رہتے ہیں صاف
نہ دیکھا کبھی ہم نے اِس کے خلاف

بہن بھائیوں پر بگڑتے نہیں
وہ ناحق کسی سے جھگڑتے نہیں

خوشی اور محنت سے پڑھتے ہیں روز
ترقی کے زینے پہ چڑھتے ہیں روز

وہ اوروں کے دُکھ سُکھ کا رکھتے ہیں دھیان
اسی بات سے اُن کی قائم ہے شان

غریبوں کے بھی کام آتے ہیں وہ
اور اُن کے لئے دُکھ اُٹھاتے ہیں وہ

غرض یہ کہ ہیں خوب ننھے میاں
شرافت کا جوہر ہے اُن میں عیاں

ح۔م۔ اسلم، سکریٹری اُردو سوسائٹی، پٹنہ

میز پر بسک اِس طرح سے کھانا چُنا تھا جیسے ثُریّا کے ابّا کی میز پر چُنا جاتا تھا۔ مگر کھانے میں بسکٹ مکھن، حلوے، مُربّے وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کو ثُریّا نے دیکھا تک نہ تھا مسٹر جُمّا نے خود بھی کھانا شروع کیا اور ثُریّا کے سامنے بھی کھانا لگا دیا۔ ثُریّا کھاتی تو کیا دعوت کے مہمانوں اور اُن کے عجیب عجیب قسم کے لباس کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ ثُریّا کے پاس ہی دوسری میز پر ایک گیدڑ صاحب تشریف رکھتے تھے۔ کالی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی اور آنکھوں پر سُنہری عینک۔ اُن کی ٹھڈّی پر داڑھی دیکھ کر ثُریّا کو گھر کی "بڑھیا نانی" یاد آگئیں اُن کی ٹھڈّی پر بھی چند لانبے لانبے بال تھے مسٹر جُمّا کو دیکھتے ہی یہ اپنی کُرسی سے اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے "آہا...... ہا...... مسٹر جُمّا ہیں؟" ان لوگوں کی میز پر آگئے۔ "ارے بھائی اتنے دنوں سے کہاں تھے تم؟" مسٹر جُمّا نے بھی اُن کو آتے دیکھ کر خالی کُرسی بڑھا دی۔ "کیا بتائیں مُدکی صاحب۔ آپ سے ملنے کو تو جی بہت چاہتا تھا مگر اِن دنوں فرصت ہی نہ ملی۔" پھر ثُریّا کی طرف دیکھ کر جُمّا نے مُدکی صاحب سے کہا مولانا یہ ثُریّا بیگم ہیں۔ کرنل شجاعت صاحب کی لڑکی۔" پھر ثُریّا سے بولے اور آپ مسٹر مُدکی "کل خشکی چوپایا کمیٹی" کے سکریٹری ہیں۔" ثُریّا نے جلدی سے اپنے ہاتھ سے توس رکھ کر مُدکی صاحب سے ہاتھ مِلایا۔

"آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی بیگم۔ سچ پوچھئے تو آپ ہی جیسے لوگوں کے شریک ہونے سے تو ہماری کمیٹی کو ترقی ہو سکتی ہے۔"

ثُریّا کو بڑی فکر ہوئی کہ اُن کو جواب کیا دے۔ گھر میں امّی یا ابّا نے یہ کبھی بتایا ہی نہ تھا کہ نئے مہمان سے ملتے وقت کس طرح اُن سے بات چیت کرنا چاہیئے۔

"یہ کیا بات ہے" مسٹر جُمّا بولے۔ "پہلے دعوت سے تو فارغ ہو لیجئے۔ پھر اطمینان سے باتیں کیجئے گا۔" ثُریّا جُمّا کے اِس جواب سے مُسکرا اُٹھی کتنا اچھا

ہے میرا حجّا" اس نے دل میں کہا اور پھر توس اٹھا کر کھانے لگی۔ نیچی نظروں سے مدکی صاحب اور ان کے لباس کو بھی دیکھتی جاتی تھی اس نے ان کے کھانے کی رکابی دیکھی تو اس کا نوالا منہ کا منہ میں رہ گیا۔ جیسے کسی چلتی مشین کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا ہو۔ مدکی صاحب کی رکابی میں دو اُبلے ہوئے چوہے رکھے تھے۔ ایک میں سے تو وہ اپنے کانٹے سے آدھا چیٹ کر چکے تھے اور دوسرا ویسے ہی پڑا تھا۔ ثریا نے پھر تعجب سے ان چوہوں کو دیکھا اور پوری میز پر ایک نظر ڈالی" ارے" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا...... پھلوں والی رکابی کے پاس ہی ایک گہری رکابی میں کوئی دس بیس چوہے رکھے تھے۔ مدکی صاحب کو پورے پورے چوہے کھاتے دیکھ کر ثریا کو بڑی گھن معلوم ہوئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے پیٹ میں بہت سے چوہے کود رہے ہوں۔ اُبکائی آنے لگی۔ اس نے باقی توس رکابی میں چھوڑ دئے اور پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہیں...... ہیں...... ؟"

مسٹر حجّا نے اس کو پانی کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر کہا" ارے" مدکی صاحب یکایک بولے" آپ نے ان چوہوں کو تو چکھا ہی نہیں۔ (باقی آدھے چوہے کو حلق سے اتار کر) ذرا کھائیے تو سہی۔ سچ مچ بڑے مزے دار ہیں" ثریا کو مدکی صاحب کی یہ بات بالکل نہ بھائی۔ اس نے بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا "جی نہیں، میں چوہے نہیں کھاتی"

"اور...... ہاں" مسٹر حجّا بولے" ننھی بی! میں تو بھول ہی گیا تھا تم نے ان کو تو کھایا ہی نہیں" انھوں نے خوب موٹا سا چوہا کانٹے سے اٹھا کر ثریا کی رکابی میں رکھ دیا۔ اسے کھا کر بلقیس آپا کے ہاتھ کا کسٹرڈ نہ بھول جاؤ تو پھر حجّا نام نہیں"

"حجّا؟ ؟" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"جی ہاں، جی ہاں" مدکی صاحب گردن ہلا کر کہنے لگے۔" ارے کسٹرڈ بھی مات ہے صاحب کیا کہنے ہیں۔ اس کے"

"میں آپ لوگوں کی طرح جانور نہیں مدکی صاحب" ثریا کو بہت غصہ آگیا۔

"ہاہا...... ہاہا...... ہوہو" میز کے تمام لوگ ثریا کے اس جملے پر ہنس پڑے اور ثریا کھسیانی ہوکر انھیں دیکھنے لگی۔

"اجی بیگم صاحب" مدکی صاحب ہنستے ہوئے بولے" یہ آپ کے یہاں والے چوہے نہیں جنھیں مسٹر حجّا چٹ کیا کرتے ہیں" (حجّا کی طرف دیکھتے ہوئے) کیوں صاحب؟"

"ہاں، ہاں، ننھی بی" مدکی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں تم ذرا چکھ کر تو دیکھو"

ثریا نے پھر ایک بار اپنی رکابی میں پڑے ہوئے

چوہے کو غور سے دیکھا۔ ارے اس کا رنگ تو چوہوں جیسا نہیں۔ دُم بالکل شہتوت جیسی۔ اس نے منہ پر آنکھوں کے حلقوں سے کشمش کے دو دانے نکلے ہوئے۔ اور پیر؟ گویا تھے ہی نہیں۔ جیسے ربڑ کے چوہے۔

جُھمّا:۔ دیکھو، دیکھو ذرا کھا کر تو دیکھو۔

"اور کیا، یہ چوہے تھوڑے ہی ہیں" مدکی صاحب ابھی تک ہنس رہے تھے۔ ثریا کو اب یقین آیا کہ کوئی مٹھائی ہے۔ چوہے کی شکل کی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا کانٹا اُس کے پیٹ میں چھو دیا۔ کانٹے کی نوک پر بڑا سا ایک اخروٹ نکل آیا۔ اُس کی دُم کھینچی تو یہ سچ مچ بڑا سا شہتوت تھا۔ پھر یہ ہنستی ہوئی اپنی رکابی کے چوہوں کو کھانے لگی۔

"سچ مچ یہ بہت اچھے ہیں" اُس نے مسکراتے ہوئے مدکی صاحب سے کہا اپنی بے جا خفگی پر وہ بہت شرمندہ تھی۔

"اور کھائیے نا" مدکی صاحب نے جواب دیا اور دو چوہے اُٹھا کر ثریا کی پلیٹ میں ڈال دئے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی مگر اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ مزے دار مٹھائی کس چیز کی بنی ہے۔ کسٹرڈ۔ پڈنگ سوپ، فرنی، جیلی" یہ تمام کھانے اس کی بلقیس آپا پکایا کرتی تھیں۔ مگر اس کا مزا ان سبھوں سے الگ تھا۔ تین چار چوہے کھا کر ثریا اور دوسری چیزیں کھانے لگی۔ پھر میز پر چھری، کانٹے اور مدکی صاحب کی چپڑ چپڑ کی آواز کے سوا بالکل خاموشی چھا گئی۔ ثریا کھاتی جاتی اور اپنے چاروں طرف کے جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کو دیکھتی جاتی۔ یکایک مدکی صاحب نے اپنی شروانی کی جیب سے کوئی گول سی چیز نکالی گھڑی جیسی۔ پھر اس کو دیکھ کر بولے" اوہو، آدھا اتوار ہوگیا اور ابھی مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں"

"ارے آدھا اتوار ہوگیا" ثریا نے حیرت سے پوچھا۔ کیسی گھڑی ہے آپ کی؟"

"جی، جی"۔ مدکی صاحب نے پھر اپنی گھڑی دیکھی" جی نہیں، منگل کو پانچ گھنٹے باقی ہیں" مجھ سے دیکھنے میں غلطی ہوئی"

ثریا کو اور بھی تعجب ہوا۔ گھڑی میں ایک، دو تین، چار، پانچ، چھ، سات بجا کرتے ہیں۔ مگر ان کی گھڑی عجیب قسم کی ہے" ذرا مجھے دکھائیے گا"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں لیجئے دیکھئے" ثریا نے جو گھڑی ہاتھ میں لی تو نہ تو اُس کے ابا کی گھڑی جیسے اس پر نشان تھے اور نہ ویسی سوئی تھی۔ بس سات لکیریں تھیں اور تین سوئیاں اُس نے گھڑی اپنے کان کے پاس لگائی، مگر ٹک ٹک کی آواز نہ آئی۔ ثریا نے ہلکے سے دو اک بار ہلایا بھی پھر بھی ٹک ٹک نہ ہوئی۔

ثریا:۔ یہ ٹک ٹک نہیں کرتی کیا؟ (باقی)

رابندر ناتھ ٹیگور

مسعود حُسین خان جامعی۔ ام ۔ اے

پچھلے مہینے بنگال کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے انتقال کی خبر پیام تعلیم میں چھپ چکی ہے۔ ہمارے خیال میں ہر ایک پیامی ٹیگور کو کسی نہ کسی طرح جانتا ہوگا تم میں سے بعض نے سنا ہوگا کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ بعض نے اُن کا نام اقبال کے ساتھ سُنا ہوگا۔ اب ہم تمھیں اُن کی زندگی کے مختصر سے حالات بتائیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور ۷ مئی ۱۸۶۱ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ یہ سال بڑا مبارک سال تھا۔ رابندر ناتھ کے علاوہ پنڈت جواہر لال کے والد پنڈت موتی لال بھی اِسی سال پیدا ہوئے۔ رابندر بڑے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد:۔ دیویندر ناتھ ٹیگور بہت بڑی جائداد کے مالک تھے رابندر اپنے ماں باپ کے تمھیں سُن کر تعجب ہوگا چودھویں بچے تھے۔ اِن سے بڑے تیرہ بھائی بہن اَور تھے۔

رابندر بچپن سے خوب صورت، تندرست ذہین اَور ہوشیار تھے۔ ۵، ۶ برس کی عمر میں اُنھیں اِسکول بھیجا گیا۔ اِسکول میں رابندر کا جی بالکل نہ لگتا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں بعد بھاگنا شروع کردیا۔ ماں، باپ نے انھیں پڑھنے کے لئے بھیجا تھا مگر رابندر نے وہاں جاکر شاعری شروع کردی۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ وہ ۹، ۱۰ برس کی عمر میں بنگالی زبان میں شعر کہنے لگے تھے۔ ماسٹر صاحبان رابندر سے ناراض تھے۔ پکڑ پکڑ کر بلواتے مگر اُستاد کی ذرا آنکھ بچی اَور رابندر غائب! یہاں ایک بات ہم صاف صاف کہہ دیں۔ رابندر کی دیکھا دیکھی کہیں آپ بھی اِسکول سے نہ اُڑنے لگیے گا۔ یہ نہ سمجھیے کہ رابندر کو پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ وہ گھر پر دُنیا بھر کی کتابیں دِن بھر پڑھا کرتے تھے۔ جبھی تو ۹، ۱۰ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا اَور ابھی ۱۳، ۱۴ برس ہی کے تھے کہ ایک کتاب لکھ ماری۔ ہے آپ میں اتنی ہمت؟ اگر آپ سمجھتے ہیں اَور سمجھتے ہی نہیں بلکہ لکھ بھی سکتے ہیں تو بھی ہماری طرف سے تو اجازت

ہے کہ تمھارا جی چاہے تو اسکول جاؤ۔ نہ چاہے تو تمھاری مرضی۔

۱۴ سال کی عمر میں ہنستے کھیلتے رابندر کو پہلا صدمہ پہنچا۔ اس سال اُن کی پیاری ماں ساردا دیوی کا انتقال ہوگیا۔ رابندر کو اُن کے باپ نے اب اسکول سے اُٹھا لیا اور گھر پر ہی اُن کی تعلیم کا انتظام کیا۔ گھر پر اور اس کے بعد دوبارہ کچھ دنوں تک اسکول میں پڑھ کر اُنھوں نے انگریزی سیکھی۔ ۱۶ برس کی عمر تک تو اُنھیں انگریزی زبان میں لکھنے کا خوب مہارت ہوگئی۔ اس زمانے میں جو مضمون اُنھوں نے کلکتہ کے انگریزی اخباروں اور رسالوں میں لکھے اُنھیں دیکھ کر انگریز تک عش عش کرنے لگے۔

رابندر ناتھ نے یورپ کے بہت سے سفر کیے۔ سب سے پہلا سفر اُنھوں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ سترہ برس کی عمر میں انگلستان کا کیا۔ انگلستان میں اُنھوں نے انگریزی لکھنے اور پڑھنے کی خوب مشق بڑھائی۔ لیکن کوئی ڈگری نہ لی۔ وہ لکھنے پڑھنے میں بی اے۔ ام اے کی ڈگریوں کے قائل نہ تھے۔ وہ اپنی مادری زبان بنگالی میں بھی برابر لکھتے رہے۔ بیس سال کی عمر میں اُنھوں نے بنگالی زبان میں کئی اچھے اچھے ڈرامے لکھے۔

رابندر ناتھ انگلستان سے واپس آئے تو ہندوستان میں کچھ نیا ہی رنگ ڈھنگ نظر آیا ہر طرف آزادی آزادی کے نعروں کی گونج تھی، اب ہندوستانی چاہتے تھے کہ اپنے ملک کی باگ ڈور خود ہی سنبھالیں۔ رابندر بھلا کیسے چپ بیٹھ سکتے تھے۔ اِن سے زیادہ ملک اور ملک والوں کے دُکھ اور رنج کو کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ بڑے جوش کے ساتھ ملک کی سیوا میں لگ گئے۔

رابندر ناتھ نے اس عرصے میں بہت کچھ لکھا بنگالی زبان میں اور انگریزی میں بھی نئے نئے قصے کہانیاں ڈرامے اور اچھی اچھی نظمیں لکھیں۔ اِسی عرصے میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اُنھوں نے ملک اور قوم کی خدمت بھی جی توڑ کر کی، پر شاعر رابندر کا جی تو ایک ایسی الگ تھلگ جگہ، ایک ایسے دور دراز کونے میں جا کر بسنا چاہتا تھا جہاں امن ہو اور شانتی۔ ملک کی خدمت اور بڑے بڑے قومی کام کرنے کے لئے تو بہتیرے لوگ موجود تھے پر ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی دھیان نہ دیتا تھا۔ پیارے میو! کل تم ہی کو بڑے ہو کر ملک اور قوم کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ تمھاری دیکھ بھال کرنے والا اور تمھیں ڈھنگ کا رستہ بتلانے والا کوئی نہ ہو تو کل تمھارے دیس کا کیا حال ہوگا؟ جیسے ناؤ بغیر کھویّے کے! رابندر ناتھ نے اس چیز کو بڑی اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ ابھی تک اپنا اسکول کا زمانہ نہ بھولے تھے۔ اُن کے خیال میں ایسے اسکولوں سے

توبھاگنا ہی اچھا۔ اسی وجہ سے سنہ ۱۹۰۱ء میں اپنے
ایک گاؤں میں ایک اسکول کھولا اس نئی بستی کا نام
شانتی نکیتن (امن کی جگہ) رکھا۔ شانتی نکیتن اب
کوئی ننھا منا اسکول نہیں۔ یہ رابندر ناتھ کی ان تھک
کوششوں سے ایک بہت بڑا کالج بن گیا ہے۔
جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے آتے ہیں۔ اور
جہاں ہندی، سنسکرت، اردو، فارسی، چینی
روسی، جرمن وغیرہ زبانوں کے علاوہ تصویر کشی اور
گانے کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ شانتی
نکیتن علاء الدین کے چراغ سے بنایا گیا ہے۔ رابندر
ناتھ نے اس کے بنانے میں بڑا ہی دکھ اور رنج سہا
اُنھوں نے اِس کے لئے اپنا سب کچھ تج دیا۔ وقت
پڑنے پر اپنی جائداد، کتابیں اور اپنی بیوی کا
زیور تک بیچ دیا۔ شانتی نکیتن رابندر ناتھ کے بڑے
گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔

شانتی نکیتن بن جانے اور اس کے بڑھنے اور
ترقی کرنے پر رابندر ناتھ بہت خوش تھے۔ یہیں
اُنھوں نے اپنے لئے ایک جھونپڑا ڈال لیا۔ اور اپنی
باقی عمر اسی میں گذار دی۔ ان کی کوششوں اور
قربانیوں کے اب اُنھیں پھل بھی ملنے شروع ہو گئے
۱۹۱۳ء میں انھیں نظموں کی سب سے اچھی کتاب
گیتان جلی پر یورپ کا مشہور انعام نوبل پرائز[۱]
ملا۔ اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں بھی ہو گیا ہے۔

دوسرے ہی سال سرکارِ انگریزی کی طرف
سے اُنھیں "سر" کا بڑا خطاب ملا۔ جسے رابندر ناتھ
نے ۱۹۱۹ء میں اس وجہ سے واپس کر دیا کہ
وہ سر کو لے کر کیا کریں۔ جب ہندوستانیوں کے سر
کی ڈنڈوں سے خاطر کی جاتی ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور اپنے شانتی نکیتن کو بہت
کم چھوڑتے۔ چھوڑتے تو مجبوراً سفر کے لئے۔ اُنھوں
نے بڑھاپے میں بھی یورپ کے دو تین سفر کئے۔ اس
مرتبہ وہاں کے بڑے بڑے لوگوں آئنسٹائن اور مسولینی
وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ ۱۹۳۲ء میں رضا شاہ
شاہِ ایران کی دعوت پر وہ ایران بھی گئے۔ انھیں
آخر عمر میں گانے اور تصویر کشی کا بڑا شوق ہو گیا تھا
وہ بہت جلد اعلیٰ درجے کی تصویریں بنانے لگے
ایسی کہ وہ لندن اور پیرس کی نمائشوں میں دکھائی
جانے لگیں۔

[۱] ڈاکٹر الفریڈ نوبل (NOBEL) سویڈن کا بہت مشہور انجنیئر اور کیمیا ساز تھا اُس نے اِس کیمیا سازی کی بدولت
کروڑوں روپے کمائے مگر اس آمدنی کو اس نے اچھے کاموں میں لگایا اس نے وصیت کی کہ ہر سال ادب، کیمیا، طب اور
سائنس میں جو لوگ کوئی خاص اور نمایاں کام کریں تو اُنھیں میری جائداد کی آمدنی میں سے انعامات دئے جائیں (ہر انعام
کوئی سوا لاکھ روپے کا) یہ انعام ۱۹۰۳ء سے تقسیم ہونے لگا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ادب کا انعام ٹیگور کو ملا۔

رابندر ناتھ ٹیگور بہت بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے بڑی اچھی اچھی کہانیاں اور قصّے بھی لکھے۔ وہ تقریر بھی بڑی اچھی کرسکتے تھے۔ لیکن ان کے من کی سب سے بڑی موج شانتی نکیتن کا اسکول تھا بچپن میں چونکہ وہ خود اسکول سے بھاگ چکے تھے۔ اس لئے اب انھوں نے ایک ایسا اسکول بنایا جہاں سے کسی کا بھاگنے کو جی نہ چاہے۔ وہ خود بہت عرصے تک شانتی نکیتن سے دور نہیں رہ سکتے تھے وہ کہیں ہوتے ان کی آنکھوں میں شانتی نکیتن کے آموں کے کنج۔ کالے کالے گھنے بادل اور ہرے بھرے میدان بسے رہتے۔ ایسے ہی ہرے بھرے میدانوں، گھنے بادلوں اور آموں کے کنجوں کو چھوڑ کر وہ اس سال کے بھادوں (۵ اگست ۱۹۴۱ء) میں شانتی نکیتن جا سے چل بسے ٭

کیا خوب آدمی تھا۔ کچھ دن ہوئے دہلی کے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے ہندوستان کے چند بڑے بڑے لیڈروں اور زیادہ تر ادبی خدمت کرنے والے بزرگوں کے حالات پر تقریریں کرائی تھیں۔ تقریر کرنے والے بھی ایسے تلاش کئے تھے جن کا ان بزرگوں سے خوب میل ملاپ تھا حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ان تقریروں کو بہت سلیقے اور نفاست کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھاپ دیا ہے زیادہ عمر کے پیامیوں کے لئے کام کی چیز ہے ضخامت ۲۴۰ صفحے ہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اوپر بہت خوب صورت کور یا گرد پوش ہے۔

۱۲ میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مل سکتی ہے۔

بتیسی:۔ از جناب وقار احمد صاحب۔ اس کتاب میں بچوں کے لئے بتیس ہنسی کی کہانیاں ہیں۔ قریب قریب سبھی دلچسپ ہیں۔ اور انھیں شروع کرنے کے بعد پوری کتاب ختم کئے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کہانیوں میں کسی نہ کسی عقل کی بات پر زور دیا گیا ہے۔ چھیانوے صفحے ہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ٹائٹل خوب صورت۔ انوار احمدی پریس الہ آباد سے ۶ میں مل سکتی ہے۔

محمد یحییٰ - پٹنہ کالج

کھیل میں کام کرنے والے

چُنّو .... ایک شریر اور چالاک لڑکا
مدن .... چُنّو کا دوست
گھسیٹا خاں .... چُنّو کا دوست مگر چُنّو سے بیزار
طوطا رام .... چُنّو کا ساتھی اور گھسیٹا کا دوست۔
منشی جی .... ہوسٹل میں باورچی خانے کے منتظم

سین

کھیل کا میدان ہے چُنّو، طوطا اور گھسیٹا آپس میں باتیں کر رہے ہیں

وقت :- شام، کوئی ۶ ۱/۲ بجے۔

گھسیٹا:- بھائی چُنّو اب تو امتحان بھی ختم ہو گئے اب تو کہیں سیر کو چلو۔

طوطا:- ہاں، ہاں ضرور۔ پڑھتے پڑھتے بھائی میں تو بالکل عاجز آ گیا۔

چُنّو:- یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا - پر چلیں کہاں

گھسیٹا:- ارے دوست پچھلی گرمیوں میں ہم پک نک کر گئے تھے۔ اب کے پھر کیوں نہ چلیں ؟

طوطا:- ضرور۔ خوب پک نک رہی تھی۔ کیوں بھائی چُنّو ؟ -

چُنّو:- ہاں تھی تو مزے کی۔ مگر کب چلوگے ؟

طوطا:- کل چلیں۔ کل اتوار ہے نا۔ کیوں گھسیٹا ؟

گھسیٹا:- بالکل ٹھیک - مگر بھائی کچھ سامان بھی تو کرنا ہوگا۔

چُنّو:- ارے، سامان کیا ؟ چل کر بازار سے کچھ پھل اور چاکلیٹ خرید لیں گے۔

طوطا:- اور ہاں بھئی چُنّو تمھارے گھر سے جو حلوا آیا

ہے اُسے بھی رکھ لینا

گھسیٹا:۔ (ہنستے ہوئے) ضرور وہی تو سب سے ضروری چیز ہے۔

چُنّو:۔ ہاں بھئی اچھا یاد دلایا۔ مگر اس کے ساتھ چار کا سامان لازمی ہے۔

گھسیٹا:۔ تم فکر نہ کرو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔

طوطا:۔ کل صبح سویرے ٹھیک ۶½ بجے روانہ ہونا ہے۔

چُنّو:۔ اور اُسی جگہ نا؟

طوطا:۔ ہاں، ہاں اُسی جگہ

سین

(جنگل۔ اسٹو و جلنے کی آواز آرہی ہے)

گھسیٹا:۔ ابھی تو کوئی سات بجے ہوں گے۔ ناشتہ کرنے میں مزا نہ آئے گا۔ پہلے ذرا کھیل لیں۔

طوطا:۔ ہم آنکھ مچولی کیوں نہ کھیلیں؟

گھسیٹا:۔ چُنّو، ضرور ضرور

چُنّو:۔ چور کون بنے گا؟

گھسیٹا:۔ آؤ میں بتاؤں (گنتا ہے) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس۔ بھئی چُنّو تم نکل گئے۔ اب میں اور طوطا رہ گئے۔

چُنّو:۔ (ہنس کر) اچھا ہوا بھئی میں تو بچ گیا۔ اب طوطا اپنی خیر مناؤ۔

گھسیٹا:۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس۔

چُنّو:۔ ارے گھسیٹا پکڑا گیا۔ جا، اب چور بن۔

طوطا:۔ شکر خدا کا، میں بچ گیا۔

گھسیٹا:۔ کٹا ہی درخت ہوگا۔ اچھا دور جا کر چھپ جاؤ۔ میں ایک سے لے کر سَو تک گننے کے بعد آنکھیں کھول دوں گا۔

چُنّو:۔ اچھا میں چلا۔ (چُنّو چلا جاتا ہے۔)

گھسیٹا:۔ بھائی طوطا موقع اچھا ہے۔ اب مار ہاتھ۔

طوطا:۔ اوہو خوب سوجھی تجھے۔

گھسیٹا:۔ ڈبے سے تمام چیزیں نکال لیں پھر اس جھاڑی کی اوٹ میں چاکلیٹ اور حلوے سے شغل کریں۔

طوطا:۔ بس بالکل ٹھیک۔ مگر جلدی۔

(دونوں مل کر تمام چیزیں نکالتے ہیں اور جھاڑی کے پیچھے جلدی جلدی کھاتے ہیں)

چُنّو:۔ (چُنّو دور سے بولتا ہے) ارے بھائی گھسیٹا ابھی تک تمہاری سَو تک گنتی ختم نہیں ہوئی۔ کیا گننا بھول گئے؟ (قریب آتا ہے) دونوں کے دونوں غائب! کھانے کا بکس تو یہیں پڑا ہے (سامنے سے دونوں آتے دکھائی دیتے ہیں) واہ بھئی واہ دونوں کہاں چلے گئے تھے۔ یہ کھیل ہے یا مذاق۔

گھسیٹا :۔ خوب ، مذاق کی ایک ہی رہی۔ میں تو تمھیں ڈھونڈھ رہا تھا۔

چُنّو :۔ واہ ۔ میں تمھیں ڈھونڈھ رہا ہوں اور تم مجھے ۔ خیر چھوڑو۔ تمھیں کھیلنا نہیں ہے ۔ آؤ ناشتہ کریں۔

(گھسیٹا اور طوطا ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں ۔)

چُنّو :۔ اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔

طوطا :۔ تم بکس کھولو نا۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں ۔ (چُنّو بکس کھولتا ہے اور خالی پاتا ہے ۔)

چُنّو :۔ (کھسیانی ہنسی ہنس کر) اچھا یہ بات ہے۔ خیر دیکھا جائے گا (دونوں زوروں سے ہنستے ہیں ۔)

سین

(چُنّو اپنے دوست مدن کے ساتھ ہوسٹل میں۔)

مدن :۔ چُنّو ۔ اِن کم بختوں نے تمھیں خوب ہی الّو بنایا

چُنّو :۔ کوئی ترکیب بتاؤ یار ؟

مدن :۔ بالکل آسان ہے ۔ وہ دیکھو منشی جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں ۔ بس اُن کے پاس تھوڑا سا حلوا لے کر چلے جاؤ ۔ سارا کام بن جائے گا

چُنّو :۔ (اُچھل کر) بس خوب رہا۔ شاباش مدن ۔

(چُنّو منشی جی کے پاس جاتا ہے)

مُنشی جی :۔ کیوں رے چُنّو نالائق ۔ کیا ہے ؟

چُنّو :۔ مُنشی جی گھر سے کچھ حلوا آیا تھا ۔ میں نے سوچا میرے منشی جی کے دانت نہیں ہیں ۔ خوب مزے سے کھائیں گے ۔

مُنشی جی :۔ لا بیٹا ۔ شاباش ۔ بڑا ہی اچھا لڑکا ہے۔

سین

شام کا وقت منّو اور چُنّو گپ کر رہے ہیں

مدن :۔ کیوں چُنّو دے آئے حلوا منشی جی کو ۔

چُنّو :۔ ہاں بھائی ۔ مگر دیکھو بھائی کامیاب بھی ہوتا ہوں یا نہیں۔

مدن :۔ (کان میں کچھ کہہ کر) میری بات مانو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔

چُنّو :۔ میں سمجھ گیا ! اچھا اب چلتا ہوں۔ وقت ہو گیا

مدن :۔ ہاں جاؤ ہوشیار رہنا

(چُنّو منشی جی کے کمرے میں)

منشی جی :۔ کیوں رے ۔ چُنّو بیٹا ۔ حلوا لایا ہے۔ نالائق۔

چُنّو :۔ نہیں منشی جی ایک بات کہنی تھی ۔

مُنشی جی :۔ کہہ کیا کہنا ہے ۔ نالائق ۔

چُنّو :۔ گھسیٹا اور طوطا کے پیٹ میں درد ہے۔ آج رات

کھانا نہیں کھائیں گے۔

منشی جی: دونوں شریر ہیں۔ زیادہ کھا گئے ہوں گے نالائق ہیں سب۔

سین

کھانے کا کمرہ ہوسٹل ہے تمام لڑکے جمع ہیں منشی جی کھانا کھلا رہے ہیں طوطا اور گھسیٹا داخل ہوتے ہیں

منشی جی: ارے گھسیٹا، طوطا تم یہاں کیوں آئے

پیٹ کا درد اچھا ہو گیا۔ نالائق۔

طوطا اور گھسیٹا: جی، جی، جی۔ پیٹ میں درد!

کس کے پیٹ میں درد تھا؟ نہیں تو

منشی جی: ارے جی، جی کا بچہ، نالائق جھوٹ بولتا ہے۔ نالائق۔ جگنو میاں نے مجھ سے کہا ہے۔ وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں کہہ سکتا جاؤ تم لوگ۔ کھانا نہیں ملے گا۔ آج کی رات۔ اگر کچھ ہو جائے گا تو میں پکڑا جاؤں گا۔

(گھسیٹا اور طوطا جاتے ہیں)

سین

دس بجے ہوسٹل میں۔ رات کا وقت

طوطا: ارے گھسیٹے یار جگنو نے تو خوب بدلا لیا

ارے یار اب تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ (پیچھے سے ایک آواز)۔ "اور کھاؤ حلوا اور چاکلیٹ"

پردہ

سائنس کا مشغلہ

بازار سے ایک شیشے کا مرتبان، تھوڑا تھوڑا المونیم اور لوہے کے چند باریک باریک ذرے اور واٹر گلاس جو انڈا رکھنے کے کام آتا ہے اور شہد کی طرح گاڑھا ہوتا ہے لے آؤ۔ مرتبان میں ریت کی تہہ بچھا دو اس پر لوہے اور المونیم کے ٹکڑے اس ترکیب سے بچھاؤ کہ پانی پڑنے سے بلبلے نہیں اس کے بعد ایک حصہ واٹر گلاس تین حصہ پانی میں ملا کر مرتبان میں ڈال دو۔ مرتبان بھر نا چاہیے چند دن بعد مرتبان میں ایک ہرا بھرا لہلہاتا ہوا باغ تیار ہو جائے گا کبھی کبھی مرتبان کے میلے پانی کو نکال دینا چاہیے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ مرتبان صاف پانی کی بالٹی میں رکھ دو۔ اس طرح میلا پانی نکل جائے گا اور صاف پانی مرتبان میں آ جائے گا۔ مگر اس کے لئے کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔

انگلستان میں تعلیم کیسے پھیلی

شانتی سروپ شاستری

ہمارے دیس میں پڑھنے لکھنے کا رواج دن بر دن بڑھتا ہی جارہا ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے مدرسے کھل رہے ہیں۔ پرانے مدرسوں کو ترقی دی جارہی ہے۔ پڑھنے لکھنے کے طریقے بدلے جارہے ہیں۔ جو نوجوان اور بوڑھے بے پڑھے لکھے رہ گئے ہیں ان کے پڑھنے لکھنے کا بھی انتظام کیا جارہا ہے۔ ان سب کوششوں پر بھی ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد سو میں کُل آٹھ ہے۔ دنیا میں بہت ہی کم ایسے ملک ہوں گے جہاں پڑھے لکھے اتنی کم تعداد میں ہوں گے۔ یورپ کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ ایک انگلستان ہی کو لے لو وہاں اس وقت پڑھے لکھوں کی تعداد سو میں ستانوے ہے۔ کیا سمجھے؟ ہندوستان میں سو میں آٹھ اور انگلستان میں سو میں ستانوے! کتنا بڑا فرق ہے۔ مگر یہ ترقی ایک دن میں نہیں ہوئی۔ انگریز قوم اور انگریزی حکومت کو اس کے لئے بہت کچھ کوشش کرنا پڑی ہے۔ آج ہم تمہیں یہی بتانا چاہتے ہیں کہ انگلستان میں پڑھنے لکھنے کا رواج کیسے اور کب سے ہوا۔

پرانے، بہت ہی پرانے زمانے کے انگریز کو زندگی اچھی طرح گذارنے کے لئے بہت اچھا شکاری اور بہادر سپاہی بننا ضروری تھا اور بس۔ پڑھنے لکھنے کا تو ذکر ہی کیا۔

سیکڑوں برس بعد اس ملک میں ایک اور قوم آئی۔ یہ سیکسن قوم تھی۔ اس قوم نے شکار اور سپاہ گری کے ساتھ ساتھ زمین جوتنا، فصل بونا، کاٹنا، اناج کو سنبھال کر رکھنا۔ غرض کھیتی باڑی کی سب باتیں سیکھیں۔ پھر زمانے نے کچھ اور ترقی کی اور بھیڑیں پالنے اون کاتنے اور کپڑا بننے کا رواج ہوا۔ اس کے علاوہ لوگوں نے تجارت اور لین دین کی باتیں سیکھنی شروع کیں۔ سپاہ گری اب بھی بہت ضروری تھی۔ نوجوان فرصت کے وقت تیراندازی اور نیزے بازی سیکھتے تھے۔

اس زمانے میں پڑھنا لکھنا کوئی ایسی عزت کی بات بھی نہیں تھی۔ یہ کام پادریوں کا سمجھا جاتا تھا۔ شریف

رئیسوں کے بچّے اِن پادریوں کے پاس آکر پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے۔

پھر ایک اَور قوم نارمن نے انگلستان پر حملہ کیا۔ اُنھوں نے اِس مُلک پر قبضہ کرتے ہی بڑے بڑے گرجے بنوائے۔ اِن گرجوں کے ساتھ ساتھ مدرسوں کا بھی انتظام کیا۔ آس پاس کے ضلعوں کے ہونہار بچّے اِن اسکولوں میں آتے تھے۔ عام لوگوں کے لئے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰ کی وفات کے چودہ سو سال بعد تک پورے یورپ میں پڑھنے لکھنے کا رواج بس برائے نام تھا۔ کوئی راجہ یا رئیس اپنا نام لکھنا جانتا تھا تو یہ گویا بڑی بات تھی صرف پادری لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور اسی کی بدولت عام لوگوں پر اپنی دھونس قائم رکھتے تھے۔ اور یوں کہو کہ من مانی کرتے تھے۔

ان گرجوں میں لاطینی زبان کا رواج تھا عبادت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی۔ پادریوں کے مدرسوں میں پڑھائی بھی لاطینی زبان میں ہوتی تھی اس کے بعد ایک انگریز بادشاہ ہنری ہشتم کے زمانے میں عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا اس کے کچھ حصّے لوگوں کو پڑھ کر سنائے بھی جاتے تھے۔ ہنری ہشتم بہت ظالم بادشاہ تھا اُسے ڈر ہوا کہ اس کتاب کو پڑھ کر لوگوں میں اس بات کا خیال پیدا ہو جائے گا کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ اُس نے تمام گرجے تباہ کردئے۔ اِن گرجوں کے ساتھ اِسکول بھی ختم ہوگئے۔ بس تھوڑے سے مدرسے باقی رہ گئے۔ یہ چند بڑے بڑے شہروں کے بیوپاری اَور تاجر لوگوں نے کھولے تھے۔ ہنری کے بعد کوئی دو سو برس تک یہی حال رہا۔

اب ایک شخص رابرٹ نے اتوار کے مدرسے جاری کئے عام بچّوں کی پڑھائی کے سِلسلے میں یوں سمجھو کہ یہ پہلی کوشش تھی۔ ان مدرسوں کے علاوہ گرجوں اَور مذہبی انجمنوں کی مدد سے بھی کچھ مدرسے چلتے رہے ایک سو سال تک یہی صورت رہی۔ اِس عرصے میں انگلستان میں بہت سے کارخانے کُھل گئے دیہاتی اپنے گاؤں سے شہر میں آ آکر ان کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے۔ اِن دیہاتی مزدوروں اَور کارخانے کے مالکوں میں اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے اَور نوبت بلووں تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ لوگ خود تو بہت سیدھے سادے ہوتے تھے۔ اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اِن کے لیڈر جو بات بتا دیتے تھے بس وہی کرتے تھے۔ یہ لیڈر خود جاہل ہوتے تھے کبھی کبھی ایسی باتیں کر بیٹھتے تھے جن سے بے چارے مزدوروں کو فائدے کی جگہ نقصان پہنچ جاتا تھا۔ انگلستان کی حکومت سے یہ باتیں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ ان بُرائیوں کا سبب محض جہالت سمجھتی تھی یہ بات بھی اِس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ مُلک پڑھے لکھے لوگ

زرخیز زمینوں، مشینوں اور کارخانوں سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ ۱۸۳۳ء سے حکومت بچّوں کی تعلیم کے سلسلے میں مذہبی انجمنوں کی مدد کرنے لگی۔ پھر بھی آج سے سو سال پہلے تک ملک میں پڑھے لکھوں کی تعداد ایک چوتھائی سے زیادہ نہ بڑھ پائی۔ مدرسے بہت کم تھے۔ جو کچھ تھے اُن کی حالت اچھی نہ تھی یورپ کے دوسرے ملک پڑھنے لکھنے میں بہت زیادہ ترقی کر رہے تھے۔ انگلستان کے سمجھ دار لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر پڑھائی کا یہی حال رہا تو انگلستان ہر بات میں دُنیا کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ جائے گا۔ اس لئے اُنھوں نے طے کر لیا کہ ملک کے ہر ایک لڑکے اور لڑکی کو پڑھا لکھا بنا دیا جائے۔ آج سے کوئی ۸۰ برس پہلے یعنی ۱۸۷۰ء میں انگلستان میں بچّوں کی پڑھائی کے بارے میں ایک قانون منظور ہوا۔ ہر ایک بچّے کے لئے مدرسے میں جانا لازمی قرار دے دیا گیا بعض مدرسوں میں بچوں کے رہنے کا انتظام بھی کیا گیا۔ آج سے ۶۰ سال پہلے سنہ ۱۸۹۱ء میں پڑھائی کے بارے میں ایک اور قانون بنا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری مدرسوں میں بچّوں سے فیس نہ لی جائے۔ اور پڑھائی بالکل مفت ہو۔ اب تک مزدور بچّے آدھے وقت تو کارخانوں میں کام کرتے تھے اور آدھے وقت پڑھتے تھے۔ اس سے اُن کی تعلیم ادھوری رہ جاتی تھی ۱۹۱۸ء میں یعنی پچھلی بڑی لڑائی کے بعد ایک اور قانون بنا اور ۱۴ سال کی عمر کی لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے پورے وقت کی پڑھائی لازمی کر دی گئی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کے لئے ۱۸ سال کی عمر تک چند گھنٹے مدرسے کی حاضری ضروری کر دی گئی۔ باقی وقت کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دی گئی۔

یہ انگریزوں کی اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال کی تعلیمی ترقی کی مختصر سی تاریخ ہے۔ پچھلے پچاس سال میں انگریز قوم نے تعلیم کے معاملے میں حیرت میں ڈالنے والی ترقی کی اور اب تو انگلستان میں شاید ہی کوئی انگریز بے پڑھا لکھا ہوگا۔ اتنی ترقی کبھی نہ ہوتی۔ اگر حکومت پڑھائی کے لئے اتنی سہولتیں پیدا نہ کرتی حکومت نے صرف پڑھائی کے مدرسے ہی نہیں کھولے بلکہ دستکاری کے مدرسے، تجارت یا بیوپار سکھانے کے اسکول کھیتی باڑی، ڈاکٹری، وکالت، انجینیری کے اسکول کھولے۔ اونچی تعلیم کے لئے یونیورسٹیاں کھولیں اسکولوں اور کالجوں میں گھوڑا سواری، تیراکی اور فوجی طریقے کی ڈرل سکھانے کا انتظام کیا گیا۔ پھر عجائب گھر، چڑیا گھر اور کتب خانے قائم کئے۔ جگہ جگہ نمائشوں کا انتظام کیا گیا۔ پھر خود لوگوں میں بچوں کی تعلیم سے عام دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ان کے لئے اچھے اچھے رسالے اور اخبار نکلنے لگے۔ مزے مزے کی دلچسپ کتابیں چھپنے لگیں۔ بڑوں کے اخباروں میں بھی کچھ صفحے بچّوں کے لئے خاص کر دئے گئے۔

سنتے ہیں فرانس اور روس وغیرہ میں بچوں کی پڑھائی کا اور بھی اچھا انتظام ہے۔ ہمارا دیس ابھی ان سب ملکوں سے پیچھے ہے۔ بہت پیچھے مگر اب سمجھدار لوگوں کی توجہ اس طرف ہوگئی ہے۔ اگر ہمت، کوشش، صبر اور استقلال سے کام لیا گیا تو کیا عجب جو کچھ دنوں میں ہم بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنا سر اونچا کر سکیں ؎

حساب دانوں کی کہانیاں

۱۔ پرانے زمانے میں تھیلس ایک مشہور حساب داں گذرا ہے۔ وہ آج سے کوئی ڈھائی ہزار برس پہلے (۶۴۰ قبل مسیح میں) ملٹس میں (یونان کا ایک مشہور شہر) پیدا ہوا۔ وہ نمک بیچ کر اپنا گذارا کرتا تھا۔ اس کے پاس بہت سے گدھے تھے۔ اس زمانے میں وہ ایک ایسی مشین کے بارے میں غور کر رہا تھا جس کی مدد سے اکیلا آدمی تیس چالیس من وزن اٹھا سکے۔ ایک دن وہ اپنے گدھوں اور خچروں پر نمک لاد کر بیچنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ اتفاق سے ایک خچر ندی میں گر گیا۔ تھیلس نے ہزار کوشش کی، ڈنڈے بھی مارے مگر وہ بہت دیر میں اٹھا۔ خچر کو اٹھتے ہی معلوم ہوا کہ وزن پہلے سے بہت کم ہے۔ کیونکہ نمک پانی میں گھل گیا تھا۔ اب وہ جب بھی ندی میں سے گذرتا جان بوجھ کر بیٹھ جاتا۔ اور اس وقت اٹھتا جب نمک کافی گھل جاتا۔ تھیلس ہر قسم کی کوششیں کر کے تھک رہا۔ مگر کوئی تدبیر بن نہ آئی۔ ایک دن اس نے اس خچر پر روئی اور اسفنج کے ٹکڑے لاد دیے۔ خچر ہمیشہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اب کے اس کے مالک نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ دور کھڑا مسکراتا رہا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد خچر اٹھا تو وزن پہلے سے دوگنا تھا۔ کیونکہ روئی اور اسفنج میں پانی بھر گیا تھا۔ کمر دہری ہوگئی۔ اسے ایسی نصیحت ہوئی کہ ندی میں بیٹھنا بند ہو گیا۔

۲۔ ایتھنز یونان کا دارالخلافہ ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں وہ ہر قسم کے علم و فن کے لیے مشہور تھا۔ اسی زمانے میں وہاں طاعون پھیل گیا۔ اور لوگ سینکڑوں کی تعداد میں مرنے اور گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یونانیوں نے اپنے مندروں میں جا کر خدا کے حضور میں دعا کی۔ چنانچہ ایک غیبی آواز سنائی دی۔ کہ اس مندر سے دگنا ایک مندر اور بنایا جائے بیماری دور ہو جائے گی۔ فوراً معمار لگا دیے گئے۔ اور نئے مندر کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی پہلے مندر سے دگنی رکھ کر مندر بنا دیا گیا۔ مگر بیماری پہلے سے بھی زیادہ پھیل گئی۔ لوگوں نے پھر دعا کی۔ تو آواز آئی۔ کہ یہ مندر پہلے سے آٹھ گنا ہے چنانچہ ایک اور مندر بنایا گیا جس کا طول پہلے سے دگنا تھا اور اونچائی اور چوڑائی اتنی ہی تھی۔ مگر بیماری کم نہ ہوئی۔ وہاں کے باشندوں نے پھر دعا کی تو معلوم ہوا کہ اس مندر کی شکل پہلے مندر سے مختلف ہے۔ چنانچہ لوگ افلاطون کے پاس گئے اور اس نے انھیں اقلیدس کے پاس بھیج دیا۔ اقلیدس بہت بڑا حساب داں تھا۔ اس نے انھیں مندر بنانے کا طریقہ بتا دیا اور بیماری دور ہوگئی

رمضانی نے شہد نکالا

محمد عمیس - علی گڑھ

رمضانی صاحب میرے نوکر ہیں اور ادریس صاحب میرے چھوٹے بھائی - انھی دونوں کا قصہ آج مجھے سُنانا ہے۔

ایک دن یہ دونوں بدحواس شور مچاتے، دوڑتے میرے پاس آئے - میں سمجھا گھر میں آگ لگ گئی ہے لیکن ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ خیر آگ تو نہیں لگی ہے لیکن ایک شہد کا چھتہ ضرور "دریافت" ہوا ہے یہ دونوں خوشی کے جوش میں اس قدر بے خود تھے کہ ٹھیک سے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کر لیا ہو۔

یہ خوش خبری مجھ تک پہنچانے کے بعد یہ حضرات اس بات پر ضد کر رہے تھے کہ اس چھتے پر دھاوے کی تیاری فوراً شروع کردی جائے۔ ورنہ مکھیاں شہد لے کر اُڑ جائیں گی - اس آخری بات پر ان کو اس قدر کامل یقین تھا اور اس طرح قسموں پر قسمیں کھا رہے تھے - جیسے اپنی آنکھوں سے مکھیوں کو بستر باندھتے دیکھا ہو - ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درخواست تھی کہ اس کارِ خیر میں میں بھی جہاں تک ہو سکے مدد کروں اور اس کام کا صلہ اپنے حصے کے شہد کی شکل میں پاؤں۔

خیر صاحب - جب میں نے پوچھا کہ آخر وہ بدبخت چھتا ہے کہاں ؟ تو بجائے سیدھا سادھا جواب دینے کے دونوں نے نئے سرے سے تمہید اُٹھائی یعنی یہ بیان کرنا شروع کیا کہ وہ چھتا "دریافت" کیسے ہوا۔ "دریافت" کا سہرا دونوں اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ اس لئے دونوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا - پتہ چلا کہ کوٹھے پر ایک کمرے کی نالی میں ہے۔ "دریافت" کا سہرا رمضانی کے سر بندھا کیوں کہ انھوں نے قسم کھا کر ثابت کر دیا کہ سب سے پہلے کوئی ایک ہفتہ ہوا انھوں نے اس کمرے میں بھنبھناہٹ کی آواز سنی تھی - اب یہ محض اتفاق کی بات کہئے کہ ان کو نالی میں جھانک کر دیکھنے کا خیال نہیں آیا - اور ادریس صاحب نے پہلے دیکھ لیا -

نتیجہ اس ہنگامے کا یہ ہوا کہ کوئی پانچ منٹ بعد مجھے اس مہم پر روانہ ہونے والے دستے کی سرداری یا سپہ سالاری قبول کرنی پڑی۔ ہم لوگ فوراً محلے کے ایرے غیرے نتھو خیرے لونڈوں کو جمع کر کے حملے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

دستے کی ترتیب یہ تھی کہ آگے آگے سپہ سالار صاحب ہاتھ میں ایک موٹی سی چھڑی لئے ہوئے تھے۔ اس کارآمد ہتھیار کی ضرورت ذرا ضرورت سے زیادہ جوشیلے مجاہدین کو قابو میں رکھنے کے لئے پیش آئی اور دورانِ سفر میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ سپہ سالار کے مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی ایک قدم پیچھے رمضانی صاحب تھے۔ ان کی شان یہ تھی کہ بغل میں کالا کمبل، سیدھے ہاتھ میں پلیٹ کاندھے پر تولیا۔ بائیں ہاتھ میں ایک مشعل جو ایک لکڑی کے سرے پر کپڑا باندھ کر بنائی گئی تھی۔ ان کے پیچھے تماشائیوں کا ایک گروہ تھا۔

ہم لوگوں کا یہ جلوس بہت دھوم دھام سے کمرے کے دروازے پر رکا۔ کوئی ۵ منٹ میں رمضانی مسلح ہو چکے تھے۔ اس شان سے کہ داہنے ہاتھ پر تولیا بندھا تھا۔ بائیں ہاتھ میں مشعل بائیں ہاتھ کا کام دشمن کے قلعے میں بدحواسی پھیلانا تھا۔ اور داہنا ہاتھ مالِ غنیمت بٹورنے کے لئے وقف تھا۔ تولیا اس لئے لپیٹا گیا تھا کہ مکھیاں کہیں ہاتھ میں نہ کاٹ کھائیں۔ کمبل ابھی بغل ہی میں دبا تھا۔

رمضانی صاحب نالی کے پاس کمبل اوڑھ کر بیٹھے۔ پلیٹ سامنے رکھی اور مشعل جلا کر بولے آپ لوگ تیار ہو جائیے۔ ہم لوگ کہنے کے مطابق فی الفور تیار ہو گئے یعنی کمرے کے کواڑ بند کر دیئے گئے۔ رمضانی صاحب کام شروع کرنے والے تھے اس لئے ہم لوگ کواڑ سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مکھیوں کے بڑے زور سے بھنبھنانے اور رمضانی صاحب کے کھو کھو کھو کھو ہنسنے کی آواز آئی۔ بولے "قسم اللہ کی بڑے گھتے میں ہیں کل کی کل!" پھر کچھ کھڑ کھڑ کی آواز آئی اور اس کے بعد رمضانی صاحب کی سُریلی آواز "ہا ہا! یہ تر تراتا مال!" معلوم ہوا کہ یہ کھڑ کھڑ کی آواز شہد کے چھتے کا ایک ٹکڑا توڑ کر پلیٹ میں رکھنے کی تھی۔

فتح کی یہ پہلی خوش خبری سن کر لونڈے خوشی سے اچھلنے کودنے لگے۔ لیکن تقدیر کھڑی ہنستی تھی۔ آہ! کسے معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا

رمضانی صاحب کی سریلی آواز ابھی ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی کہ اچانک انھوں

نے تلملا کر ایسی چیخ ماری کہ کچھ بزدل تو تڑ سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ باقی لوگ بے تابی سے کہا "کیا ہوا رمضانی؟ کیا ہوا رمضانی؟" کا شور مچانے لگے۔ جواب میں رمضانی صاحب نے بہت مدھم آوازمیں کچھ من منا کر فرمایا جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ایک مکھی نے کمل میں گھس کر گردن پر ڈس لیا ہے۔ سخت تکلیف ہو رہی ہے۔

رمضانی صاحب کی آواز اتنی کم زور تھی کہ معلوم ہوتا تھا بس اب چلے اور نزع کا وقت قریب ہے۔ اس وقت سچ پوچھیے تو نہ تو ہمیں رمضانی صاحب کے ڈسے جانے کا غم تھا اور نہ اُن کے وفات پانے کا۔ غم اس کا تھا کہ کہیں ہمت ہار کر رمضانی صاحب فرار نہ ہو جائیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ محنت اکارت۔ کیونکہ باہر کھڑی ہوئی بزدلوں کی جماعت میں بدقسمتی سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ "مرحوم" کی جگہ لے سکے۔ شہد کھانے کے لئے اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ رمضانی صاحب کو مکھیوں سے انتقام لینے کا جوش اور شاباش وغیرہ دے دلا کر دوبارہ زندگی کی روح پھونکی جائے۔

رمضانی صاحب کے معاملے میں ابھی ہم اس نسخے پر عمل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ کمرے کے اندر سے یکبارگی پیروں کی دھما دھم اور کمل کی پھٹا پھٹ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ رمضانی صاحب گلا پھاڑ کر کواڑ پیٹتے ہوئے چیخے "بس اب کھول دیجیے۔ غبیش میاں!".... ....اب نہیں رہوں گا اس کے اندر........ ارے مرگیا........ اجی مکھیاں گھس گئیں کمل میں........" اور جب ہم نے اپنی حفاظت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کواڑ کا تھوڑا سا پٹ کھولا تو رمضانی اتنے زور شور سے کواڑ سے رگڑ کھاتا اور بدن سے قمیص نوچتا نکل کر بھاگا۔ جیسے توپ سے گولا چھوٹا ہو۔

یہ منظر دیکھ کر سب کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ زور شور کی بھگدڑ مچی جیسے بکریوں کے گلے میں چیتا آن کودا ہو۔

وہ دن اور آج کا دن رمضانی نے پھر کبھی شہد نکالنے کی کوشش نہیں کی۔

چراغ کی کہانی

مرزا اسکندر بیگ
گورکھ پور

انسان کبھی بے کار نہیں بیٹھا رہتا۔ پرندوں اور دوسرے جانوروں کی طرح سورج ڈوبتے ہی پڑ کر سو جاتا ہے۔ بلکہ رات کا ایک اچھا خاصا حصہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ لیکن رات کو کام کرنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے۔ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی اور طرح سے روشنی پیدا کی جائے تاکہ رات کو کام کیا جاسکے۔ رات کو چاند اور ستاروں کی مدھم روشنی ناکافی ہوتی ہے اور جب بادل گھر آتے ہیں تو وہ بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ پھر روشنی کس طرح پیدا کی جائے؟

یہی سوال تھا جو شروع شروع میں انسان کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا اور اس کے حل کرنے کی فکر تھی۔ اس نے دیکھا کہ رات کے اندھیرے میں جگنوؤں کے چمکنے سے روشنی ہو جاتی ہے اس نے اس روشنی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ایک سوراخ دار ناریل کے خول یا ایک سوراخ دار تونبی میں چند ننھے ننھے جگنو پکڑ کر بند کر دیے۔ یہ گویا انسان کا پہلا چراغ تھا جس سے اس نے روشنی حاصل کی۔ لیکن ان کیڑوں کی پیدا کی ہوئی روشنی زیادہ تیز نہ ہوتی تھی۔ اس لئے انسان کو کسی دوسرے ذریعے کی فکر ہوئی۔ چراغ کی ترقی میں دوسرا قدم وہ تھا جب اس نے اپنے غار میں جلائی ہوئی آگ سے درخت کی ایک ٹہنی کو روشن کیا اور اس سے چراغ کا کام لینے لگا۔ اسی کو مشعل کہتے ہیں اب اس مشعل میں بھی ترقی ہوئی اور وہ ایسی کھپاچوں سے بنائی گئی جن میں تیل یا چربی کا جز تھا۔ اس طرح روشنی زیادہ تیز اور پائدار ہو گئی۔ اس کے بعد کسی درخت کے پتوں میں موم یا چربی مل دی گئی اور انھیں ایک لکڑی کی چھڑ کے چاروں طرف لپیٹ دیا گیا۔ یوں روشنی اور صاف ہوگئی اور اس قسم کی مشعلیں شمعیں کہلائی جانے لگیں۔ کچھ عرصے بعد عقل مندوں نے معلوم کیا کہ اگر مشعل کے چاروں طرف چکنائی پوت دی جائے تو روشنی اور بھی عمدہ اور پائدار ہو جائے گی۔ بس

پھر کیا تھا ہر جگہ اسی طرح کی مشعلیں بننے لگیں۔ ایسی مشعل کی روشنی بہت زیادہ ہوتی تھی اور لطف یہ ہے کہ جلتے وقت دھواں بھی بہت کم ہوتا تھا۔ ہزاروں سال تک اسی قسم کی مشعلوں سے کام چلتا رہا۔ اس کی ترقی میں ایک اہم قدم اس وقت اٹھایا گیا جب الفریڈ اعظم (Alfred the Great) کے زمانے میں سوت کی ایک بتی پر چربی یا لاکھ کی ایک تہہ سی چڑھائی جانے لگی اور یوں موم بتی وجود میں آئی۔ عموماً کئی موم بتیاں ایک ساتھ روشن کی جاتی تھیں جن کی روشنی سے گھر میں اچھا خاصا اجالا ہو جاتا تھا۔ آج کل کی موم بتیاں اُن سے اچھی تو ہیں لیکن اصول دونوں کا ایک ہی ہے۔

ابھی تک تو صرف شمع اور مشعل ہی کی ترقیوں کا ذکر ہوا ہے لیکن اُن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک اور قسم کے چراغ میں بھی ترقی ہو رہی تھی۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو گیا کہ جانوروں کی پگھلی ہوئی چربی آسانی سے جلنے لگتی ہے تو اس نے ایک اور قسم کا چراغ بنایا جس کی ترقی یافتہ صورت آج کل کے لیمپ ہیں۔ شروع شروع میں کسی خول دار چیز یا کسی جانور کی کھوپڑی میں چربی پگھلا کر ڈال دی جاتی تھی۔ اور اس میں درخت کے ریشے بٹ کے ڈال دئے جاتے تھے جو بتی کا کام دیتے تھے اس چراغ کی بناوٹ سادہ تھی اور یہ ہلکا بھی تھا۔ ہوتے ہوتے سنکھ وغیرہ کی جگہ مٹی کے دئے استعمال ہونے لگے۔ ان میں ایک طرف بتی کے لئے جگہ ہوتی تھی۔ ایسے دیوں کا آج تک ہندوستان وغیرہ میں رواج ہے۔ رفتہ رفتہ ان میں بجائے چربی کے سرسوں، ارنڈ، نیم اور مونگ پھلی کا تیل استعمال ہونے لگا۔ دیوالی کے موقع پر جو چراغاں ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ یہی دئے ہوتے ہیں اور میٹھا تیل استعمال کیا جاتا۔

قدیم رومیوں اور یونانیوں (Romans & Greeks) میں جو لیمپ استعمال ہوتے تھے عموماً فانوس نما ہوتے تھے اور ان میں تیل کی کپی ہوتی تھی۔ بیچ میں ایک سوراخ ہوتا تھا۔ اس میں بتی گذاری جاتی تھی اور تیل ڈالا جاتا تھا۔ اکثر ان لیمپوں میں ایک درجن سے زیادہ چراغ ہوتے۔ ان میں الگ الگ بتیاں ڈالی جاتی تھیں جتنی زیادہ بتیاں ہوتی تھیں اسی قدر روشنی بھی زیادہ تیز ہوتی تھی۔ کے مقام کارٹونہ کے عجائب گھر میں ایک ایسا لیمپ موجود ہے جس میں الگ الگ سولہ بتیاں ہیں۔ عجیب وغریب لیمپ آج سے پونے تین ہزار برس اتروریہ کے بت خانے میں روشن ہوا تھا۔ (پہلی با[ر]) اس قسم کے لیمپ صرف اُس زمانے میں مہذب طبقے ہی میں استعمال نہ ہوتے تھے بلکہ اب بھی اُن کا رواج ہے۔ کبھی کبھی یہ لیمپ بے حد خوب صورت ہوتے لیکن اُن کی روشنی زیادہ نہ ہوتی تھی اور ان سے دھواں بہت نکلتا تھا جو گھر کی تمام چیزوں کو

کو سیاہ کر دیتا تھا۔ آخرکار ان میں بھی اِصلاح شروع ہوئی۔

۱۷۸۳ء میں آرگینڈ (Argand) نامی ایک سوئس (Swiss) ڈاکٹر نے جو اِن دِنوں لندن میں ٹھہرا ہوا تھا ایک نیا لیمپ ایجاد کیا جو ان تمام لیمپوں سے عمدہ تھا۔ آرگینڈ نے پُرانے لیمپ میں کیا اِصلاح کی؟ کسی معمولی لیمپ کو دیکھو جس میں مٹی کا تیل جلتا ہے، تُم دیکھو گے کہ اس کی چمنی بتی کو ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اسی کے ذریعے سے ہوا آیا جایا کرتی ہے۔ آرگینڈ نے اِسی اصُول کو سامنے رکھا۔ لیمپ کے اِس حصّے کو جس میں چمنی ہوتی ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ اِس میں ہوا کے آنے جانے کے لئے راستہ موجود ہے اسی راستے سے وہ بتی تک پہنچتی ہے۔ کیونکہ گرم ہوا (جو بتی کے جلنے کی وجہ سے گرم ہو جاتی ہے) ہلکی ہونے کی وجہ سے اُوپر کو اُٹھتی ہے۔ لہٰذا اس لیمپ کی ساخت میں اس اصُول کو مدِّنظر رکھا گیا تھا کہ جلتے وقت بتی کو زیادہ سے زیادہ تازہ ہوا مل سکے۔ آرگینڈ نے جو بتی اپنے لیمپ میں اِستعمال کی وہ پتلی اور چپٹی تھی اِس لئے اپنی جسامت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ ہوا لے سکتی تھی۔ اِس قسم کے لیمپ کی روشنی بہت عمدہ ہوتی تھی اور بتی کی لَو صاف اور شفاف ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے جلتے وقت اِس میں سے دھواں گویا نکلتا ہی نہ تھا۔

آرگینڈ کی اِس ایجاد کی ہر جگہ دھوم مچ گئی۔ اور اگلے بیس سالوں میں لیمپ بنانے میں اتنی ترقیاں ہوئیں جتنی پچھلی بیس صدیوں میں بھی نہ ہوئی تھیں طرح طرح کے برنر (Burner) (لیمپ کا وہ حصّہ جس میں بتی ڈالی جاتی ہے اور جس پر چمنی جمائی جاتی ہے) ایجاد ہوئے۔ لیکن ان میں وہی آرگینڈ والا اصُول کام کر رہا تھا۔

آرگینڈ کی اس ایجاد کے بعد اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص ولیم مرڈک (William Mirdock) نے گھروں کو روشن کرنے کا ایک نیا طریقہ معلوم کیا لوگ مدت سے جانتے تھے کہ جب چربی یا کوئلہ جلتا ہے تو دونوں میں سے اُٹھتے ہوئے ابخرات جلتے وقت بہت صاف روشنی دیتے ہیں اور یہ جلنے والی چیز گیس ہوتی ہے۔ چربی یا کوئلہ نہیں۔ شمع یا تیل والے لیمپ کی بتی کی لَو تیل کو حرارت پہنچاتی ہے جس سے تیل میں سے گیس نکلتی ہے ۱۷۹۲ء میں ولیم مرڈک نے اِس گیس سے بہت عمدہ کام لیا اس نے ٹین کے ایک بہت بڑے برتن میں کوئلوں کو خوب دہکایا اور اُن سے نکلی ہوئی گیس کو نلوں اور نلکیوں کے ذریعے اپنے مکان کے ہر حصّے میں پہنچا دیا۔ جہاں کہیں وہ روشنی کرنا چاہتا تھا گیس کی نلکی کی ٹھیری کھول دیتا تھا۔ جب گیس

نکلنے لگتی تو ذراسی دیا سلائی لگانے سے فوراً جل اُٹھتی تھی۔ اس کی روشنی بہت تیز عمدہ اور صاف ہوتی تھی۔ اس میں سے دُھواں بالکل نہیں نکلتا تھا۔ لیکن اس طرح روشنی کرنے میں ایک بڑا عیب یہ تھا کہ اگر کہیں گیس کے نل میں سوراخ ہوجاتا تھا تو گیس نکلنے پر جلد ہی آگ لگ جاتی تھی۔ کیونکہ یہ گیس فوراً آگ پکڑتی ہے۔

اس خرابی کو دوُر کرنے کی کوشش ہو رہی تھی کہ ۱۸۰۶ء میں ایک نئی قسم کی روشنی ایجاد ہوئی جس نے گیس کی روشنی کو ختم کردیا۔ یہ روشنی بجلی کی تھی۔ اس کا تجربہ پہلے پہل لندن والوں کے سامنے سرہمفری ڈیوی نامی سائنس داں نے کیا۔ اس نے ۲۰۰۰ سیل کی بیٹری بنائی اُس کے + اور - (مُثبت اور منفی) تاروں کے قریب لانے سے ان کے بیچ میں روشنی کی ایک لکیر سی دکھائی دی سب سے پہلے جو برقی لیمپ ایجاد ہوا اُسے ارک لیمپ (Arc Lamp) کہتے ہیں گیس کاربن (Gas Carbon) کی ایک پتلی سی چھڑ میں سے بجلی کی لہر گذاری جاتی ہے۔ اور اس کے ایک طرف ایک قوس سا قائم ہوجاتا ہے۔ یہ بے حد روشن ہوتا ہے

اس قسم کی بجلی کی روشنی بہت تیز ہوتی ہے چنانچہ ارک لیمپوں سے صرف بازار اور گلیاں روشن کی جاتی تھیں۔ لیکن اس ایجاد سے پہلے روشنی کے لئے گیس لیمپ ہی استعمال ہوتے تھے (۱۸۱۶ء میں لندن کا بیشتر حصہ گیس کے لیمپوں سے روشن ہوتا تھا ۱۸۲۱ء میں پہلے پہل امریکہ کے شہر بالٹیمور میں گیس کی روشنی ہوئی تھی) رفتہ رفتہ بجلی کی روشنی میں ترقی ہوئی۔ اور اس کی سب سے ترقی یافتہ صورت آج کل کے بجلی کے قمقمے (بلب) ہیں۔ اب بجلی کی روشنی بہت سستی ہوگئی ہے۔ اور ہر شہر میں بجلی کے قمقمے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کو سستا کرانے میں امریکہ کے ایک مؤجد سر طامس ایلوا ایڈیسن نے بڑی مدد کی۔ ان کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

مشعل، شمع، لیمپ، گیس کے لیمپ اور بجلی کے قمقمے، چراغ کی ترقی کے مختلف قدم ہیں اب ذرا خیال کرو کہ چراغ کے سلسلے میں انسان نے کیسی کیسی ترقیاں کی ہیں پہلے پہل لکڑی کی ایک چھڑ جلائی جاتی تھی جس سے تمام غار سیاہ ہوجاتا تھا اب یہ حال ہے کہ بٹن دبایا نہیں کہ تمام گھر میں روشنی ہوگئی نہ دھوئیں اور کاجل کا اندیشہ اور نہ گیس سے نقصان پہنچنے کا خدشہ۔

بُلبُل

احمد سلمان - جامعہ نگر

آجا آجا بلبل آجا | پیارے پیارے بلبل آجا
اچھا سا اک گیت سناجا | پیاری صورت اپنی دکھاجا

آجا آجا بلبل آجا
پیارے پیارے بلبل آجا

اتنا مجھ سے ڈرتا ہے کیوں | پیار نہیں تو کرتا ہے کیوں
جنگل جنگل پھرتا ہے کیوں | گرم ہوا میں مرتا ہے کیوں

آجا آجا بلبل آجا
پیارے پیارے بلبل آجا

تجھ کو اچھا کھانا کھلاؤں | ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلاؤں
باغ کی تجھ کو سیر کراؤں | اچھے اچھے پھول دکھاؤں

آجا آجا بلبل آجا
پیارے پیارے بلبل آجا

میری آنکھ کے تارے بلبل | میرے دل کے سہارے بلبل
دنیا بھر کے پیارے بلبل | میرے اچھے پیارے بلبل

آجا آجا بلبل آجا
پیارے پیارے بلبل آجا

سلمان کا دل تجھ پہ فدا ہے | درد تو یہ تو ہی نے دیا ہے
آجا تو بس یہ ہی دوا ہے | بتلا تیرے دل میں کیا ہے

آجا آجا بلبل آجا
پیارے پیارے بلبل آجا

مینا

قمر محمود خاں نیا ہیڑا

پالی ہے میں نے ننّی سی مینا | ہوتا ہے اُس کا رنگین گانا
زرّیں پر اُس کی چھوٹی سی منقار | دیکھے سے جس کو آجاتا ہے پیار
چھوٹی سی آنکھیں پھیلے ہوئے پر | مینا کا میری چرچا ہے گھر گھر
پالا ہے میں نے عرصے سے اُس کو | ہوتی ہے تسکیں دیکھے سے اُس کو
باتوں سے میری راحت ہے پاتی | گانا ہے اپنا مجھ کو سناتی
مجھ سے ہمیشہ باتیں ہے کرتی | ہے میرے آگے وہ شعر پڑھتی

کاہے کو کاٹوں کاہے کو بیچوں
وہ مجھ سے کھیلے میں اس سے کھیلوں

چڑیا

مبارک زماں خاں قائم گنج

دیکھو پھدکنے والی چڑیا | پیاری پیاری اچھی چڑیا
صبح کو منگل گانے والی | پیڑ پہ دھوم مچانے والی
چھوٹے چھوٹے پر پھیلا کر | بیٹھی ہے دیوار پہ آکر
دانا کھانے آئی ہے یہ | شور مچانے آئی ہے یہ
محنت کرنا اور کمانا | خود کھانا بچوں کو کھلانا
ہر دم اس کا کام یہی ہے | صبح یہی ہے شام یہی ہے

دانا ہم بھی اب ڈالیں گے
ہم بھی اک چڑیا پالیں گے

پیاری عفت

عبدالقدیر جبلپوری - ندوہ لکھنؤ

عفت لڑکی بھولی بھالی | سب سے انوکھی سب سے نرالی
بال بھی اس کے کالے کالے | بالوں میں سیدھی مانگ نکالے
کپڑے پہنے اچھے اچھے | پاؤں میں اس کے سونے کے لچھے
گھر کا کام خوشی سے کرتی | جو کچھ کرتی جی سے کرتی
وہ نہ تھی سر چڑھنے والی | ہر دم لکھنے پڑھنے والی
دیکھیں تو خوش ہوں آپ بھی اس سے | خوش ہیں سب ماں باپ بھی اس سے

کرتے ہیں سب اس سے محبت
کنبے کی رونق گھر کی زینت

ستارے

محمد آفاق علی - فتح گڑھ

چمکو چھوٹے تارو چمکو | کیا جانیں ہم تم کو کیا ہو
کوسوں اوپر اس دنیا سے | اپنی چمک تم ہو دکھلاتے
روشن سورج جب چھپ جاتا | اور اندھیرا سا چھا جاتا
اپنی اپنی مشعل لے کر | تم ہو نکل کر آتے باہر

روشن ہو دنیا کو کرتے
اور ہو سب کی دعائیں لیتے

تین بے وقوف

ایس اے بشیر - گورکھپور

ایک قصہ تمھیں سناتا ہوں | رونے والوں کو بھی ہنساتا ہوں
لیکن قصہ ہے یہ عجب پر لطف | ہے نصیحت بھی جس میں لطف کا لطف
یعنی تھے تین بے وقوف کہیں | کر رہے تھے بحث ندی کے قریں
ایک کہتا تھا میرے یارو سنو | ختم باتیں کرو ہماری سنو
گر جو لگ جائے اس ندی میں آگ | مچھلیاں جائیں گی کہاں یہ بھاگ؟
دوسرے نے کہا ارے احمق | میں ہمیشہ کہوں گا جو ہے حق
ہیں درخت اس لئے یہاں پہ کھڑے | تاکہ گر آگ اس ندی میں لگے
مچھلیاں پانی سے نکل آئیں | اور درختوں پہ جھٹ سے چڑھ جائیں
تیسرے نے کہا خوشا چہ خوب | کہہ گئے دل کو جو ہوا مرغوب
مچھلیوں کو سمجھ رکھا ہے کیا | بھینس اور بکری یا کوئی بھینسا
کر چڑھیں بے دریغ پیڑ پہ یہ | اور سستی کریں نہ ہرگز یہ
بچو اور بچیو ذرا سوچو | ختم قصہ ہوا نصیحت لو
بے وقوفوں سے دوستی نہ کرو | رائگاں وقت کو کبھی نہ کرو
دشمنِ عقل مند ہے بہتر | دوست سے عقل میں جو ہی کمتر

تم بشیر کی یہ بات مان بھی لو
ہے بزرگوں کا قول جان بھی لو

انگلستان میں ایک گاؤں ہے ڈمبی شائر ویلز اب سے کوئی ۸۵ سال (نومبر ۱۸۵۲ء) پہلے کا ذکر ہے وہاں ایک چمار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام ہنری جونز رکھا۔

اس لڑکے کے ماں باپ بہت غریب تھے اس کا دادا ایک باغ میں کام کرتا تھا اور بے چارے کو کل چار شلنگ فی ہفتہ مزدوری ملتی تھی۔ ان کا گھر بھی بہت چھوٹا تھا۔ بس دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں کوئی سوا تین تین گز لمبی۔ انھی میں گھر گرہستی کا سامان تھا اور انھی میں سات آدمیوں کا کنبا رہتا تھا اور ہاں ایک کوٹھری میں ہنری نے جوتے سینے کی دکان بھی لگا رکھی تھی۔ جگہ کی تنگی کا یہ حال تھا کہ کھانے کے وقت ننھے ہنری کو مشکل سے جگہ ملتی تھی۔ کبھی کبھی تو اُسے کھڑے کھڑے کھانا پڑتا تھا۔ بچوں کی چیخ پکار گاہکوں کی بحث تکرار کے سبب گھر میں ہر وقت ہلڑ سا مچا رہتا تھا۔

ہنری کے باپ کی آمدنی ۲۰ شلنگ فی ہفتہ تھی۔ بہت ہی معمولی اور سادہ کھانا کھاتے تھے پھر بھی گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ ان مشکلوں پر بھی یہ خاندان ہنسی خوشی زندگی کے دن گذارتا تھا۔ سچ ہے غریب آدھے پیٹ کھا کر بھی خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔

ہنری کچھ بڑا ہوا تو گاؤں کے مدرسے میں بھیج دیا گیا۔ اس مدرسے کا اُستاد بہت جلاد تھا۔ ہاتھ میں ہر وقت بید رہتا تھا اور ذرا ذرا سی غلطی پر بُری طرح مارتا تھا۔ گرمیوں گرمیوں یہ مدرسہ بند رہتا تھا۔ اس زمانے میں مدرسے کے بچے کھیتوں میں مزدوری کرتے۔ وہاں انھیں کھیتوں میں سے شلغم نکالنے اور صاف کرنے کا کام دیا جاتا۔ ہنری بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کھیتوں پر جاتا۔ اس وقت اُس کی عمر ساڑھے پانچ برس تھی۔ بچوں کے لئے یہ بہت محنت کا کام تھا۔ کبھی کبھی تو ننھا ہنری اس قدر تھک جاتا کہ بڑے لڑکے اُسے اُٹھا کر گھر لاتے۔ آخر عاجز آ کر ہنری نے کھیتوں میں جانا چھوڑ دیا

اور گھر میں اپنے باپ کی مدد کرنے لگا۔ باپ کو جوتے سیتے ہوتے دیکھتا اور خود بھی سیتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کام میں بہت ہوشیار ہو گیا۔ کبھی کبھی تو اس کے باپ کو اس کام میں اس سے مشورہ لینا پڑتا۔ وہ اس کام کو خوب جی سے سیکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس میں ماہر ہو جائے اور ساری دنیا میں شہرت حاصل کرے۔

بارہ سال کی عمر میں اس نے پڑھنا لکھنا ختم کر دیا اور پورے وقت اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس کی ماں کو چمار کا پیشہ ناپسند تھا۔ وہ چاہتی ہنری باغبان بنے یا لہار۔ مگر ہنری کے باپ کو اس سے اختلاف تھا۔ غرض دو آدمیوں نے مل کر محنت کی تو کام اچھا چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ ہنری کے باپ نے اچھی خاصی دُکان کھول لی۔

اُسی زمانے میں اُس کا ایک دوست ٹام گاؤں کے مدرسے میں اُستاد بن کر آیا۔ روزانہ کے میل ملاقات سے دونوں میں اور بھی گہری دوستی ہو گئی۔ ٹام نے ایک دن اُسے آگے پڑھنے اور کسی اسکول میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ خود ہنری کے دل میں بھی یہی خواہش تھی مگر سوال خرچ کا تھا۔ اُس کے ماں باپ تو بالکل مجبور تھے۔ بس یہ سوال سامنے آتے ہی وہ دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ مگر پڑھنے کی خواہش اُس کے دل میں برابر بڑھتی رہی اور اُس نے پکا ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو پڑھے گا ضرور۔ آخر کسی نہ کسی طرح وہ ایک مدرسے میں داخل ہو گیا تین دن مدرسے جاتا باقی دن باپ کا کام سنبھالتا۔

اس زمانے میں ایک سالانہ امتحان ہوتا تھا "کوئن اسکالرشپ" جو لڑکا یہ امتحان پاس کر لیتا اُسے بیانگر کے اُستادوں کے مدرسے میں بھیج دیا جاتا۔ ہنری رات دن محنت کر کے امتحان میں بیٹھا اور اوّل آیا۔ اس کے بعد وہ دو سال تک بیرڈ کالج میں پڑھتا رہا۔ یہاں کے امتحان میں بھی وہ سب سے اوّل رہا۔

۱۹ سال کی عمر میں اسے برن مان کے مدرسے میں پڑھانے کی جگہ ملی۔ اس کام میں اُسے بہت کامیابی ہوئی اور بہت جلد وہ ایک اچھا اُستاد مشہور ہو گیا۔ ۲۳ سال (۱۸۷۷ء) کی عمر میں اُس نے گلاسگو یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ ان پے در پے کامیابیوں سے اس کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی۔ گلاسگو یونیورسٹی میں اس کی زندگی اچھی گذری۔ طرح طرح کی مشکلوں نے اُس کا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا۔ سب سے اہم سوال خرچ کا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا نااُمید ہو جاتا تھا کہ آگے پڑھنے کا خیال چھوڑ دیتا تھا۔ آخر قدرت نے اس کی مدد کی۔ اس زمانے میں "کلارک فیلوشپ" کا امتحان ہونے والا تھا۔ اس امتحان میں پاس ہونے والوں کو سرکاری وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ہنری بھی اپنے اُستاد

کی ہدایت پر امتحان میں شریک ہوا اور کامیاب ہوگیا۔ اب اُسے چار سال کے لئے ۲۲۵ پونڈ سالانہ وظیفہ ملنے لگا۔

اپنی عمر کے بتیسویں سال بیانگر کالج کا پروفیسر بنایا گیا اس کے بعد سینٹ اینڈ ریوز یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ یہاں اُس نے تین سال تک بہت خوش اسلوبی اور محنت سے کام کیا۔ تین سال کے بعد گلاسگو یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس زمانے میں یہ بہت علمی اعزاز کی جگہ تھی اور بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھی۔ ہنری ۱۸ برس تک اس یونیورسٹی میں اپنے طالب علموں کو فلسفہ اخلاق کی تعلیم دیتا رہا۔ پچھلی بڑی لڑائی (سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء) میں اُس نے اپنے ملک و قوم کی بہت خدمت کی۔ آخر سنہ ۱۹۲۲ء میں ۷۰ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔

بلند ہمتی اور صبر و استقلال کی بدولت ایک چمار کا لڑکا بھی پروفیسر بن سکتا ہے۔

تصویروں میں
کہانی
(۱)
(۲)
(۳)
(۴)
بخش الٰہی، کلکتہ
FIROZE

پیامیوں نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا ہے، اور بڑی گھمسان لڑائی ہو رہی ہے۔ اس وقت مناسب ہوگا اگر پیامیوں کو اس ملک کا مختصر سا حال بتا دیا جائے۔

آج کل عام طور پر روس اس علاقے کو کہتے ہیں جو اتحادِ جمہوریہ اشتراکیہ سوویٹ Union of Socialist Soviet Republick یا یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کی حکومت میں ہو۔ خواہ وہ حصہ یورپ کا ہو یا ایشیا کا۔

روس کا رقبہ ہندوستان اور برما دونوں کے رقبے سے قریب قریب آٹھ گنا ہے۔ روس کی مغربی سرحد فن لینڈ

ریاست ہائے بالٹک سے لے کر پورے شمالی اور

نقشہ مغربی روس[1]

سوویٹ روس
پولینڈ
جرمنی
یوکرین
ہنگری
رومانیہ
آرلیسہ
یوگوسلاویہ
اٹلی

بحیرۂ بیرنگ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایران، ترکی اور رومانیہ

[1] یہ نقشہ صرف مغربی روس کا ہے اس سے موجودہ لڑائی کے سمجھنے میں بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

روس کے جنوب میں ہیں۔

موجودہ روسی حکومت کا رقبہ ۱۹۳۳ء میں ۸۲۴۱۹۲۱ مربع میل تھا آبادی ...... ۱۴۶۔

اس جنگ کے شروع میں روس نے جرمنی کا ساتھ دیا اور پولینڈ اور فن لینڈ کے کچھ حصوں پر قبضہ کرلیا مگر معلوم نہیں کیا صورتیں پیش آئیں کہ ان دونوں میں بھی چل گئی اور جرمنی کی پوری توجہ اس وقت روس کی طرف ہے۔ واقعات نے کروٹ لی

آج کل روس کی قومی دولت بہت زیادہ ہے قریب قریب تمام قیمتی دھاتیں ملتی ہیں۔ سونا۔ چاندی لوہا وغیرہ۔ باکسائیٹ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ المونیم تیار کرنے کے کام آتا ہے۔ المونیم ہوائی جہازوں کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ سب سے زیادہ اہم چیز پٹرول ہے۔ یہ روس کے ایک علاقے کوہ قاف میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

روس کی زمین بہت زرخیز ہے۔ مختلف قسم کے اناج اور ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ گیہوں بھی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ جنگلی جانوروں کی بھی کثرت ہے۔ جیسے ریچھ، بھیڑیے اور لومڑی وغیرہ۔ ایک جانور سابل بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا سمور بہت قیمتی ہوتا ہے۔

روسی علاقہ پہلے سلافیوں سے آباد تھا۔ یہ سلافی لوگ کب آئے اور کیوں آئے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ان قبیلوں میں اتحاد و اتفاق نہیں تھا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ باہر کے حملہ آوروں سے زیادہ دن تک محفوظ نہ رہ سکے۔ مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے یہاں پر حکومت کی۔ دسویں صدی میں یہاں عیسائی مذہب کو ترقی ہوئی۔

روس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا روس کا وہ حصہ جو یورپ میں واقع ہے۔ اس میں وائٹ رشیا، یوکرین ٹرانس کاکیشیا، ترکمنستان، ایجیکستان تاسکیستان شامل ہے۔ یہ یورپی حصہ بحر منجمد سے کوہ قاف تک اور پولینڈ سے ارالس تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ ایشیائی روس ہے۔ اس میں سیبریا شامل ہے یہ ارالس سے پاسیفک تک پھیلا ہوا ہے اس میں ایشیائے کوچک کا حصہ بھی شامل ہے۔

پہلا روسی شاہنشاہ جس نے زار کا لقب اختیار کیا ایوان (Ivan) تھا (۱۵۴۷ء) شہر ماسکو اس وقت پایۂ تخت تھا۔ اس شاہنشاہ کے جانشینوں میں سب سے مشہور پیٹر تھا۔ اس نے سینٹ پیٹرزبرگ آباد کیا اور اس کو پایۂ تخت قرار دیا۔ کیتھرائن دوم اور اس کے جانشینوں نے حکومت کا رقبہ بڑھادیا اس میں ایشیا اور یورپ کے حصے بھی شامل تھے نپولین کے دور میں اور اس کے بعد

روس ایک طاقت ور حکومت خیال کی جانے لگی تھی۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں جاپانیوں نے کوریا کے لیے روس سے لڑائی کی اور جیت گیا۔ لڑائی کے بعد ملک میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ شروع میں زار نے عوام کو حقوق وغیرہ دینے کا وعدہ کیا۔ ڈوما[1] سنہ ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی۔ اس مجلس نے زار سے حقوق اور اختیارات طلب کئے۔ زار نے مجلس کو ختم کر دیا۔ وہ اسی طرح مجلسیں قائم کرتا اور روسیوں کو بہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی بڑی لڑائی چھڑ گئی روس نے سرویا کا ساتھ دیا۔ جو اتحادیوں میں سے تھا۔ مگر روس لڑائی کے لئے تیار نہ تھا۔ وہاں کے امیر آرام طلب اور عیش پرست تھے۔ خود زار اپنی بیوی کے اشاروں پر چلتا تھا۔ روز بروز ملک کی حالت خراب ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صرف جنوری سنہ ۱۹۱۷ء میں دس لاکھ سے زیادہ روسی سپاہی فوج سے بھاگ گئے۔ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء کو ملک میں انقلاب شروع ہوا۔ ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء کو زار تخت سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد ایک اتحادی حکومت بنائی گئی۔ یہ حکومت بعد میں بالشویکی جماعت ہو گئی۔ جس میں مشہور انقلابی لینن اور ٹراٹسکی شامل تھے۔

انقلاب کے چند روز بعد جرمنی سے صلح کی گئی روسی حکومت سے چند ملک آزاد ہو گئے جو یہ ہیں:- فن لینڈ، پولینڈ، استھونیا، لٹویا اور لتھوانیا۔

روس کا آخری زار نکولاس دوم تھا اُسے انقلابیوں نے قتل کر دیا۔ اس کے خاندان کے اور لوگوں کو بھی ۱۶ جولائی سنہ ۱۹۱۸ء میں قتل کر دیا گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک انجمن اشتراکیہ سوویٹ جمہوریت قائم کی گئی۔ اس میں روس، یوکرین۔ سفید روس اور ٹرانس کاکیشین فیڈریشن شامل تھے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں قانون پر نظر ثانی کی گئی اور اس وقت سے روس سوویٹ کی حکومت میں ہے۔ (سوویٹ کے معنی روسی زبان میں جماعت کے ہوتے ہیں۔)

سنہ ۱۹۲۴ء میں لینن کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ پر جوزف اسٹالن نے قبضہ کیا۔ یہ اس وقت بھی روس کا کرتا دھرتا ہے۔ اسٹالن نے حکومت پر قبضہ کرتے ہی ٹراٹسکی کو ملک سے نکال دیا اور اس کے

---

[1] وہ جماعت جس میں روس کے عام لوگوں کے منتخب کئے ہوئے لوگ ملکی معاملات پر رائے دینے کا حق رکھتے تھے۔

بہت سے ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔

۱۹۲۹ء میں پانچ سال کا ایک زراعتی صنعتی پروگرام تیار کیا گیا جس کی وجہ سے رُوس دنیا کا ایک بہتر زراعتی اوُر صنعتی ملک بن گیا۔ ۱۹۳۳ء میں امریکہ نے اس رُوسی حکوُمت کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۴ء میں اس کو مجلس اقوام میں جگہ ملی۔ ملک میں حکوُمتی کام سوویٹ کے ذریعے ہوتا ہے۔ آل رشین کانگریس آف سوویٹس " تمام صوُبہ داری اوُر ضلع داری سوویٹس اس کے ماتحت ہیں۔ ہر ایک کام کے لئے یہیں سے ممبر بنائے جاتے ہیں۔ جو اپنے کام کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

اب رُوس میں اعلیٰ پیمانے پر صنعتی کاروبار شروع ہو گئے ہیں۔ فوج بھی باقاعدہ ہو گئی۔ ہوائی اوُر بحری طاقتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ تعلیم لازمی ہے یہاں کا سکّہ شیر واٹز (Chervonltz) کہلاتا ہے۔ رُوس میں پانچ دن کا ہفتہ ہوتا ہے۔ چھ ہفتوں کا ایک مہینہ بارہ مہینوں کا سال۔ زاید دنوں میں انقلاب کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس وقت رُوس لڑائی کی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ نپولین کے حملے کے بعد رُوس پر یہ دوُسرا ہیبتناک حملہ ہے نپولین کو تو ناکامی ہوئی تھی دیکھئے جرمنی کا کیا انجام ہوتا ہے لڑائی بہت زوروں پر ہو رہی ہے۔ جرمنی نے اعلان کیا کہ وہ دس ہفتوں میں رُوس کو ختم کر دے گا۔

میری مینا

عُمر کامل - دہلی

میری مینا بھی کیا پیاری ہے۔ جب مزے مزے کی باتیں کرتی ہے تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب میں گھر آتا ہوں تو پنجرے میں اُچھل اُچھل کر کہتی ہے " عُمر میاں تم آگئے لے بی زبیدہ، اے بی زبیدہ بچے کے ہاتھ دُھلاؤ۔ دسترخوان بچھاؤ، کھانا کھلاؤ" جب تک میں ہاتھ مُنہ دھو کر دسترخوان پر نہیں بیٹھ جاتا اُس وقت تک وہ یہی آواز لگاتی رہتی ہے جس وقت میں کھانا شروع کرتا ہوں تو وہ کہتی ہے" میاں کھاؤ۔ بیٹا کھاؤ" میں کہتا ہوں "مینا تم بھی تو کھاؤ" تو وہ کہتی ہے "اچھا کھاتی ہوں" اور پیالی میں چونچ ڈال کر کھانے لگتی ہے۔ میں کھاتا جاتا ہوں اور اس سے مزے مزے کی باتیں کرتا جاتا ہوں میں پوچھتا ہوں" تمھارا مزاج تو اچھا ہے" تو وہ بھی کہتی ہے" تمھارا مزاج تو اچھا ہے" میں کہتا ہوں" الحمدللہ" تو وہ بھی کہتی ہے" الحمدللہ"

بنگالے کی مینا کے بھی کیا کہنے۔ خوب بولتی ہے۔ دو چار دفعہ جو کچھ سُنتی ہے وہ کہنے لگتی ہے اُس سے جب کہتے تھے مینا کالے کوے کی جورو ہو تو کہتی " آدمی میں کیوں ہوتی" اس پر سب گھر والے ہنستے۔ اس مینا کا سیاہ رنگ، سبز چونچ زرد پنجے، اور چونچ کے دونوں طرف لکیریں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بڑی اچھی قیمت سے بکتی ہے۔ یہاں کی مینا سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ عمر میں زیادہ نہیں ہوتی۔ دو چار سال میں کانٹا نکلتا ہے اور مر جاتی ہے

کیا تم جانتے ہو؟

محمد ظفر صدیقی - لاہور

(۱) پنسل ٹیڑھی کیوں نظر آتی ہے؟ ایک پانی کا برتن لو اور اُس میں ایک پنسل ڈالو۔ جہاں پنسل پانی میں ہوگی وہاں ٹیڑھی نظر آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سورج کی کرنیں پانی میں داخل ہوتی ہیں تو وہ جُھک جاتی ہیں یہ سائنس کا ایک اُصول ہے

(۲) ہم گرج پہلے سُنتے ہیں یا بجلی پہلے دیکھتے ہیں ؟ بادلوں کے گرجتے وقت تم بجلی پہلے دیکھو گے یا گرج پہلے سُنو گے بجلی پہلے دیکھو گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ سفر طے کرتی ہے اور گرج ۱۱۰۰ فٹ فی سیکنڈ سفر طے کرتی ہے۔

(۳) ناخنوں پر سفید نشان تُم نے کبھی بیماری کے بعد اپنے ناخنوں پر سفید نشان دیکھے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدن میں خون کم ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کی صحت اچھی ہو مگر خون کم ہو تو یہ سفید نشان ضرور ہوتے ہیں۔

(۴) آسمان نیلا کیوں نظر آتا ہے ؟ آسمان کے نیلے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی سات رنگوں کی ہے اور ہوا میں بہت سے ذرے اُڑتے پھرتے ہیں۔ یہ ذرے نیلا رنگ جذب کر لیتے ہیں اور ہم کو آسمان نیلا نظر آتا ہے۔

(۵) چھتری کس نے ایجاد کی ؟ ہم کسی خاص شخص کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ چین کے لوگ چھتری کا استعمال ہزاروں سال سے کر رہے ہیں مگر انگلستان میں پہلی دفعہ جس شخص نے چھتری استعمال کی اس کا نام جان ہامنوے تھا۔ اب سے کوئی ۱۵۵ برس پہلے (۱۷۹۶ء)

(۶) ہم پانی پر کیوں تیر سکتے ہیں ؟ قدرتی طور پر انسانی جسم میں ہوا بھری ہوئی ہے جس کی وجہ سے انسان پانی سے ہلکا ہے۔ سمندر یا دریا میں تیرنے میں آسانی رہتی ہے۔ تالابوں میں اتنی آسانی نہیں ہوتی۔ سمندر میں نمک گھلا ہوا ہوتا ہے۔

(۷) کیا مچھلی آنکھ بند کر سکتی ہے ؟ مچھلیوں کے لئے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ آنکھ بند کریں۔ کیونکہ اُن کی آنکھوں پر پپوٹے نہیں ہوتے۔ جب وہ سو جاتی ہیں تو بھی اُن کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ سانپ کی آنکھیں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

برسات

قمر محمود خان۔

گرمیوں میں جب سورج کی شعاعیں سیدھی سر پر پڑتی ہیں تو سمندروں اور ندیوں کا پانی بھاپ بن کر اوپر چلا جاتا ہے اور جب وہ پہاڑوں سے ٹکراتا ہے تو بوندیں بن جاتا ہے۔ بوندیں بھاری ہوتی ہیں اس لئے ہوا انھیں سنبھال نہیں سکتی اور وہ گرنے لگتی ہیں اسے ہم بارش کہتے ہیں۔ اب آپ بارش پر غور کیجئے کہ اس سے کیا کیا فائدے ہیں ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور یہاں سب سے زیادہ کاشتکاری ہوتی ہے۔ بارش سے سب سے زیادہ فائدہ کاشتکاری کو پہنچتا ہے۔ جس سال بارش نہیں ہوتی اس سال غلہ پیدا نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو بہت کمی سے ہوتا ہے لیکن زیادہ بارش بھی مُضر ہے کیونکہ کھیت میں غلہ سڑ جاتا ہے اور پھر وہی مہنگائی کی مصیبت :-

عید کا تحفہ

یہ پرچہ تمہیں رمضان شریف میں ملے گا اس کے بعد عید آئے گی۔ عید میں تم اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو عید کارڈ ضرور بھیجو گے۔ یہ کارڈ اب کے بازار سے نہ خریدنا۔ تم خود ہی کیوں نہ بناؤ۔ ہماری جامعہ کے بچوں نے تو بہت سے کارڈ بنا ڈالے ہیں۔ بہت خوب صورت خوب صورت۔ اوپر (۱) (۲) دو پھول ہیں۔ انھیں کارڈ کے کونوں پر بنالو باقی بیل اور پھول حاشیے کے لئے ہیں یہ ہاتھ کا بنا ہوا تحفہ ان بازار کے کارڈوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوگا۔ ان پھولوں میں اپنی پسند کے رنگ بھرلو۔

(سید عروج الحسن)

عبدالغفار صاحب کی کتاب ایک معلّم کی زندگی کی ضخامت کوئی ایک ہزار صفحے ہو گئی ہے۔ اس لئے قیمت بھی مجبوراً چار کی جگہ پانچ روپے کردی گئی ہے۔ لیکن اس کا اثر پچھلے آرڈروں پر نہیں پڑے گا۔
اس کتاب کا ایک دلچسپ ٹکڑا اگلے پرچے میں شائع ہوگا

عزیز بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔ لیجئے صاحب اکتوبر بھی آن پہنچا۔ یوں سمجھو کہ جاڑوں کی آمد ہے۔ مگر کبھی اس مہینے میں موسم بہت خراب ہو جاتا ہے، دلّی میں خاص کر۔ اب سے چار پانچ برس پہلے تو مچھروں کی بہت کثرت تھی ملیریا وبا کی طرح پھیلتا تھا۔ اب وہ بات تو نہیں ہے مگر خطرہ دور اب بھی نہیں ہوا ہے۔ ملیریا بخار مچھروں کے کاٹنے سے آتا ہے۔ اس لئے دلی کے یا اُن جگہوں کے پیامی جہاں مچھر بہت ہوتے ہیں مچھر دانی لگا کر سویا کریں۔ یا کم سے کم سوتے وقت کوئی بودار تیل مل لیا کریں۔ آج کل صبح کو نہانا اور کچھ ہلکی ورزش بھی ضرور کرنا چاہیے۔

پچھلے پرچے میں ہم کشمیر کی سیر کا حال بہت تھوڑا لکھ سکے تھے شاید پہلگام کا ذکر تھا۔ ہاں تو پہلگام میں ہم تین دن ٹھہرے۔ پہلے دن تو وہیں پہلگام میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ دوسرے دن حامد علی خاں صاحب پروفیسر غفور صاحب، احمد خاں اور میں کچھ توس اور کچھ انڈے اور تھوڑے سے آم ساتھ لے آڑو کے ارادے سے پیدل چل کھڑے ہوئے۔ آڑو پہلگام سے کوئی آٹھ میل ہے۔ اونچائی کوئی آٹھ ہزار فٹ ہوگی۔ پیدل اور گھوڑوں کے چلنے کے لئے بس ایک پتلی سی پگڈنڈی ہے۔ پگڈنڈی کے ساتھ دریائے رہتا ہے۔ خیر صاحب ہم کبھی چڑھائی پر چڑھتے کبھی اُتار پر دوڑتے ہوئے مارا مار آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستے میں آڑو کے قریب کچھ چرواہے ملے۔ یہ جمّوں کی طرف کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں پہاڑوں کی برف پگھل جاتی ہے اور یہ اپنے جانور چرانے کے لئے بڑی دور دور تک نکل جاتے ہیں۔ یہ لوگ کرگل جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے اُن کے ساتھ ایک تصویر بھی لی۔ کوئی ۱۰ بجے ہم لوگ آڑو پہنچ گئے۔ یہ بہت چھوٹا سا گاؤں ہے مشکل سے پندرہ بیس گھر ہوں گے۔ بہت خراب خستہ دو چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ ایک دکان پر ہم نے چائے بنوا کر پی۔ یہیں ایک شخص کے پاس ملائی کی بنی ہوئی روٹی دیکھی، مزہ چکھنے کے لئے ایک خریدی مگر کسی سے کھائی نہ گئی۔

اڑدے کلہائی گلیشیر بہت تھوڑی دور رہ جاتا ہے۔ حامد صاحب کے دل میں اس گلیشیر کے دیکھنے کی مدت سے خواہش تھی۔ اب اس قدر قریب آکر ایک وہی کیا سب کے دل میں جوش اُٹھا مگر چلتے وقت تو کوئی ارادہ تھا ہی نہیں نہ کوئی سامان ساتھ تھا۔ حامد صاحب نے بہت دوڑ دھوپ کی کہ کرائے پر کچھ کمل اور لوئیاں وغیرہ مل جائیں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ گاؤں کے پاس سیزے پر بیٹھ کر توس کھائے اور ایک ایک آم چکھا۔ کچھ دیر لیٹے۔ ڈاک بنگلے کے چپراسی اور گاؤں کے لوگوں سے گپیں ہانکیں غرض خوب ستائے۔ اتنے میں ساڑھے بارہ بج گئے رائے ہوئی کہ اب لوٹ چلنا چاہیے۔ واپسی پر چائے کا ایک دور اور چلا۔ جموں کے علاقے کے کچھ افسر گدڑے مل گئے تھے۔ ان سے بات چیت ہوئی۔ یہ کلہائی کی طرف جا رہے تھے کہنے لگے تم ہمارے پاس آجانا ہم تمہارا سب انتظام کر دیں گے مگر یہ اُن کی مہماں نوازی تھی ورنہ اُن کے پاس خود ہی بہت مختصر سامان رہتا ہے۔ چائے پی کر ہم لوگ روانہ ہوگئے۔ حامد صاحب اور احمد خاں کی رفتار بہت تیز تھی۔ پروفیسر صاحب بہت سنبھل سنبھل کر اور ہم بہت اطمینان سے چل رہے تھے کوئی پونے چار بجے پہلگام پہنچ گئے۔ سفر بہت دلچسپ رہا دوسرے دن تیسرے پہر کو پہلگام سے سری نگر آگئے۔

روس اور جرمنی کی لڑائی کو یہ تیسرا مہینہ ہے مگر ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ بلکہ لڑائی کی شدت دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ روس پوری طاقت سے جرمنی کا مقابلہ کر رہا ہے پھر بھی جرمن فوجیں کچھ نہ کچھ آگے بڑھ رہی ہیں بعض بعض جگہ انھوں نے دریائے نیپر کو بھی پار کر لیا ہے۔ لینن گراڈ کو انھوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ روسی بھی اس کی حفاظت میں اپنی جانیں لڑا رہے ہیں۔ اس وقت وہاں بہت سخت کشت و خون ہو رہا ہے۔

ادھر ایران میں انگریزوں اور روسیوں نے ایرانی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انگریزی اور روسی فوجیں طہران تک پہنچ گئی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی تخت سے الگ ہو کر اصفہان چلے گئے۔ اُن کی جگہ اُن کے بیٹے بادشاہ بنائے گئے۔ انگریزوں اور روسیوں کا اعتراض تھا کہ ایران میں جرمنوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں ایرانی حکومت کے جواب سے انگریزوں کو تشفی نہ ہوئی اور انھوں نے روسیوں کے ساتھ مل کر ایران پر حملہ کر دیا اس حملے کے دو اہم مقصد اور بھی تھے۔ ایران کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنا اور روس کی مدد کے لئے راستہ حاصل کرنا یہ دونوں مقصد بھی پورے ہوگئے انگریزوں اور روسیوں نے اطمینان دلایا ہے کہ لڑائی کے بعد ان دونوں کی فوجیں ایران کو خالی کر دیں گی جاپان اور امریکہ میں صلح و صفائی کے معاہدے کے لئے بات چیت ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں مگر بات چیت جاری ہے۔ تازہ خبریں یہ ہیں کہ جرمنوں نے کیوے لیا۔ سیام پھر خطرے میں ہے۔

معمّا نمبر ۲۳

پہلا انعام ۶ے

دوسرا انعام للعہ

مشقی کوپن

ب	۴	■	۳ ی	د	۲ ل	ہ	۱ پ
	■	■		ا	۶	■	
ل	۱۱	۱۰ گ	ن	۹	■	۸	۷ ہ
و	ز	۱۴	■	ن	۱۳ ی	ہ	۱۲
■	ل	ے	۱۶	■		ن	۱۵ ے
۱۹	■	■	■	۱۸	۱۷ س	■	■
ی	۲۳	۲۲ ر	■	پ	■	۲۱	۲۰ م
ن	۲۵	■		ی	ر	ع	۲۴

دائیں سے بائیں

(۱) ایران کے بادشاہ رضا شاہ . . . . تخت سے دست بردار ہوگئے۔

(۴) .. لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہندوستان جنگ کے خطرے سے قریب ہے۔

(۶) کیمیاگر کی ایک .. کی کسر مشہور ہے۔

(۷) .. روز صبح اور رات کو بستر پر دراز ہونے سے پہلے آنکھیں ٹھنڈے پانی سے دھولیا کرو۔

(۹) اس صوبے کے وزیر اعظم مسلم لیگ سے علیحدہ ہوگئے۔

(۱۲) انکار کے لئے بولتے ہیں۔

(۱۴) روز (بے ترتیب)

(۱۵) مصیبت ... کے بعد اس کی فکر بیکار ہے۔ (الٹا)

(۱۶) صابن سے آسانی سے صاف ہوجاتا ہے۔

(۱۷) دیکھئے کس .. میں جنگ کا خاتمہ ہو۔

(۲۰) دریا کے پانی کا بڑھنا۔

(۲۴) مسلم قومی لیڈر کی ہر .... قوم سے بڑے بڑے کام کرا سکتی ہے۔

(۲۵) عرب میں جو قافلے چلتے ہیں .. کی رفتار عام طور پر دو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اوپر سے نیچے

(۱) . . . . کے بعد اس پر غور نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کھانا کھا کر ہضم نہ کرنا۔

(۲) -- ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔

(۳) یہ چمن . -- ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے — سوداؔ

(۵) آقا اب تمھیں دس روپے ماہانہ ملیں گے اور آیندہ سال سے پندرہ روپے ملنا شروع ہوں گے --- منظور ہے۔

(۸) زیور کا آخری نتیجہ فروخت یا ----

(۱۰) بھنی ریت (بے ترتیب)

(۱۱) کامل ہے جو . . . سے وہ ہے کمال تیرا۔

(۱۳) اتنہائی اس میں بھی بعض انسان بڑی ہمت سے کام لیتے ہیں۔

(۱۸) خداوند عالم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار --- بھیجے ہیں

(۱۹) اس کے کھلونے زیادہ تر ہندوستان میں رائج ہیں۔

(۲۰) بڑھاپے میں -- خراب ہوجاتی ہے۔

(۲۱) جرمنی اور روس کی لڑائی میں بے --- حساب فوج ماری گئی۔

(۲۲) جامعہ میں ہاتھ کا کاغذ ... سے بنایا جاتا ہے۔

(۲۳) تکرار کرنے سے آپ کے والد کے والد بول اٹھیں گے۔

قواعد

۱- تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔

۲- ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۳- ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳؍ آٹھ حلوں کی ۶؍ ہے۔

۴- دونوں انعام تقسیم کر دئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہو گی۔

۵- تمام حل ۱۸ اکتوبر تک دفتر پیام تعلیم جامعہ دہلی میں پہنچ جانے چاہئیں۔

۶- ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۷- پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

۸- کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۹- ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

۱۰- دالؔ اور واؤ کا فرق نمایاں ہو۔ (د - و)

۱۱- چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے۔ (ی - ے)

۱۲- جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہئے۔

۱۳- املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

۱۴- پتہ :- سب ایڈیٹر "پیام تعلیم" - مکتبہ جامعہ قرول باغ - نئی دہلی

معمہ نمبر ۲۲ کا صحیح حل

ی ۶	چ ۵		ر	د ۴	گ ۳	ب ۲	ٹ ۱
ت	م	ل	ہ ۸		و	ہ	ا ۷
ی	ل ۱۰		ی		ل	و	ل ۹
م	ہ	د ۱۲		چ ۱۱		د	
ی			ر ۱۵	و	ز ۱۴		ص ۱۳
	ا ۱۹		و	ن ۱۸		ا ۱۷	و ۱۶
ہ ۲۳	و ۲۲		س		ب ۲۱	ج	ر ۲۰
و	ر	د ۲۵		ش	ا	ل	ٹ ۲۴

صحیح حل　　　انعام اول　　　فی کس عیر

(۱) محمد احمد - حیدرآباد دکن　(۲) محمد عمر مجددی المقری رام پور

(۳) رحیم الدین - دہلی　(۴) سید مصور حسین - دہلی

ایک غلطی　　فی کس ۵ر

۱- صادق حسین - ناگپور

۲- محمد مائل احمد - حیدرآباد دکن

۳- نصیر الدین احمد - کاگنارہ

۴- سید محمد مہدی - پٹنہ

۵- سید خلیل احمد - بھوپال

۶- عربیہ خاتون - حیدرآباد دکن

۷- محمد عمر - مرزا پور

۸- مصطفیٰ علی - بمبئی

۹- محمد عبدالرزاق - حیدرآباد دکن

۱۰- تقی محسن - انبالہ شہر

(۱۱) احمد منظور الحق - حیدرآباد دکن

(۱۲) محمد عبدالمجید - حیدرآباد

چلد بہادر

سلیم الدین شمیم جالنوی

ام۔ خادم اللہ نثار۔ چارسدہ

سید عبدالرحمان میاں (شاہ جہاں پور)

محمد ظفر صدیقی لاہور

Regd. L. No. 1961

ایک معلّم کی زندگی

نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہو جائے گی

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے ہر ایک جلد تقریباً پانچ سو (۵۰۰) صفحوں کی ہے اور مجلّد ہے جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں۔ چونکہ اِس کی ضخامت ایک ہزار صفحے ہو گئی ہے اِس لئے مکمل سٹ کی قیمت للعہ کے بجائے صہ روپے کر دی گئی ہے۔ کتابی سائز ۲۰×۳۰ ۸/۱

یہ کتاب عبدالغفار صاحب مدہولی کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور رواں تاریخ بھی ہے اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ بھی۔ یقین ہے کہ بچے اور بڑے دونوں اسے دل لگا کر پڑھیں گے۔

جو خریدار جامعہ کے یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک مکمل سٹ کے دام پیشگی بھیجیں گے اُن کے لئے محصول ڈاک (۱۱) معاف ہوگا۔

اب تک جن حضرات سے مبلغ للعہ وصول ہوئے تھے اُن سے زائد مطالبہ نہ کیا جائے گا اور محصول ڈاک بدستور معاف رہے گا۔ نیز جن کے آرڈر وی۔ پی کے لئے آچکے ہیں اُن سے بھی کتاب کی قیمت للعہ ہی لی جائے گی۔ البتہ محصول ڈاک خود اُن کے ذمّے ہوگا۔

مکتبہ جامعہ

نئی دہلی

ترجمان جامعہ
پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

چند حامی

محمد عبدالحسیب حیدرآبادی

پیام تعلیم کے خاص مضمون نگار

اقبال مرزا لاہور

محترمہ آپا جان

محمد الدین موجد بدایوں

پیامِ تعلیم دہلی

پیامِ تعلیم دہلی، یوپی، سی پی، قلات، بنگال، برار، اندور، میسور حیدرآباد اور پنجاب کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔ "منیجر"

قیمت سالانہ عہ/ ـ فی پرچہ ۳/

ایڈیٹر محمد حسین حسان

جلد ۲۴ نمبر ۱۱

نومبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ، ڈی۔ محبوب المطابع پریس، دہلی

سالنامے کا کام بہت سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ جناب نیر صاحب کی ایک بہت اچھی کہانی اور ایک نظم ہمیں مل گئی ہے۔ اور دوسرے مضمون بھی جلد پہنچنے والے ہیں۔

جو عزیز پیامی اپنی نظمیں سالنامے میں چھپوانا چاہتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ر نومبر تک بھیج دیں۔ یہ نظمیں خود انھی کی لکھی ہوئی ہوں۔ دوسروں کی نظمیں اپنے نام سے بھیج دینا بہت شرم ناک بات ہے۔

بچّوں کی کوششیں اس مرتبہ تین صفحوں میں آئی ہیں پھر بھی کوئی ۸۰، ۹۰ مضمون ابھی باقی ہیں یہ مضمون ترتیب سے چھپیں گے۔ بچّے صبر سے کام لیں۔ مضمون جس قدر مختصر ہوں گے اُتنے ہی جلد چھپ سکیں گے۔

ثُریّا کا خواب بچّوں نے بہت پسند کیا۔ کہانی کا باقی حصّہ ابھی بہت ہے لیکن دسمبر میں سالے کی جلد ختم ہو رہی ہے اس لئے اگلے پرچے میں باقی حصّہ سب کا سب چھاپ دیا جائے گا۔

ٹیگور والا مضمون عام طور سے پسند کیا گیا۔ مسعود حسین خاں صاحب جامعی نے بہت اچھے انداز میں اُن کے حالات بیان کئے ہیں اس پرچے میں مضمون کا دوسرا حصّہ چھپ رہا ہے۔ یہ ٹیگور کی شاعری پر ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ بچّے اسے اور بھی پسند کریں گے۔

پیامِ تعلیم صوبۂ سندھ، کلکتہ کارپوریشن ریاست اندور اور ریاست قلات میں بھی سرکاری طور پر منظور ہو چکا ہے۔ مکتبے کے سرگرم اور پرجوش کارکن خالد صاحب کی کوششوں کو اس کامیابی میں بہت کچھ دخل ہے۔

عید کی خوشی

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیّر

خوشیوں کا ابر چھایا　｜　منظر یہ دِل کو بھایا
زہرہ نے گیت گایا　｜　نغمہ نیا سنایا
خوش ہو گئی خُدائی
عیدِ سعید آئی

بچّوں کا حال دیکھو　｜　سب کو نہال دیکھو
غم پائمال دیکھو　｜　نِکلا ہلال دیکھو
لو وہ دِیا دِکھائی
عیدِ سعید آئی

ہے عید ہم کو پیاری　｜　آئی خوشی کی باری
اس کی خوشی ہے نیاری　｜　سب پر ہے وجد طاری

دل کی کلی کھلائی
عیدِ سعید آئی

کپڑے اُتار ڈالو ٭ پہلے ذرا نہالو
یہ کام اب نہ ٹالو ٭ جوڑا نیا نکالو
لو بہن اس کو بھائی
عیدِ سعید آئی

پھر عید گاہ جاؤ ٭ پڑھ کر نماز آؤ
جی بھر کے شیر کھاؤ ٭ مل کر ہنسو ہنساؤ
سب بہن اور بھائی
عیدِ سعید آئی

غنچے بھی ہنس رہے ہیں ٭ تارے بھی ہنس رہے ہیں
بچے بھی ہنس رہے ہیں ٭ بوڑھے بھی ہنس رہے ہیں
نیرؔ خوشی ہے چھائی
عیدِ سعید آئی

مدکی صاحب "ہاں۔ ہاں کرتی کیوں نہیں، دیکھوں ذرا مجھے دیجیے"

ثریا کے ہاتھ سے گھڑی لے کر مدکی صاحب نے اپنے کان سے لگائی اور بولے "توبہ میں بھی کیا چوپایہ ہوں اس میں کنجی تو ہے نہیں۔ پھر چلے تو کیوں کر" اور پھر اپنے ایک لمبے ناخن کو گھڑی کے سوراخ میں ڈال کر گھمانے لگے جیسے اس میں کنجی دے رہے ہوں۔ "آپ کے پاس گھڑی ہے مسٹر جما؟ ذرا دیکھئے تو کیا وقت ہوا ہے"

جما نے واسکٹ کی جیب سے چھوٹی سی ایک گھڑی نکالی اور اسے دیکھ کر بولے۔

"جمعرات تین گھنٹے زیادہ"

"جمعرات تین گھنٹے زیادہ؟؟" مدکی صاحب نے جملے کے اس حصے کو زور سے دہرایا "جما نے یہ کمبخت کب سے بند ہے"

ثریا:۔ تمہارے پاس بھی ایسی گھڑی ہے جما؟

جما:۔ تم نے نہیں دیکھا اسے؟ بلقیس آپا کی وہ جو پرانی بیٹی ہے نا اُسی میں تو میں اسے رکھا کرتا ہوں۔"

ثریا:۔ ہاں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم بھی ایسی نرالی گھڑی رکھتے ہو۔

مدکی صاحب:۔ نرالی کیوں ثریا بیگم۔

ثریا:۔ "آپ لوگوں کی گھڑی ...." ابھی ثریا نے اتنا ہی کہا تھا کہ انگارے جیسا لال ایک لانبا سا گرگٹ ان لوگوں کی میز کے پاس رینگتا ہوا آیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور چوڑے سے بدصورت منہ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی کو کاٹ کھائے گا۔ اُس نے مدکی صاحب کی طرف کھڑے ہو کر اپنے منہ کو کھولتے ہوئے کہا "مولانا! شاہ نے صدر صاحب کو کچھ اہم کام کے لئے بلایا ہے اور آپ کو بھی یاد فرما رہے ہیں"

مدکی صاحب:۔ طامنتقل خان اس وقت شاہ کے پاس ہیں؟ مدکی صاحب نے گرگٹ سے پوچھا۔

گرگٹ:۔ جی ہاں۔ ابھی ابھی ایک روز ہوا کہ وہ وہاں گئے تھے۔

مدنی صاحب :- اچھا تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔

ٹِک ٹِک ٹِک۔۔۔۔ کٹ کرکٹ نے چھلکتے ہوئے کہا اور روانہ ہو گیا۔

ثریا :- یہ کون تھا جمّا ؟

جمّا :- شاہ کا سپاہی

مدنی صاحب :- آپ بھی چلتے ہیں مسٹر جمّا ؟

ثریا :- آپ کے شاہ کے یہاں ؟

جمّا : نہیں آپ جائیے مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔

ثریا :- نہیں نہیں جمّا مجھے شاہ کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ چلو نا پھر واپس آکر لوگوں سے ملاقات کر لینا۔

"ہاں، ہاں چلئے مسٹر" مدنی صاحب اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "ثریا بیگم بھی ہمارے شاہ کو دیکھ لیں گی۔"

ثریا :- ہاں جمّا چلو چلو، میں شاہ کے دربار میں ضرور جاؤں گی۔

جمّا :- اچھا چلو۔ مگر میں وہاں زیادہ دیر تک ٹھہروں گا نہیں۔

ثریا :- اچھا اچھا میں ٹھہرنے کو نہ کہوں گی۔

ثریا جمّا کی انگلی پکڑے مدنی صاحب کے ساتھ چلنے لگی۔ ادھر ادھر کی میزوں سے گھومتے گھامتے اور عجیب عجیب قسم کے جانوروں اور پرندوں کو کرسیوں پر بیٹھے اور کھاتے ہوئے دیکھتے یہ لوگ چلے جا رہے تھے۔ جس میز کے پاس سے یہ تینوں گزرتے، اس جگہ کے لوگ ان لوگوں کو حیرت سے تکنے لگتے اور پھر مدنی صاحب پر نظر پڑتے ہی کوئی نہ کوئی ان کو سلام کے لئے اپنا ہاتھ، چونچ یا پنجہ ذرا اٹھا لیتا اور مدنی صاحب بھی جلدی سے مسکرا کر اس کا جواب دے دیتے۔ ثریا کو دیکھ کر سبھی کو حیرت ہو رہی تھی اور ثریا کو جانوروں سے زیادہ ان کے طرح طرح کے کپڑوں کو دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا۔ خرگوشوں کے عمدہ عمدہ سوٹ ہاتھیوں کی رنگ برنگ کی ساریاں۔ پرندوں کے ریشمی فراک اور مچھلیوں کے نرالے لباس۔ کوئی جانور ثریا کو اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھنے لگتا تو ثریا ڈر کے مارے جلدی سے جمّا کی انگلی مضبوطی سے پکڑ لیتی اور ادھر سے اپنا منہ پھیر لیتی۔ بہت دیر تک گھومتے گھامتے یہ لوگ ایسی جگہ پہنچے جہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے بیچ میں ایک پتلی سی پگ ڈنڈی سیدھی چلی جا رہی تھی۔ دور ہرے ہرے میدان کے کنارے یہ پگ ڈنڈی ختم ہو گئی تھی اور ایک ننھا سا مکان چمک رہا تھا۔ بالکل جیسے ثریا کے آپا کے ڈرائنگ روم والا تاج محل۔ جھاڑی میں سے کبھی کبھی کوئی جھینگر "کر۔ کر" کرتا ادھر سے ادھر گزر جاتا آگے آگے مدنی صاحب اپنی چھڑی گھماتے۔ بیچ میں

ثریا اور اس کے پیچھے مسٹر جاپ چاپ چلے جاتے تھے۔ راستے میں گھونگے مدکی صاحب کی چھڑی کی آواز سے جلدی سے ایک کنارے ہو جاتے۔ لال پیلے اُجلے، نیلے۔ چھوٹے چھوٹے گھونگے ثریا کو بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے اُس کے جی میں آیا کہ ایک کو ہاتھ میں اُٹھالے مگر اُن کے جسم پر دو بڑی بڑی سینگوں جیسی چیز دیکھ کر اس کی ہمت نہ ہوئی۔

چلتے چلتے ثریا نے اچانک مدکی صاحب کے پیروں کی طرف دیکھا تو اُسے بڑا تعجب ہوا۔ اُن کے جوتے چمڑے کے نہ تھے۔ بڑے بڑے آموں کی سفید سفید چپٹی چپٹی دو گٹھلیاں تھیں۔ مدکی صاحب کے ٹیڑھے پیروں پر یہ جوتے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے مگر اُن سے ویسی ہی آواز آ رہی تھی جیسی ملقیس آپا کی اونچی ایڑی والی چپل سے آتی تھی۔ "چوں۔ چوں۔ چر" بالکل ویسے ہی گویا چمڑے کے جوتے ہوں۔

ثریا نے دل میں کہا "کیسی عجیب جگہ ہے جو چیز دیکھو نرالی جو بات سُنو انوکھی۔ یہ سب جنّا کی مہربانی ہے۔ کیا مزے میں کیسی کیسی نئی نئی جگہوں کی سیر ہو رہی ہے۔ یہ گیدڑ، بلیاں، گرگٹ اور چھپکلیاں بھی ہم لوگوں جیسا کھانا کھاتے ہیں، کام کرتے ہیں! اور کپڑے بھی پہنتے ہیں!! عجیب جانور ہیں یہ .... اور تو اور اُن کا بادشاہ بھی ہے۔ وزیر بھی چوپایا کمیٹی۔ ... ہونہہ۔ یہ مدکی صاحب تو بڑے دلچسپ جانور ہیں۔ آپ کے پاس گھڑی بھی ہے مگر گنجی نہیں دیتے۔ جمعرات تین گھنٹہ زیادہ۔ ایک، دو، تین، چار، سات، پانچ تو اس میں بجتے ہی نہیں اور بجتے بھی ہیں تو جمعرات جمعہ اتوار، سنیچر .... کیسی نرالی گھڑی ہے۔ ----

ثریا یہ سب باتیں سوچ رہی تھی۔ کہ سامنے وہ ننھا سا محل آ گیا۔ اور سب لوگ اُس کے قریب آ کر رُک گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ مگر اُس کی دیواریں چاندی جیسی چمک رہی تھیں۔ ننھے ننھے خوب صورت دروازوں پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے ثریا کی گڑیوں جیسا گھر تھا۔ مگر ذرا اس سے بڑا اور بہت خوب صورت۔ اس کا گول گنبد اور سُنہری برجیاں ثریا کے کاندھوں اتنی اونچی تھیں۔ ثریا اس ننھے سے محل کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ یکایک مکان کے اندر سے ایک چھوٹا سا خوب صورت سا مکڑا باہر آیا اس کے ایک ہاتھ میں ایک ننھی سی صُراحی تھی دوسرے میں ایک چاندی کا گلاس۔ مدکی صاحب کو دیکھتے ہی مکڑے نے دو چار مرتبہ اپنے پیروں کو زمین سے اُٹھایا۔ مدکی صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد مکڑے نے صُراحی سے گلاس میں پیلے پیلے رنگ کا تھوڑا سا پانی اونڈیلا اور مدکی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ مدکی صاحب دو گھونٹوں میں غٹاغٹ کر کے چڑھا گئے

(باقی آئندہ)

۲
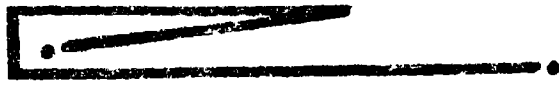
شاعر ٹیگور

مسعود حسین خاں جامعی ۔ ایم اے

"میرے گیت ایسے سادے ہوں جیسے سویرے بستر سے اٹھنا۔ ایسے جیسے شبنم کے قطروں کا پتوں سے ڈھلکنا۔

ایسے سادے جیسے بادلوں میں رنگین دھاریاں جیسے رات کے وقت ہلکی ہلکی بارش"

یہ ٹیگور کے الفاظ ہیں جن کے حالات تم پچھلے پیام تعلیم میں پڑھ چکے ہو۔ سمجھے ٹیگور کس نرم و نازک طریقے سے بات کہنا چاہتے ہیں۔ ان کے کہنے کا انداز کیسا ہے؟ لہجہ کیسا ہے؟ دیکھو نیند کے متعلق کہتے ہیں

"تم جانتے ہو بچوں کی آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی ہے"؟

لوگوں کا بیان ہے کہ پرستان میں جنگلوں کے سائے میں چھپا ہوا ایک گاؤں ہے جس پر جگنو یا ٹمٹماتی روشنی [illegible] وہاں ایک سیدھا پودا ہے اس پودے پر سادہ شرمیلی کلیاں لٹک رہی ہیں بس یہی وہ جگہ ہے جہاں سے بچے کی آنکھوں کو نیند چومنے آتی ہے"

اچھا اب یہ بھی سنئے کہ یہ نیند غائب کہاں ہو جاتی ہے۔

ماں کہتی ہے "بتاؤ بتاؤ میرے بچے کی آنکھوں سے نیند کون اڑا کر لے گیا؟

میں اس تاریک غار میں جاکر دیکھوں گی جہاں مختلف صورتوں کے پتھروں میں سے ہوکر ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا ہے۔

مولسری کے درختوں کے جھنڈ میں ڈھونڈوں گی، اس خوابوں بھرے سایے میں ڈھونڈوں گی ایک کونے میں کبوتر غوں غوں کر رہے ہیں، تاروں بھری راتیں ڈھونڈوں گی جہاں پریوں کی پازیب کی جھنکار سنی جاتی ہے۔

بانس کے جنگل میں شام کے وقت جب یہ سناٹا ہوگا اور ہوا کے لمبے لمبے سانسوں سائیں سائیں آوازیں آرہی ہوں گی تو میں اسے

ڈھونڈوں گی ۔"

ٹیگور کے ہونٹوں پر تھکن کے باوجود مُسکراہٹ کھیلتی ہے۔ وہ بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی اُمنگ دلولہ اور جوش رکھتے ہیں۔ اُن کا جسم بوڑھا ہو چکا ہے مگر دل جوان ہے۔

"کیا مضائقہ اگر میرے بال سفید ہوتے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ ایسا ہی جوان رہوں گا جیسے گاؤں کے دوسرے آدمی ہیں۔

ان میں سے بعضوں کی مسکراہٹ میں سادگی ہے اور بعضوں کی آنکھوں میں چمک ہے

بعضوں کے آنسو دن ہی میں اُبل پڑتے ہیں اور بعض کے رات کے اندھیرے میں چُھپکے چُھپکے ڈھلک جاتے ہیں۔ اِن سب کو میری ضرورت ہے۔ مجھے اتنی فرصت نہیں کہ میں موت پر غور کروں "

ٹیگور نے اقبال کی طرح وطن کی شان میں بڑے اچھے اچھے گیت لکھے ہیں۔ اُنھوں نے مُلک کی بپتا کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ جس طرح ساری عُمر اُس کی خدمت اپنے قوّت بازو سے کی، اسی طرح وہ اسے اپنے خوابوں کی دُنیا میں بھی نہیں بھولے۔ گیتان جلی کا ایک ترانہ پڑھیے:۔

"جہاں انسان کے ذہن کو کوئی ڈر نہ ہو جہاں سر بلند رہتا ہو، جہاں علم آزاد ہو، جہاں دُنیا فرقہ بندی سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو گئی ہو، جہاں الفاظ سچائی کی گہرائی سے نکلتے ہوں جہاں کوشش کا ان تھک ہاتھ ہر کام کو پورا کر دیتا ہو۔

جہاں خراب رواجوں کے خشک ریگستان میں عقل کا صاف شفاف چشمہ غائب نہ ہو جاتا ہو۔

جہاں (اے مالک) تو خیال اور عمل کی لامحدود وسعتوں کی طرف ذہن کی رہنمائی کرتا ہے۔

ایسی آزاد فضا کے نیچے اے مرے مالک، مرے مُلک کو غفلت کی نیند سے جگا دے "

یہ تھا ٹیگور کا خواب!! آپ نے اقبال کا "نیا شوالہ" پڑھا ہوگا تو آپ کو اقبال کا خواب بھی یاد ہوگا۔ اگر ٹیگور آپس میں میل ملاپ چاہتے ہیں تو اقبال بھی دل کی سونی بستی کو پریم نگر بنانا چاہتے ہیں۔

اور شاعروں کی طرح ٹیگور کے چاروں طرف عمر کا گھیرا نہیں پڑا ہوا ہے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ بوڑھے جوان اور بچے سبھی تھے بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ بڑے اچھے بچے تھے۔ انھیں بچوں سے دلچسپی آخر عمر تک رہی اور انھوں نے بچپن پر بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی ان نظموں کا ترجمہ " ماہِ نو" کے نام سے اُردو میں بھی ہو گیا ہے۔ ان نظموں کا انداز اتنا رسیلا ہے اور مطلب کچھ ایسے نرالے سہل لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم پڑھو تو کہو " واہ بھئی یہ تو بڑا ہی آسان ہے۔ ہم تو سب سمجھ گئے۔ پر جو

ہم سے سچ سچ پوچھو تو کوئی ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آیا۔ اچھا آؤ ہم تم دونوں مل کر سمجھنے کی کوشش کریں۔

بچہ کہتا ہے۔ "اماں تم کہتی ہو کہ ابا نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور برابر لکھتے رہتے ہیں۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں!

خدا جانے انھیں ہر وقت لکھنے میں کیا مزا آتا ہے۔

جب میں ابا کا قلم یا پنسل اٹھاتا ہوں اور ان کی کتاب پر ا۔ ب۔ ت۔ لکھ دیتا ہوں تو اماں تم مجھ پر ناراض ہوتی ہو۔

جب ابا لکھتے ہیں تو تم ایک لفظ بھی نہیں بولتیں

جب ابا بہت سے کاغذ خراب کرتے ہیں تو اماں تم کچھ نہیں کہتیں لیکن اگر میں ذرا سا کاغذ کشتی بنانے کے لئے لیتا ہوں تو تم کہتی ہو بچے تو بہت ہی دق کرتا ہے۔

ابا جو کاغذ کے تختے کے تختے نشان ڈال کر سیاہ کر دیتے تو ...... ؟"

تم نے دیکھا ٹیگور بات کتنے سہل انداز میں کہتے ہیں۔ ٹیگور بات چپکے سے کہتے ہیں۔ اتنے چپکے سے جیسے تتلیاں چپکے سے آپس میں ملتی ہیں اور کچھ کہہ کر الگ ہو جاتی ہیں اور پھر یہ بات اتنے ہی چپکے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ ہم نے بعض بنگالی زبان جاننے والوں سے یہ بھی سنا ہے کہ ان کے بول بڑے ہی آسان ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی گھلاوٹ اور رس ہوتا ہے۔ ان کی باتیں دل کو خوش کرتی ہیں۔ اور آنکھوں کے سامنے رنگین پردے لاتی ہیں۔ اور شاعر جھوٹے، مگر ہاں ٹیگور نے کلیوں کا چٹکنا سنا ہے تاروں بھری رات میں پریوں کی پازیب کی جھنکار سنی ہے۔ مور اور کبوتر کے دل کی دھڑکن کو محسوس کیا ہے کنول کی کشتی میں تیرتے ہیں اور بنگال کی سنہری صبح اور رنگ بھری شام میں بادلوں پر سورج کی کرنوں کا ناچ دیکھا ہے۔ دراصل ان کی شاعری اس چشمے کے مانند ہے جو آہستہ آہستہ بہتا ہے جس میں لہریں ہیں۔ طوفان نہیں یہ وہ طوفان نہیں جو اقبال چاہتے ہیں۔

وہ ندی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا ہو

جس کی ہوائیں تند نہیں وہ کیسا طوفان

لیکن ٹیگور اور اقبال میں لہر اور طوفان کا فرق ہے۔ اب یہ تمہاری خوشی کہ تم لہر پر بہنا چاہتے ہو یا طوفان پر [illegible]

۳
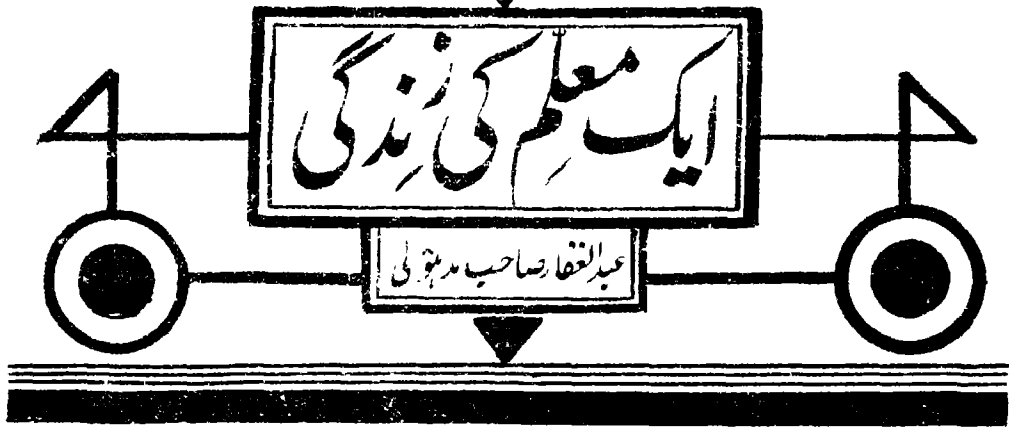
۴۱ء کے جنوری کا آخری دن جامعہ والوں کے لئے بہت خوشی کا دن تھا۔ اُسی دن اُستادوں کے اور لڑکوں کے درمیان کرکٹ کا شاندار میچ ہوا۔ یہ جامعہ کی زندگی میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے کھیل میں تفریح کا پہلو بھی تھا اور سنجیدگی کا بھی۔

میچ تیلک کے جلسے کے بعد یعنی ساڑھے دس بجے شروع ہونے والا تھا۔ آج کل جس جگہ باغبانی ہوتی ہے اُسی میدان میں یہ اکھاڑا جمع تھا۔ میدان کے ایک طرف کُرسیاں بچھی ہیں۔ ان پر اساتذہ بیٹھے ہیں۔ خوانچے والے میدان کا حلقہ لگا رہے ہیں۔ طرح طرح کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ لڑکوں کی ٹولیاں میدان کے چاروں طرف جہاں تہاں بیٹھ گئی ہیں۔

لڑکوں میں بہت جوش و خروش ہے۔ اُستاد بھی اپنی جماعت کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ لڑکے پھر بھی لڑکے ہیں۔ اُن کو اپنے کھیل، پھرتی اور محنت پر پورا اعتماد ہے۔ اساتذہ کی جماعت میں بس چند ہی لوگ ایسے ہیں کہ جم گئے تو جم گئے ورنہ عام کھلاڑی تو ....

ٹھیک ساڑھے دس بجے ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ سب کے کان کھڑے ہوئے۔ اے لو وہ دونوں فریق میدان میں آگئے ہیں آگے آگے لڑکوں کے کیپٹن ابوبکر (ثانوی) اور اُستادوں کے کیپٹن سید نصیر احمد صاحب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکوں کی طرف سے کیپٹن کے علاوہ عبدالشکور، اسمٰعیل خاں، حسن سُبحانی، اخلاق الرحمٰن، ملک محمد صدیق، غضنفر علی خاں، محمد عمر، ملک محمد ابراہیم، شبیر احمد خاں، خلیل خاں نظر آتے ہیں۔ اُستادوں میں نصیر احمد صاحب کیپٹن کے علاوہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ماسٹر برکت علی صاحب، سید نذیر نیازی صاحب، امیر علی صاحب (نگران مدرسہ)، شفیق الرحمٰن صاحب

(ناظم ہمدردان جامعہ) حامد علی خاں (مہتمم مکتبہ) علی احمد صاحب، احمد علی صاحب، حفیظ الدین صاحب عبدالخالق صاحب۔ سید مجتبیٰ حسین صاحب نمایاں نظر آرہے ہیں۔ ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ) آنکھوں کے علاج کے لئے بمبئی گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ بھی اس ٹیم میں ضرور شریک ہوتے۔ اس سے پہلے قرول باغ میں جو میچ ہوا تھا اس میں اُنھوں نے کئی رن بنائے تھے

وہ لیجئے لڑکوں نے "ٹاس" بھی جیت لیا۔ اُنھوں نے اخلاقاً اور مصلحتاً اپنے بزرگوں کو پہلے کھیلنے کی دعوت دی ہے۔ اُستادوں کی پہلی جوڑی احمد علی صاحب اور حامد علی خاں صاحب پر مشتمل ہے احمد علی صاحب نے پہلے کھیلنا شروع کیا۔ یہ کرکٹ کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ کھیل کو خوب سمجھتے ہیں اگر جم جائیں تو سمجھئے وارے نیارے ہیں۔ ان کے کھیل میں خوب صورتی نہیں ہے۔ لیکن رن بنانے کا گر اُنھیں آتا ہے۔ آدمی کافی تیز اور پھرتیلے ہیں۔ یہ لیجئے اُنھوں نے پہلے ہی بال پر چوا رسید کیا۔ تالیاں بجیں۔ دوسری بال پر صرف ایک رن بناکر دوسری طرف پہنچ گئے۔ آہا! اب حامد علی خاں صاحب کی باری ہے۔ یہ لمبے آدمی ہیں۔ کلائی میں قوت بھی ہے لیکن کھیل سے ناواقف ہیں۔ شاید اِس میدان کے مرد نہیں ہیں۔ یہ بھی اس فکر میں ہیں کہ بے تُکی اُڑائیں۔ لیجئے خیریت ہوئی پہلی گیند پر بال بال بچ گئے۔ بالر اُن کی کمزوری سے واقف ہوگیا ہے۔ اُس نے ذرا ہلکی بال دی تو یہ بلّے کو گھماتے ہوئے آگے بڑھے۔ گیند سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بریک ہوکر سیدھی وکٹ میں گھس گئی اُن کا آؤٹ ہونا تھا کہ لڑکوں نے پہلی کامیابی پر تالیاں بجائیں۔ اُستادوں کے ابھی پانچ رن بن سکے ہیں۔

اُستادوں کے تیسرے کھلاڑی پروفیسر محمد مجیب صاحب ہیں ہلکے پھلکے آدمی۔ قدوقامت میں چھوٹے۔ قدروقیمت میں بڑے، کرکٹ شاذ و نادر ہی کھیلتے ہیں۔ آج تو اپنی جماعت کی مدد کرنے آئے ہیں۔ مجیب صاحب جیوں ہی بلّا لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ سارے مجمع نے تالیاں بجائیں ان کا کھیل دیکھنے کے لئے لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے لڑکوں نے اپنی فیلڈنگ مختصر کرلی اور بالر نے انڈر ہینڈ (Under hand) گیند پھینکنی شروع کی پہلی گیند تو مجیب صاحب نے روک لی۔ دوسری پر ایک رن بنایا۔

اب احمد علی صاحب پھر بالر کے مدِمقابل ہیں ابوبکر جو لڑکوں کی ٹیم کے سب سے عمدہ بالر ہیں اُن کو جلد از جلد آؤٹ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اُن کا جم جانا خطرناک ہے۔

لیکن یہ بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ ہر گیند دیکھ بھال کر مارتے ہیں۔ پہلی گیند تو اُنھوں نے روک لی۔ دوسری پر پھر ایک چوا لگایا اور تیسری پر دو رن بنا کر دوسری طرف چلے گئے۔ اب مجیب صاحب کے کھیلنے کی باری ہے۔ اس دفعہ یہ پہلی گیند پر ہی آوٹ ہوگئے۔ بارہ رن پر اساتذہ کا دوسرا وکٹ گر گیا۔ لڑکے اپنی کامیابی کی رفتار پر خوش اور مطمئن ہیں۔

مجیب صاحب کی جگہ برکت علی صاحب نے لی۔ اس خیال سے کہ کچھ تو رن بنیں۔ یہ میدان میں داخل ہوئے تو اُن کے چہرے سے فکر اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کی سنجیدگی بتلا رہی تھی کہ اُنھیں اپنی جماعت کے جیتنے کی اُمید کم ہے۔ برکت صاحب کھیل کو خوب سمجھتے ہیں اور بہت محتاط کھلاڑی ہیں وکٹ کے قریب پہنچتے ہی انھوں نے درمیانی دایاں بایاں وکٹ لیا۔ کریز کو ناپا، سوائیلے پر ایک لکیر کھینچی راستے کی کنکریاں ہٹائیں۔ بالر پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ اور بلے کو نہایت احتیاط سے زمین پر رکھ کر کھیلنے کے لئے تیار ہوئے، تیاری تو یہ بتا رہی ہے کہ آج برکت صاحب "سَو" سے اِدھر دم نہ لیں گے۔ پہلی گیند تو اُنھوں نے آگے بڑھ کر روک لی۔ دوسری پر بلا گھمایا لیکن گیند وکٹ سے ذرا ہٹ کر نکل گئی۔ دوسری گیند پر یہ جو آوٹ ہونے سے بچے تو اور زیادہ سنبھل گئے۔ تیسری گیند بہت سیدھی تھی اور ٹھیک درمیانی وکٹ پر گر رہی تھی۔ برکت صاحب نے اپنا اگلا پیر بڑھا کر جوں ہی گیند روکی بالر نے (How that) ہوزٹ کا نعرہ لگایا۔ امپائر نے اِل، بی ڈبلیو دے دیا۔ پھر تو لڑکوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے اور مذاق کرنے لگے۔ برکت صاحب واپس آکر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "امپائر کا فیصلہ مشکوک ہے"۔ لڑکے اس لئے خوش تھے کہ اگر انھیں کھیلنے کا موقع ملتا تو یہ گھنٹوں کھیلتے رہتے۔

اس کے بعد اُستادوں نے بہت کوشش کی لیکن کھیل کا رنگ جم نہ سکا۔ بعض نے دو ایک ہاتھ دکھائے اور کچھ رن بنائے۔ لیکن اکثر کورے ہی لوٹ آئے۔

آخری وِکٹ کا گرنا تھا کہ مجمع میں ایک شور برپا ہو گیا۔ لڑکے خوش خوش اُچھلنے کودنے لگے دو چار منٹ کے لئے سارا میدان گرد و غبار سے اٹ گیا۔

دس منٹ کے وقفے کے بعد لڑکوں نے کھیلنا شروع کیا۔ اساتذہ فیلڈنگ کے لئے میدان میں جم کر کھڑے ہوگئے۔ لڑکوں کی طرف سے پہلے ابوبکر عبدالشکور کھیلنے کے لئے آئے۔ لڑکوں اور اُستادوں نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔

(باقی آئندہ)

سپاہی بچہ

سید ابوتمیم، فرید آبادی

فضلو بڑا شریر بچہ تھا - ایک رات اور ایک دِن مُسلسل میرا اور اُس کا ساتھ رہا - ریل کے سفر میں میں بھی اُس کی شرارتوں سے عاجز آگیا تھا اور دوسرے مسافر بھی - اُچھل کر ریل کے ڈبّے کے مچان پر جا بیٹھا پھر کچھ دیر بعد دھوں سے کود پڑا - چلتی ریل میں دروازہ پکڑ کر لٹک جاتا - سارے مُسافر خوف سے لرزتے رہتے منع بھی کرتے مگر وہ کب سُننے والا تھا ۔

وہ ایک ایسے خاندان کا بچہ تھا جن کی عمریں لڑائی کے میدان میں زیادہ کٹی تھیں - مگر جب سے ہمارا مُلک انگریزوں کے پنجے میں آیا ہے لوگ پالتو طوطوں اور مرغیوں کی طرح کم زور، پست ہمت اور ڈرپوک ہوگئے ہیں - بجائے بہادری کے کاموں کے آرام کرسیوں پر بیٹھ کر زندگی گذارتے ہیں - فضل الدین (فضلو کا پورا نام ہے) کے عزیز اور رشتے دار بھی آرام طلب ہوگئے ہیں ۔

جب وہ سترہ، اٹھارہ برس کا ہوا تو اُس کے ایک ماموں نے اُسے کسی نواب کا مصاحب بنانا چاہا - یہ مصاحب بڑے دلدار لوگ ہوتے ہیں - نوابوں کو ہنساتے رہنا - جھوٹ بولتے رہنا - دوسروں کی غیبت کرتے رہنا - نوابوں کی چاپلوسی کرتے رہنا اُن کا کام ہوتا ہے - ان کا دین ایمان بس یہ رہ جاتا ہے کہ دولت کماؤ چکنی غذا کھاؤ - تھوڑی دیر نوابوں کو خوش کرو اور موج اُڑاؤ ....

لاحول ولا قوۃ -

کچھ دن تک فضلو کو نواب صاحب کے ہاں جانا پڑا - وہاں اور بیسیوں جوان اور بوڑھوں کی طرح اُسے بھی ہاتھ باندھے اور گردن جھکائے کھڑا رہنا پڑا - ان مصاحبوں کی خوشامدی باتوں اور فریب و مکر کی بات چیت سے وہ تنگ آنے لگا - مگر اُس کا ماموں خوش تھا - وہ دیکھتا تھا کہ نواب صاحب فضلو پر بہت مہربان ہیں - انعام اکرام دیتے رہتے ہیں ساتھ رکھتے ہیں - جب فضلو موجود نہیں ہوتا ہے تو اُسے یاد فرماتے ہیں - مگر فضلو کو اس زندگی سے وحشت ہوتی جا رہی تھی - آخر اُس سے یہ بے غیرتی کی زندگی

کٹ سکی۔

یک دن گھر سے فرار ہوگیا مشکل سے اس کی
ب میں بیس روپے ہوں گے اور نہ کوئی کپڑا نہ لتا
ں جو جوڑا تن پر تھا وہی اس کی ملکیت تھا۔

وہ سیدھا پونا پہنچا اور فوج میں بھرتی ہوگیا۔
موٹر چلانی جانتا تھا اس کے ماموں کے پاس تھی
راسی پر اس نے ہاتھ صاف کیا تھا...... فوج
ں اس کو موٹر کا کام دیا گیا اور شاید ۱۹ روپے تنخواہ
ہری۔ بھرتی ہونے کے بعد اس نے اپنے ماموں
زوالد کو اطلاع دے دی۔ اس کی بہنیں بہت
ئی پیٹیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ مر جائے گا بلکہ
ں لئے کہ ۱۹ روپے بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ کہتی
یں کہ اتنے کے تو نوکر ہمارے یہاں ہیں۔

کچھ دن بعد وہ باہر بھیج دیا گیا۔ شاید اس کی
ری پلٹن۔ ابھی چند دن ہوئے اس کا تار ملا کہ میں
ئی پہنچ گیا ہوں اور پنجاب جا رہا ہوں۔ دلی کے اسٹیشن
اس سے ملنے گیا۔

ریل آئی اور اس کے ساتھ گھبرائے ہوئے
وں کی بھیڑ، جن کی آنکھیں پھٹی ہوئی، سانس پھولے
ئے اور اوسان خطا تھے...... یہ لوگ
تو ریل میں بیٹھنے والے تھے یا اُن کے کوئی عزیز اُترنے
ے تھے۔ میں نے چاہا کہ اُن کی طرح گھبرا جاؤں۔
ر نہ گھبرا سکا۔ اُترنے والے اُتر گئے اور بیٹھنے والے

گھس گئے تو صرف قلیوں کا شور باقی رہ گیا۔ کیا دیکھتا
ہوں کہ سامنے سے فضلو چلا آ رہا ہے، مگر کس شان سے!
آہاہا۔ دیکھنے کے قابل تھا وہ۔ کالی فوجی نیلی ٹوپی
ذرا سی ترچھی۔ خاکی قمیص جس کے بازو پر "نائیک" کی
نشانی سلی ہوئی، خاکی نیکر، گرم بڑی جُراب اور کوئی
۲۰ سیر کا کالا جوتا...... جب وہ آ رہا تھا تو جوتا
بھی چیں چاں کر رہا تھا اور پلیٹ فارم بھی لرز رہا تھا۔
سینہ اس کا چوڑا ہوگیا تھا اور رنگ ذرا سا کالا۔ قد
اُس وقت مجھے بہت لمبا معلوم ہوا، حالانکہ میرے
قد سے اب بھی وہ بہت چھوٹا تھا...... مجھے
دیکھتے ہی جھپٹ گیا۔ میں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی بھینچا
اور کان کترنا چاہا۔

میں اُسے چار کے ہوٹل میں لے گیا۔ چار پلائی۔
وہ چاء پیتا رہا اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ اب فضلو
شرارت کا پتلا نہیں تھا۔ بڑا متین بن گیا تھا (شاید اب
بھی وہ اپنے ساتھیوں سے شرارت کرتا ہو۔) مجھے اس
پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ جب وہ نواب صاحب کے جنگل
سے نکل کر بھاگا تو اس وقت بھی مجھے بہت خوشی
ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا کہو فضلو تم کہاں رہے اس عرصے
میں؟ اُس نے کہا "سوڈان اور ابی سینا کی
لڑائیوں میں۔"

میں نے پوچھا لڑائی دیکھی بھی یا کہیں دور رہی

تھے ؟"

کہنے لگا "واہ صاحب - ہم تو عموماً حملے کے
وقت فوج کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں - حبش کی تمام
لڑائیوں میں میں نے شرکت کی - جو شہر ہتھیار ڈال
دیتے تھے ، اُن میں پہلے ہم ہی داخل ہوتے تھے"

میں نے پوچھا کیوں بھائی یہ اٹلی والے اتنے
پِلپِل کیوں نکلے ؟

کہنے لگا اُن کے پاس نہ تو اچھے ہتھیار تھے
اور نہ اچھی فوجی تعلیم دی گئی تھی " میں نے دریافت کیا
"کبھی تمھاری فوجوں سے دو بدو (آمنے سامنے)
بھی لڑائی ہوئی ؟ یعنی سنگینوں کی جنگ ؟" کہا "ہاں کئی
دفعہ - مگر اُن کی رائفلیں بہت پرانی ہوتی تھیں -
اور اکثر کے پاس سنگین ہوتی ہی نہ تھی - البتہ اُن کے
پاس تین نال کی رائفل بڑی خطرناک چیز تھی - اُن کے
ہوائی جہاز بہت کم زور تھے اور چلانے والے بالکل
اناڑی ...... جب وہ پکڑے جاتے تھے تو ہم
پر ایک مصیبت ہوتی تھی - اُن کو بھیڑ بکریوں کی طرح
لاریوں میں بند کر کے لانا لے جانا ہمارا ہی کام ہوتا تھا
راستے بھر چاؤں چاؤں کرتے اور لڑتے بھڑتے جاتے تھے"

میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی پوچھا میاں
تم مرے نہیں - بولا "جی نہیں مگر میری گاڑی پر گولیاں
کئی مرتبہ لگیں - دشمن بھاگتا تھا تو ہم کو اُن کا پیچھا کرنا
پڑتا تھا اور بعضے بھاگتے بھاگتے بھی گولی چلا دیتے تھے

میں نے پوچھا "جو کبھی گولی تمھاری کھوپڑی پر لگ جاتی
تب کیا ہوتا ؟" مسکرا کر بولا - "ہوتا کیا ؟ اجی گولی سے
زیادہ تو خطرناک پینر ہاتھوں کے بم ہوتے ہیں مگر ہمارے
دشمن کے دستی بم ایسے گھٹیا تھے کہ دس فٹ سے بھی کسی
کے لگتے تو بس ذرا سی کھال پھٹ جاتی تھی - اچھا وقت
ریل کا کم ہے ، کچھ خاندان کا حال تو سنائیے " میں نے
کہا "لو سنو تمھارے ابا کی پنشن ہو گئی - تمھاری ایک
بھانجی اللہ کے ہاں گئی - تمھارے ایک چچا زاد بھائی
نے اپنی بیوی پر بندوق کا فیر کر دیا - اب وہ سرکاری
مہمان ہیں - شاید دو سال کی سزا ہو گی - مگر تم یہ تو بتاؤ
کہ تم نواب صاحب کی مصاحبت سے کیوں گھبرا کر بھاگے
تھے ، اچھے خاصے تھے وہاں معقول تنخواہ ، عمدہ غذا
نرم بستر اور عمدہ موٹروں کی سواری ملتی تھی ......"

میری بات کاٹ کر کہا "آپ مجھے چھیڑئیے مت - آپ جانتے
ہیں کہ نرم بستر اور چکنی غذائیں - رنڈیوں اور ان کے
بھڑووں کو بھی ملتی ہیں مگر اُن کی عزت کوئی کرتا ہے ؟ ایمان
اور خودداری بیچ کر زندگی گذارنے سے بہتر تو موت ہے
اب اگر میں مرا تو لوگ یہی کہیں گے نا کہ دشمن سے مقابلہ کرتے
ہوئے مرا - یہ تو نہیں کہیں گے کہ کسی نواب کی چاپلوسی اور
خوشامد کرتا ہوا مرا " میں نے اُس کی کمر ٹھونکی اور مرحبا کہا

وہ اُٹھا - نیکر کو ذرا اونچا کیا اور چرچر کی آواز کے
ساتھ ہوٹل سے نکلا ...... لوگ اس کو دیکھ رہے تھے اور
میں دل ہی دل میں اُس کو داد دے رہا تھا ۔

جھوٹ کے پاؤں

گنیش چندر سکسینہ

ایک مُرغا تھا پیڑ پر بیٹھا — اُس کو بلّی نے دُور سے دیکھا
کھائے مُرغے کو دِل میں یہ آئی — پیڑ کے نیچے چل کے وہ آئی
پھر مُخاطب ہوئی وہ مُرغے سے — کچھ سُنا تُم نے جو ہوا ہے طے
جانور اِک جگہ ہوئے تھے جمع — بولے آپس کا کُشت و خوں ہے منع
اِس لئے نیچے تُم اُتر آؤ — نہ ڈرو مجھ سے اور نہ گھبراؤ
مُرغ کافی تجربہ رکھتا تھا — اُس کی مکّاری پہ وہ ہنسنے لگا
اور بولا کہ حال سب سمجھاؤ — سایہ ٹھنڈا ہے بیٹھ کر ستاؤ
اِتّفاقاً شکاری کُتّے دو — آتے دیئے دِکھلائی بلّی کو
کُتّے نزدیک آتے جب دیکھے — چاہا بلّی نے راستہ ناپے
بھاگنے کا کیا ارادہ جو — مُرغا چلّایا ٹھہرو بات سُنو
بولی بلّی میں رُک نہیں سکتی — کہنا جو کچھ ہے تم کہو جلدی
مُرغ بولا مجھے یہ کہنا ہے — خوف کُتّوں سے ایسے کیا ہے
کِس لئے ڈر کے بھاگتی ہے بُوا — بدگمانی ہے یہ تری بے جا
بولی تیری طرح سے یہ کُتّے — بے خبر لیگ کے ہیں فیصلے سے
کہا مُرغے نے بات یہ سچ ہے — جھوٹ کے پاؤں ہی نہیں ہوتے
یہ کہانی نہیں ہے عبرت ہے — ماننے والوں کو نصیحت ہے

بات مکّاری کی کبھی سُن کر
کرنا ہرگز نہ یک بیک باور

عبدالواسع　　　　چک مگلوری

انگلستان میں ایک جگہ ہے مانس فیلڈ نوٹنگھم یہاں ایک معمولی مزدور پیٹرک فلنگھان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام جیمز فلنگھان رکھا۔ اس کا باپ پیٹرک فلنگھان ایک آوارہ مزدور تھا۔ تمباکو کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ بہت سے ہفتہ وار ملتے تھے۔ اپنے کام میں بہت ہشیار تھا مگر شراب پینے کی بری لت پڑ گئی تھی۔ ساری آمدنی اسی میں خرچ ہو جاتی تھی۔ پھر جب وہ شراب پی کر بدمست ہوتا تو بیوی بچوں پر بہت ظلم کرتا۔ مارتا۔ پیٹتا اور گھر سے نکال دیتا غرض پورا خاندان ایک مصیبت میں مبتلا تھا۔

جیمز فلنگھان کچھ بڑا ہوا تو اس کے باپ نے اُسے بھی اپنے ہی کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔ جیمز کے ساتھی مزدور بہت شہدے اور آوارہ تھے۔ اُن کی ہر بات سے بازاری پن ظاہر ہوتا تھا۔ جیمز کی آواز اچھی تھی اور رات کو کھانے کے بعد گایا کرتا تھا تمام مزدور اُسے گھیرے رہتے تھے۔ اُسے اُنھوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

ایک دن جیمز کا ایک ساتھی اُسے شراب کی ایک بھٹی میں لے گیا۔ اور اُسے گانے پر مجبور کیا۔ لوگوں نے اُس کے گانے کو بہت پسند کیا اور اس دن بھٹی کی شراب بہت بکی۔ اب تو بھٹی کا مالک بھی اُسے بہت چاہنے لگا۔ جیمز کے گانے زیادہ تر تھیئٹروں کے ہوتے تھے۔ جب تماشا دیکھنے جاتا تو یہ گانے یاد کر لیتا اور بھٹی میں آکر سناتا۔

جیمز پادریوں کا وعظ سننے کے لئے ہر اتوار کو گرجا ضرور جاتا تھا۔ ان وعظوں سے اُس کے دل پر اچھا اثر ہوتا تھا۔ آخر ایک دن ایک پادری کے وعظ نے اس کی کایا ہی پلٹ دی۔ جیمز نے تمام برائیوں سے توبہ کی اور عہد کیا کہ زندگی بھر مخلوق کی خدمت کرے گا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتا تھا پر وہ اسی دن قاعدہ خرید لایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی شدھ بدھ ہو گئی تو چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھنے لگا۔ اب وہ دن میں کوئلے کی کان میں کام

کرتا اور رات کو کتابیں پڑھتا۔ تھوڑے دنوں میں اُسے اچھا خاصا لکھنا پڑھنا آ گیا۔ اُس نے حمد و نعت کی بہت سی نظمیں بھی زبانی یاد کر لیں۔ ان نظموں کا اس پر اور بھی اچھا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی دُعا پڑھنے کے لئے اُسے گرجا میں بھی بُلایا جانے لگا۔ اب تو اُسے اپنی قابلیت بڑھانے کا اور بھی شوق ہوا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے بہت اچھی قابلیت حاصل کر لی۔ اور اُسے گاؤں کے مدرسوں کا نگراں مقرر کر دیا گیا۔

اُس نے اپنے گاؤں میں وعظ کہنا بھی شروع کر دیا۔ لوگ اُس کا وعظ بہت شوق سے سنتے۔ وہ روزانہ سولہ گھنٹے کام کرتا۔ اُس نے بائبل بھی خوب غور سے پڑھی۔ اس کے صفحے کے صفحے پڑھتا چلا جاتا اور اُن کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھا دیتا۔ لوگوں پر اس کی ان باتوں کا بہت اثر ہوتا تھا۔ کان کے مزدور یعنی اُس کے ساتھی اس کی اس حیرت میں ڈالنے والی کایا پلٹ کو دیکھ کر دانتوں تلے اُنگلی دبا لیتے تھے۔

ہوتے ہوتے اُس کے وعظ کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ جگہ جگہ لوگ اُسے وعظ کے لئے بُلانے لگے۔ ایک گاؤں کے لوگوں پر تو اس کے وعظ کا اتنا اثر ہوا کہ اس سے چھ مہینے تک برابر وعظ کہلواتے رہے۔ لوگ روزانہ جوق در جوق اس کی تقریر سننے آتے تھے۔ مجمع اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ جیمز کو کرسی یا منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنی پڑتی تھی۔

جیمز نے پڑھنے لکھنے کا شغل برابر جاری رکھا اور اپنے اسی شوق اور مسلسل محنت کی بدولت عالم و فاضل بن گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ نوٹنگھم کا پادری بنا دیا گیا۔ جیمز نے یہاں کے گرجا میں تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان وعظوں نے یہاں کے لوگوں میں ایک زندگی پیدا کر دی۔ اس کے بعد وہ بڑی میٹڈن چرچ میتھوڈسٹ کا بڑا پادری مقرر کیا گیا۔

لندن کے ٹرینیٹی گرجا میں لوگ بہت کم آتے تھے بات یہ تھی کہ وہاں کے پادریوں کو اپنے کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ آخر جیمز کو یہاں بُلایا گیا۔ شروع شروع میں اُسے کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلے دن وعظ میں کُل ۳۰ آدمی آئے وہ بھی غریب طبقے کے۔ بہت کچھ دوڑ دھوپ اور سوچ بچار کے بعد ایک تدبیر اُس کی سمجھ میں آئی۔ وہ گلی کوچوں میں جگہ جگہ وعظ کہتا پھرتا اس کا اثر لوگوں پر بہت اچھا ہوا۔ اور اب یہ حالت ہوئی کہ جہاں پہلے چند ادنیٰ اور غریب لوگ آتے تھے وہاں اب عمارت میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی آخر عمارت کو بڑھانے کی ضرورت ہوئی۔ اس کام کے لئے ضرورت تھی روپے کی۔ روپے اکٹھا کرنے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ گاؤں گاؤں جا کر وعظ کرتا اور آخر میں چندہ جمع کرتا۔ اس طرح اُس نے کافی روپیہ جمع کر لیا۔ اس روپے سے چند مہینوں میں عمارت بن کر تیار ہو گئی اس عمارت کا نام سینٹ جارج ہال رکھا گیا

اب جیمز کی مذہبی قابلیت کا چرچا انگلستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ہونے لگا۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا والوں نے اُسے اپنے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اِن دونوں جگہوں پر اس کے وعظ بہت کامیاب رہے۔ ان مُلکوں کے لوگوں نے اسے اپنے یہاں بہت عزّت و احترام کے ساتھ مہمان رکھا۔

یہاں سے لوٹ کر اُس نے کئی کتابیں لکھیں اُس کے وعظوں کی طرح اس کی کتابیں بھی تمام دنیا میں مقبول ہوئیں۔

جیمز ۱۹۱۶ء میں بیمار پڑا اور ۱۹۱۸ء میں اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ انگریزی پارلیمنٹ کے تمام ممبر اس کے جنازے میں شریک تھے۔ سچ ہے بلند ہمتی اور محنت و استقلال کی بدولت ایک بازاری اور تھیٹر کے گانے گانے والا بے علم لڑکا بھی اتنا عروج حاصل کر سکتا ہے ✦

شفق

مبارک حسین خاں ازھر

ہوئی شام پھولی شفق آسماں پر
تنی سُرخ بانات سارے جہاں پر

یہ پیارا سماں بھی بہت خوش نُما ہے
افق پر حقیقت میں سونا چڑھا ہے

ہوا ہے جو رنگین دریا کا پانی
بنا لال شربت ہے دریا کا پانی

درختوں نے بھی سُرخ بانات پہنی
لگی جھومنے اُن کی ایک ایک ٹہنی

پلک مارتے ہی یہ منظر نرالا
ہوا دُور آنکھوں سے دن کا اجالا

غرض یوں ہی مٹتی ہے ہر شے یہاں کی
ہر اک چیز فانی ہے ازھر یہاں کی

آنکھ مچولی

ایم اقبال حسین، چکردھر پور

ریاست گانگپور کے ایک گاؤں میں ایک شخص نے ہاتھی فراہم کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا روزانہ اس کے یہاں سے سو پچاس ہاتھی دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔

ٹھیکے دار کے ہاتھی خانے میں جہاں ہر قسم کے چھوٹے بڑے ہاتھی موجود تھے وہاں ۲۰ ، ۲۵ چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ یہ دیکھنے میں بہت خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے ہاتھی خانے میں دن رات دھما چوکڑی مچائے رکھتے۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے ناسمجھ بچے اکثر ہاتھی خانے کے گرد جمع ہو جاتے اور ہاتھیوں کے بچوں کی خوش فعلیاں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے اور اپنے ہمجولیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے۔

ایک روز گاؤں کے بچے آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے ہاتھی خانے کے میدان میں گھیرا بنائے کھڑے تھے اور ان میں سے ایک بچے کو چور بنا کر اس کی آنکھوں میں پٹی باندھ رہے تھے۔ اتنے میں ہاتھی خانے سے ہاتھیوں کے ۱۰ ، ۱۵ بچے گاؤں کے بچوں کے پیچھے آ کر چپکے سے کھڑے ہو گئے۔ ان بچوں کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ یہ تو بس اپنی دھن میں پٹی باندھے جانے والے بچے کو دیکھ رہے تھے کہ پٹی بندھ جائے اور تالی بجے تو ہم لگ بھاگیں اتنے میں تالی بجی اور بچے اندھا دھند بھاگنے لگے۔ اب جن بچوں کے پیچھے ہاتھیوں کے بچے کھڑے تھے وہ ان سے ٹکرا ٹکرا کر ادھر ادھر لڑھک پڑھک گئے۔ ہمجولیوں کی نظر جونہی ہاتھیوں کے بچوں پر پڑی گھبراہٹ میں "ہاتھی آیا بھاگو" کہہ کر بے تحاشا اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگے ہاتھیوں کے بچے بھی گاؤں کے بچوں کے پیچھے دوڑے اور تھوڑی دور جا کے ان بچوں کو جا لیا اور اپنی اپنی سونڈوں میں لپیٹ کر ہاتھی خانے کے میدان میں جہاں بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے لے آئے اور ان بچوں کو اپنے گھیرے میں لے کر ایک نے اپنی سونڈ آنکھوں میں رکھ کر بچوں کو اشارے سے بتایا کہ ہم بھی آنکھ مچولی کھیلیں گے گاؤں کے بچے پہلے تو اپنے آپ کو ہاتھیوں کے محاصرے میں دیکھ کر خوف سے چیختے چلاتے رہے بعد میں آنکھ مچولی

کا اشارہ سمجھ کر رونا دھونا سب بھول گئے اور ہاتھیوں کے بچوں کے ساتھ مِل کر آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

ہاتھیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے گاؤں کے بچے نڈر ہوگئے۔ اکثر کوئی بچہ کبھی چور ہوتا تو آنکھوں میں پٹی بندھی ہوتی اور وہ ہاتھیوں کے جھنڈ میں بلاخوف وخطر گھس جاتا اور ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ہاتھیوں کے بچوں کو پکڑ کر چلاتا "چور چور" آواز سُن کر تمام بچے ہاتھی خانے میں گھس کر ہاتھی کے بچے کو کھینچ تان کر باہر میدان میں لے آتے۔ "چور ہاتھی کا بچہ" اپنی سونڈ سے آنکھیں بند کر لیتا۔ بچے تالی پیٹ کر اِدھر اُدھر ہاتھی خانے میں گھس پڑتے اور بڑے بڑے ہاتھیوں کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل جاتے کبھی ان کی اوٹ میں چھپے رہتے۔

ہاتھیوں کے بچوں کے ماں باپ انسان کے بچوں کے ساتھ مِل کر آنکھ مچولیاں کھیلنے کا تماشا دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور خوشی میں گاؤں کے تمام بچوں کو اپنے اوپر سوار کرا کے جنگل کی سیر کرانے لے جاتے پھر جنگل سے لوٹ کر بچوں کو گاؤں میں اُتار کر اپنے ہاتھی خانے کو روانہ ہوتے۔

ہاتھیوں کے بچے گاؤں کے بچوں سے کچھ ایسے ہِل مِل گئے تھے کہ اگر کبھی کبھار گاؤں کے بچے آنکھ مچولی کھیلنے نہ آتے تو یہ گاؤں جا کر انھیں بُلا لاتے، اور اُن سے آنکھ مچولی کھیلتے ✦

گڑیا اور گڈے کی شادی

نذیر تجمل صاحب

تعلیمی مرکز کے چھوٹے بچوں نے ایک دفعہ
دنیا کی سیر کی۔ وہاں کا منظر ان کو بہت پسند آیا۔
ہم نے ان کو بتایا کہ ہمارے ملک میں کشمیر ایسی اچھی
جگہ ہے جہاں اس قسم کے بہت اچھے اچھے نظارے
دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً پہاڑیاں جہاں شام کے
وقت ایک عجیب خاموشی ہوتی ہے اور جب چاند
کی چاندنی کھلتی ہے تو کالے کالے درخت، ندی
نالوں کا شور کرتا ہوا، پانی دودھ کی طرح سفید
اور پھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ اسی طرح وہاں کی
سہانی صبح، پہاڑوں کے دامن میں بہتا ہوا صاف
پانی جس پر اِدھر اُدھر ڈونگے اور کشتیاں پڑی
پھرتی ہیں۔ پرندوں کا چہچہانا اور پوست کے کھیتوں
میں سرخ سرخ پھول جو صبح کی ٹھنڈی ہوا کے
ہلکے ہلکے تھپیڑوں سے معلوم ہوتا ہے جاگ اٹھے
ہیں اور آنکھیں کھول کھول کر اِدھر اُدھر تک رہے
ہیں۔ اور پھر پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں جن پر
ہرے سبزے کی بہار بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے

لڑکوں کو وہ ملک بہت پسند آیا اور سب
نے ارادہ کیا کہ ہم اس قسم کا ایک چھوٹا سا ملک اپنے
اسکول میں بنائیں گے۔ اب ان کا یہ بہت اچھا
کھیل تھا۔ سب نے مل کر اتنا کام کیا کہ سچ مچ ایک
اچھا خاصا ٹیلا بنا کر کھڑا کر دیا۔ ندی، نالے نکالے،
ان پر پل بنا کے سڑکیں بنائیں اور ان کے ساتھ
ساتھ تار کے کھمبے بھی کھڑے کئے۔ ریل کی پٹری گاڑی
اور انجن تیار کیا۔ موٹریں اور تانگے بنائے۔ چھوٹے
چھوٹے گھر بنائے۔ پوست کے پھولوں کا کھیت بنایا
طرح طرح کے درخت بنائے۔ میں نے جب ان کو
کشمیری لوگوں کی بہت سی کہانیاں سنائیں۔ تو
وہ اور بھی بہت سی چیزیں بنانے لگے۔ مثلاً مٹی کے
برتن، چٹائیاں، کھلونے اور بالوں کے نمدے،
اس طرح جماعت میں بہت سا سامان تیار ہو گیا
پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دو لڑکے چھٹی لے کر ایک
شادی میں چلے گئے جب واپس آئے تو دن بھر دولہا
دلہن کا چرچا رہا۔ سب بچوں نے مل کر طے کیا کہ ہم

گڑیا اور گڈے کی شادی کریں اور یہ شادی کشمیریوں کے رسم و رواج کے مطابق ہو جماعت میں اب اور ہی جوش نظر آنے لگا۔ بہت سی چیزیں مثلاً کپڑے زیور برتن، کچھ بننے لگے، کچھ جمع ہونے لگے۔ اسی ٹیلے یا کشمیر کے ماڈل میں ایک طرف گڈے کا گاؤں بنا دوسری طرف گڑیا کا گاؤں بنا۔ آتش بازی تیار ہوئی اور شادی کی تیاریاں دھوم دھام سے ہونے لگیں۔ کوئی ۳ مہینے یہ کام برابر ہوتا رہا۔ یہ سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ایک مقررہ دن بہت دھوم دھام سے شادی رچی

پہلی جماعت کے بچوں نے دوسری جماعت والوں کو بھی دعوت دی اور بڑی جماعتوں کے لڑکوں میں سے ایک ایک دو دو نمائندے چن لئے گئے جو اسکول کی دوسری دلچسپیوں کے خاص کارکن یا سردار تھے۔ پہلے ایک جلسہ ہوا۔ بچوں نے رپورٹ پڑھی، نظمیں سنائیں اور اپنا تیار کیا ہوا سینما دکھایا۔ اس میں کشمیری مناظر کی ڈرائنگ تھی سب بچے اور استاد دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر دوسری جماعت والوں نے سہرا پڑھا، جو بہت ہی اچھا تھا۔ جناب مولوی شفیع الدین صاحب نیر نے لکھ کر دیا تھا اور باتیں لکھنے سے پہلے آپ کو وہ سہرا سناتے ہیں

سہرا

گڈے میاں نے باندھا ہے سہرا — دیکھو تو کیسا اچھا ہے سہرا
گڑیا دلہن ہے گڈا ہے دولہا — دولہا دلہن کا پیارا ہے سہرا
پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے — محفل میں ساری مہکا ہے سہرا
پھولوں کی لڑیاں پھولوں کی چھڑیاں — خوشیوں کی گھڑیاں لایا ہے سہرا
چاند اور سورج اس پر فدا ہیں — آنکھوں کا ان کی تارا ہے سہرا
بچے بھی خوش ہیں خوش ہیں بڑے بھی —
خوشیوں کا شاید تحفہ ہے سہرا

گڈے میاں کی شادی رچی ہے
نیر بھی لکھ کر لایا ہے سہرا

یہ شعر اتنا پڑھنے والے نے اتنا اچھا پڑھا کہ دو تین بار پڑھوایا گیا۔ کیا بچے کیا بڑے ہم سب نیر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اور بھی طرح طرح کی نظمیں پڑھی گئیں۔ خاص طور سے ایک نظم سب نے بہت پسند کی۔ یہ نظم گڈے کی طرف سے ایک لڑکے نے پڑھی۔ اس میں گڈا اپنے وطن کی یوں تعریف کرتا ہے۔

مرا دیش سُندر نظاروں کی دُنیا
حسیں پربتوں کوہساروں کی دُنیا
بسنتوں کی دنیا بہاروں کی دُنیا
وطن ہے مرا چاند تاروں کی دُنیا
مرا دیش سُندر نظاروں کی دُنیا

یہ نظم بہت لمبی ہے۔ لیکن اوپر کے بند سے اندازہ کر لیجئے کہ کتنی اچھی ہوگی۔ پڑھنے والے نے ایسی عمدہ لَے سے گایا ہے کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد نہایت عمدہ دعوت ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے بہت سا چندہ جمع کیا تھا۔ ان کا ایسا اہتمام دیکھ کر ہر کوئی خوش ہو رہا تھا۔ پورے دو گھنٹے کی رونق اور چہل پہل کے بعد بچوں کا یہ کھیل ختم ہو گیا۔

ذہن میں رکھئے ......؟

(۱) رسالہ ہر ماہ پابندی اور احتیاط کے ساتھ ۲۸ تاریخ کو تمام خریداروں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ۷، ۸ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو سمجھ لیجئے کہ راستے میں گم ہو گیا۔

(۲) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ ۱۵ تاریخ تک کر کے دوبارہ طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تعمیل ذرا مشکل ہے۔

(۳) ہر قسم کی خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے جو پتے کے اوپر چٹ پر درج ہوتا ہے بغیر نمبر خریداری کے وصول ہونے والے خطوں کی تعمیل نہ کی جائے گی۔

(۴) جو صاحب آئندہ سال خریداری جاری نہ رکھنا چاہیں۔ براہِ کرم اس کی اطلاع زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو ضرور دے دیا کریں۔

(۵) معمے کے کوپن کے ساتھ سوائے معمے کے کسی دوسری قسم کی خط و کتابت ہرگز نہ کیجئے۔ دیر میں تعمیل ہونے یا نہ ہونے کا دفتر ذمے دار نہیں۔

"منیجر"

اُڑن کھٹولا

ریش زاں سکینہ

ننھا محمود اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ اس کو سبق یاد کرتے کرتے نیند آ گئی۔ اتنے میں ایک اُڑن کھٹولا اُس کے پاس آیا۔ اُس میں سے آواز آئی کہ میاں محمود آؤ تمھیں دُنیا کی سیر کرا لاؤں۔ محمود بہت حیران ہوا کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا تو اُس کو ایک چھوٹا سا بونا نظر آیا وہ سر سے پاؤں تک ہرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اُس نے محمود سے نہایت ہی ادب سے کہا کہ آؤ میاں تمھیں دنیا کی سیر کرا لاؤں، مجھ سے ڈرو مت آؤ کھٹولے میں بیٹھ جاؤ۔ محمود بھی ڈرتے ڈرتے اُس میں بیٹھ گیا۔ محمود کا اس میں بیٹھنا تھا کہ وہ اُڑن کھٹولا تو اُڑنے لگا۔ محمود کو جو ٹھنڈی ہوا لگی تو وہ ایک طرف سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو بہت چھوٹے چھوٹے آدمی، موٹریں سب نکلیں نظر آئیں۔ وہ بونے سے پوچھنے لگا کہ میاں بونے یہ تو بتاؤ؟ کہ تم ہو کون اور نیچے یہ چھوٹے چھوٹے آدمی کون ہیں" اُس نے کہا کہ "میں بونوں دیس کے راجا کا ایک درباری ہوں اور وہاں کے راجہ نے مجھے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا ہے اور یہ جو تم نیچے دیکھ رہے ہو یہ تمھاری دنیا ہے تمھیں معلوم ہے کہ اِس وقت ہم کئی ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے ہیں۔ اتنے میں اُن کا کھٹولا ایک دم رُک گیا۔" بونے نے کہا۔ "میاں اب اُترو۔ یہی بونوں دیس ہے جیسے ہی ان کا کھٹولا رکا۔ بہت سے آدمی آ گئے۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اُنھوں نے بونے کو جُھک جُھک کر سلام کیا۔ بونے نے کہا، "یہ ہمارے مہمان ہیں اور یہ ہمارے بونوں دیس کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی دو ایک منٹ چلنے کے بعد محمود وغیرہ شاہی محلوں میں پہنچے وہاں جا کر محمود کو پتہ لگا کہ یہ بونا راجہ کا درباری نہیں بلکہ بونوں دیس کا راجہ ہے۔ محمود نے تمام بونوں دیس کی سیر کی۔ چھوٹے چھوٹے باغ۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ یہ وہاں کے بونوں کے ساتھ مل کر نہایا۔ اور اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ اُنھوں نے اسے طرح طرح کے کرتب دکھائے" اس کا دل تو وہاں سے جانے کو نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس بونے نے کہا کہ "آؤ میاں میں تم کو چاند دیس کی سیر کرا لاؤں"۔ پھر یہ دونوں اُسی کھٹولے میں بیٹھ گئے۔ چاند دیس جانے کے لئے اُن کو اور اوپر جانا پڑا۔ تمام دن تو وہاں کچھ رونق نہ ہوئی لیکن جب شام ہوئی اور چاروں طرف چراغ روشن ہوئے اُس نے نیچے دیکھا دُنیا آسمان کی طرح لگ رہی تھی، چھوٹے چھوٹے ستارے بھی دکھائی دینے لگے۔ اب تو بہت ڈرا کہ رات ہو گئی۔ ابا ناراض ہوں گے۔ اس نے بونے سے کہا: "مجھے لے چلو لیکن بونے نے کہا، "ابھی اور سیر کر لو" مگر محمود نے چھلانگ مار دی اور دریا میں جا گرا اتنے میں محمود کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ بونا ہے نہ وہ دریا۔ پلنگ سے نیچے گرا ہوا ہے اور بھائی جان کہہ رہے ہیں اُٹھو اسکول جانے کی تیاری کرو۔

دوست وہ جو وقت پر کام آئے

بدر عالم فاروقی۔

ایک تھکا ماندہ مُسافر ایک درخت کے سایے میں سو رہا تھا اچانک ایک شیر جنگل سے نکلا اور دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا۔ اسی لمحہ مسافر کا کُتّا دوڑتا ہوا آیا وہ زور سے شیر پر بھونکنے لگا اور اپنے آقا کو جگا دیا مُسافر نے جلدی سے اپنے کُتّے کو گود میں اُٹھایا اور درخت پر چڑھ گیا۔ شیر کو اپنے شکار کے کھو جانے پر بہت غُصّہ آیا اور درخت کے اِرد گرد چکّر لگاتا رہا۔ آخر نا اُمّید ہو کر جنگل میں چلا گیا۔ کُتّے نے اِس قدر اونچی آواز سے بھونک کر درحقیقت اپنے آقا کی جان بچائی (ترجمہ)

پریوں کا تحفہ

مس افسری مرزا مرتضٰی بیگ۔ اعظم گڈھ

ایک روز اختر اپنے باغیچے میں گلاب کے درخت کے پاس چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ آج اُس کا دل نہ لگتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس کے پاس کوئی خوب صورت چڑیا ہوتی جس سے وہ کھیلا کرتا۔ اتنے میں اسے پاس کے تالاب سے پانی اُچھالنے کی ہلکی ہلکی آواز سُنائی دی۔ اس نے نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ تین ننھّی ننھّی پریاں تالاب میں تیر رہی ہیں۔ اختر ڈرتا ڈرتا ان کے پاس گیا اور ادب کے ساتھ چُپ کھڑا ہو گیا۔ پریاں نہایت مُحبّت سے اختر کے ساتھ پیش آئیں۔ اس تالاب کے اندر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اس سے وہ اختر کو اندر لے گئیں۔ پہلے اُسے ایک بہت بڑا باغ نظر آیا۔ اس میں نارنگی سیب کیلا اور بہت سے اچھّے پھلوں کے خوب صورت درخت اور طرح طرح کے پھول تھے۔ اس کے بعد ایک اور کمرے میں لے گئیں جہاں اچھے اچھے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ اختر نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ پریوں نے اس کو محلوں اور باغوں کی سیر کرائی جن کو دیکھ کر اختر کو بہت تعجب ہوا۔ وہ اختر کو اس کمرے میں بھی لے گئیں جہاں بہت سی چڑیاں تھیں۔ اختر کو ایک نیلی سُنہرے تاج کی چڑیا بے حد پسند آئی۔ شام ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے اختر گھر جانا چاہتا تھا چلتے وقت پریوں نے وہی نیلی چڑیا اُسے تُحفے میں دی۔ اختر خوش خوش گھر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں شیر کو کھڑے ہوئے دیکھ کر گھبرا اُٹھا۔ اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ یہ معلوم کر کے کہ یہ سب خواب تھا وہ بہت حیران ہوا۔ چند دن بعد اُس کے ابّا سفر سے واپس آئے اور اُسے تحفے میں ویسی ہی نیلی چڑیا دی جیسی پریوں نے دی تھی۔ اب تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے دل میں کہا "پریوں نے مجھے یہی تحفہ دیا تھا"

مہربان شہزادی

ذاکر حسین ۔ برار

کسی زمانے میں ایک ویران محل میں ایک خوب صورت شہزادی رہتی تھی۔ محل کے قریب ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں طرح طرح کے خوب صورت پھولوں کے درخت تھے۔ یہاں شہزادی ہر روز ٹہلا کرتی تھی۔ ایک دن وہ ٹہل رہی تھی کہ جھاڑیوں میں سے ایک کوّا اُس کے سامنے اُڑ کر گرا۔ کوّے کا سارا بدن خون سے بھرا ہوا تھا اور تمام پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ شہزادی کو کوّے پر بہت رحم آیا وہ بولی "میں کس طرح تمھاری مصیبت دُور کر سکتی ہوں"

کوّے نے کہا "شہزادی صاحبہ میں حقیقت میں بدشکل جانور نہیں ہوں بلکہ ایک شہزادہ ہوں مجھ کو ایک بُری پری نے کوّے کی شکل میں بدل دیا۔ اور تمام کوّوں نے مجھ سے لڑکر میرے پروں کو نوچ ڈالا ہے۔ تم اگر میرے واسطے کچھ تکلیف اُٹھاؤ تو میں اچھا ہو سکتا ہوں۔ رات کو سوتے وقت اکیلی لیٹو اور جو کچھ دیکھو یا سُنو اس سے نہ ڈرو نہ بولو۔ اور اگر ڈر گئی یا کچھ بولوگی تو خرابی ہوگی"۔ شہزادی راضی ہوگئی۔ رات کو بچھونے پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی۔ مگر نہ سو سکی۔ آدھی رات کو کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر ہمت کرکے دیکھتی ہی رہی چند بدشکل اور خوفناک چڑیلیں کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ اُنھوں نے ایک پتیلی چولھے پر رکھ کر آگ جلادی جب پتیلی کا پانی اُبلنے لگا تو بھتنیاں شہزادی کو اس میں دھکیلنے کے لئے آگے بڑھیں۔ شہزادی نے آنکھ بند کرلی اور مُنہ سے ایک آواز بھی نہ نکالی اسی وقت باغ کے اندر مرغ نے ککڑوں کوں کہا۔ بھتنیاں غائب ہوگئیں۔ شہزادی لیٹی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کوّا اُڑکر کھڑکی کی طرف آیا اور کہا "شہزادی میں پہلے سے بہت اچھا ہوں۔ میں تمھاری تکلیف کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کرسکتا"۔ دو برس تک بے چاری شہزادی نے تکلیف اُٹھائی جب بھتنیاں اس طرح آتیں مُرغ بانگ دے دیتا اور بھتنیاں غائب ہوجاتیں۔ ایک روز کوے نے کہا "پیاری شہزادی تم کو ایک سال اور تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد میں ایک شہزادہ ہوجاؤں گا تم کسی جگہ نوکری کرلو"۔ شہزادی راضی ہوگئی اور نوکری کرنے لگی شہزادی کا آقا بہت سختی کرتا اور اُس سے سخت کام کرواتا۔ آخر اس کے ہاتھ سخت اور لال ہوگئے ایک روز چرخہ کاتنے بیٹھی اور اپنے ہاتھ کو افسوس کے ساتھ دیکھنے لگی۔ کچھ آواز سُن کر اُس نے پیچھے مڑکر دیکھا تو ایک خوب صورت نوجوان شخص کو قریب کھڑا دیکھا شہزادے نے کہا "میں وہی شہزادہ ہوں پیاری شہزادی تم نے میرے لئے تکلیف برداشت کی اور ان چڑیلوں سے آزاد کیا، اب تم میری ملکہ ہو چلو اسی محل میں ہم دونوں زندگی بسر کریں گے"۔ وہ دونوں واپس محل میں پہنچے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ بجائے ویران محل کے وہاں ایک خوشنما محل ہے۔ پھر وہ دونوں خوش خوش اُس محل میں زندگی بسر کرنے لگے

جیسی نیت ویسا پھل

احسان اسحٰق ڈوڈھی

ایک لکڑہارا جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں لاتا انھیں بیچ کر اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ایک بار اس کی کلہاڑی دریا میں گر گئی۔ غریب لکڑہارا دریا کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ اتنے میں ایک فرشتہ آسمان سے اُترا اور اُس سے رونے کی وجہ پوچھی۔ لکڑہارے نے سب حال بتایا فرشتے نے جھٹ دریا سے ایک سونے کا کلہاڑی نکالی اور کہا "یہی تمھاری کلہاڑی ہے؟" اس نے کہا "نہیں جناب یہ میری نہیں"۔ فرشتے نے پانی سے ایک اور چاندی کی کلہاڑی نکالی لکڑہارے نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتہ پھر پانی میں اُتر گیا اور ایک لوہے کا کلہاڑی لے آیا۔ لکڑہارے نے کہا "ہاں جناب یہی میری کلہاڑی ہے"۔ فرشتے نے کہا "تم ایماندار آدمی ہو تمھیں یہ تینوں کلہاڑیاں انعام میں دی جاتی ہیں۔ لکڑہارا بہت خوش ہوا اور انھیں بیچ کر امیر ہوگیا۔ اس بات کا چرچا شہر میں ہوا ایک چالاک آدمی نے سوچا "ہم بھی کچھ اور کما لائیں" اس نے ایک کلہاڑی دریا میں گرادی اور رونا شروع کردیا۔ فرشتے نے آکر پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے؟ اس نے جواب دیا میری کلہاڑی دریا میں گر پڑی ہے۔ فرشتہ جھٹ دریا میں سے ایک سونے کی کلہاڑی لے آیا۔ اُس آدمی نے کہا "ہاں ہاں جناب یہی میری کلہاڑی ہے"۔ فرشتہ اس کی مکاری کو سمجھ گیا اور بولا "لکڑہاروں کی کلہاڑی بھی سونے کی ہوتی ہے"۔ یہ سُن کر وہ شرمندہ ہوگیا اور نا اُمید ہوکر چلا گیا۔

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی اصلاح کے بعد

تارے

طیب رسول تمنا بلیاروی

یہ چھوٹے چھوٹے تارے — جگ مگ کرتے ہیں سارے
ہیں کیسے پیارے پیارے — یہ ننھے ننھے تارے
ہیں چمکیلے یہ تارے — ہیں روشن ان سے سارے
ان سے بھولے بھٹکے بے چارے — پاتے ہیں رستہ سارے

ہیں خوب ہی روشن تارے
بھاتے ہیں ہم سب کو سارے

میز کا پنکھا

ممتاز ظفر۔ عمر ۹ سال

پنکھا میرا چلنے والا — اپنے پنکھ سے ہلنے والا
پنکھا بولا بازو ہلا کر — کرتا کیا ہے مجھ کو چلا کر
میں بولا ہنس کر یوں اس سے — ٹھنڈی ہوا ہوں لیتا تجھ سے
جب میں چاہوں تجھ کو چلاؤں — اور جب بھی چاہوں ٹھہراؤں
تو بجلی سے چلنے والا — ٹھنڈی ہوا ہے دینے والا
پیتل کے ہیں پنکھ جو تیرے — بھاتے ہیں وہ دل کو میرے
تو پاتا نے میں پڑھتا ہوں — پنکھا چلوں مت کر میں پڑھتا ہوں
تو گرمی سے مجھ کو بچاتا — میرے پسینے کو ہے سکھاتا
گرمی میں آرام ہے دیتا — دم بھر بھی آرام نہ لیتا
تو ہے میرے دل کو پیارا — تیرا چلنا مجھ کو گوارا
تجھ سے میں سبق سیکھوں گا — میں بھی اپنا کام کروں گا

ڈبے میں میں تجھ کو رکھوں گا
ڈھکنا تیرے سر پہ دھروں گا

بارش وسبزہ

قمر نیما ہیڑہ

یہ رجھماتی بارش یہ لہلہاتا سبزہ
یہ مسکراتی بارش یہ کھلکھلاتا سبزہ
یہ راگ گاتی بارش یہ وجد کرتا سبزہ
یہ دھیمی دھیمی بارش یہ دل لبھاتا سبزہ

جنگل بھی اب ہرے ہیں تالاب بھی بھرے ہیں
دلچسپیوں کے میری سامان ہو رہے ہیں
نہریں بھری ہوئی ہیں ندیاں بھی چل رہی ہیں
اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں خوشیاں منا رہی ہیں

پودوں کی خوشیاں دیکھو پیڑوں کی خوشیاں دیکھو
انساں کی خوشیاں دیکھو حیواں کی خوشیاں دیکھو

سبزہ بھی ہر طرف ہے بوٹے بھی ہر طرف ہیں
پودے بھی ہر طرف ہیں اور پھل بھی ہر طرف ہیں

کوئل بھی خوب کوکے باغوں میں مور بولے
ان سب کے ساتھ مل کر گیت اک تو بھی گائے

آرزو

شہزادہ پرویز

اک جھیل کے کنارے سرسبز ، غیچہ ہو
اُس باغیچے کے اندر دارالمطالعہ ہو
اُس جا رکھی ہوئی ہوں دنیا کی سب کتابیں
اُن پر چڑھی ہوئی ہوں سونے کی صاف جلدیں
بکھرے پڑے ہوں میزوں پہ کچھ رسالے
ٹھنڈی ہوائیں جن کے اُلٹا رہی ہوں ورقے
انجیل اور گیتا قرآن بھی یہیں ہو
دُنیا ہے جس سے چمکی وہ شان بھی یہیں ہو
اس جھیل کے کنارے ہر شام کو میں جاؤں
اپنے تخیلوں کی دُنیا الگ بساؤں
لوں ہاتھ میں قلم اور گیت وہ سناؤں
ایسے ہوں گیت جن سے ہنسوں اور رلاؤں
کاغذ کی سرزمیں پر جب ناچے قلم میرا
ایسا وہ دُھن میں ناچے ہر شام سی سویرا

ہو جاؤں محو اتنا پرویز شاعری میں
ٹہنی پہ اپنی غنچہ ہنس کر مجھے جگادے

بہار

مشتاق مرزا ـ جماعت سوم جامعہ

دیکھ آئی بہار | کیسی چھائی بہار
بارش ہونے لگی | شاما گانے لگی
ہوا ٹھنڈی چلی دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

آہا بوندیں گریں | آہا کلیاں کھلیں
آہا شاخیں ہلیں | دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

سوندھی سوندھی سی بو | بولی کوئل وہ کو
چل! باغ کو تو | دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

پھول بھی ہیں ہزار | نہیں جن کا شمار
وہ چمک وہ نکھار | دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

آؤ پھرنے کو جائیں | گانا اچھا سا گائیں
مل کے خوشیاں منائیں | دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

چلو مشتاق اب | دیکھو آئی بہار
کیسی چھائی بہار

پچھلے دو مہینوں میں اُردو زبان کے دو مشہور ادیب اس دُنیا سے چل بسے۔ حضرت فانی بدایونی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ فانی بدایونی اُردو کے شاعر تھے۔ اور عظیم بیگ چغتائی اُردو نثر لکھنے والے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے بہت ذہین اور تیز تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوگئے۔ ابھی ایف۔ اے بھی پاس نہ کیا تھا کہ مصیبتوں اور پریشانیوں نے آگھیرا۔ باپ سے کسی بات پر ناچاقی ہوگئی اور یہ ایک الگ گھر میں رہنے لگے۔ اب رہنے سہنے کھانے پینے اور پڑھنے لکھنے کا خرچ انھی پر آپڑا تھا۔ یہ بڑی مایوسی کی حالت تھی اور کوئی ہوتا تو ہمت ہار جاتا اور پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھتا۔ مگر مرزا عظیم بیگ نے ہمت و استقلال سے کام لیا۔ مضمون اور کتابیں لکھ لکھ کر بیچتے اور اپنا خرچ چلاتے۔ بی اے پھر ال ال بی پاس کر کے جاورے میں وکالت شروع کردی اور یوں سمجھو کہ مصیبت کے بادل محض ان کی ہمت و استقلال کی بدولت چھٹ گئے

وکالت کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب لکھنے پڑھنے کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ وہ اُردو کے بہت بڑے مزاحیہ لکھنے والوں میں تھے۔ مزاحیہ یعنی ایسے مضمون جن میں مزاح یا ہنسی کی باتیں ہوں۔ تم نے پچھلے پرچوں میں سید ابو تمیم صاحب کا مضمون سکرٹری صاحب اور عیش صاحب کا مضمون رمضانی نے شہد نکالا۔ پڑھا ہوگا۔ بس اسی قسم کے مضمون۔ مزاحیہ کہلاتے ہیں۔ مرزا مرحوم کو ایسے مضمون لکھنے میں بہت مہارت تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُن کی زندگی کا سرمایہ یہی مزاحیہ مضمون ہیں۔ اُردو میں مزاحیہ نویسی کا رواج ابھی تھوڑے دنوں سے ہوا ہے۔ پھر بھی بہت سے اچھے لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں۔ جیسے رشید صدیقی صاحب۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ پطرس۔ شوکت تھانوی وغیرہ۔ ان میں سے بعض لکھنے والوں نے تو اتنا لکھا اتنا لکھا کہ ان کے مضمونوں میں یکسانی اور پھیکاپن پیدا ہونے لگا۔ مرزا عظیم بیگ نے خوب خوب لکھا ہے گھر کی پریشانیوں کی وجہ سے وہ کچھ مجبور بھی تھے

مگر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور اپنے مضمونوں کے معیار کو نیچے نہیں گرنے دیا

اُنھوں نے بہت تھوڑے دنوں میں مزاحیہ مضمون لکھنے کی اتنی مشق بڑھائی تھی۔ اُن کے بعض مضمون اور کتابیں تو ایسی ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً کولتار، مرزا کڑھلے انگوٹھی کی مصیبت وغیرہ وہ اُردو کی طرح ہندی بھی لکھتے تھے اور ہندی پڑھنے والوں میں بھی ایسے ہی مقبول تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا یا بات کا بتنگڑ اور سوئی کا بھالا بنانے میں مرزا مرحوم کو بہت کمال حاصل تھا۔ اکثر سنجیدہ مذاق میں کام کی بات کہہ جاتے تھے۔ کہیں کہیں تو خوب ہنستے پیدا کرتے تھے۔ لکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ چاہے کوئی کتنا ہی ضبط کرے ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شروع زمانے کی غیر معمولی محنت اور دماغی پریشانیوں کی وجہ سے اُن کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ بے چارے کو کبھی آرام و اطمینان سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ آہستہ آہستہ مرض نے دق اور سل کی شکل اختیار کر لی۔ پچھلے چار برسوں میں مرض بہت بڑھ گیا تھا ایسی حالت میں بھی جس طرح بھی بن پڑتا اُردو ادب اور اُردو زبان کی خدمت کرتے رہتے[۵]

مرزا مرحوم نے جوانی میں انتقال کیا۔ اُن کا لکھنے پڑھنے کا مشغلہ تو ابھی جوانی تک پہنچا بھی نہ تھا۔ پھر بھی اتنی تھوڑی مدت میں اور ایسی مسلسل پریشانیوں میں اُردو ادب کا جو ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر ہر شخص یہ کہنے پر مجبور رہو گا کہ انھوں نے جو کچھ کیا اپنی بساط سے بہت زیادہ کیا۔ مرحوم کو اس کا خود بھی احساس تھا۔ مرنے سے پہلے کہا کرتے تھے۔ میں دُنیا سے ناکام نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں نے جو کام بھی کیا اس میں مجھے کامیابی ہوئی مرزا مرحوم ۱۰ر اگست کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

[۵] اُنھوں نے بچوں کے لئے بھی ایک کتاب لکھی ہے "کیا اور کیوں" یہ نظامی پریس بدایوں میں چھپی ہے۔

ظریف قاتل

(خاور جبلپوری)

ایران کی بادشاہت دوسرے ملکوں کی طرح آسانی سے نہیں بدلتی۔ عموماً ایسے موقعوں پر بدامنی پھیل جاتی ہے اور قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔ گویا بادشاہ کے مرتے ہی ایرانی دنیا بالکل نئی ہوجاتی ہے۔ پھر نہ تو کوئی قانون سی باقی رہتا ہے۔ نہ قاعدہ نہ انتظام۔ ہر شخص آزاد اور خود مختار نظر آتا ہے۔ سارے حکام معزول اور فوجی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور جب تک دوسرا بادشاہ تخت و تاج سنبھال کر مفسدوں کی روک تھام فوج کا انتظام اور افسروں کی بحالی کا اعلان نہ کردے سارا ملک قیامت کا نمونہ بنا رہتا ہے۔

میں ایک روز سہ پہر کے وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار شہر سے باہر سیر و تفریح کے لئے نکلا اور سب کی صلاح سے یوشن تپہ کی طرف چلا۔
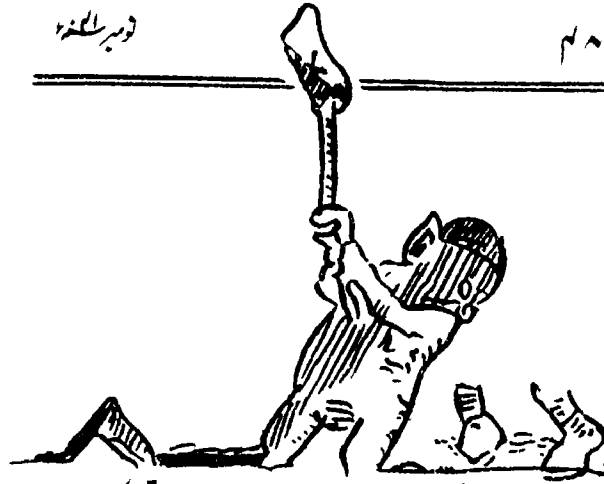
یوشن تپہ طہران سے پورب کی طرف اور کافی دور ایک پُرفضا مقام ہے جہاں ناصر الدین شاہ نے پہاڑ کی بلندی پر عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی ہیں بڑا سا باغ لگوایا ہے اور بہترین عجائب خانہ بنوایا ہے۔ دوسری طرف گھوڑ دوڑ کا وسیع میدان ہے جہاں ہر سال اعلیٰ حضرت خود تشریف لاتے ہیں اور بہت سے مرد عورت تماشا دیکھنے آیا کرتے ہیں۔

ہم لوگ یہاں پہنچ کر گھوڑوں سے نیچے اُترے اُنھیں ملازم کے سپرد کرکے باغ کے اندر داخل ہوگئے اور باغ کی خوب صورت نہریں، خوش نما پھولوں اور رسیلے پھلوں سے لدے ہوئے درختوں سے گذرتے ہوئے باغ کے درمیانی حصے تک پہنچ گئے۔ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ داروغہ نے قریب آکر سلام کیا اور کہا۔

"شاید آپ عمارتوں کے اندر جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں اگر کوئی حرج نہ ہو تو یہی ارادہ کرکے گھر سے آئے ہیں"

داروغہ:۔ معاف کیجئے گا اس وقت تو داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی بادشاہ سلامت شاہ عبد العظیم

کی زیارت سے فارغ ہو کر یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ نہ معلوم کس وقت چلے آئیں اور آپ کے ساتھ مجھے بھی ندامت اُٹھانی پڑے۔

جھٹپٹے کے وقت ہم باغ سے باہر آئے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور شہر کی طرف واپس لوٹے۔ لیکن پھاٹک کے قریب پہنچتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ تمام کوچہ و بازار سونے پڑے ہیں۔ کہیں کہیں دو ایک آدمی کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور ہماری طرف تعجب سے دیکھتے جاتے تھے۔

توپ خانے کے میدان تک ایک ایک کرکے سب ساتھی جدا ہوگئے اور مجھے تنہا آگے جانا پڑا۔ تھوڑی دور آگے چل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ناصریہ اسٹریٹ پر میرے ایک دوست جلدی جلدی قدم اُٹھائے ہوئے چلے آرہے ہیں اُنھوں نے سلام کیا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

"مرزا صاحب! یہ وقت اکیلے پھرنے کا نہیں ہے جلدی سے گھر پہنچ جائیے۔"

میں نے گھوڑا تیز کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب گھر پہنچا تو سب نے میری سلامتی پر مبارک باد دی اور مجھے بھی یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ بادشاہ کو قتل کر دینے کے بعد پچھلے دستور کے خلاف کوئی خاص گڑبڑ نہیں ہوئی۔

خیر سے گھر میں کھانے پینے کا معقول انتظام تھا رات خیریت سے گذری۔ صبح ہوتے ہی ایک ملازم کو اصلیت معلوم کرنے بھیجا اُس نے واپس آکر خوش خبری سُنائی کہ بادشاہ کا قتل ہو جانے پر بھی خلافِ معمول ایران میں امن قائم رہا۔

تفصیل پوچھنے پر اُس نے کہا۔

وزیرِ اعظم کی دانش مندی سے مُلک میں بدامنی نہ پھیلنے پائی۔ جس وقت ناصرالدین شاہ کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تو وزیرِ اعظم نے اُن کی موت چُھپا کر ولی عہد کو تار دے دیا اور جواب آنے کے بعد اُن کی بادشاہت اور اپنی وزارت کی برقراری کا سرکاری اعلان سارے شہر میں کرا دیا۔ اس لئے اب کسی بدامنی اور بے اعتدالی کا خوف باقی نہیں رہا۔

دوسرے واقف کار لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کل ناصرالدین شاہ، شاہ عبدالعظیم کے مقبرے کو زیارت کے لئے گئے تھے۔ جمعہ کا دن عام زیارت کے لئے ہوتا ہے اس دن مجمع بہت زیادہ تھا۔ یورپ کی سیر سے واپسی پر شاہ موصوف نے اپنا حفاظتی گارڈ موقوف کر دیا تھا حالانکہ وزیرِ اعظم نے اس کی مخالفت بھی کی اور عرض کیا کہ بادشاہ کو ہمیشہ حفاظت سے رہنا چاہیے۔ لیکن بادشاہ نے اس بات کو پسند نہ کیا۔

ٹھیک اس وقت جب وہ ہزاروں آدمیوں کے درمیان شاہ عبدالعظیم کی زیارت سے فارغ ہو کر

امام زادہ حمزہ کے مقبرے کی طرف جا رہے تھے ایک شخص سوداگروں کی وضع قطع میں آیا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

"حضور عالی انصاف چاہتا ہوں"

بادشاہ اس کی درخواست سننے کے لئے رک گئے اس نے عرضی نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نہایت اطمینان سے پستول نکال کر بادشاہ کے سینے پر دو فیر کر دئے۔ نشانہ کامیاب رہا وہ اسی وقت تڑپ کر ٹھنڈے ہوگئے۔ قاتل گرفتار کر لیا گیا لیکن وزیر اعظم کے حکم سے فوراً سارے مجمع کو مقبرے سے باہر نکال دیا گیا اور مشہور کر دیا گیا کہ بادشاہ کا صرف پیر زخمی ہوا ہے اور وہ زندہ ہیں۔

اس کے بعد ان کی نعش کو زندہ آدمی کی طرح بگھی میں بٹھا دیا گیا۔ وزیر اعظم قریب بیٹھ گیا اور پنکھا جھلتا رہا جس سے عام لوگوں کو ان کی موت کا یقین نہ ہو سکا۔

واقعی اگر وہ دانشمندی سے کام نہ لیتا تو اس موقع پر امن و امان قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا قاتل مشہور و معروف سید جمال الدین افغانی کا مرید مرزا رضا کرمانی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ مرزا رضا بابی تھے اور چونکہ شاہ مرحوم بابیوں کے سخت مخالف تھے اس لئے انھیں قتل کر دیا گیا۔

۲

ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد ہی اعلیٰ حضرت مظفر الدین شاہ تبریز سے طہران واپس آ گئے۔ بادشاہ کے قتل اور اس کے قاتل سے متعلق آئے دن نئی نئی خبریں اور افواہیں سننے میں آ رہی تھیں اور اس کے سزایاب ہونے تک ایران کے گوشے گوشے میں اسی دلچسپ موضوع پر اظہارِ خیالات کیا جا رہا تھا۔

قاتل کو شاہی قلعے میں قید کیا گیا۔ بہت لوگوں نے اس سے مختلف قسم کے سوالات کئے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس لئے کسی کی پرواہ نہ کرتا اور تحقیقات کے وقت کبھی خاموش رہتا کبھی سخت جواب دے دیتا اور کبھی ہنسی مذاق میں ٹال دیا کرتا تھا۔

بادشاہ کے قتل کی اصلیت معلوم کرنے کی ہر چند کوشش کی گئی مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

ایک دن ایک خواجہ سرا اس کے پاس پہنچا اور بہت ہی سخت و سست کہہ کر پوچھا کہ تو نے ایسی ذلیل حرکت کیوں کی۔

خواجہ سرا کو معلوم تھا کہ مرزا رضا جیل خانے میں ہے اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا

(باقی آئندہ)

جادو کی تصویریں

(انوار احمد ۔ لکھنؤ)

یہ دیکھو کھیل کا کھیل اور جادو کا جادو۔ ذرا ایک تو دیکھو کچھ زیادہ سامان کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف (۸) چھوٹی چھوٹی تصویریں تھوڑا سا کاغذ ایک سفید شیشہ اور تھوڑی سی لئی۔ تصویریں اگر رنگین ہوں تو بہت اچھا ہے۔ سائز یہی ۱" × ۱¼" مربع کاغذ کے دو ٹکڑے ہوں ۷ ۔ ۷ انچ کے اور شیشہ کوئی ۲½ ۔ ۲ انچ کا پہلے دونوں کاغذوں کو کھنچی ہوئی لائنوں پر موڑ دو۔ دونوں میں بیچ کے جو کالے خانے ہیں انھیں کاٹ کر نکال دو۔ جن جن خانوں میں تصویریں ہیں ان میں تصویریں چپکا دو اب بیچ والا خانہ رہ گیا جسے تم نے کاٹ کر نکال دیا ہے کرو یہ کہ دونوں کاغذوں کی دوسری طرف اس خانے کے چاروں طرف لئی لگاؤ اور شیشے پر چپکا دو۔ اس طرح دونوں کاغذوں کی پشتیں ایک ہی میں مل گئیں۔ دیکھا کیسی آسان ترکیب ہے۔ اب تمھارا کھیل بالکل تیار ہے۔

ہاں اس کھیل کی کرامتیں بھی سن لو۔ تم دونوں مڑے ہوئے کاغذوں میں سے صرف ایک کو کھولوگے تو چار کی جگہ تمھیں پانچ تصویریں نظر آئیں گی۔ چار تو کاغذ کے اوپر کی اور ایک شیشے کے نیچے کی اب تم اپنے دوستوں میں سے کسی کو یہ کھیل دکھاؤ اور اس سے کہو کہ وہ جس تصویر کو کہے گا درمیان میں آ جائے گی۔ اب وہ جس تصویر کو بتائے پہلے تم اسے شیشے پر موڑ دو یعنی دوسری تصویریں۔ اب اسے باتوں میں لگا کر شیشے کو پلٹ دو اور دوسرا کاغذ کھول کر دکھا دو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اس کی بتائی ہوئی تصویر بیچ میں ہے۔

شکار کرنے گئے، خود شکار ہو گئے

ایس۔ ٹی۔ عبدالجبار۔ مدارس

نویدِ عید ہے اس کی خوشی کا کیا کہنا
ہے باغ باغ ہر اک آدمی کا کیا کہنا

بہار پر ہیں چمن میں یہ لالہ و سنبل
شباب پر ہیں گلاب و جوہی کا کیا کہنا

چہک رہی ہے اِدھر عندلیب گلشن میں
چٹک رہی ہے اُدھر ہر کلی کا کیا کہنا

کئے ہیں زیبِ بدن سب لباس پاک و صاف
سبھی ہوں جس میں مگن اُس خوشی کا کیا کہنا

اب عید گاہ سے پھر میلے جائیں گے بچے
عجیب لُطف ہے اس دل لگی کا کیا کہنا

کھلونے اُمّی کو دِکھلا رہا ہے لا لا کر
کھِلا سا جاتا ہے اِس ننھے جی کا کیا کہنا

فقیر آس لگائے ہزاروں بیٹھے ہیں
جو دے گا راہِ خُدا اُس سخی کا کیا کہنا

ہزاروں عیدیں مُبارک ہوں تم کو اے بچّو
رقی کی ہے یہ خوشی اس خوشی کا کیا کہنا

عزیز بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔ رمضان شریف خیریت سے گذر گئے عید آئی اور چلی گئی۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ رسالہ تمھیں عید کے دن ملے۔ مگر قانونی پابندیوں کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ہماری طرف سے دیوالی اور عید کی مبارک باد قبول کرو۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب کے دونوں تیوہار ایک ہی مہینے میں آکر پڑے۔ تمھیں ایک خوش خبری سنائیں۔ بہت اچھی خوش خبری!!! تمھاری آپاجان کوئی ایک سال کے بعد پھر جامعہ میں واپس آگئیں۔ انھیں لڑائی کی وجہ سے حکومت نے پونا میں نظر بند کر دیا تھا وہ تم سب کو سلام کہتی ہیں اور اس بات سے بہت ہی خوش ہیں کہ اس عرصے میں اکثر اپنے خطوں میں تم اُن کی خیریت پوچھتے رہے۔ تم اُنھیں مبارک باد کا خط بھیجنا چاہو تو پیام تعلیم کی معرفت بھیجنا۔

روس اور جرمنی کی لڑائی اس مہینے بھی پورے زوروں سے جاری رہی۔ جرمنی نے روس کے بہت سے شہر فتح کر لئے۔ لینن گراڈ پر ابھی قبضہ تو نہیں ہوا ہے مگر روسی فوجیں آہستہ آہستہ کمزور پڑ رہی ہیں۔ ادھر جرمنوں نے روس کے دارالسلطنت ماسکو کو بھی گھیرے میں لے لیا ہے اور حالت بہت ہی خطرناک ہے۔ حکومت کے دفتر وغیرہ بھی ماسکو سے دوسرے شہر قازان چلے گئے ہیں۔ انھیں ابھی تک انگلستان اور امریکہ سے کوئی مدد نہیں مل سکی ہے۔ پھر بھی اُن کے دل نہیں ٹوٹے ہیں اور اپنے وطن کی حفاظت میں بڑی بہادری کے ساتھ جانیں قربان کر رہے ہیں۔

ادھر یورپ میں جاپانی فتنہ پھر کچھ کچھ جاگتا معلوم ہوتا ہے وہاں کی وزارت بھی بدل گئی ہے اور جو شخص وزیرِ اعظم بنا ہے وہ انگریزوں کا پرانا دشمن ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جاپان روس کی شکست کا انتظار کر رہا ہے۔ روس ہار گیا تو وہ سائبریا سے اُس پر حملہ کرے گا روس بھی اس بات کو جانتا ہے اُس نے سائبریا میں بہت سی فوجیں بھیج دی ہیں۔ علاوہ اس کے چین میں جاپان کے خلاف نئی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں بھی غالباً روس ہی کا اشارہ ہے۔

شاہ ایران کو انگریزوں نے ایران سے باہر کسی دوسرے ملک میں بھیج دیا۔ انگریزی اخبار اُن پر طرح طرح کے الزام لگا رہے ہیں حالانکہ یہی اخبار لڑائی سے پہلے اُن کی تعریفوں کا پل باندھ دیتے تھے۔

اس مرتبہ بچوں کی نظموں کے بارے میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کو شکائتیں ہیں ایک تو یہ کہ بار بار لکھنے پر بھی بچے دوسروں کی نظمیں

اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں۔ دوسرے جو کچھ لکھتے ہیں بہت لاپرواہی سے لکھتے ہیں۔ اتنی غلطیاں ہوتی ہیں کہ انھیں ٹھیک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد پیامِ تعلیم کے صفحے بھرنا نہیں ہے۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نیّر صاحب کو شعر کے شعر اپنی طرف سے بڑھانے پڑیں۔ ہماری خواہش تو یہ ہے کہ جن پیامیوں کی طبیعت موزوں ہے اور شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی ہمّت بڑھائی جائے اور انھیں آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ نثر کے مضمون بھی ہمارے پاس بے شمار آ رہے ہیں اُن میں بھی زیادہ تر کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہم بہت دنوں سے اپنے پیامیوں سے کہہ رہے ہیں کہ لکھنے کی باتیں علاوہ کہانیوں کے اور بھی ہیں ہم انھیں یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ سب مضمون پیامِ تعلیم میں تو چھپ نہیں سکتے۔ بعض مضمون دو دو سال سے ہمارے پاس رکھے ہیں۔ اور ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ اگر پیامی مضمون کے ساتھ ۱؎ کے ٹکٹ بھی رکھ دیا کریں تو اصلاح و مشورے کے بعد واپس کر دیے جائیں۔

پچھلے سال لکھنؤ کے پیامیوں نے اپنے قلمی رسالے جگاؤ کا سالنامہ چھپوایا تھا۔ اب اسی قسم کی کوشش حیدر آبادی بچوں نے کی ہے اور ادب کے نام سے اپنے پرچے کا سالنامہ بہت سلیقے سے شائع کیا ہے۔ اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر عزیزی معین الدین انصاری اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"........ ہم نے بھی مدرسۂ عالیہ کے طلبار کی ایک چھوٹی سی برادری بنائی ہے اور یہ رسالہ اسی برادری کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔ ہم اس برادری کو پیام برادری کی شاخ بنانا چاہتے ہیں ..... ہم نے اپنے سالنامے میں فہرست مضامین پر پیام برادری کا مونوگرام (جاگو اور جگاؤ) بھی اُتارا ہے" رسالے میں مضمون سب بچوں کے ہیں لیتھو کی تصویریں بھی انھی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں لکھائی چھپائی ترتیب غرض ہر چیز میں اہلیت اور سلیقے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ہم اس کامیابی پر اپنے عزیزوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک کوشش پندرہ روزہ رسالہ پیامی (بنارس) بھی ہے۔ یہ اچھا خاصا نکلتا ہے مگر لکھائی چھپائی اور مضامین میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے۔ ہمارے خاص مضمون نگار جناب سید عروج الحسن صاحب پیامِ تعلیم کے پچھلے معموں کو (حل سمیت) کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ کتاب میں ایسی ہدایتیں بھی ہوں گی جن کی وجہ سے کوپن بھرنے اور الفاظ کے صحیح استعمال کرنے میں بہت مدد ملے گی علاوہ اس کے آئندہ معموں میں کسی پچھلے معمے کا اشارہ ہوگا تو اسے سمجھنے میں بھی سہولت ہوگی۔ عروج صاحب کی خواہش ہے کہ اس کا نام تم ہی تجویز کر دو۔ مگر جلد۔

جو بچے پیامِ تعلیم کے خریدار نہیں ہیں وہ ہم سے اکثر معمے کے کوپن منگاتے رہتے ہیں۔ یہ کوپن اکثر اُن کے پاس دیر میں پہنچتے ہیں اور انھیں حل صحیح وقت پر بھیجنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس مشکل کو دُور کرنے کی ایک ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ ان کا انعام (ایک دفعہ میں) اگر ۴؎ بھی آ جائے تو پیامِ تعلیم ایک سال کے لئے اُن کے نام جاری کر دیا جائے (پیامِ تعلیم کی اصلی قیمت ۴؎ ہے)

اُمید ہے کہ پیامی اس تجویز کو پسند کریں گے (محمد حسین حسّان)

معمّا نمبر ۲۴

پہلا انعام - ۶ ؍
دوسرا انعام - للعہ ؍

مشقی کوپن

٦ خ	٥	■	٤ ک	٣ ر	ا	٢ ب	١ م
ط	■	٩ د		٨ ں	■		٧ ا
و	ق	١٢	■	ب	١١	ر	١٠
	■	و	١٤	■	س	١٣	■
■	ن	ا		١٧	١٦ ر	■	١٥
٢٠	■	ل	■	ب	ا	١٩	١٨ ح
ا	■		٢٢ ن	ا		ر	٢١ ب
م	٢٥	■		٢٤	■		٢٣ ت

دائیں سے بائیں

(۱) مسلمانوں کو عید اور ہندوؤں کو دلوالی ۔۔۔۔ ہو
(۵) لفظ بمعنی برف
(۷) ا بار
(۸) ۔۔۔ آئی عید آئی دیکھئے
خوش ہوئی ساری خدائی دیکھئے — نیّر
(۱۰-۱۲) اُلٹا
(۱۲) ہمیں ۔۔۔ اُمید ہے کہ آپ معمّوں سے اپنی دلچسپی قائم رکھیں گے (بے ترتیب)
(۱۳) بے سوچے سمجھے ر ۔۔ اچھی نہیں۔
(۱۴) چھوٹے سے بھی ۔۔ سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔
(۱۶) اس لفظ کا اطلاق سوائے خدا کے کسی اور پر جائز نہیں ہے۔
(۱۸) عام طور پر طلبہ اس مضمون سے گھبراتے ہیں۔
(۲۱) روس میں کافی علاقہ ۔۔۔۔۔ ہے۔
(۲۳) چھوٹے بچے کھیل میں چھپ کر جب سامنے آتے ہیں تو یہ لفظ کہتے ہیں
(۲۴) پتھر کی مورت
(۲۵) چھوٹے بچے ہم عمر بچوں میں کھیلنا پسند کرتے ہیں۔

اوپر سے نیچے

(۱) ایک ہی ۔۔۔ میں ہندو اور مسلمانوں کے خوشی کے بڑے تہوار پڑ جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جلد اتحاد ہو جائے گا۔
(۲) دیکھئے روس کے بعد کس کی ۔۔۔ آتی ہے۔
(۳) اگر لڑکوں پر اُستاد کا صحیح ۔۔۔ نہیں تو وہ ان کو پڑھا نہیں سکتا
(۴) اس معمّے ۔۔ کامیابی صرف چار الفاظ پر منحصر ہے۔
(۶) اپنے اعزا اور احباب کے ۔۔۔ کا جواب نہ دینا بد اخلاقی ہے۔
(۹) نظر نہ آئی اسے رات جب کہیں کالی
چراغ لے کے چلی ڈھونڈنے کو ۔۔۔۔۔ — بیزد
(۱۱) یہ اکثر تباہی کا باعث ہوتا ہے
(۱۴) چھوٹے سے بھی تو کے بجائے ۔۔ سے بات کرنا چاہئے
(۱۵) کیوں کر ممکن ہے کہ ۔۔۔ اپنا اثر نہ کرے۔
(۱۷) انسان کی زندگی ۔۔۔ کی مانند ہے۔
(۱۹) فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر ۔۔۔ ملتا نہیں
(۲۰) یہ ایک ۔۔۔ خیال ہے کہ انسان کی عزت پیسے سے ہے
(۲۲) جنگ کی وجہ سے ہتھیاروں میں ۔۔۔ نئی ایجادیں ہو رہی ہیں

قواعد

۱۔ تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصّہ لے سکتے ہیں۔

۲۔ ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ آٹھ حلوں کی ۶ر ہے۔

۴۔ دونوں انعام تقسیم کردیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۵۔ تمام حل ۲۰ر نومبر تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی میں پہنچ جانے چاہئیں۔

۶۔ اڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۷۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۹۔ ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں

۱۰۔ دالؔ اور ڈالؔ کا نمایاں فرق ہو (دؔ - ڈؔ)

۱۱۔ چھوٹی اور بڑی ےؔ کا فرق لازمی ہے۔ (یؔ - ےؔ)

۱۲۔ جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو۔ وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے۔

۱۳۔ املا کی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

(۱۴) حلوں کے بارے میں شکایتی خطوں کے لئے جوابی کارڈ یا ایک ٹکٹ آنے چاہئیں۔ شکایت ٹھیک ہوئی تو اُن کے پیسے انعام میں شامل کرلئے جائیں گے ورنہ اطلاع مل جائے گی۔

۱۵۔ **پتہ**:- سب اڈیٹر۔ "پیام تعلیم" مکتبہ جامعہ (قرول باغ - نئی دہلی)

معمّا نمبر ۲۳ کا صحیح حل

۱ پ	ہ	۲ ل	د	۳ ی	■	۴ ا	۵ ب
ٹ	■	۶ ت	ا	و	■	■	و
۷ ہ	۸ ر	■	۹ ب	ن	۱۰ گ	۱۱ ا	ل
۱۲ ن	ہ	۱۳ ی	ن	■	۱۴ ر	ز	و
۱۵ ے	ن	ا	■	۱۶ ت	ے	ل	■
■	■	۱۷ س	۱۸ ن	■	■	■	۱۹ ط
۲۰ م	۲۱ د	■	ب	■	۲۲ ر	۲۳ د	ی
۲۴ ت	ح	ر	ی	ک	■	۲۵ ا	ن

صحیح حل — انعام اوّل — فی کس ے ر

(۱) سید وزیر حیدر۔ دہلی

(۲) محمد ضیاء الدین۔ ناگپور

ایک غلطی — فی کس ۵ ر

(۱) نصیر حسن۔ دہلی

(۲) حمیدہ بیگم ۔ ״

(۳) محمد نظیر الحسن۔ مونگیر

(۴) محمد اقبال صدیقی۔ گنگاوتی

(۵) سید نسیم رضا۔ دہلی

(۶) سید محمد احمد۔ فتح پور

(۷) حبیب انصاری۔ لکھنؤ

(۸) احمد منظور الحق۔ حیدرآباد دکن

(۹) سید ریاست عباس۔ دہلی

(۱۰) مصطفیٰ علی۔ بمبئی

پچھلے معمے میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اِس مرتبہ بہت احتیاط کی گئی ہے۔ حل دیکھتے وقت اِس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

معما نمبر ۲۴　　**کوپن نمبر**

۶ خ	۵	■	۴ ک	۳ ر	ا	۲ ب	۱ م
ط	■	۹ د		۸	■		۷ ا
و	ق	۱۲	■	ب	۱۱ ر		۱۰
	■	و	۱۴	■	س	۱۳	■
■	ن	ا		۱۷	۱۶ ر	■	۱۵
۲۰	■	ل	■	ب	ا	۱۹	۱۸ ح
ا	■		۲۲ ن	ا		ر	۲۱ ب
م	۲۵	■		۲۴	■		۲۳ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۴　　**کوپن نمبر**

۶ خ	۵	■	۴ ک	۳ ر	ا	۲ ب	۱ م
ط	■	۹ د		۸	■		۷ ا
و	ق	۱۲	■	ب	۱۱ ر		۱۰
	■	و	۱۴	■	س	۱۳	■
■	ن	ا		۱۷	۱۶ ر	■	۱۵
۲۰	■	ل	■	ب	ا	۱۹	۱۸ ح
ا	■	ن	ا			ر	۲۱ ب
م	۲۵	■		۲۴	■		۲۳ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۴　　**کوپن نمبر**

۶ خ	۵	■	۴ ک	۳ ر	ا	۲ ب	۱ م
ط	■	۹ د		۸	■		۷ ا
و	ق	۱۲	■	ب	۱۱ ر		۱۰
	■	و	۱۴	■	س	۱۳	■
■	ن	ا		۱۷	۱۶ ر	■	۱۵
۲۰	■	ل	■	ب	ا	۱۹	۱۸ ح
ا	■		۲۲ ن	ا		ر	۲۱ ب
م	۲۵	■		۲۴	■		۲۳ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۴　　**کوپن نمبر**

۶ خ	۵	■	۴ ک	۳ ر	ا	۲ ب	۱ م
ط	■	۹ د		۸	■		۷ ا
و	ق	۱۲	■	ب	۱۱ ر		۱۰
	■	و	۱۴	■	س	۱۳	■
■	ن	ا		۱۷	۱۶ ر	■	۱۵
۲۰	■	ل	■	ب	ا	۱۹	۱۸ ح
ا	■		۲۲ ن	ا		ر	۲۱ ب
م	۲۵	■		۲۴	■		۲۳ ت

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

ایک معلّم کی زِندگی

نومبر ۱۹۴۱ء کے آخر میں شائع ہو جائے گی

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ ہر ایک جلد تقریباً پانچ سو (۵۰۰) صفحوں کی ہے اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں۔ چونکہ کل ضخامت ایک ہزار صفحے ہو گئی ہے اس لئے مکمل سٹ کی قیمت للعہ کے بجائے صہ کر دی گئی ہے۔

کتابی سائز ۲۰×۳۰/۱۶

یہ کتاب عبدالغفار صاحب مدہولی کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور رواں تاریخ بھی ہے اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ بھی۔ یقین ہے کہ بچے اور بڑے دونوں اسے دل لگا کر پڑھیں گے۔

اب تک جن حضرات سے مبلغ للعہ وصول ہوئے تھے ان سے زائد مطالبہ نہ کیا جائے گا اور محصول ڈاک بدستور معاف رہے گا۔ نیز جن کے آرڈر وی پی کے لئے آچکے ہیں اُن سے بھی کتاب کی قیمت للعہ ہی لی جائے گی۔ البتہ محصول ڈاک خود اُن کے ذمے ہو گا۔

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

REGD. NO. L. 1961

نومبر ۱۹۴۱ء

پیام تعلیم

قطب مینار

مرسلہ عبدالشافی اعظم گڑھ
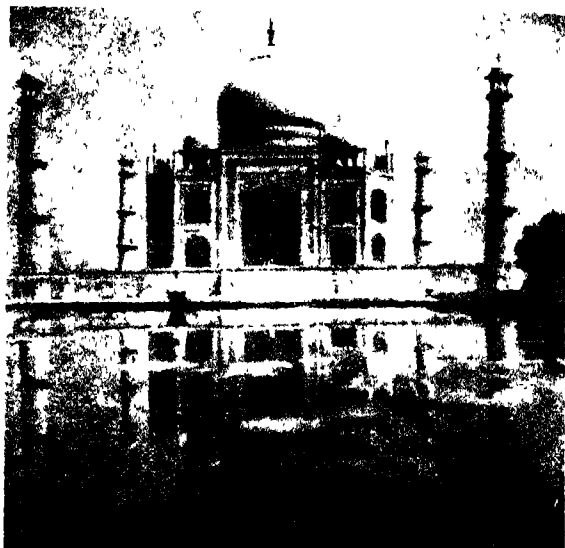
عکس

مرسلہ علی عباس لکھنوی

مقبرہ اعتماد الدولہ آگرہ

مرسلہ محمد انس اعظم گڑھ

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

کیا مصیبت ہے

آغا سلیم دہلی
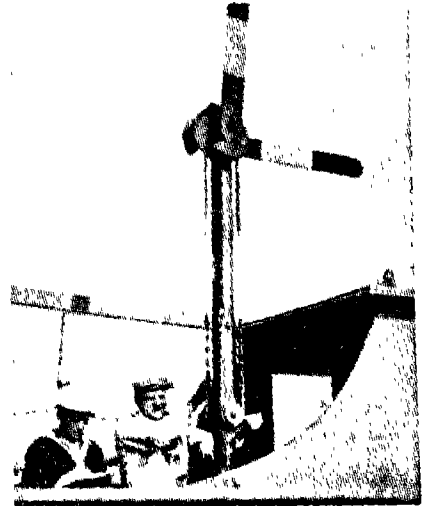
پیام رسانی ایک جہاز سے دوسرے جہاز کو
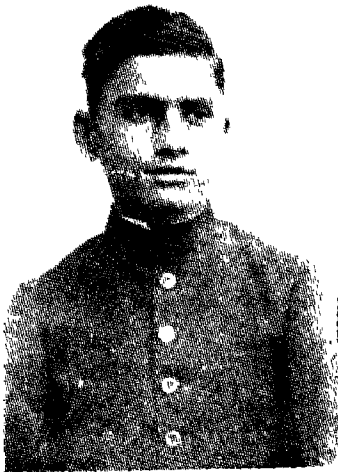
محمد الدین سوجد بدایوں

پیام تعلیم ۔ دہلی ، یوپی ، سی پی ،
قلات ، بنگال ، برار ، اندور ، میسور ، حیدرآباد اور پنجاب
کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے

پیام تعلیم
دہلی

قیمت سالانہ عہ ۔ فی پرچہ ۳
ایڈیٹر محمد حسین حسان

جلد ۲۴ | فہرست مضامین ☆ دسمبر ۱۹۴۱ء | نمبر ۱۲

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی ۔ محبوب المطابع پریس دہلی

پیام تعلیم کا اگلا پرچہ سال گرہ نمبر ہوگا۔ یہ ۲۸ دسمبر کو چھپے گا اور جنوری کی پہلی تاریخ کو پیامیوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ہم اس کی تیاری کے لئے بہت اہتمام کر رہے ہیں مگر کاغذ کے دام روزانہ بڑھ رہے ہیں تصویروں کا کاغذ بھی سے نایاب ہے۔ یہی دو چیزیں پرچے کی خوش نمائی کے لئے ضروری ہیں۔ باوجود اس کے ہم اپنی طرف سے پرچے کو خوشنما اور دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کریں گے۔

سالنامے کے سلسلے میں پیامیوں کے مضمون اور نظمیں آنی شروع ہوگئی ہیں۔ ان نظموں اور مضمونوں کے پہنچنے کی آخری تاریخ دس دسمبر ہے۔ مضمون بہت محنت سے لکھا ہوا ہو اور بہت صاف اور خوش خط ہو، اسی طرح نظمیں بھی بہت صاف صاف لکھی ہوئی ہوں۔

مضمون اگر جغرافیے، سائنس وغیرہ پر ہوں گے تو ان کے چھپنے کا زیادہ امکان ہے۔ جغرافیے میں سیر وسفر، پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں، سمندروں جھیلوں وغیرہ کے حالات، مختلف ملکوں کے لوگوں کا رہن سہن، غرض سبھی چیزیں آسکتی ہیں۔ کہانیوں کے چھپنے کا سب سے کم امکان ہے۔

اب تک تم ہمیں دہلی یا نئی دہلی کے پتے سے خط لکھتے تھے۔ اب ڈاک خانے والوں نے پتہ بدل دیا ہے۔ یعنی پہلے پتہ لکھنے کے بعد دہلی آخر میں لکھا جاتا تھا اب پہلے دہلی لکھا جائے گا پھر قرول باغ مثلاً اس طرح۔

منیجر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ
دہلی - قرول باغ

اب جو منیجر پیام تعلیم کو یا ہمیں خط لکھو تو اس پتے کا خیال ضرور رکھنا نہیں تو خط یہاں بہت دیر میں ملے گا۔ اچھا بھئی اب تم نئے سال کی خوشی میں اپنے پیام تعلیم کو کیا تحفہ دوگے اگر ہر ایک پیامی ایک ایک خریدار اس مہینے کے آخر تک فراہم کر دے تو اس وقت خصوصاً یہ اس کے لئے بہترین تحفہ ہوگا۔

جامعہ کی زندگی

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر

قوم کی خدمت سکھائے جامعہ کی زندگی
خواب غفلت سے جگائے، جامعہ کی زندگی

کوہِ فاراں پر سُنا تھا جو ترانہ قوم نے
پھر وہی نغمہ سُنائے جامعہ کی زندگی

قوم مردہ میں ہو پیدا اتّحاد و ضبط و نظم
یہ مسیحائی دکھائے جامعہ کی زندگی

سادگی اطوار میں پیدا عروج افکار میں
مشق کچھ ایسی کرائے جامعہ کی زندگی

لُطف جب ہے قوم کی مایوسیاں کافور ہوں
گر کوئی ایسا بتائے جامعہ کی زندگی

پھیل جائے ہر طرف علم و ہنر کی روشنی
جوت کچھ ایسی جگائے جامعہ کی زندگی

اُمّتِ واحد کے سارے تفرقے ہو جائیں دور
فرقہ بندی کو مٹائے جامعہ کی زندگی

طبقۂ نسواں بھی ہے تعلیم کا محتاج آج
اِس حقیقت کو سُجھائے جامعہ کی زندگی

عزم و استقلال سے پھر کام لیں افرادِ قوم
کچھ سبق ایسا پڑھائے جامعہ کی زندگی

حالیؔ و اقبالؔ و شبلیؔ جوہر و سیّد کی مثل
نوجواں اپنے بنائے جامعہ کی زندگی

اے خدا مقبول ہو نیرؔ کے دِل کی یہ دُعا
قوم کی بگڑی بنائے۔ جامعہ کی زندگی
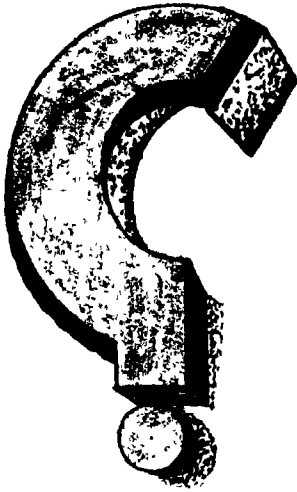
ماں

رعنا اکبرآبادی ۔ آگرہ

تم کو معلوم ہے ماں کا رُتبہ
دُکھ اُٹھا کر تمھیں پالا اُس نے
کبھی جھولے میں جُھلایا تُم کو
تم نے جو بات کہی مان گئی
لوریاں دے کے سکھائیں باتیں
ماں سے تُم نے یہ سلیقہ سیکھا
بولنا تُم کو سکھاتی نہ اگر
نیک ہر کام سکھایا ماں نے

اُس کی آغوش اماں کا رُتبہ
تُم جو مچلے تو سنبھالا اُس نے
کبھی سینے پہ بٹھایا تم کو
پیار کی بات پہ قربان گئی
اچھی اچھی تمھیں آئیں باتیں
پاؤں چلنے کا طریقہ سیکھا
پڑھنا، لکھنا تمھیں آتا کیوں کر
آدمی تُم کو بنایا ماں نے

ماں کے رُتبے کا سدا دھیان رہے
یاد ہر وقت یہ احسان رہے

پانی پیتے ہی مدکی صاحب یکایک چھوٹے ہونے لگے۔ پہلے اُن کے پیر سکڑنے لگے پھر پیٹ، پھر سر پھر پُورا بدن ...... اور دیکھتے دیکھتے وہ اسی مکڑے کے برابر ہوگئے۔ پھر جس دروازے سے مکڑا آیا تھا یہ اندر چلے گئے۔ اب مکڑے نے تھوڑا سا پانی جُمّا کو دیا۔ جُمّا نے ثریا کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور سب پانی پی گئے۔ پانی کا پینا تھا کہ اُن کی پتلی سی ٹانگیں، دم، بدن اور سر سب سکڑنے لگے اور یہ اُس مکڑے سے بھی چھوٹے ہوگئے جُمّا کی یہ حالت دیکھ کر ثریا کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چھوٹا سا جُمّا اب اُس کے گھٹنوں برابر زمین پر کھڑا تھا۔ ثریا بے اختیار بہت زور سے چیخی "جُمّا ...... جما ...!!"

پہلے تو جمّا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اپنے چھوٹے ہاتھوں سے ثُریا کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا "نہیں بی ڈرو نہیں"۔ جُمّا کی بہت باریک سی آواز آئی۔ ثریا نے اپنے کان اُن کے مُنہ سے اور قریب کر لئے۔ "تم ڈر کیوں رہی ہو۔ شاہ کے محل میں جانے کے لئے ہر ایک کو یہ عرق پینا پڑتا ہے"۔ اُن کی آواز اتنی باریک تھی کہ ثریا پھر بھی پُوری طرح نہ سُن سکی وہ اور جھک گئی۔ "اُس کے پینے سے تمھیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ پھر جب ہم لوگ وہاں سے واپس آئیں گے تو دُوسری قسم کا عرق پی کر پہلے جیسے بڑھ جائیں گے۔ لو اب ذرا تم بھی جلدی سے پی لو دیکھو مدکی صاحب چلے گئے"۔

ثُریا نے ڈرتے ڈرتے گلاس کا تھوڑا سا پانی پی لیا اور تھوڑی دیر میں وہ جمّا کے برابر ہوگئی۔ مگر جُمّا پھر بھی قد میں اُس سے چھوٹے ہی رہے۔ اُس نے جو بولنے کی کوشش کی تو اُس کی آواز پہلے سے بہت مہین ہوگئی تھی۔

ثریا:۔ جُمّا! ہم لوگ جیسے پہلے تھے ویسے ہی پھر ہو جائیں گے نا؟

جُمّا:۔ ہاں بھئی ہاں۔ اگر تُم چاہو تو ابھی فوراً دُوسرا عرق پی کر پہلے جیسی ہو سکتی ہو"۔ پھر ثُریا کی اُنگلی پکڑ کر بولے "چلو چلو اب محل میں چلیں"۔

مسٹر جمّا ثریا کو اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے ۔ اور ایک لانبے راستے سے گذرتے ہوئے بڑے ہال میں پہنچے ۔ ہال کے دروازے پر دو دربان چھوٹے چھوٹے بھالے لئے کھڑے تھے ۔ اُن کی وردی بالکل لال تھی ۔ سروں پر سرکس کے مسخروں جیسی سیاہ لانبی ٹوپیاں تھیں یہ دیکھنے میں آدمی کی طرح معلوم تو ہوتے تھے مگر ایک کی شکل طوطے جیسی تھی اور دوسرا بالکل بطخ کی طرح تھا ۔ ان دربانوں نے ثریا یا مسٹر جمّا سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی ۔ اپنے بھالوں کو انھوں نے قینچی کی طرح ہال کے دروازے پر لٹکا رکھا تھا گویا دروازہ بند کر رکھا تھا انھیں آتے دیکھ کر اپنے بھالے سیدھے کر لئے ۔ دروازہ کھل گیا اور یہ دونوں اندر پہنچ گئے

ہال کافی لانبا چوڑا اور بہت اونچا تھا اس کی دیواریں آئینے کی طرح چمک رہی تھیں ۔ دیواروں میں جگہ جگہ چڑیوں کے رنگ برنگ کے خوب صورت پر بہت قرینے سے سجے تھے ۔ ہال کے آخری سرے پر چبوترے جیسی ایک اونچی جگہ تھی ۔ اس پر بہت خوب صورت قالین بچھا تھا چبوترے پر جانے کے لئے بیچ میں ایک سنہری سیڑھی تھی ۔ سیڑھی کے دونوں طرف ادھر اُدھر پانچ چھ لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے کرسیوں پر بیٹھے تھے بہت سی کرسیاں خالی بھی پڑی تھیں ۔ چبوترے پر ٹھیک بیچ میں ایک اونچا تخت تھا ۔ تخت کیا تھا بس ثریا کی آپا کے ڈرائنگ روم جیسی بہت ہی نفیس کوچ تھی تخت بالکل سبز رنگ کا تھا ۔ اس میں سنہری رنگ کے بہت سے پتھر چم چم کر رہے تھے ۔ اس پر شاہ بیٹھے تھے ۔ اُن کی صورت ایسی نرالی تھی کہ ثریا انھیں دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی ۔ سر پر سیاہ رنگ کا تاج تھا اور اس میں بہت سے ہیرے جواہرات لگے تھے ۔ اُن کی آنکھوں پر عینک تھی ۔ اور چہرے پر لال رنگ کی گھنی داڑھی جو بیچ سے ادھر اُدھر بٹی ہوئی تھی ۔ سیاہ رنگ کا عبا پہنا تھا اس کی وجہ سے یہ اور بھی بدصورت نظر آ رہے تھے ۔ اُن کے دونوں طرف دو لڑکیاں تھیں اُن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں ۔ شاہ کے پیچھے ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا حبشی مورچھل جھل رہا تھا ۔ تخت کے ارد گرد اچھی اچھی کرسیوں پر اور دوسرے لوگ تھے جو صورت اور لباس سے شہزادے معلوم ہوتے تھے ہال کے بیچ میں فرش پر ایک گول دائرے میں خوب صورت خوب صورت رنگوں کی بہت سی تتلیاں ناچ رہی تھیں ۔ ہلکے ہلکے کوئی گیت بھی گاتی جاتی تھیں ۔ ان کے بازوؤں پر دو اچھے اچھے ڈینے تھے اور یہ نیلے رنگ کا ریشمی لباس پہنے تھیں ۔ مسٹر جمّا نے ہال میں آتے ہی اپنی نظریں نیچی کر لیں اور تخت سے دور فرش پر ایک کرسی پر بیٹھ گئے ثریا بھی اُن کے پاس ہی بیٹھ گئی تتلیوں کا گانا بڑا نرالا تھا ۔ اپنے ڈرائنگ روم میں اُس کی بلقیس آپا نے ریڈیو میں روشنی جلا کر کتنی بار اُسے طرح طرح کے گانے سُنائے تھے مگر ان تتلیوں کا گانا تو عجیب طرح

کا تھا۔ کبھی زور سے کبھی آہستہ اور کبھی خوب زور سے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس قسم کا گیت ہے۔ ثریا کے پاس ہی ایک خوب صورت جھینگر بیٹھا تھا اُس کے دونوں پر بالکل سُرخ تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ یہ بھی ان تتلیوں کی طرح آہستہ آہستہ کوئی گیت گا رہا تھا۔ اپنا کاغذ بھی دیکھتا جاتا تھا۔ ثریا نے اُس کا گیت غور سے سُنا تو اس کا اور تتلیوں کا گانا ایک سا معلوم ہوا۔ ثریا نے آہستہ سے جمّا سے پُوچھا۔ "یہ کون ہیں جمّا؟"

جمّا:۔ یہ نان تین صاحب ہیں (آہستہ سے ثریا کے کان میں) یہ شاہی محل میں ناچ کے اُستاد ہیں!

ثریا:۔ تو یہی ان تتلیوں کو سکھایا کرتے ہیں۔

جمّا:۔ ہاں دیکھو نا۔ تتلیاں جو اس وقت گیت گا رہی ہیں وہ اسے اپنے کاغذ پر لکھتے ہوئے کانوں سے ملاتے جاتے ہیں۔

ثریا نے ذرا جھک کر ان کا کاغذ دیکھا۔ اُسے اس کی کتابوں کی طرح کے حرف نہ تھے۔ بلکہ ایک موٹے سانپ کی تصویر بنی تھی۔ اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ حضرت پھر پڑھ کیا رہے ہیں؟ "مگر ان کے کاغذ پر تو صرف ایک سانپ کی تصویر بنی ہے؟" اس نے مسٹر جمّا سے پُوچھا۔

جمّا:۔ ہاں ہاں اس وقت تو محل میں سانپ گانا ہو رہا ہے۔ شاہ کا جیسا حکم ہوتا ہے ویسا ہی گانا نان تین تیار کرتے ہیں۔ کبھی سانپ گانا۔ کبھی بچھو گانا اور کبھی اُلّو گانا جیسے گیت جس وقت شاہ کو سُننے کی خواہش ہو ویسے ہی ان تتلیوں کو گانا پڑتے ہیں۔

لکھنے کا یہ طریقہ، سانپ کا گانا اور بچھو کا گانا یہ تمام باتیں ثریا کی سمجھ میں بالکل نہ آئیں اور وہ پھر گانا سُننے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ان تتلیوں نے اپنا ناچ گانا ختم کیا اور شاہ کو سلام کر اُلٹے پیروں باہر چلی گئیں۔ سارے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ ثریا شاہ کو دیکھنے لگی۔ شاہ نے سر اُوپر اُٹھایا ادھر اُدھر دیکھا اور پکارا "مدکی صاحب"

"حاضر شاہ پناہ" مدکی صاحب ثریا کی دوسری طرف سے بولے اور نظریں نیچی کئے آہستہ آہستہ سیڑھیوں کو طے کرتے شاہ کے پاس جا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ شاہ نے ان سے کچھ باتیں کیں۔ ثریا انھیں بالکل نہ سُن سکی۔ اس کے بعد مدکی صاحب بھی بغیر اپنی پیٹھ دکھائے ہال سے باہر چلے گئے۔ شاہ نے پھر تخت کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا اور مسٹر جمّا جلدی سے بہت سلیقے سے بیٹھ گئے۔

"جمّا" شاہ کی آواز آئی۔

مسٹر جمّا جلدی سے کھڑے ہو گئے اور بولے:۔

"حاضر شاہ پناہ"

شاہ :- تم یہاں کب آئے بھئی ۔ اچھے تو ہو؟

جمّا نے بہت سلیقے سے جواب دیا "جی یہ ثریا بیگم ہماری دوست ہیں ان کو حضور کا محل دیکھنے کی بڑی تمنا تھی اس لئے اُن کے ساتھ یہاں آگیا" شاہ نے حیرت سے ثریا کو دیکھا ۔ ارد گرد کے تمام شہزادے بھی اُسے دیکھنے لگے ۔

شاہ :- ثریا !

ثریا :- جی، وہ اس طرح بولی جس طرح اپنے ابا جان کے پکارنے پر جواب دیا کرتی تھی ۔

شاہ :- اِدھر آؤ ۔

جمّا نے ثریا سے آہستہ سے کہا "ننھی بی شاہ کے پاس جاؤ" ثریا آہستہ آہستہ ڈرتی ہوئی شاہ کے پاس پہنچی ۔ "تم یہاں کیسے آئیں" شاہ نے پوچھا ۔

ثریا :- جی مجھے جمّا یہاں لائے ہیں اور اس نے جمّا کی طرف دیکھا ۔

جمّا :- جی ہاں ہم لوگ دعوت میں یہاں گئے تھے ۔ عالم پناہ ۔

شاہ :- بہت خوب ۔ تمہارا نام ثریا ہے ۔ تم کچھ جانتی بھی ہو ۔

ثریا :- جی ہاں ۔

شاہ :- کیا کیا ؟

ثریا :- کھیلنا ، کھانا ، لکھنا ، پڑھنا ، کھانا پکانا اور ....

شاہ :- بس بس ، تب تو تم بہت سے کام جانتی ہو" (کچھ سوچ کر) اچھا ایک بات کا جواب دو گی ؟

ثریا :- (آہستہ سے) جی !

شاہ :- ہم میں اور تم میں کیا فرق ہے ؟

ثریا ایک گہرے سوچ میں پڑ گئی .... جانور بول نہیں سکتے ۔ کپڑے نہیں پہنتے ۔ میز ، کرسی پر کھانا نہیں کھاتے ۔ گا بھی نہیں سکتے .... مگر ؟ ......

مگر یہاں تو یہ جانور سبھی کام کرتے ہیں ۔ بولتے بھی ہیں ، گاتے ، ناچتے بھی ہیں ۔ ان کے بادشاہ اور شہزادے بھی ہیں ۔

شاہ :- (مسکرا کر) نہیں بتا سکیں ؟

ثریا نے ہال کے سب لوگوں اور شہزادوں کو دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا "جی .... جی ہم لوگ بہت بڑے ہوتے ۔ ہیں اور آپ لوگ بہت ......"

"ہاہ - ہاہا - ہاہوہو" ثریا کے اتنا کہنے پر تمام درباری زور سے ہنس پڑے ۔ پھر شاہ نے کچھ سوچ کر پاس بیٹھے ہوئے ایک شہزادے سے کچھ لانے کو کہا اور وہ قریب ہی کی میز پر سے ایک خوب صورت گلاس میں کوئی عرق ڈال کر لے آیا ۔ شاہ نے جمّا کو پکار کر وہ گلاس دے دیا ۔ مسٹر جمّا نے خاموشی سے گلاس ہاتھ میں لیا اور اُس کو منہ سے لگا کر پینے لگے ۔

ایک گھونٹ ، دو گھونٹ ، اور پھر۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔
مسٹر جما بڑھنے لگے۔ بڑھتے جاتے اور گلاس کا عرق پیتے جاتے۔ عرق ختم ہو گیا اور جما بڑھتے بڑھتے ہال کی چھت سے جا لگے۔ بڑے بڑے ہاتھ، موٹے موٹے پیر، چوڑا چکلا سر اور دو بڑی بڑی خوفناک آنکھیں اُن کی صورت ایسی ڈراؤنی ہو گئی کہ ثریا کا مُنہ حیرت سے کھل گیا۔ بیچ ہال میں اتنے لانبے چوڑے یہ بالکل دیو جیسے معلوم ہو رہے تھے۔ شاہ نے جما کی طرف دیکھا اور مسکرا کر ثریا سے پوچھا۔ "تمھارے یہاں کے لوگ اتنے بڑے ہوتے ہیں ثریا؟"

ثریا سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ وہ جما کے قد کو دیکھ کر بولی" مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ تو جادو سے ہو گئے ہیں" شاہ نے اس پر ایک زور سے قہقہہ لگایا اور کہا" یہ جادو سے ہو گئے ہیں؟"

"تو اور کیا" ثریا بولی" ہماری دنیا میں تو یہ بالکل چھوٹے سے رہتے ہیں۔ اور۔۔۔۔ اور کوئی بھی جانور اتنا بڑا نہیں ہوتا۔" ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ہال کے دروازے سے ایک بہت ہی بدصورت عورت قیمتی لباس پہنے اندر داخل ہوئی۔ اس کے سیاہ کھُلے ہوئے بالوں پر تاج رکھا تھا۔ اس کی صورت شاہ سے ملتی جلتی تھی۔ مگر آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوفناک تھیں۔ غصّے سے بھری ہوئی۔ اُسے آتے دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ کچھ تو آہستہ سے وہاں سے کھسک گئے اور باقی اِدھر اُدھر یوں ہی ٹہلنے لگے۔ شہزادے آہستہ سے آپس میں ملکہ ملکہ کہتے نیچے اُتر گئے۔ شاہ جو اب تک قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دم خاموش ہو گئے۔ آہستہ سے اپنے تخت سے اُتر کر ملکہ کے پاس بڑھے۔ ثریا حیران تھی کہ ملکہ کے آنے سے سب لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ یہ بھی ڈرتی کانپتی ملکہ کی صورت دیکھتی مسٹر جما کے پاس جا پہنچی۔ جما ویسے ہی ہاتھی۔ جیسے بیچ ہال میں اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ ملکہ نے غصّے سے اپنی گردن اُٹھاتے ہوئے جما کو دیکھا اور بولی" یہ کیا تماشا ہے؟"

"کچھ نہیں کوئی بات نہیں" شاہ نے اس طرح جواب دیا گویا وہ ڈر رہے ہوں۔ "چلو نا۔ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں" اور یہ تخت کی طرف چلنے لگے۔ ملکہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ثریا تک پہنچی۔

اُس کی صورت دیکھتے ہی ثریا کو اور بھی ڈر لگنے لگا۔ جما کے موٹے موٹے پیروں سے لپٹ گئی جما نے اوپر ہی سے اپنی آنکھوں کو گھماتے ہوئے ثریا کو دیکھا اور ملکہ کو اپنے پاس دیکھ کر ایک دم کانپ اُٹھا

"یہ کون ہے" ملکہ ثریا کو دیکھ کر زور سے بولی" تم یہاں کیوں آئی ہو۔ کون ہو تم؟"

"سو۔۔۔۔ سو۔۔۔۔ ثریا بانو مارے خوف کے ثریا کے مُنہ سے آواز نہ نکلی۔

"یہ آج کی دعوت میں آئی تھی" شاہ نے ثریا

کی طرف سے ملکہ کو جواب دیا۔

"ہونہہ" ملکہ نے ناک پھلا کر شاہ کو دیکھا "شاہی محل میں اس کا کیا کام" اور اُس نے اپنے سیاہ ہاتھ سے جن پر لانبے لانبے بال تھے۔ ثریا کی کلائی کو پکڑ لیا "بولو تم یہاں کیوں آئیں...... دد یا یہ جانور کی بچی اور ہمارے محل میں...... ہونہہ......"

"مہ.... مجھ.... مجھے جہاز پر دستی یہاں لے آئے" ثریا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ملکہ نے تالی بجائی۔ فوراً ایک سپاہی حاضر ہوا۔ ملکہ نے ثریا کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے گرفتار کر لو"۔ ثریا نے زور سے ایک چیخ ماری اور جما کے پیروں سے لپٹ گئی۔ سپاہی نے اپنے پورے جسم کو گھماتے ہوئے ثریا کے دونوں ہاتھ لپیٹ لئے اور فرش پر رینگتا ہوا ملکہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ثریا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ زور زور سے چلاتے لگی "مجھے چھوڑ دیجئے، ملکہ.... ملکہ.... مجھے چھوڑ دیجئے.... اب میں یہاں کبھی نہ آؤں گی۔ اچھی ملکہ..... جما؟... جما مجھ کو بچا لو..... دیکھو یہ لوگ مجھے مارنے لے جا رہے ہیں" جما ویسے ہی بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ملکہ شاہ کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں لال انگارا ہو رہی تھیں۔ شاہ نے ملکہ سے کہا "مگر اس غریب کی جان لینے سے فائدہ! پیاری ملکہ!"

"فائدہ!" ملکہ نے شاہ کی طرف دیکھا "یہ انسان کی بچی ہے۔ ان انسانوں کی جو روزانہ ہماری کتنی بے زبان رعایا کو تکلیف دیتے ہیں۔ ٹھوکا مارتے ہیں، پیٹتے ہیں اور اُن کا گلا گھونٹ دیتے ہیں" غصے سے ملکہ کی آواز کانپنے لگی۔

"لیکن اس بے چاری کا کیا قصور؟" شاہ کہنے لگے "اس نے تو....."

"میں اور زیادہ سننا نہیں چاہتی۔ ملکہ شاہ سے بگڑ کر بولی" ثریا ابھی تیری گردن صاف کر دی جائے گی تو ذرا جا کر ہمارے جادو گھر کو دیکھ آ"

"آہ آہ" ثریا بے اختیار چلا اٹھی اور روتی ہوئی بولی "نہیں نہیں ملکہ ایسا نہ کہئے.... میں.... میں ہاتھ جوڑتی ہوں ایسا نہ کہئے.... مجھے معاف کر دیجئے پیاری ملکہ.... میں اب کبھی...."

"چپ" ملکہ نے زور سے ثریا کو ڈانٹا پھر سپاہی سے کہا۔ "جاؤ اسے جادو گھر دکھا کر گردن مروڑ کے حوالے کر دو"

بہت خوب سپاہی بولا اور ثریا کو ہال سے باہر لے جانے لگا۔ ثریا روتی جاتی اور مڑ مڑ کر جما کو دیکھتی جاتی۔ دروازے سے نکل کر یہ دونوں ایک لانبے راستے سے گذرنے لگے۔ راستے میں ایک دو سپاہی رینگتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گذر جاتے اور کبھی کوئی شہزادہ ثریا کو حیرت سے دیکھنے لگتا۔ ثریا کی آنکھوں سے آنسو برابر بہہ رہے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی

چلتے چلتے ثریا کو مدکی صاحب نظر آئے۔ اور یہ رونی آواز میں اُن کو پکارنے لگی ”مدکی صاحب...... مدکی صاحب مجھے بچائیے...... دیکھئے یہ مجھے مارنے جا رہا ہے...... مدکی صاحب مجھے بچا لیجئے“

مدکی صاحب نے ثریا کو روتے دیکھا ...... دوڑتے ہوئے اس کے پاس آ پہنچے۔ اُن کو دیکھ کر سپاہی نے جلدی سے اُنھیں سلام کیا اور ثریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کڑکران شکو شائیں ہسن“ ”کران شکو تائیں؟“ مدکی صاحب حیرت سے ثریا کو دیکھ کر سپاہی سے بولے ”قچو ہورہا بن“

”ہاہا بن تائیں فش“ سپاہی نے جواب دیا۔

مدکی صاحب اور سپاہی کے درمیان اسی طرح تھوڑی دیر تک کچھ باتیں ہوا کیں۔ پھر اُنھوں نے ثریا کو سپاہی سے الگ کرکے اپنے ساتھ لیا اور آگے آگے چلنے لگے۔ ثریا کا رونا اب بند ہو گیا تھا

”اُف“ مدکی صاحب نے ثریا سے کہا ”بیگم دیکھئے آپ اتنا روئیں کہ تمام سڑک آپ کے آنسوؤں سے ڈوبی جا رہی ہے“

ثریا نے مڑ کر سڑک کو دیکھا تو جدھر سے وہ آئی تھی اس طرف کی پوری سڑک اس کے آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ جیسے بہت زور کا پانی برسا ہو ”تو اب کیا ہوگا مدکی صاحب؟“ وہ اس طرح بولی گویا اس نے بھیگی سڑک کو دیکھا ہی نہیں۔ ”آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں“

”ہوگا کیا“ مدکی صاحب بولے۔ ”آپ گھبرائیے نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا“ پھر کچھ رک کر وہ بولے ”ہماری ملکہ صاحبہ بڑی غصہ والی عورت ہیں ذرا ذرا سی بات پر فوراً ہی گردن کی صفائی کا حکم دے دیتی ہیں۔ مگر آپ نے کیا کہا تھا؟“

”جی میں نے تو......“ ثریا کو ایک ہچکی آئی اور وہ بولی ”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بلکہ آئیں اور مجھے محل میں دیکھ کر خوب بگڑیں اور کہا..“

”خیر کوئی بات نہیں“ مدکی صاحب بولے ”اب آپ چپ رہیے۔ دیکھئے میں نے یہ سپاہی مسٹر جما کے بلانے کو بھیج دیا ہے۔ وہ آکر سب کچھ ٹھیک کرلیں گے جب تک آپ جادو گھر کی سیر کر لیجئے“

”مگر جما آئیں گے کیوں کر“ ثریا نے کہا ”وہ تو بہت بڑے ہو گئے ہیں؟“

”جی میں نے اُن کے پاس سکڑنے والا عرق بھیج دیا ہے اُس کو پی کر وہ پہلے جیسے ہو جائیں گے اور وہاں چلے آئیں گے“ مدکی صاحب نے جواب دیا۔

ثریا کا رونا اب کم ہو چلا تھا۔ آنسو بھی اب کم گرتے مگر اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں یہ ایک بڑے کمرے کے پاس پہنچی۔ کمرے میں بہت سی بڑی بڑی رنگین تصویریں تھیں اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کھلونے تھے۔ مدکی صاحب نے ایک

طرف سے ثریا کو تصویریں دکھانا شروع کیں..... "دیکھئے یہ سب وہ تصویریں ہیں جن میں آپ کے یہاں کے لوگوں کا ان بے زبان جانوروں پر ظلم دکھایا گیا ہے۔ دیکھئے ان شریر بچوں نے ایک غریب مینڈک کو ڈھیلوں سے کس قدر مارا ہے۔ اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی اور ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن اس پر بھی اُن کو اس بے چارے پر ذرا رحم نہیں آتا۔ ثریا اُس کو دیکھنے لگی۔ "اور یہ دیکھئے اس بلی کے ننھے بچے کو ان لڑکوں نے گلے میں پھندا ڈال کر صرف اس لئے جان سے مار دیا کہ یہ کالا کلوٹا ہے۔ اور اُن کے پالنے کے لائق نہیں۔ اور یہاں یہ لڑکے اس بے چاری چڑیا کے بچے کو گھونسلے سے اُتار لائے ہیں۔ اس کا ایک انڈا توڑ دیا اور اس بچے کو ذبح کرنے جا رہے ہیں۔ دیکھئے چڑیا اپنے بچے کے لئے کتنی بے قرار ہو رہی ہے۔" پھر دوسری تصویر دکھاتے ہوئے "اُن بچوں نے چند خوب صورت تتلیوں کو پکڑ کر شیشی میں بند کر دیا ہے۔ اُن کے واسطے چند پھول بھی ڈال دئے ہیں مگر کیا بند شیشی میں یہ زندہ رہ سکتی ہیں؟" ثریا تتلیوں کو دیکھنے لگی "اور گھاس کے اس بھولے بھالے ٹڈے کے پیر میں تاگا باندھ کر بے چارے کو اُڑا رہے ہیں۔ اس بے چارے کے دونوں ہاتھ اُکھڑ گئے اور تکلیف سے مر رہا ہے۔ لیکن لڑکے اپنی حرکت پر کتنے خوش ہیں اور پھر وہ تصویر دیکھئے۔ ایک چیونٹی نے اس لڑکے کو کاٹ لیا تھا۔ محض اس لئے کہ اس کے پیر کے نیچے دب گئی تھی اور یہ لڑکا غصے میں ان تمام چیونٹیوں کو موم بتی سے جلا رہا ہے۔ بھلا ان بے چاریوں نے اس کا کیا بگاڑا تھا اور پھر یہ اس کے کاٹنے سے مرا تو نہیں جا رہا تھا......"

مدکی صاحب نے ثریا کو جادو گھر کی تمام تصویریں دکھا ڈالیں۔ ثریا جیسے جیسے تصویریں دیکھتی جاتی اس کا رونا غائب ہوتا جاتا اور لڑکوں کی ان تمام شرارتوں پر شرم سے اپنا منہ پھیر لیتی۔ "سچ تو یہ ہے ثریا بیگم" مدکی صاحب بولے "آپ کے یہاں کے بچے اتنے پاجی اور شریر ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ انھیں جتنی بھی سزا ملے کم ہے۔"

"مگر سب بچے تو ان جانوروں اور تتلیوں کو نہیں مارا کرتے" ثریا نے جواب دیا "میں انھیں کتنا چاہتی ہوں لیکن پھر مجھے کیوں.....؟" اور وہ اپنے ہاتھوں سے آنسوؤں کو پوچھتی ہوئی رو کر بولی۔ "مجھے ملکہ کیوں مارتی ہیں؟"

"اوہو پھر رونے لگیں۔" مدکی صاحب ثریا کو روتے دیکھ کر بولے اور ہنس کر کہا "دیکھئے یہاں رونے دیجئے نہیں۔ ورنہ آپ کے آنسوؤں سے تمام کمرا بھر جائے گا اور جادو گھر کی تمام تصویریں خراب ہو جائیں گی۔"

"جما.....؟" ثریا نے اس کو دیکھ کر پکارا "تم آ گئے جما، مجھ کو بچا لو..... مجھ کو ملکہ سے....."

پھر وہ خوب زور سے اپنا منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ارے تم اتنا روتی کیوں ہو تمھارے

اس رونے سے سارا راستہ خراب ہو گیا۔ مسٹر جمّا ثریّا کے بدن کو سہلاتے ہوئے بولے "دیکھو میں سب ٹھیک کر لوں گا!" پھر انھوں نے مدکی صاحب سے کہا "مولانا شاہ نے ثریّا کے لئے ملکہ سے کتنی خوشامد نہ کیں شہزادوں نے بھی بہتیرا کہا مگر ملکہ نے ایک نہ سُنی"

"تو اب کیا ہوگا جمّا" ثریّا نے یکایک مسٹر جمّا کی بات کاٹتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔" مسٹر جمّا نے بگڑ کر ثریّا کو دیکھا اور پھر مدکی صاحب سے کہنے لگے

"ملکہ کا حکم ہے کہ ثریّا کی گردن صاف کر دی جائے تو کیوں نہ ہم لوگ ایک چال چلیں۔"

"یعنی" مدکی صاحب نے مسٹر جمّا سے پوچھا

"یعنی یہ کہ آپ ننھی بی کی گردن وغیرہ رومال سے صاف کر کے انھیں اس سرنگ کے ذریعے محل سے نکال دیجئے اور میں اس درمیان میں گردن مروڑ کو بہلا پھسلا کر یہ کہنے پر راضی کر لوں گا کہ اگر ملکہ ثریّا بی کے بارے میں اس سے پوچھیں کہ اس کی گردن صاف کر دی گئی تو وہ کہہ دے کہ جی ہاں ثریّا کی گردن صاف کر دی گئی۔ اس طریقے سے ملکہ کی بات بھی نہ جائے گی اور ثریّا بھی مرنے سے بچ جائیں گی۔"

"ہوا.... ہوا.... ہو ہو ہو" مدکی صاحب مسٹر جمّا کی اس ترکیب پر مارے خوشی کے اچھل پڑے اور بولے "یار جمّا تم کو بھی کیا دور کی سوجھتی ہے۔ میں جھوٹ کہتا ہوں کہ انسانوں کے ساتھ رہتے رہتے تمھیں بہت عقل آگئی ہے۔ واہ..... واہ کیا چال سوچی ہے تم نے!"

"خیر ان باتوں کو چھوڑیئے" مسٹر جمّا نے کہا۔ "دیکھئے تھوڑی دیر میں گردن مروڑ آتا ہی ہوگا میں اب ذرا اس کو پھسلاتا ہوں۔ لالچی تو پرانا ہے کم بخت بس صرف ایک رس گلے میں قابو میں آجائے گا۔ آپ ننھی بی کو لے کر اس سرنگ کے پاس روانہ ہو جائیے" پھر ثریّا کو دیکھتے ہوئے بولے "کیوں ننھی بی کیسی انوکھی تدبیر سوچی ہے۔ اب ذرا ہنس دو۔ ہاں ہاں ہنسو ہنسو۔"

مسٹر جمّا ثریّا کے پیٹ میں گدگدی کرنے لگے۔ ثریّا نے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا اور مسکرا پڑی "اور راستے میں اگر کسی نے پکڑ لیا تو؟" اس نے جمّا سے پوچھا۔

"ہونہہ راستے میں پکڑ کر کوئی کر ہی کیا پائے گا تم محل سے نکلتے ہی اس شربت کو پی لینا اور اپنے اصلی قد میں آجاؤ گی۔ پھر کوئی بھی تمھارے پاس آنے کی ہمت بھی نہ کرے گا۔" مسٹر جمّا نے ثریّا کے ہاتھ میں ایک شیشی دے کر کہا "لو ذرا اسے سنبھال کر رکھنا۔"

پھر مسٹر جمّا نے مدکی صاحب سے کہا "اچھا مولانا اب آپ ذرا جلدی سے ان کی گردن، منہ وغیرہ رومال سے خوب صاف کر دیجئے۔ میں گردن مروڑ

کے پاس جا رہا ہوں۔ مسٹر حبا ہنستے ہوئے اور ثریا کو دیکھتے ہوئے جادو گھر سے باہر چلے گئے۔ پھر مدکی صاحب نے اپنی جیب سے ایک ننھا سا رومال نکالا اور ملکہ کے کہنے کے مطابق ثریا کی گردن کو صاف کر دیا اور اس کو اپنے ساتھ لئے کمرے سے باہر جانے لگے۔

ثریا کے ہاتھ میں شیشی آتے ہی اسے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر۔ وہ شیشی کے عرق کو دیکھنے لگی ...... "کیوں نہ میں ابھی فوراً ہی اس شربت کو پی جاؤں اور ملکہ کا سارا غصہ نکال دوں ..." یکایک اس کے دل میں یہ خیال آیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"مگر پھر بے چارے چیتا کا کیا ہوگا" اس نے سوچا اس کا کوئی کر ہی کیا سکتا ہے۔ جب میں بہت بڑی ہو جاؤں گی تو کس کی اتنی مجال ہے کہ اس پر ہاتھ اٹھا سکے۔ شیشی کے ہلنے سے نیلے رنگ کا شربت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اچھل اچھل کر ثریا سے کہہ رہا ہو..... "ثریا! مجھ کو پی لو۔ سب پی لو۔ خوب اچھی طرح پی لو۔ پھر تم بہت بڑی ہو جاؤ گی، اتنی بڑی کہ محل کی چھت سے جا لگو گی۔ یہاں کے سب لوگ تم سے ڈر جائیں گے۔ وہ ڈر کے مارے بھاگنے لگیں گے۔ سپاہی، گردن مروڑ شہزادے، شاہ اور ملکہ سب لوگ تمھیں دیکھ کر کانپنے لگیں گے۔ ملکہ، ظالم ملکہ تم نے اس کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے تمھاری گردن صاف کرنے کا حکم دیا، تم کتنا روئیں کتنی معافی مانگی، لیکن اس نے ایک نہ سنی .... مگر اب؟ ..... اب ذرا اس کا سارا غصہ اتار دو ...... مجھے پی لو ..... پی لو ...... پی لو" شربت بہت جلد جلد ہلنے لگا گویا حلق میں جانے کو بے قرار ہو ..... ثریا چلتے چلتے ایک دم رک گئی۔ اس کا سانس بہت تیزی سے چلنے لگا اور اس کا چہرا چمک اٹھا۔

"مدکی صاحب ذرا ٹھہرئے" وہ یکایک بولی۔ مدکی صاحب نے منہ پھیر کر ثریا کو دیکھا ..... "ہیں ..... ہیں .... یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" وہ حیرت سے بولے اور چاہا کہ جلدی سے شیشی کو اس کے ہونٹوں سے الگ کر دیں۔ مگر شیشی کا بہت سا عرق ثریا کے حلق سے پار ہو چکا تھا۔ اور اب؟ ..... ثریا بڑھنے لگی .... ایک انچ، دو انچ، تین چار اور پانچ .....!! پھر کچھ دیر میں چھت سے الگ گئی ..... "یہ آپ نے کیا کر لیا؟" مدکی صاحب کی چیخ کی آواز اس کے کان میں آئی۔

"میں ملکہ کے پاس جا رہی ہوں مدکی صاحب" وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز اتنی زور کی تھی جیسے بادل گرجا ہو۔ "میں ملکہ سے ملنے جاؤں گی ملکہ سے" پھر وہ واپس ہال میں جانے لگی۔ اپنے لانبے قد کی وجہ سے وہ بہت جھک جھک کر چل رہی تھی فاصلہ ہی کتنا تھا۔ صرف چار، پانچ قدموں میں ہال میں داخل ہو گئی۔ جب اس کے بھاری بھاری پیر زمین

پر پڑتے تو بجلی کی کڑک جیسی آواز ہوتی اور سارا محل
ہلنے لگتا ۔ ہال میں داخل ہوتے ہی محل بھر میں بہت شور
مچ گیا ۔ باریک باریک آوازوں سے تمام ہال گونجنے لگا
ثریا نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے نیچے کے تخت کو تاکا
شہزادے شاہ اور ملکہ سب لوگ ڈر کے مارے کانپ
رہے تھے ۔ ثریا نے جلدی سے ملکہ کو اپنے انگشت جیسے
ہاتھ میں اٹھا لیا ... اس کے ہاتھوں میں ملکہ ایک ننھی
سی گڑیا معلوم ہو رہی تھی .... "ملکہ" ثریا گرج کر بولی
اور ملکہ لرز گئی ۔

"چھوڑ دو ، مجھے چھوڑ دو ، اچھی لڑکی مجھے چھوڑ
دو .... میں معافی مانگتی ہوں ، مجھے چھوڑ دو" ملکہ
روتی ہوئی ثریا سے بولی ۔ ثریا کا سانس بہت تیز
چل رہا تھا ۔ وہ ملکہ کو دیکھتے ہوئے بولی "چھوڑ دو
..... مجھے چھوڑ دو ..... بڑی آئیں بے چاری رونے
والی .... چھوڑ دو ..... ہونہہ .... جب
میں نے رو رو کر تم سے کہا تھا تم کو کیا ہوا تھا ؟
بڑی غصہ والی بنی تھیں .... ہونہہ .... [illegible]
پر غصہ رہتا ہے ..... اس کی گردن صاف کردو
..... آئیں کہیں کی ملکہ ! ...." ثریا غصے میں
بکنے لگی ۔ پھر اس نے ملکہ کی گردن کو اپنے دونوں انگوٹھو
اور دو انگلیوں سے [illegible] اٹھا لیا اور اس
کو زور سے دبانے لگی ۔ ملکہ کے حلق سے ہلکی ہلکی آوازیں
آ رہی تھیں ۔ ثریا نے پھر ایک بار خوب زور سے ملکہ کی
گردن کو دبایا ۔ ملکہ کو ایک ہچکی آئی اور .... ؟

اور ثریا کی آنکھ کھل گئی ۔ بلقیس آپا ہنستی ہوئی
اس کو جگا رہی تھیں اور یہ لئے جیا کو دونوں ہاتھوں سے
پکڑے اٹھائے تھی ۔ صبح ہو چکی تھی ۔ رات کی دودھ جیسی چاندنی
سورج کی روپہلی روشنی میں بدل گئی تھی ۔ ثریا کا طوطا
خوب زور زور سے اس کو پکار رہا تھا .... ثریا ثریا
اٹھو ۔ صبح ہو گئی ۔ چائے پینے چلو ، اٹھو" (ختم)

عبدالواسع بنگلوری

انگلستان میں ایک جگہ ہے سالبری۔ یہاں اوسط درجے کے گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا ہیری فیکٹ۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کا زمانہ تھا۔

ہیری فیلکٹ کو شروع شروع میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ تھا۔ ہاں کھانے کھیلنے سے زیادہ رغبت تھی اُسے ڈیمس اسکول میں داخل کیا گیا۔ مگر وہاں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ اکثر اسکول سے بھاگ بھاگ آتا تھا۔ اُستاد بھی خوش نہ تھے اور اُسے کند ذہن اور کندۂ ناتراش کہا کرتے تھے۔ اس کے درجے کے لڑکوں نے تو اُسے پاگل کا خطاب دے رکھا تھا۔ پیٹو ایسا کہ خوب ڈٹ ڈٹ کر کھاتا پھر بھی بھوک کی شکایت رہتی۔

ہیری کے ماں باپ اپنے کام کے سلسلے میں سالبری سے کہیں دور جانے لگے تو اُسے اسکول کے ہوسٹل میں داخل کر گئے۔ بھوک کی شکایت اُسے یہاں بھی اسی طرح تھی مگر ہوسٹل میں رہ کر اس کی عادتیں بدلنے لگیں۔ اب وہ پڑھنے لکھنے میں بھی ترقی کرنے لگا تندرستی بھی بہت اچھی ہوگئی اپنے پورے درجے

میں سب سے قوی اور تندرست لڑکا وہی تھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ لندن کالج میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے پڑھائی میں اور بھی محنت کی۔ وہ تقریریں بھی بہت اچھی کرنے لگا۔ غرض کالج بھر میں وہ مستعد محنتی اور شوقین طالب علم مشہور ہوگیا۔

ہیری کی آرزو تھی کہ پڑھ لکھ کر پارلیمنٹ کا ممبر بنے اور اپنے ملک کے غریبوں کی خوب خدمت کرے اس زمانے میں انگلستان کے غریبوں کا حال بہت قابل رحم تھا۔ مزدوروں پر بہت ظلم کیا جاتا تھا اور کسان لگان کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ ہیری کے دل پر اس ظلم اور جبر کا بہت اثر تھا اور اسی ظلم کو روکنے کے لئے وہ پارلیمنٹ کا ممبر بننا چاہتا تھا۔

تعلیم کے زمانے میں غالباً زیادہ محنت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ یہ درد ایسا بڑھا کہ پڑھنا لکھنا چھوٹ گیا۔ آخر دوا و علاج سے یہ شکایت دور ہوگئی لیکن بدقسمتی نے ابھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا ایک دن سالسبری میں وہ اپنے باپ کے ساتھ

شکار کو گیا۔ جنگل میں لمبی لمبی گھاس بہت تھی۔ باپ آگے
بڑھ گیا۔ پاس ہی اُسے کچھ پرند نظر آئے۔ اور اُس نے
نشانہ لگایا۔ ہیری بھی نشانے کی زد میں تھا مگر لمبی
گھاس میں نظر نہ آتا تھا۔ یہ نشانہ چڑیوں کے تو لگا نہیں
ہاں بے چارا ہیری ان کا شکار ہو گیا۔ اور کارتوس
کی چھوٹی چھوٹی گولیاں اس کی آنکھوں میں گھس گئیں
ہیری کے لئے دنیا تاریک ہو گئی تمام آرزوئیں خاک
میں ملتی نظر آرہی تھیں۔ جیسے تیسے آنکھوں کے زخم
تو ڈاکٹروں نے اچھے کر دئے مگر اُن کی روشنی ہمیشہ
کے لئے رخصت ہو گئی۔ ہیری نہ اب لکھ سکتا تھا نہ پڑھ
سکتا تھا۔ باوجود اس کے ہیری نہ تو دل برداشتہ
ہوا نہ اس نے ہمت ہاری۔ دوست احباب اُسے
ہمدردی کے خط لکھتے تھے تو اُنھیں وہ برابر یہی جواب
دیتا تھا کہ میں اندھا نہیں ہوں۔ ابھی دنیا میں کام
کرنے کے قابل ہوں اور یہ تھی بھی سچی بات۔

اس کا حافظہ بہت اچھا تھا لوگوں کو اُن کی آواز
سے پہچان لیتا تھا۔ بعض ایسے لوگوں کو بھی وہ محض
آواز سے پہچان لیتا تھا جن سے ملے ہوئے مدت
گذر چکی تھی۔

وہ محض اپنی قابلیت کے بل پر باوجود اندھا
ہونے کے پارلیمنٹ میں جانا چاہتا تھا لوگ اسی عیب
کی وجہ سے اُسے پارلیمنٹ کا ممبر بنانے سے جھجکتے تھے آخر ۲۲ سال
کی عمر میں اس کی یہ دلی آرزو پوری ہوئی۔

پارلیمنٹ میں اُس کی پہلی تقریر تو ذرا یونہی رہی
مگر رفتہ رفتہ وہ ایسی زوردار تقریر کرنے لگا کہ لوگوں کے
دل ہل جاتے تھے۔ اس کا لہجہ ایسا صاف اور اُس
کی دلیلیں اس قدر ٹھیک اور منصفانہ ہوتی تھیں کہ
مخالف گروہ سے ان کا جواب نہ بن پڑتا۔ وہ جب
تک پارلیمنٹ میں رہا غریبوں کی طرف سے لڑتا رہا۔
اُسے ہندوستان سے بھی بہت ہمدردی تھی جب
کبھی پارلیمنٹ میں ہندوستان کا مسئلہ چھڑتا تو
وہ اتنی زور سے ہندوستانیوں کا ساتھ دیتا کہ لوگ
حیران رہ جاتے۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے بعض ممبر
اُسے ہندوستانی ممبر کہنے لگے۔

سنہ۱۸۸۰ء میں ہیری پوسٹ ماسٹر جنرل بنایا
گیا۔ اس وقت یہ عہدہ بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس محکمے
میں نوّے ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ محکمے میں بہت سی
خرابیاں تھیں۔ ہیری نے کام ہاتھ میں لیتے ہی ان سب
خرابیوں کو دور کیا۔ پرانے قانون کی جگہ نئے قانون
جاری کئے۔ عام لوگوں کی سہولت کا ہر ہر بات میں
خیال رکھا۔ اس طرح ڈاک خانے کا کام پہلے سے کہیں زیادہ
بہتر طریقے پر چلنے لگا

ستمبر سنہ۱۸۸۳ء میں اُسے ٹائیفائڈ (موتی جھرا بخار)
ہو گیا۔ بیماری کی خبر ہر جگہ پھیل گئی۔ لوگ اخباروں سے
اس کی تندرستی کا حال پوچھتے تھے۔ خود ملکہ وکٹوریہ
اُس کا حال پوچھنے کے لئے کئی کئی بار تار بھیجتی تھیں آخر

خدا کا شکر کہ اس بیماری سے اُسے نجات ملی۔

اچھا ہوتے ہی وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اسی محنت اور مستعدی کے ساتھ ان کی ان خدمتوں کی وجہ سے انگلستان کیا غریب کیا امیر سبھی دل سے عزت کرتے تھے۔ آکسفورڈ اور گلاسگو کی یونیورسٹیوں نے تو اُسے کئی اعزازی ڈگریاں دیں۔

ٹھیک ایک سال بعد ۱۸۵۸ء میں وہ پھر بیمار پڑا۔ یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ تعزیت کے بے شمار خط اُس کی بیوہ کے پاس آئے۔ ملکہ وکٹوریہ نے بھی ایک بہت ہی درد بھرا خط لکھا۔ اس زمانے کے مشہور وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کہتا ہے کسی کی موت کی یاد انگلستان والوں کے دل میں اتنی تازہ نہ ہوگی جتنی ہیری کی۔ ہیری نے لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی تھی اگر ہیری کی آنکھیں نہ جاتی رہتیں تو وہ دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہوتا ۔

پیام رسانی

محمد عبدالحسیب

لڑائی کے زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پیام پہنچانے کا کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لڑائی کی فوجوں کا تعلق صدر دفتر سے ہوتا ہے یا خود فوجیں ایک دوسرے سے دور پڑی ہوتی ہیں۔ ان فوجوں کو امداد۔ پیش قدمی یا واپسی کے سلسلے میں صدر دفتر کی ہدایتوں کی ضرورت ہوتی ہے یا اپنی فوجوں میں آپس میں ایک دوسرے کو پیام بھیجنا ہوتے ہیں۔

پہلے یہ کام دو جھنڈیوں، لالٹینوں اور دھوپ آئینے سے لیتے تھے۔ کبوتروں سے تو اب تک یہ کام لیا جاتا تھا۔ خط وغیرہ ایک چھوٹی سی المونیم کی ڈبیا میں بند کرکے کبوتر کے پیر سے باندھ دیا جاتا تھا اور کبوتر اُسے مقررہ جگہ پر پہنچا دیتا تھا۔ مگر پیام کہیں دور یا جلد بھیجنا ہوتا تھا تو دقت [illegible]تی تھی۔ اس دقت کو تاربرقی نے بڑی حد تک دور کر دیا۔ اس کام کے لئے فوج کا ایک دستہ متعین کر دیا جاتا ہے۔ تار بھیجنے کے لئے ایسے اشارات مقرر کر لئے جاتے ہیں جنھیں دشمن نہ سمجھ سکے۔ اگر لڑائی کے میدان میں کہیں ٹیلیفون کے تار موجود ہیں تو اُن کے ذریعے تار بھیجنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون والوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا۔

پھر ٹیلیفون کی ایجاد نے پیام رسانی میں اور بھی سہولت پیدا کر دی ہے تاربرقی میں تو یہ ہے کہ جب آدمی اسے سیکھے تبھی کام کر سکتا ہے۔ اور ٹیلیفون جاہل سے جاہل سپاہی بھی کر سکتا ہے

مگر تار اور ٹیلیفون کے لئے بہت کچھ ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے، ہزاروں، لاکھوں گز تو تار ہی تار ہوتا ہے۔ اِن سب دقتوں کو دور کرنے کے لئے مارکونی نے بے تار کی تاربرقی یا ریڈیو ایجاد کر دیا۔ آج کل لڑائی کے ہتھیاروں میں حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ نئی نئی چیزیں، نئے نئے۔ ٹینک اور ہوائی جہاز ایجاد ہو رہے ہیں۔ اب لڑائی کا میدان ہزار ہزار میل لمبا ہوتا ہے ایسی صورت میں ریڈیو کی طرح ایک ایسی ہی ایجاد کی ضرورت تھی جو دم کے دم میں خبریں اِدھر سے اُدھر پہنچا دے اور کم سے کم ساز و سامان کی ضرورت ہو۔ اب پانی کا جہاز ہو یا ہوائی جہاز تارپیڈو کشتی ہو یا ٹینک

سب میں ریڈیو کا آلہ لگا ہوتا ہے جس سے خبریں وصول کرتے ہیں یا دوسری جگہ بھیجتے ہیں اور اب تو یہاں تک ہو گیا ہے کہ موٹروں اور موٹر سائیکلوں کے علاوہ پیراشوٹ سپاہیوں کے پاس دوسرے سامان کے ساتھ یہ آلہ بھی ضرور ہوتا ہے ۔

اچھا لڑکا

شہزادہ پرویز چشتی

ایک تھا لڑکا چھوٹا سا — پتلا سا اور موٹا سا
آنکھیں اس کی موٹی سی — موٹی لیکن چھوٹی سی
اس کی ناک پکوڑی سی — یعنی چوڑی چوڑی سی
صبح سویرے اٹھتا تھا — پہلے سیر کو جاتا تھا
ناشتہ آکر کرتا تھا — پھر وہ بیٹھ کے پڑھتا تھا
کرکے سبق وہ اپنا یاد — جاتا تھا مکتب کو شاد
اس کو جب کہتے استاد — سبق کیا ہے تو نے یاد
سبق سنا دیتا فر فر — جیسے چلتی ہے موٹر
وقت جو چھٹی کا ہوتا — آتا وہ گھر کو سیدھا
اک گھنٹہ کرتا آرام — کرتا پھر مکتب کا کام

اس کا ہے ریحانی نام
کرتا ہے جو اچھے کام

بھوک

— ایڈیٹر کا پڑوسی

یہ کانپور اسٹیشن ہے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دہلی میل کے منتظر ہیں۔ کچھ لوگ بنچوں پر اور کچھ لوگ اپنے اسباب پر بیٹھے ہیں۔ ہر مسافر کے پاس ایک یا دو قلی کھڑے ہیں۔ ایک طرف انٹر کلاس کے ویٹنگ روم کے سامنے بنچ پر ایک بنگالی بابو اپنی پوٹلی اور ٹوکری سمیٹے بیٹھے ہیں۔ بنگالی بار بار مسافروں پر ایک ایک کرکے نظر ڈالتا ہے۔ شاید ان میں کوئی اونچا کرتا اور ایک خاص انداز کی دھوتی کے نیچے انڈرویر پہنے (یہ بنگالیوں کا خاص لباس ہے) نظر آئے تاکہ اُس سے دو دو باتیں کرسکے۔ مگر آنکھیں نا اُمید ہوکر ٹوکری کی طرف لوٹتی ہیں جسے وہ ذرا قریب سرکا لیتا ہے۔

دہلی میل کے انجن کی سیٹی نے دفعتہً مسافروں میں حرکت پیدا کی اور دیکھتے دیکھتے سارا اسباب جو ایک منٹ پہلے فرش پر بکھرا تھا۔ انسانی سروں پر پہنچ گیا بنگالی بابو نے بھی اپنی پوٹلی بغل میں دابی اور ٹوکری کو ہاتھ میں لٹکا کر سنبھل کھڑے ہوئے۔ اتنے میں دہلی میل پلیٹ فارم پر آگیا اور مسافروں کی دوڑ دھوپ خوانچہ والوں کی پکار اور قلیوں کی چیخوں نے قیامت کا منظر آنکھوں کے سامنے کردیا۔ ---- اس دھکا پیلی میں بابو اپنی پوٹلی اور ٹوکری سنبھالے انٹر کلاس کی طرف اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے ماتھے کے بل اُس وقت تک نہیں گئے جب تک اُنھوں نے انٹر کلاس کی ایک پوری سیٹ پر قبضہ جما لیا۔

انٹر کلاس میں کل چار مسافر تھے۔ بنگالی بابو کے مقابل کی سیٹ پر ایک نہایت قوی الجثہ لحیم شحیم پنجابی ۱۰ گز کی شلوار پہنے سو رہا تھا۔ مسافروں کے شور وغل سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سنبھل کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنی ڈراؤنی شکل کو ایک بہت ہی وزنی بالوں دار ٹوپی سر پر رکھ کر اور ڈراؤنا بنا لیا۔ پنجابی نے بے تابانہ طور سے کسی چیز کی تلاش میں کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کیا اتنے میں گاڑی چل دی۔

ابھی گاڑی کان پور کے اسٹیشن سے نکلی ہی تھی کہ بنگالی نے جلدی سے ٹوکری کے اندر سے دو ڈبے نکالے چھوٹا ڈبہ رس گلوں سے بھرا تھا اور بڑے میں خشکے کے

علاوہ زیادہ حصہ مچھلی کا تھا۔ اس عرصے میں جبکہ بنگالی کھانے کا سامان کر رہا تھا پنجابی کنکھیوں سے اس کو برابر دیکھتا رہا۔ مچھلی کا ڈبہ کھلتے ہی خوشبو کا ایک ایسا لطیف بھبکا نکلا کہ پنجابی کے منہ میں پانی آ ہی گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ مچھلی تو بڑی اچھی چیز ہوتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے مچھلی کی مقدار ڈبے میں سے کم ہوتی گئی۔ پنجابی کا۔ (جو شاید کافی دیر سے بھوکا تھا) پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے یہ کہہ کر مہر سکوت توڑا "کیوں بابو! سنا ہے مچھلی دماغ کے لئے بہت اچھی غذا ہے، شاید اسی وجہ سے بنگالیوں کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔"

بنگالی۔ "ہاں ہم بھی سنتا ہے کہ مچھلی کوپڑی (دماغ) کو بہت زور دیتا ہے۔"

پنجابی۔ "اگر آپ اس وقت بیچیں تو میں مچھلی کے دو قتلوں کے دو آنے دوں۔ بڑی بھوک لگی ہے کانپور پر بھی کچھ نہ خرید سکا۔"

بنگالی۔ "نہ بابو ہم مچھلی بیچتا نہیں ہے، ہم آپ کھاتا ہے۔"

اس وقت پنجابی کا بھوک کی شدت سے برا حال تھا اس کو کھانا کھائے کافی دیر ہو چکی تھی۔ التجا کے انداز میں اس نے کہا "اچھا، میں تمھیں دو قتلوں کے چار آنے دوں گا۔"

بنگالی:۔ "ہم چار آنے میں بھی دینا نہیں مانگتا ہے۔"

پنجابی کو بڑا تاؤ آیا۔ جی میں آیا کہ اس کلے پستہ قد آدمی کو توڑ مروڑ کر باہر پھینک دے۔ پھر کچھ سوچ کر جیب سے اٹھنی نکالی اور کہا "اچھا لو آٹھ آنے"

بنگالی نے چمکتی ہوئی چاندی پر دو پوروں کی مضبوط گرفت کی اور کاغذ پر مچھلی کے دو قتلے رکھ کر پنجابی کے حوالے کئے۔

پنجابی نے مزے لے لے کر قتلوں کو چٹ کرنا شروع کیا۔ ابھی مچھلی کا آدھے سے کچھ کم قتلا باقی تھا کہ پنجابی نے ایک خاص انداز سے بنگالی کی طرف دیکھا اور کہا "بنگالی بابو، تم نے دو قتلوں کے آٹھ آنے مجھ سے بہت زیادہ لے لئے۔"

بنگالی کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "دیکھو دیکھو بابو تم تو بہت عقل مند ہوگیا۔ مچھلی نے تمھاری کوپڑی (دماغ) کو زور دیا۔"

خیال رکھئے

جن لوگوں کا چندہ دسمبر میں ختم ہوگیا ہے وہ زیادہ سے زیادہ اپنا چندہ ۲۲ دسمبر تک ضرور بھیج دیں۔

جو خریدار چاہتے ہیں کہ ان کو سالنامہ محفوظ طریقے پر ان تک پہنچ جائے وہ ۲ کے ٹکٹ پہلے ہی سے بھیج دیں تاکہ رسالہ انھیں رجسٹری کے ذریعے سے بھیجا جائے سالنامہ دوبارہ نہیں بھیجا جائے گا۔ سالنامے کا وی۔ پی۔ وصول نہ کرنے والے حضرات اگر اپنے فیصلے سے دفتر کو پہلے ہی مطلع کر دیں تو بہتر ہے۔

دس منٹ کے وقفے کے بعد لڑکوں نے کھیلنا شروع کیا۔ اساتذہ فیلڈنگ کے لئے میدان میں جم کر کھڑے ہوگئے۔ لڑکوں کی طرف سے پہلے ابوبکر اور عبدالشکور کھیلنے کے لئے آئے۔ لڑکوں اور استادوں نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ یہ دونوں بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔ ان کا کھیل بہت اطمینان کا ہوتا ہے اور وجیہہ بھی ہیں۔ خاص کر ابوبکر کے کھیل میں ایک شان ہے۔ یہ رن بھی کافی بناتے ہیں۔

پہلے ابوبکر نے کھیلنا شروع کیا۔ پہلی گیند تو آزمانے کی خاطر روکی۔ دوسری پر ایک رن بنایا۔ اب عبدالشکور بالر کے سامنے ہیں اُنھوں نے پہلی گیند پر چوّا لگایا اور دوسری پر تین رن بناکر ابوبکر کی جگہ لے لی۔

مخالف بالر اُن کو جمنے کا موقع نہیں دینا چاہتے لیکن یہ جوڑا بھی کم چالاک نہیں ہے۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ مارنے والی گیند کو مارتے ہیں اور روکنے والی کو روکتے ہیں۔ ابوبکر نے ایک اور چوّا لگایا۔ اُستادوں نے اپنی فیلڈنگ بڑھالی۔ باؤنڈری پر ان لوگوں کو رکھا ہے جو تیز دوڑ سکتے ہیں لیکن یہ سارا اہتمام بے کار ثابت ہو رہا ہے۔ ابوبکر کا صحیح کھیل ان لوگوں کو کیچ کا موقع نہیں دے گا۔ آج اُن کا ہاتھ جم گیا ہے۔ ان کا دوسرا ساتھی بھی کچھ پیچھے نہیں ہے۔ اساتذہ کو اطمینان سے کھڑے رہنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ بال کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھکے جا رہے ہیں۔ اُستادوں کے کپتان نصیر احمد صاحب جلد جلد بالر بدل رہے ہیں۔

گیند احمد علی صاحب کے ہاتھ میں ہے بہت اچھی گیند پھینکتے ہیں۔ ان کی گیندیں بریک (Break) ہوا کرتی ہیں۔ وہ لیجئے عبدالشکور آوٹ ہوگئے۔ اُنھوں نے ایک ہلکی گیند پر ہٹ مارنے کی کوشش کی گیند بلے کے کنارے لگ کر سیدھی وکٹ میں

گھس گئی ۔ اُستادوں کی تعداد ہی کتنی ہے ذرا سی دیر میں تالیاں ختم ہوگئیں۔

دوسرے کھلاڑی خلیل خاں ہیں یہ اچھے کھلاڑی ہیں۔ سنبھل کر کھیلتے ہیں۔ گھبرانے کا نام نہیں لیتے جیوں ہی یہ میدان میں داخل ہوئے بعض اُستادوں نے مجھ سے چپکے سے وقت پوچھا۔ میں نے کہا اُن کے آؤٹ ہونے کے بعد بتلاؤں گا۔ خلیل خاں نے پہلی ہی گیند پر اوور باؤنڈری یعنی چھکا لگایا اس چھکے سے لڑکے اتنے خوش ہوئے کہ دیر تک کچھ بولتے رہے۔

ابوبکر اب پھر کھیل رہے ہیں۔ دو رن بنائے اب تک یہ پانچ رن بنا چکے ہیں۔ اُستاد چاہتے ہیں کہ یہ کسی طرح آؤٹ ہو جائیں تاکہ کم زور کھلاڑیوں کو چھیڑنے کا موقع ملے۔

خلیل خاں بھی آج ہاتھ کی صفائی دکھانا چاہتے ہیں۔ برکت صاحب کی گیندیں ذرا مہذب قسم کی ہوتی ہیں۔ خلیل خاں ان کی خبر لے رہے ہیں۔ اس جیتے ہوئے کھیل کو دیکھ کر بعض اُستادوں نے مجھ سے کہا تمھارے وقت کا سب لوگ اعتبار کرتے ہیں اعلان کر دو کہ وقت ختم ہوگیا ہے۔" میں نے کہا" لڑکے مجھے بے ایمان کہیں گے۔" اتنے میں ایک اور چوّے کا شور سنائی دیا۔ کھیل ساڑھے بارہ بجے ختم ہونے والا تھا۔ ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے زور سے کہنا شروع کیا۔ ساتھی سمجھے کہ بے ایمانی سے وقت ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہے) "حضرات ساڑھے بارہ میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجتے ہی کھیل ختم ہو جائے گا۔"

اُستادوں اور لڑکوں کے رنوں میں صرف ۱۰ کا فرق ہے۔ ابوبکر اور خلیل خاں اس فکر میں ہیں کہ وقت سے پہلے پندرہ سے زیادہ رن بن جائیں۔ اُستاد چاہتے ہیں کہ گنتی بڑھنے نہ پائے تاکہ بغیر کسی فیصلے کے کھیل ختم ہو جائے۔ لڑکے اپنی جگہ خوش ہیں۔ اب گھڑی پر نگاہ ہے۔ غرض اس اعلان کے بعد ایک نئی جد وجہد کا کھیل شروع ہوا۔

وہ لیجئے ابوبکر نے "چوا" لگایا۔ کون لڑکا ہے جس نے تالی بجانے میں حصّہ نہ لیا ہو۔ خونچے والوں کے ہاں بھی اب کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ تمام لوگ اس آخری کھیل کی طرف متوجہ ہیں۔ یہ برکت صاحب کے اوور کی آخری گیند تھی۔

اب احمد علی صاحب کے ہاتھ میں گیند ہے۔ یہ بہت سنبھل سنبھل کر بالنگ کر رہے ہیں۔ لیکن اب کی دفعہ ایک ایک رن کی دوڑیں ایسی ہونے لگیں کہ لڑکوں کو اور شور کرنے کا موقع مل گیا۔ تم جانو جن کھلاڑیوں کی پشت پر سینکڑوں لڑکے ہوں اُن کی ہمت کیسے نہ بڑھے۔ یہ شور تو بزدل سے بزدل کھلاڑی میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے کسی بڑی خوشی کے

انتظار میں خاموش ہیں ۔ لیجئے ایک بارگی شور ہوا ٹوپیاں ہوا میں نظر آنے لگیں ۔ لڑکوں نے تالیوں کی گونج سے سارا میدان سر پر اٹھا لیا ہے ۔ اچھل کود ہو رہی ہے ۔ پھولے نہیں سماتے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ استادوں کے رنوں سے دو رن بڑھ گئے ہیں اب میری نظر بھی ہر وقت کلائی پر ہے ۔ گیند کو بلے پر روکنے کی ٹپ ٹپ آواز آ رہی ہے ۔ لیکن کھلاڑی اس فکر میں ہیں کہ آخری لمحوں میں جھکنے کا نہیں تو چوکے کا ہاتھ دکھا دیں ۔ میں نے حسن خاں چپراسی سے کہا " تیار ۔۔۔۔ چلو" ٹن ٹن گھنٹی بجنے لگی ۔ پھر وہی پہلا سا ہنگامہ +

حسابی چٹکلا

مونا ، بھوپال

مدت کی بات ہے کہ دو مسافر روزگار کی تلاش میں پردیس کے لئے اپنے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے ۔ ایک مسافر کے پاس دو روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین ۔

چلتے چلتے ایک پڑاؤ کیا ، وہاں ایک مسافر پہلے سے موجود تھا ۔ اس کے پاس کھانے کا کوئی سامان نہ تھا ۔ جب یہ دونوں مسافر کھانا کھانے بیٹھے تو تیسرے مسافر نے ان سے درخواست کی کہ مجھے بھی ساتھ کھلا لو ۔ میں قیمت ادا کر دوں گا ۔ دونوں نے یہ بات منظور کر لی اور سب کھانا کھانے لگے ۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو تیسرے مسافر نے پانچ پیسے ان کو دئے اور کہا اپنا حصہ بانٹ لو ۔ یہ کہہ کر وہ تو اپنے راستے چلا گیا ۔ جس مسافر کے پاس دو روٹیاں تھیں اس نے دو پیسے خود لئے اور تین پیسے تین روٹیوں والے مسافر کو دینے لگا ۔ اس نے اعتراض کیا کہ مجھے کم دے رہے ہو ۔ بات بڑھی دونوں میں جھگڑا ہونے لگا ۔ آخر یہ طے پایا کہ انصاف کے لئے قاضی کے پاس چلو

دونوں قاضی کے پاس پہنچے اور قصہ بیان کیا ۔ قاضی نے کہا ۔ تین روٹی والا مسافر سچ کہتا ہے ۔ اس کا اعتراض صحیح ہے ۔ اچھا ۔ اب تم سوچو قاضی نے کیا فیصلہ کیا ہوگا اگر سمجھ میں نہ آئے تو نیچے اس کا حل دیکھو اور اپنے ماسٹر صاحب سے اس کا حل سمجھو ۔

قاضی صاحب نے فیصلہ کیا کہ دو روٹی والے مسافر کو ایک پیسہ ملے گا اور تین روٹی والے مسافر کو چار پیسے

کیوں ؟

پنسل ہماری روزمرّہ کی ضرورت کی چیز ہے ۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سرمے سے بنتی ہے ۔ یہ خیال غلط ہے ۔ یہ اصل میں ایک دھات سیاہ سیسے (باگر یفائٹ) سے بنائی جاتی ہے اور بار، پہلے پنسل ایک دوسری چیز کا نام تھا ۔ تصویر بنانے والے آرٹسٹ اور پینٹر جو برش استعمال کرتے تھے وہ پنسل کہلاتا تھا، بلکہ اونٹ کے بالوں والے برش اب بھی پنسل ہی کہلاتے ہیں ۔

کہتے ہیں پنسل کوئی نئی ایجاد نہیں ہے ۔ پندرھویں صدی عیسوی (آج سے کوئی چار سو برس پہلے) کے ایک شخص تھیوفلس کی ایک تحریر ملی ہے ۔ اس میں لکیریں پنسل سے کھنچی ہوئی ہیں اصل میں کوئی ۱۵۶۵ء کی بات ہے کمبرلینڈ کے پاس سیاہ سیسے یا گریفائٹ کی کان نکلی تھی ۔ بس جبھی سے پنسلیں بننے لگیں ۔ مگر یہ ایک ہی کان تو اس کام کے لئے کافی نہ تھی ۔ اس لئے پنسلیں زیادہ نہیں بن سکتی تھیں ۔ آخر بہت تلاش کے بعد زیمبری کے مقام پر ایک کان اور نکلی ۔ اب پنسل بنانے کی تجارت میں خوب ترقی ہوئی ۔ سنہ ۱۷۶۱ء میں اس کا بہت بڑا کارخانہ بھی قائم ہو گیا ۔

۱۷۹۵ء میں ایک شخص این جے کانٹے نے پنسل بنانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا یہ اتنا اچھا اور مفید ثابت ہوا کہ اب تک اسی طریقے سے پنسلیں بنائی جاتی ہیں ۔ مگر ایک کمی اب بھی باقی تھی یہ پنسلیں مہنگی بہت ہوتی تھیں ۔ ایک شخص بروکڈن نے ایسا طریقہ معلوم کیا کہ سیسے کے بے کار ذرّے بھی کام آنے لگے ۔

آج کل پنسلیں زیادہ تر کالے سیسے کی مٹی سے بنائی جاتی ہیں ۔ بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے سرمے کے سفوف کو مختلف حوضوں میں سے گذارتے ہیں اس طرح بھاری ذرّے نیچے بیٹھ جاتے ہیں ۔ جو مادہ باقی رہ جاتا ہے اس سے بڑھیا قسم کی پنسلیں بنائی جاتی ہیں مٹی کو اتنا صاف کیا جاتا ہے کہ اس میں لوہے اور ریت کا کوئی ذرہ باقی نہیں رہتا ۔ پھر سیسے کے سرمے اور اس مٹی کو پانی میں حل کر کے لئی سی بنا لیتے ہیں ۔ پھر ایک مشین میں ڈالتے ہیں اس سے یہ لئی سرلیش کی

طرح چیک دار ہو جاتی ہے۔ بعد میں اسے شکنجے میں کس دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ گندھے ہوئے آٹے کی طرح بن جاتی ہے۔ اب اسے ایک لمبے سلنڈر میں بھر دیتے ہیں اور ایک کھوکھلے سلنڈر یا بیلن میں سے گذارتے ہیں اور سرمے کی قلم یا لمبی گول سلائیاں تیار ہو جاتی ہیں وہی جس سے تم لکھتے یا لکیریں کھینچتے ہو۔

پنسلیں سخت اور نرم یا کچی اور پکی دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔ پکی پنسل کے مسالے کو گرمی زیادہ پہنچائی جاتی ہے۔ کچی پنسل میں سُرمہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے مسالے کو گرمی کم پہنچائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچی پنسل کا لکھا ہوا زیادہ روشن اور گہرا ہوتا ہے۔

اب سُرمے کی یہ سلائیاں لکڑی کے خول میں رکھی جاتی ہیں۔ بڑھیا پنسلوں کے لئے دیودار کی اور معمولی پنسلوں کے لئے صنوبر یا چیڑ کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ لکڑی کا چھ پنسلوں کی چوڑائی کا تختہ مشین میں رکھ کر چھیلا جاتا ہے۔ اس سے تختے میں چھ چھ خول ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے کناروں پر سریش لگا کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشین سے کاٹ کر وارنش اور رنگ پھیرتے ہیں۔ پنسل کا نام اور ٹریڈ مارک بھی ساتھ ہی ساتھ چھاپ دیتے ہیں۔

رنگین پنسلیں چربی، مٹی، موم اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ملا کر بناتے ہیں۔ کوپنگ پنسلیں مٹی اور تیل کے ایک خاص مرکب سے تیار ہوتی ہیں۔ ان کا لکھا ہوا مٹ نہیں سکتا بلکہ پانی ڈالنے سے اور روشن ہو جاتا ہے۔ پنسلیں زیادہ تر امریکہ، جرمنی اور انگلینڈ میں بنتی ہیں۔ جاپان نے بھی ان کی بدولت روپیہ کمایا ہے۔ کچھ دنوں سے ہندوستان میں بھی یہ کام ہونے لگا ہے ❖

ظریف قاتل

(۲)

خاور جبلپوری

لیکن ظریف قاتل نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کرکے بدن پر لرزہ پیدا کرنے کے بعد بلند آواز سے کہا "ہشت" اور خواجہ سرا ایسا بدحواس ہوا کہ اپنے اوپر فیر ہوجانے کے خیال سے اُس کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ اسی سلسلے میں قاتل کی زندہ دلی کا ایک اور قصہ سننے میں آیا۔

حاجی کاظم، شاہی مسخروں میں ایک مشہور و معروف مسخرہ تھا اس کی ظرافت کی سارے ایران میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے فن میں اتنا ماہر اور ہوشیار تھا کہ بڑے بڑے حاضر جواب اس کے آگے لاجواب ہو جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ دربارِ عام میں ایک بوڑھے امیر کو شیر جنگ بہادر کا خطاب ملا جس وقت امیر نے شاہی خلعت پہن کر بادشاہ سلامت کو ادب سے سلام عرض کیا تو بادشاہ نے حاجی کاظم کی طرف دیکھ کر کہا "حاجی ہم نے اس پرانے وفادار کو شیر جنگ بہادر بنا دیا ہے تم بھی مبارک باد کہو۔" حاجی نے کھڑے ہو کر بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ واقعی جناب نے ان صاحب کے حسب حال خطاب عنایت فرمایا ہے کیونکہ یہ مجسم شیر ہیں صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ شیر اپنی دُم ہلایا کرتا ہے اور ان کا سر ہلتا رہتا ہے۔"

یہ سن کر سارا دربار قہقہوں سے گونج گیا اور بادشاہ کو بھی خوب ہنسی آئی۔

ایک روز حاجی کاظم نے مظفرالدین شاہ سے مرزا رضا کے پاس جا کر اپنی ظرافت سے رام کرنے کے بعد اصلیت معلوم کرنے کی اجازت لی۔ اور قاتل کے پاس پہنچ کر اس کی بلائیں لینے کے بعد بولا۔

"میں قربان جاؤں سچ سچ بتا تو نے بادشاہ کو کیوں مارا؟"

مرزا جھنجھلا کر کہنے لگا "اس وقت مجھے نہ ستاؤ میں ایک وفادار دوست کی یاد میں بیتاب ہوں اور کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

حاجی نے کہا "میرے دوست یہ ناچیز حاضر

ہے آپ مجھے اپنا سچا دوست سمجھ کر شوق سے باتیں کریں۔"

مرزا:- نہیں جی تم میرے کس کام آسکتے ہو۔

حاجی:- آخر کچھ کہو تو سہی؟ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔

مرزا:- اصل بات یہ ہے کہ ایک وفادار کتّا میرا دوست تھا جو ہمیشہ اپنی پیاری آواز سے مجھے خوش کیا کرتا تھا اگر تم بھی میری دوستی کا دم بھرتے ہو تو مہربانی کرکے تھوڑی دیر تک کتّے کی طرح بھونکو تاکہ مجھے تسکین ہو جائے اور اطمینان سے تمھارے سوالات کا جواب دے سکوں۔

جب حاجی کاظم نے اپنا کام نکالنے کی غرض سے زور زور سے بھونکنا شروع کیا تو مرزا رضا نے چلّا کر کہا" سپاہیو ادھر آؤ اور اس ناپاک کتّے کو یہاں سے ہٹا دو ورنہ بھونک بھونک کر میرا دماغ خراب کردے گا۔"

حاجی اپنی شکست پر شرمندہ ہو کر کہنے لگا "تو مجھ سے بھی بدذات نکلا" اور وہاں سے نامراد واپس ہو کر تمام قصّہ بادشاہ کو سنایا۔ بادشاہ بھی بہت ہنسے اور کہنے لگے "خیر تیرا اُستاد تو پیدا ہوگیا۔

ایک روز اعلیٰ حضرت نے مرزا کو اپنے حضور میں طلب فرما کر دریافت کیا کہ اگر تو سچ سچ بتادے گا کہ میرے والد کے قتل کی سازش میں کس کا ہاتھ تھا تو ممکن ہے تیری جان بچ جائے۔

مرزا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "حضور عالی یہ مانا کہ ساری دنیا میری اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی مگر آپ کو تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے کیونکہ میری ہی بدولت ابھی سے بادشاہی مل گئی اور میں نے یہ کام اسی غرض سے کیا بھی ہے۔"

بادشاہ کو اس کی ظرافت آمیز باتوں پر ہنسی آگئی مگر اُنھوں نے ضبط سے کام لے کر اُسے قید خانے میں واپس کر دیا۔

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب کی اصلاح کے بعد

ہماری آپا جان

[illegible]

جامعہ نگر اوکھلا میں آپا جان کے آنے کی خوشی میں جلسہ ہوا تھا۔ جامعہ کے ایک چھوٹے بچے [illegible] نے یہ نظم جلسے سے تھوڑی دیر پہلے دو چار منٹ میں [illegible] تھی۔

پونا میں تھیں آپا جان
پونا میں تھیں آپا جان
جیل سے چھٹ کر آئی ہیں
ساتھ میں خوشیاں لائی ہیں
شام کو آج وہ آئیں گی
باتیں ہم کو سنائیں گی
زندہ رہیں یہ آپا جان
زندہ رہیں یہ آپا جان
جرمن میں یہ پیدا ہوئیں
جامعہ میں چل کر آئیں
بچوں کو یہ پڑھاتی ہیں
اچھے کام سکھاتی ہیں
کھیل وہ سب کا دیکھتی تھیں
کپڑے بھی وہ دیکھتی تھیں
احمد نے یہ نظم لکھی
سب نے خوش ہو کر [illegible]
میری اچھی آپا جان
میری اچھی آپا جان

مینا

احسان الحق دہلی

میں نے ہے اک مینا پالی
پیاری پیاری کالی کالی
پر ہیں اس کے کیسے کالے
چونچ ہے اس کی جیسے لالے

آنکھیں تو اس کی نیلی ہیں
دیکھنے میں کیا خوب بھلی ہیں
[illegible] سناتی
باتیں مجھے ہے خوب سناتی
کبھی ہے پڑھتی کبھی ہے گاتی
خوب ہے گھر میں شور مچاتی

صبح سویرے ہی سے اُٹھ کر
احسان کو ہے خوب جگاتی

اسکول

عزیزہ [illegible] مومن علی حیدرآباد دکن

کیا [illegible] پیارا ہے
کیسا نیارا نیارا ہے
باغ بھی ہے چھوٹا سندر
تتلیاں بیٹھیں پھولوں پر
سندر ڈالی ڈالی ہے
اچھی مالن مالی ہے
لڑکیاں سیدھی سادی ہیں
بالکل بھولی بھالی ہیں
کھیلنے کے سامان [illegible] ہیں
کھیلوں کے میدان بھی ہیں

کیا [illegible] پیارا ہے
کیسا نیارا نیارا ہے

موٹر

افضال احمد۔ ساگر

موٹر آئی پوں پوں کرتی
پھر پھر پھر پھر دھول اڑاتی
صاحب بھیا کی یہ موٹر ہے
نیلی کالی یہ موٹر ہے

بیٹھ کے اس پر جاتے ہیں ہم
ہر پل پیتر لاتے ہیں ہم

کیسی اچھی موٹر ہے یہ
پیاری پیاری موٹر ہے یہ

جب تیزی سے یہ چلتی ہے
تتلی سی معلوم ہوتی ہے

تلی بے لی مجو پاپا
ریاض چچا پیارے دادا

سب اس پر بیٹھا کرتے ہیں
سیر کو سب جایا کرتے ہیں

جب میں بیٹھا ہوتا ہوں
رہ گیروں سے یہ کہتا ہوں

ایک طرف کو چلنا بھائی
دیکھ دیکھ کے چلنا بھائی

مت اس کے نیچے دب جانا
ناحق اپنی جان نہ گنوانا

بڑے زور سے سر سر جاتی
فر فر فر فر ہوا اڑاتی

نظم یہ افضال نے لکھی
عمر ہے جس کی آٹھ برس کی

سنو لڑکے

ام اقبال حسینہ چکردھرپوری

سنو بات میری کہ ہے لاجواب
بری عادتوں سے کرو اجتناب

کسی کو اگر گالیاں دو گے تم
تمہیں بھی وہ دے گا کا سا جواب

نہ جھگڑو کسی سے نہ منہ کو چڑاؤ
نہیں تو زمانہ کہے گا خراب

ابے اور تبے سے نہ باتیں کرو
کرو بات کے وقت تم جی جناب

نہ ہلڑ مچاؤ مدرسے میں تم
نہ غصے میں پھاڑو کسی کی کتاب

نہ ہوگے کبھی فیل رکھو یہ یاد
اگر دل لگا کر پڑھو گے کتاب

نہ حاصل کرو گے جو علم و ہنر
تو ہوگے یقیناً جہاں میں خراب

کرو کام اچھے اگر تم سدا
ملے اچھے لڑکے کا تم کو خطاب

اگر چاہتے ہو بنو تم بھلے
بری عادتوں سے کرو اجتناب

لکھو ایسی نظمیں کہ اقبال تم
بنو ہند میں شاعر لاجواب

پیام تعلیم

شیخ محمود صدیقی - صدیق

ایک اچھا سا رسالہ ہے پیام تعلیم
جو ہمیشہ ہمیں دیتا ہے پیام تعلیم

قصے دلچسپ نئی باتیں سنا کر کیا خوب
علم بچوں کا بڑھاتا ہے پیام تعلیم

کیسی نظموں و مضموں کو بنا کر اچھے
خوب ہی دل کو لبھاتا ہے پیام تعلیم

منتظر تھے بہت آیا تو ہم از حد خوش ہیں
عید کا چاند یہ گویا ہے پیام تعلیم

سچ کہو صاف رہو جھوٹ سے نفرت رکھو
ایسی باتیں ہی سکھاتا ہے پیام تعلیم

جاگو اور جگا لو کہ یہ دیتا تعلیم
ہم سے غفلت کو بھگاتا ہے پیام تعلیم

اس میں بچوں کے مضامین کئی ملیں گے ضرور
رہبر علم ہمارا ہے پیام تعلیم

باتیں صحت کی شجاعت کی ہنر کی علمی
ہم کو ہر ماہ سناتا ہے پیام تعلیم

کتنے پڑھنے میں لگا رہتا ہے ہر وقت صدیق
واہ کیا شوق بڑھاتا ہے پیام تعلیم

بچے

(سعید منڈیاہو)

ننھا منھا پیارا پیارا
سارے گھر کا راج دلارا

اماں کے دل کا وہ پارا
ابا کی آنکھوں کا تارا

سب سے چھوٹا سب سے پیارا

شبنم جیسے آنسو اس کے
کتنے پیارے کتنے اچھے

اشکوں کی وہ بوندیں پیاری
جیسے ہوں موتی کے گچھے

لگتے ہیں وہ مجھ کو اچھے

جب اسکول سے آتا ہوں میں
اس کو لیٹا پاتا ہوں میں

اس کے سرہانے جاتا ہوں میں
اس کو خوب ہنساتا ہوں میں

دل اپنا بہلاتا ہوں میں

ایک شیر

محمد صالح درجہ سوم ، عمر ۶ سال

ایک بادشاہ تھا وہ ایک شیر کے شکار کو گیا اور وہاں پر ایک شیر مار کر کھالیا اور پھر اپنی نئی موٹر میں بیٹھ کر گھر گیا اور اپنی ملکہ سے سب حال کہا۔ ایک دن وہ پھر شکار کو گیا۔ آج وہ اپنی ملکہ کو بھی لے گیا اور پھر ایک شیر مار کر دونوں نے آدھا آدھا بانٹ لیا اور دونوں نے کھالیا۔ اور پھر دونوں گھر گئے۔ آج وہ بے حد خوش تھے چونکہ آج دونوں نے بانٹ کر کھایا تھا اور لڑائی نہیں ہوئی تھی

اپنا کمرہ سجانا

اجمل خاں، ایبٹ آباد

ہر لڑکا امیر ہو یا غریب اُس کو شوق ہوتا ہے کہ وہ اپنا کمرہ سجائے۔ اِس کے کمرے میں اگر ایک الماری ہو تو بہت اچھا ہے۔ عام الماریوں میں چار خانے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ بہت اچھی ہے۔ الماری کے پہلے خانے میں کھیل کی جیتی ہوئی چیزیں اپنے کپ، انعام اور اپنے کھلونے سجا کر رکھو۔ اور اِن کے ساتھ ہی ایک ڈبہ بنا لو جس میں تمھاری وہ نقدی ہو جس سے تُم اپنے کھلونے خرید سکو۔ دوسرے خانے میں اپنی جمع کی ہوئی کتابیں اور رسالے رکھو۔ اور اُس خانے میں بھی ایک ڈبہ رکھو جس کی نقدی سے تم کہانیوں کی کتابیں خریدو اور تیسرے خانے میں اسکول کی کتابیں رکھو۔ اُن پر نمبر بھی لگاؤ تاکہ کوئی کتاب کھوئے نہیں۔ اور اس خانے کے سرمائے سے تعلیم کے کام کی چیزیں کاغذ، قلم دوات خریدو۔ چوتھے خانے میں فالتو قلم دان، ہولڈر، پنسل رکھو۔ تاکہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔ کھیل کا سامان بھی اسی خانے میں ہو۔ اس خانے والی نقدی سے کھیل کا سامان خریدو۔ اب الماری کو مقفل کر دو۔ اگر کمرے میں کوئی دری ڈال دی جائے تو بہتر رہے گا۔ دو میزیں اور چار پانچ کرسیاں کمرے میں رکھو۔ ایک میز پر آئینہ، کنگھی، تیل، برش، ٹوتھ کریم سجا کر رکھو۔ دوسری میز پر قلم دان اور نوٹ بک رکھو ایک اسٹینڈ بازار سے خرید لاؤ جس پر جوتے رکھے جاتے ہیں اور اس کو دروازے کے ساتھ رکھ دو۔ بس سجا ہوا کمرہ تیار ہے ۔

سِکندر اور ارسطو

فضل محمد جگر سلائی

سکندر:- اے استاد - خدا سے کیا مانگنا چاہیئے؟

ارسطو:- دونوں جہاں کی نیکی۔

سکندر:- عمر کس کام میں گذارنی چاہیئے؟

ارسطو:- علم حاصل کرنے میں۔

سِکندر:- وہ کون سی آگ ہے جو زندہ آدمی کو جلا ڈالتی ہے؟

ارسطو:- حسد کی آگ۔

سکندر:- وہ کون سی چیز ہے جو آخر میں میٹھی ہو جاتی ہے؟

ارسطو:- صبر

سکندر:- وہ کون سا لباس ہے جو میلا نہیں ہوتا؟

ارسطو:- نیک نامی۔

سکندر:- عقل مند کسے کہتے ہیں؟

ارسطو:- جو کم کہے زیادہ سُنے۔

سِکندر:- دل کی تاریکی کیا ہے؟

ارسطو:- کنجوسی اور دولت کا لالچ۔

حامد و محمود

محمد ابراہیم قاضی بھیونڈی

اتوار کا دن تھا۔ ارشد صاحب صُبح کے وقت آنگن میں آرام کرسی پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً پھاٹک سے کسی نے آواز دی "بابوجی دو دن سے بھوکا ہوں۔ کچھ کھلا دیجیئے" ارشد صاحب نے اخبار سامنے سے ہٹایا تو ایک دس سال کا لڑکا چیتھڑوں میں لپٹا، بال پریشان۔ ہاتھوں، پاؤں پر گرد جمی ہوئی، رنج و غم کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیسا درد تھا جس نے ارشد صاحب کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس کے حالات معلوم کریں۔ بچے نے بہت ہی درد بھری آواز میں کہا "میرے باپ ایک چھوٹی سی دوکان کے مالک تھے کچھ زمین بھی تھی جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے گھر کا خرچ آسانی سے چل جاتا تھا۔ میں اپنے

باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، جس کی وجہ سے میری پرورش بڑے لاڈ پیار میں ہوئی۔ اس زمانے میں اسکول جایا کرتا تھا میں ابھی تیسری جماعت میں تھا کہ میرے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مجبوراً میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں اور میری ماں اپنے ماموں کی سرپرستی میں چلے گئے۔ کچھ دن نہ گذرے تھے کہ ماں بھی مجھ بدنصیب کو اُس دُنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس وقت میری عُمر ۹ سال کی تھی۔ ماں کی موت کے بعد ماموں کی مہربانیاں کم ہونے لگیں۔ ماموں کی بے رُخی اور مُمانی کی سختی نے مجھ کو مجبور کیا کہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں چنانچہ ایک روز بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے شہر کی راہ لی۔ وہاں پر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ہوٹل میں پیالیاں صاف کرنے کی جگہ ملی۔ چند دن گذرے کہ اس ہوٹل کا بھی دیوالہ نکل گیا۔ بہت کوشش کی کہ نوکری مل جائے مگر نہ جانے کیوں کوئی پاس بھی نہ پھٹکنے دیتا تھا۔ دو تین دن اسی طرح گذرے۔ بھوک کی شدت حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اور اب دو دن سے فاقہ ہے۔ ارشد صاحب کا دس سالہ بچّہ حامد بھی اِدھر آگیا تھا اور یہ باتیں سن رہا تھا۔ فقیر حامد کی طرف دیکھ کر بولا ارے حامد تُم نے نہیں پہچانا میں تمہارا وہی دوست محمود ہوں۔ حامد نے جب اپنے پُرانے ہم جماعت کا نام سُنا تو خوشی سے اُچھل پڑا اور محمود کو بہت محبت اور خلوص سے گلے لگایا۔ ارشد صاحب نے جب اپنے بچّے کو ایک غریب بچّے سے اس محبت اور خلوص سے ملتے دیکھا تو خوش ہوئے۔ دوسرے دن آنگن میں حامد و محمود دونوں اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

ہم لوگوں کی تفریح

فہیم جہاں بیگم قزلباش۔ آگرہ۔

برسات کا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسے پرلطف موسم میں کہیں تفریح کو جانا چاہیے اور میں مع اپنی چند سہیلیوں کے تاج محل کی سیر کے لئے روانہ ہوگئی شام کا وقت تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا اور اس پر پانی کے قطرے ایسے معلوم ہو رہے تھے گویا سبز مخمل پر سچّے موتی۔

میں:۔ "ارے بھائی بلبل اس وقت تُمہارا گانا ہونا چاہیے۔"

رشیدہ:۔ "اب تو میں کبھی نہ سناؤں گی۔ پھر کہا تم نے مجھے بلبل۔"

میں:۔ "اچھا سنادو۔ پیاری رشیدہ، رشیدہ۔"

سلمہ:۔ "نہیں بھئی آج رشیدہ بیگم صاحبہ ہی کو گانا ہوگا۔"

زرینہ:۔ (اچھل کر) "بھئی سب مل کر ایک ساتھ گائیں نا۔ مجھے تو اس طرح گانا بہت پسند ہے۔"

سب:۔ "ہاں ہاں یہ زرینہ کی تجویز بہترین ہے۔"

سب نے مل کر گانا شروع کیا

فصل بہار چھائی گھٹا گھنگور گھور
کوئل کی کوک پیاری بلبل کا زور شور
زور دے کر ———— بلبل کا زور شور

رشیدہ (بگڑ کر) بُلبُل بُلبُل یہ مجھے اچھا نہیں لگتا کوئی اور گانا گاؤ۔

سلمہ (قہقہہ لگا کر) کیا بُلبُل کا نام ہی دنیا سے مٹادو گی اچھا پھر تم ہی بتاؤ کون سا گائیں۔ رشیدہ کی تجویز پر میری ایک نظم سب نے مل کر گانا شروع کی

رُت ہے برسات کی بہت پیاری ❖ موجزن جھیلیں ندیاں پیاری ۴۴۴

۴۴۴ واہ واہ کا ہم سب نے مل کر خوب شور مچایا۔ اب رات زیادہ ہوگئی تھی ہم لوگ ملازم کے اصرار پر تھکے ماندے روانہ ہوئے۔ رستے میں بھی چیزیں نہ لیا اور شعر ارتم کرتے ہوئے گھر واپس آگئے۔

تم نے اکثر میلوں میں بساطیوں کی دُکان پر ایک چھوٹی سی نوٹ بک کی قسم کا ایک کھلونا دیکھا ہوگا اس میں اگر پیسہ بند کرکے کھولو تو غائب ہوجاتا ہے اور دوبارہ کھولو تو موجود ۔۔۔ اتفاق سے ایک روز میاں عمران بازار سے وہی کھلونا خرید لائے اور گھر میں یہ جادو دکھانا شروع کیا۔ سب نے خوب تعریفیں کیں۔ لیکن زبیدہ بی بی نے ایک نیا تماشا دکھانا شروع کیا۔ ہوا یہ کہ پہلے تو اُنھوں نے میاں عمران سے وہ کھلونا مانگا اور جب اُنھوں نے دینے سے انکار کیا تو زُبیدہ بی بی نے مُنہ بسور کر رونا شروع کیا اور وہ اودھم مچا کہ اللہ تیری پناہ۔ رئیس نے جو یہ سُنا تو عمران میاں سے یہ کھلونا لے لیا اور تھوڑی دیر میں ویسا ہی ایک دوسرا بنا کر زبیدہ بی بی کو دے دیا تب جاکر میاں عمران کی جان چھوٹی۔ ہم تم کو ترکیب بتلائے دیتے ہیں تاکہ تُم بھی اپنے بھائی بہنوں کے لئے بنا سکو خود بھی کھیلو اور دوسروں کو بھی دکھاؤ۔ ترکیب کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے صرف تھوڑی سی دفتی ذرا سا پرانا کپڑا تھوڑا سا رنگین کاغذ اور ذرا سی لئی یا گوند کی ضرورت ہوگی

سامان :۔

دفتی کے دو ٹکڑے "۴ × "۶ ۔ کپڑے کی تین دھجّیاں "۵ × "½ ۔ رنگین کاغذ کے دو ایک ہی رنگ کے ٹکڑے "۳½ × "۳½

پہلے ایک دفتی پر لمبائی کی طرف دو دھجّیاں قریب "½ کے اس طرح چپکا دو کہ کناروں سے تقریباً "½ فاصلہ رہے۔ تیسری دھجّی کو اسی دفتی کے درمیان دوسرے سرے پر "۱ کی جگہ چپکا دو (دیکھو خاکہ نمبر۱) اب ان تینوں دھجیوں کو دفتی کے نیچے سے نکال کر دوسری طرف لاؤ یعنی جس طرف دو دھجّیاں تھیں اِدھر ایک والی دھجّی کا سرا آگیا اور جس طرف ایک دھجّی تھی اُدھر دو والی دھجّیوں کے سرے آگئے۔ (دیکھو خاکہ نمبر۲) اب تمھارے پاس ایک دفتی
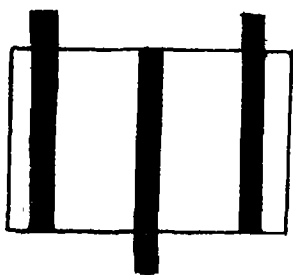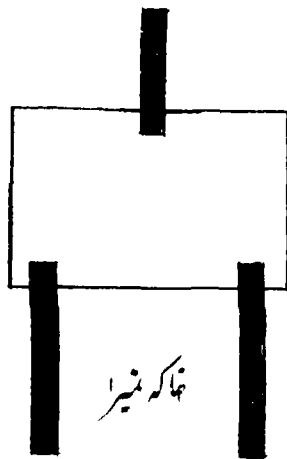
خاکہ نمبر ۱

خاکہ نمبر ۲

باقی ہو۔ اس کو تم اس دفتی پر برابر رکھو یعنی چٹیں درمیان میں رہیں اور سرے دو ایک طرف اور ایک دوسری طرف نکلا ہوا رہے۔ اِن تینوں سروں کو تم اسی دفتی پر اوپر کی طرف چپکا دو (دیکھو خاکہ نمبر ۲) اچھا اب اس کی خصوصیت یہ ہو جائے گی کہ اوّل تو یہ ایک چھوٹی نوٹ بک کی طرح معلوم ہوگی اور دوسرے یہ کہ اس کو لمبائی کی طرف سے دونوں طرف کھول سکتے ہیں۔ اب اس کو خشک ہونے کے لئے چھوڑ دو اور تم دوسری چیز بناؤ۔

رنگین کاغذ کے ٹکڑوں کو ہر طرف تین برابر حصّوں میں تقسیم کرو اور نمبر ۴ کی طرح خط کشیدہ حصوں کو باری باری موڑ دو۔ اب اپنی بنائی ہوئی نوٹ بک کو کھولو۔ اور درمیان والی دھجی کے بالکل بیچ میں موڑے ہوئے کاغذ کی پشت چپکا کر بند کر دو۔ اب دوسری طرف سے نوٹ بک کھولو اور اسی درمیانی دھجی پر دوسرا موڑا ہوا کاغذ پہلے موڑے ہوئے کاغذ کی پشت سے پشت ملا کر ٹھیک سے چپکا دو۔ اب تمہیں ایک ہی موڑا ہوا کاغذ معلوم ہوگا کیونکہ دوسرا اس کے نیچے چھپ گیا ہے یعنی دونوں کاغذوں کی پشتیں ٹھیک ٹھیک ایک میں چپک گئی ہیں۔ لیکن درمیان میں ایک دھجی ہے اب اس کو خشک ہونے کے لئے رکھ دو۔

خاکہ نمبر ۳

خاکہ نمبر ۴

تمھارا کھلونا اب تیار ہو گیا ہے۔ اب لگے ہاتھوں اس کے کھیلنے کی ترکیب بھی سن لو کسی دوست سے ایک پیسہ لے کر نوٹ بک کھولو اور پھر مڑے ہوئے کاغذ کو کھول کر درمیان میں پیسہ رکھ کر پہلے کی طرح بند کر دو۔ اور دوست سے کہو کہ تمھارا پیسہ غائب ہو گیا ہے تمھارے دوست کو یقین نہ ہوگا اور وہ کہے گا "واہ دیکھیں تو کیسے غائب ہو گیا۔"
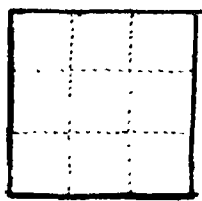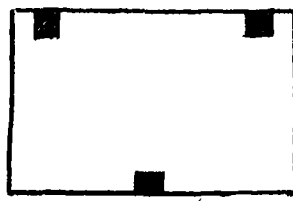
تم ذرا ہوشیاری سے نوٹ بک کو دوسری طرف سے کھول کر دکھاؤ تو وہ تعجب کرے گا لیکن تم پھر اس طرف سے کھولو جس طرف پیسہ رکھا تھا اور پیسہ نکال کر دکھا دو اس کو اور زیادہ تعجب ہوگا۔ جس کو دکھاؤ گے واہ واہ کرے گا۔ کہو ہے مزے دار کھیل۔ دفتی پر رنگین کاغذ لگا کر اس کو خوب صورت بنا سکتے ہو۔

خاکہ نمبر ۵
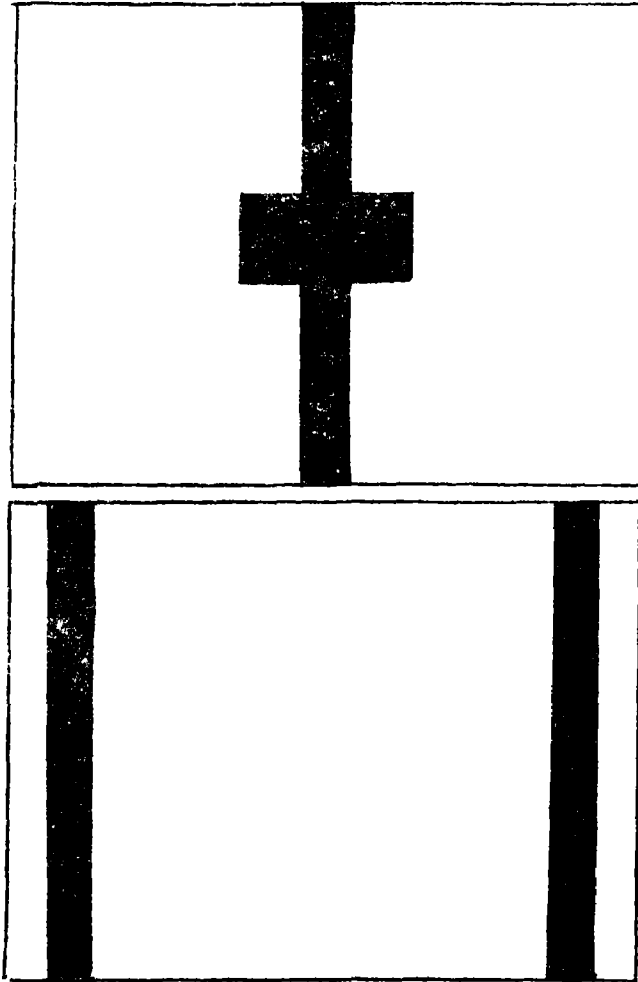
لڑائی کے ہتھیار
مرسلہ محمد عبدالحی - حیدر آباد دکن
گولی
قیمت ایک آنہ
بالو کے تھیلے
قیمت دو آنے
پستول
قیمت پچاس روپے
بندوق
قیمت ایک سو روپے
مشین گن
قیمت ایک ہزار آٹھ سو روپے
برات بلون
قیمت دس ہزار روپے
ہلکی انٹی ایرکرافٹ گن یعنی ہوائی جہاز گرانے والی بندوق
قیمت چالیس ہزار روپے
جنگی ہوائی جہاز
قیمت ایک لاکھ دہ ہزار روپے
بم برسانے والے ہوائی جہاز
قیمت ایک لاکھ ستائیس ہزار روپے
ڈسٹرائیر (برباد کرنے والا جہاز)
قیمت (ساٹھ لاکھ روپے)
کروزر (دشمن کی تلاش کرنے والا جہاز)
قیمت ڈھائی کروڑ روپے
جنگی جہاز
قیمت ساڑھے دس کروڑ روپے
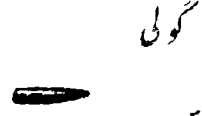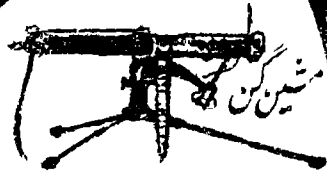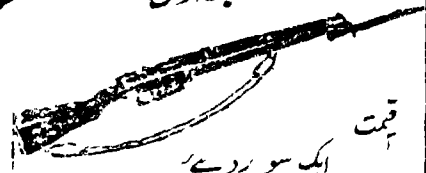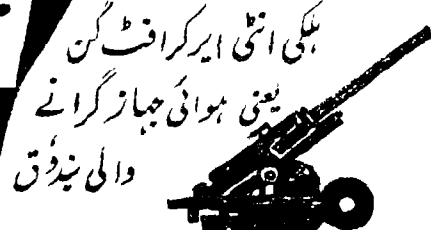
عزیز بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔ یہی سال کا آخری مہینہ آپہنچا۔ سردی بھی خوب پڑنے لگی ہے یہ کھانے، پینے، کھیلنے، کودنے اور پڑھنے کا موسم ہے اور ہاں یہی اس مہینے کے آخر میں یا پہلی جنوری تک تمھارا سالنامہ بھی نکلے گا۔ مضمون تو بڑے اچھے اچھے آرہے ہیں۔ نظمیں بھی اور کہانیاں بھی۔ اِس مرتبہ چیزوں کی مہنگائی کی وجہ سے معاملہ بہت مشکل ہوگیا ہے پھر بھی ہم اپنی طرف سے تو کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں گے۔

پچھلے مہینے بھی لڑائی کا رنگ وہی رہا۔ جرمنی لینن گراڈ اور ماسکو کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ سردی اور برف باری کی وجہ سے جرمن فوجوں کو بہت دقتیں پیش آرہی ہیں۔ پچھلے مہینے اسٹالن کی بہت اہم تقریر بھی ہوئی تھی اس میں اُس نے دعویٰ کیا ہے کہ روسی سپاہی بہادری میں جرمن سپاہیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ہاں روس کے پاس بھاری ٹنکوں کی کمی ہے اس لئے اُسے دقت پیش آرہی ہے اسے یورپ کی حکومتوں سے شکایت بھی ہے وہ کہتا ہے یورپ میں یا کہیں اور جرمنی کے خلاف لڑائی چھیڑ دی جائے تو جرمن فوجوں کی طاقت اور توجہ بٹ جائے گی اور پھر اُسے شکست دینا آسان ہو جائے گا۔ اپنی تقریر میں اُس نے یہ بھی کہا کہ اب تک ۴۵ لاکھ جرمن سپاہی مارے جاچکے ہیں یا قید اور زخمی ہوئے ہیں اس کے مقابلے میں روسی سپاہیوں کی تعداد ۱۳ لاکھ بتائی[۴۴] اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جرمنی نے بار بار انگریزوں کی طرف صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر اس بات کو اس کی کمزوری پر محمول کیا گیا اور جرمنی کے لئے سوائے لڑائی کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے تیسرے دن برطانیہ کے وزیر اعظم کی تقریر شائع ہوئی اس میں اُنھوں نے کہا کہ اب ہماری ہوائی طاقت دشمن سے زیادہ نہیں تو برابر تو ضرور ہوگئی ہے اُنھوں نے جاپان کو بھی تنبیہ کی اگر امریکہ سے لڑائی چھڑی تو برطانیہ بھی ایک گھنٹے کے اندر لڑائی کا اعلان کر دے گا۔

جرمنی کے شہروں اور جرمنی کے مفتوحہ علاقوں کے شہروں پر انگریزی ہوائی جہازوں کے حملے برابر ہو رہے ہیں۔ اور اب تو افریقہ میں لیبیا پر انگریزی فوجوں نے حملہ بھی کر دیا ہے اور انگریزی فوجیں ۵۰ میل آگے بڑھ گئی ہیں جرمنی اور اٹلی کی فوجوں کا بہت کافی نقصان ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں اسٹالن کا منشا شاید پورا ہو جائے گا۔

[۴۴] اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہٹلر نے بھی تقریر کی اس نے روسی سپاہیوں کی تعداد ۴۶ لاکھ بتائی۔

ہندوستان میں کانگریس کی طرح مسلم لیگ نے بھی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ دوسری طرف کانگریس اور حکومت کے سمجھوتے کی خبریں بھی گرم ہو رہی ہیں۔ ستیہ گرہ کے قیدیوں کے چھوٹنے کی افواہیں بھی اُڑ رہی ہیں۔

عربک کالج گرلز ہائی اسکول دہلی کا مشہور مدرسہ ہے اس سال اس نے سہ ماہی رسالہ بھی نکالا ہے۔ یہ رسالہ بہت کامیاب ہے۔ زیادہ تر مضمون اسکول کی لڑکیوں کے ہیں اور ان کا معیار بہت اچھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ سے چھوٹی بچیوں کے مضمونوں کے لئے بھی ضرور جگہ نکالی جائے گی۔

پچھلے مہینے ہم نے رسالہ سعادت لاہور کے قہقہہ نمبر پر تبصرہ کیا تھا۔ رسالے کی قیمت غلط چھپ گئی تھی۔ اس کی سالانہ قیمت چار روپئے ہے۔ دو روپئے تو چھ مہینے کا چندہ ہے۔

پچھلے دو مہینوں سے باوجود سخت احتیاط کے سنے میں کتابت کی غلطیاں ہو رہی ہیں ہمیں اس کا بہت افسوس ہے۔

اب ہم اور بھی احتیاط سے کاپیاں دیکھتے ہیں۔ پھر بھی کوئی بھول چوک ہو جائے تو پیامی ہمیں فوراً اطلاع دیں۔

ہاں سالنامے کے لئے مضمون اور نظمیں زیادہ سے زیادہ ۱۰ دسمبر تک ہمارے پاس پہنچ جائیں۔

اچھا اب سالنامے میں ہماری تمہاری ملاقات ہوگی (محمد حسین حسان)

ایک غلطی ——— انعام فی کس[لہ] ۲ر

۱۔ سلطان احمد المدواے دہلی
۲۔ کے ایم ظفر اللہ۔ کلکتہ
۳۔ محمد امین۔ بارہ بنکی
۴۔ محمد صلاح الدین انصاری حیدر آباد
۵۔ اقبال باسط علی خاں حیدر آباد
۶۔ حمید الدین یوسف۔ امرتسر
۷۔ اعجاز اختر ریاض ״
۸۔ سید ابراہیم خلیل حیدر آباد
۹۔ سید حمید قادری ״
۱۰۔ شیخ سلمان صادق۔ امرتسر
۱۱۔ اخلاق احمد۔ جامعہ نگر
۱۲۔ سید محی الدین۔ حیدر آباد
۱۳۔ قدسیہ بیگم ״
۱۴۔ محمد عماد الدین احمد میدک
۱۵۔ صالح ای لوٹیا۔ راولپنڈی
۱۶۔ شاہد حسین علوی۔ اورنگ آباد
۱۷۔ جمال فاطمہ۔ احمد نگر
۱۸۔ محمد شریف۔ جموں
۱۹۔ بقار اللہ عثمانی۔ رہتک
۲۰۔ مشتاق احمد گجرانوالا
۲۱۔ زیب الدین۔ میرٹھ
۲۲۔ ام اقبال حسن۔ چکر دھر پور
۲۳۔ غازی الرحمان۔ فیروز پور
۲۴۔ محمد اسلم ناصر علی شجاع۔ بڑودہ
۲۵۔ کمال الدین منشی۔ بھٹکل
۲۷۔ عبد الستار۔ گلبرگہ پور
۲۷۔ تقی محسن۔ انبالہ

لہ یہ رقم بہت تھوڑی ہے کوئی اچھی کتاب انعام میں نہیں بھیجی جاسکتی ان بچوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ آئندہ ڈیڑھ پیسے کے ٹکٹوں کے ساتھ چار حل بھیج دیں ۴۴

۴۴ ہاں اُن کے نام کے ساتھ جو نمبر شمار ہیں وہ ضرور لکھ دیں

معمّا نمبر ۲۵

(انعام میں کتابیں بھیجی جائیں گی)

پہلا انعام ۶؍

دوسرا انعام ۴؍

دائیں سے بائیں

(۱) کہتے ہیں کہ رُوس کی .... سے جرمنوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

(۳) بچوں کو جسمانی - - - دینا اچھا نہیں۔

(۵) ، علی گڑھ کی اچھی ہوتی ہے۔ (الٹا)

(۷) حروفِ تہجی کا پہلا حرف۔

(۹) خیال ہے کہ موجودہ جنگ .. سال تک جاری رہے گی۔

(۱۰) لفظ مُنیر کے بے ترتیب حروف۔

(۱۴) کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہٹلر رُوس پر.... فتح نہیں پا سکتا۔

(۱۵) تُم .. بھر کھانا کھاتے ہو۔

(۱۶) بہت سے لوگ ....کے بجائے دیوال لکھتے ہیں غلط لکھتے ہیں

(۱۸) ایک مُخلص قومی کارکن جس کام میں اپنا --- اُٹھا لیتا ہے تو قوم سے بڑے بڑے کام کرا لیتا ہے۔

(۱۹) تنگ آمد بہ - - - آمد

اُوپر سے نیچے

(۱) سو ---- کی ایک لوہار کی

(۲) لفظ بمعنی ایک

(۳) سُنا ہے کہ ایک .. بھی بہشت میں جائے گا۔

(۴) نرم دل آدمی کو ہمیشہ بہت جلد ہوتا ہے۔

(۶) اسٹالن سے پہلے رُوس میں اس کی حکومت تھی۔

(۸) قسمت سے ہی ناچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر .. میں ہوں یکتا طاق مجھے کیا نہیں آتا

(۱۱) قتلِ حُسین اصل میں مرگ ..... ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد (جوہر)

(۱۲) بچے دُشوار، دقیق اور غیر دلچسپ ..... کو پسند نہیں کرتے۔

(۱۳) الف بے زبر

(۱۷) کیا ہمارے معموں میں تمہارا --- لگتا ہے (الٹا)

قواعد

۱۔ تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔

۲۔ ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ آٹھ حلوں کی ۶ر ہے۔

۴۔ دونوں انعام تقسیم کردئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۵۔ تمام حل ۱۰ دسمبر تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی میں پہنچ جانے چاہئیں

۶۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۷۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

۸۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۹۔ ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

۱۰۔ دال اور واؤ کا نمایاں فرق ہو۔ (د ۔ و)

۱۱۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے۔ (ی ۔ ے)

۱۲۔ جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو۔ وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے

۱۳۔ املائی غلطی بھی شمار کی جائے گی۔

۱۴۔ حلوں کے بارے میں شکایتی خطوں کے لئے جوابی کارڈ یا ملہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ شکایت ٹھیک ہوئی تو اُن کے بچے انعام میں شامل کرلئے جائیں گے ورنہ اطلاع مل جائے گی۔

۱۵۔ **پتہ**:۔ سب ایڈیٹر "پیام تعلیم"، مکتبہ جامعہ دہلی ۔ قرول باغ

معما نمبر ۲۴ کا صحیح حل

۶ خ	۵ ی	■	۴ ں	۳ ر	ا	۲ پ	۱ م
ط	■	۹ د	ی	۸ ع	■	ا	۷ ا
و	ق	۱۲ ی	■	ب	۱۱ ا	ر	۱۰ ہ
ط	■	و	۱۴ ت	■	س	۱۳ ی	■
■	ن	ا	م	۱۷ ج	۱۶ ر	■	۱۵ ص
۲۰ ع	■	ل	■	ب	ا	۱۹ س	۱۸ ح
ا	■	ی	۲۲ ن	ا	ف	ر	۲۱ ب
م	۲۵ ہ	■	ت	۲۴ پ	■	ا	۲۳ ت

صحیح حل — انعام اوّل — فی کس ۱۲ر

۱۔ محمد مائل احمد ۔ حیدرآباد ۱۲۔ جُنید الحق ۔ جامعہ نگر

۲۔ شبیر احمد ۔ ناسک ۱۳۔ احسان الحق " "

۳۔ محمد عبدالواحد ۔ حیدرآباد ۱۴۔ محمد اقبال صدیقی ۔ رائچور

۴۔ محمد ایوب ۔ لہری قلات ۱۵۔ منظور الحق ۔ جموں

۵۔ سید محمد اسحاق ۔ جامعہ نگر ۱۶۔ بھوپندر پال سنگھ بیتیرا (برار)

۶۔ نسیم آرا بیگم ۔ دہلی ۱۷۔ نسیم [illegible] ۔ دہلی

۷۔ نصیر حسن ۔ دہلی ۱۸۔ مصور حسن "

۸۔ خورشید اسحاق مرزا ۔ لکھنؤ ۱۹۔ شیخ عبدالعلیم ۔ لکھنؤ

۹۔ مرزا انوار الزماں بیگ ۔ بلند شہر ۲۰۔ محمد شاکر بڑودہ

۱۰۔ محمد یوسف محبوب ، شیوگاؤں ۲۱۔ دوست محمد ۔ دہرادون

۱۱۔ نیاز احمد ۔ جامعہ نگر ۲۲۔ سید خلیل احمد ۔ بھوپال

(باقی صفحہ ۵۳۶ پر)

معما نمبر ۲۵ — کوپن نمبر

۴ ا		۳ س	■	۲ ی	د	ر	۱ س
	■		۶ ز	۵ ک	■	■	
س	۹	■		■	۸ ق		۷ ا
	■	۱۲ م	ر	۱۱	۱۰	■	ر
س	■		■	ز	■	۱۳	■
■		۱۵ م	■	ی	ہ	ب	۱۴
ر		و	۱۷ ی	۱۶ د	■	■	■
■	گ		۱۹	■	م		۱۸ ق

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۵ — کوپن نمبر

۴ ا		۳ س	■	۲ ی	د	ر	۱ س
	■		۶ ز	۵ ک	■	■	
س	۹	■		■	۸ ق		۷ ا
	■	۱۲ م	ر	۱۱	۱۰	■	ر
س	■		■	ز	■	۱۳	■
■		۱۵ م	■	ی	ہ	ب	۱۴
ر		و	۱۷ ی	۱۶ د	■	■	■
■	گ		۱۹	■	م		۱۸ ق

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۵ — کوپن نمبر

۴ ا		۳ س	■	۲ ی	د	ر	۱ س
	■		۶ ز	۵ ک	■	■	
س	۹	■		■	۸ ق		۷ ا
	■	۱۲ م	ر	۱۱	۱۰	■	ر
س	■		■	ز	■	۱۳	■
■		۱۵ م	■	ی	ہ	ب	۱۴
ر		و	۱۷ ی	۱۶ د	■	■	■
■	گ		۱۹	■	م		۱۸ ق

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۲۵ — کوپن نمبر

۴ ا		۳ س	■	۲ ی	د	ر	۱ س
	■		۶ ز	۵ ک	■	■	
س	۹	■		■	۸ ق		۷ ا
	■	۱۲ م	ر	۱۱	۱۰	■	ر
س	■		■	ز	■	۱۳	■
■		۱۵ م	■	ی	ہ	ب	۱۴
ر		و	۱۷ ی	۱۶ د	■	■	■
■	گ		۱۹	■	م		۱۸ ق

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

جامعہ کا بینڈ

فوارہ

مرسلہ فضل محمد چک سلانی

چشمہ ویری ناگ

مرسلہ عبدالحق جامعی

Regd. L. No. 1961